وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

"اور بے شک آپ (ﷺ) خلق عظیم پر پیدا کیے گئے ہیں۔" (سورۃ القلم)

حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نوراللہ مرقدہٗ
کی کتاب مسائل السلوک کی توضیح وتشریح سلیس زبان وعام فہم اندازِ بیاں

تسہیل

مسائل السلوک

معروف

قرآنی تعلیمات

تالیف

مولانا عبدالرحمن صاحب

اُستاذ حدیث وتفسیر

(خلیفہ مجاز حضرت محی السنۃ مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ)

حال مقیم جدہ (سعودی عرب)

Al-Manhal Publishers

"اور بے شک آپ (ﷺ) خلقِ عظیم پر پیدا کیے گئے۔" (سورۃ القلم)

حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ
کی کتاب مسائل السلوک کی توضیح وتشریح سلیس زبان وعام فہم انداز بیاں

تسہیل
مسائلِ السلوک

معروف

قرآنی تعلیمات

تالیف
مولانا عبدالرحمن صاحب
اُستاذ حدیث وتفسیر
(خلیفہ مجاز حضرت محی السُّنَّۃ مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ)
حال مقیم جدہ (سعودی عرب)

المنہل
بلاک A-1، گلستان جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی
021-34612901 | 0321-2000870
almanhalpublisher@gmail.com
almanhalpublisher@hotmail.com
web.facebook.com/almanhal.publisher

تسہیل مسائل السلوک قرآنی تعلیمات

تالیف
مولانا عبدالرحمن صاحب
اُستاذ حدیث وتفسیر
(خلیفہ مجاز حضرت محی السنۃ مولانا شاہ ابرار الحق صاحب)

الناشر
المنهل
بلاک A-1، گلستان جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی
021-34612901 | 0321-2000870

پاکستان بھر میں ملنے کے پتے

لاہور:
مکتبہ رحمانیہ
اقرا سینٹر، غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور
042-37221395,0343-9697395
042-37224228
ادارہ اسلامیات
190 انارکلی، لاہور
042-32722401

ملتان:
ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان
0322-6180738 061-4540513
مکتبہ اشاعت الخیر، ملتان
061-4514929

راولپنڈی:
اسلامی کتب گھر CDA اسٹاپ، راولپنڈی
051-4830451
الخلیل پبلشنگ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
051-5553248

حیدرآباد:
محمد احسن
0321 - 8727384

کوئٹہ:
مکتبہ رشیدیہ سرکی، کوئٹہ
081-2662263, 0333-7825484
مکتبہ فاروقیہ، عبدالستار روڈ کوئٹہ
0311 - 3737656
مکتبہ صالحیہ، کانسی روڈ، کوئٹہ
0304 - 3485588

پشاور:
ممتاز کتب خانہ قصہ خوانی بازار، پشاور
091 - 2580331
دارالاخلاص قصہ خوانی بازار، پشاور
091 - 2567539, 0300 - 5831992

فیصل آباد:
اسلامی کتاب گھر، سٹی ہرٹ پلازہ اردو بازار، فیصل آباد
041 - 37223506, 041 - 37230718,
0343 - 2000921

کوہاٹ:
مکتبہ حسین بن علی، ہنگو روڈ، کوہاٹ
0334 - 8299027

ادارۃ النور
دوکان نمبر 2-3، اوژمینشن، بنوری ٹاؤن، گرومندر، کراچی
021-34914596, 0324-2855000
idaratunnoor@gmail.com

سورة السجدة

سورة الأحزاب

سورة السبا

سورة الفاطر

سورة يٰس

سورة الصّٰفّٰت

سورة صٓ

سورة الزمر

سورة غافر

سورة حٰم السجدة

سورة الشوریٰ

سورة الزخرف

سورة الدخان

سورة الجاثية

سورة الأحقاف

سورة محمّد

سورة الفتح

سورة الحجرات

سورة ق

سورة الذٰريٰت

سورة الطور

سورة النجم

سورة القمر

سورة الرحمٰن

سورة الواقعة

سورة الحديد

سورة المجادلة

سورة الحشر

سورة الممتحنة

سورة الصف

سورة الجمعة

سورة المُنٰفِقُوْنَ

سورة التغابن

سورة الطّلاق

سورة التحريم

سورة الملك

سورة القلم

سورة الحاقة

سورة المعارج

سورة نوح

سورة الجن

سورة المزمل

سورة المدثر

سورة القِيٰمة

سورة الانسان

سورة المرسلٰت

سورة النباء

سورة النازعٰت

سورة عبس

سورة التكوير

سورة الانفطار

سورة التطفيف

سورة الانشقاق

سورة البروج

سورة الطارق

سورة الاعلیٰ

سورة الغاشية

سورة الفجر

سورة البلد

سورة الشمس

سورة الليل

سورة الضحیٰ

سورة الانشراح

سورة التين

سورة العلق

سورة القدر

سورة البينة

سورة الزلزال

سورة العٰديٰت

سورة القارعة

سورة التكاثر

سورة العصر

سورة الهمزة

سورة الفيل

سورة قريش

سورة الماعون

سورة الكوثر

سورة الكٰفرون

سورة النصر

سورة اللهب

سورة الإخلاص

سورة الفلق

سورة النّاس

❀❀❀

مولانا ابوالحسن ندوی

بعد حمد وصلوٰۃ:

حضرت مولانا عبدالرحمن بن احمد شریف صاحب حیدرآبادی سے میں بخوبی واقف ہوں، مولانا علوم دینی و اسلامی کے فاضل ہیں، جنوبی ہند کے دینی و علمی حلقوں میں آپ کی بیش بہا خدمات رہی ہیں۔ مولانا نے ہندوستان کے مختلف اداروں سے استفادہ کیا ہے۔ آخر میں مدرسہ مظاہرالعلوم ضلع سہارن پور (یوپی) سے علوم دینیہ کی تکمیل کی اور اصول دین علم وشریعت میں اعلیٰ سندیں حاصل کیں۔ تحصیل علم کے بعد جامعہ نظامیہ حیدرآباد میں تقریباً پندرہ سال درس وتدریس کی خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا موصوف نے عامۃ المسلمین کی تعلیم و تربیت کی جانب بھی خصوصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں اہل علم حضرات کے لیے ''مجلس علمیہ'' کی تاسیس رکھی جس کا دینی وعلمی حلقوں میں اثر رہا ہے۔

چونکہ مولانا توحید وسنت کے داعی وعلمبردار تھے اپنے شہر میں اہل بدعت کی مخالفتوں سے دوچار ہوگئے۔ اسی سال موصوف نے فریضۂ حج ادا کیا اور ان کی خواہش ہے کہ کچھ عرصہ انہی مقامات مقدسہ میں رہ کر علمی و دینی خدمت انجام دیں، چنانچہ انہیں اس مقصد کے حصول کے لئے تعاون کی ضرورت ہے۔

مجھے اس بات سے خوشی ہوگی کہ مولانا کے مقصد کی تکمیل ہو۔ اس بارے میں جو بھی ان کے ساتھ معاونت کریں میں اُن کا شکر گذار رہوں گا۔

والسلام

کتبہٗ الفقیر الی اللہ

ابوالحسن علی الحسنی الندوی

مکۃ المکرمہ

۳؍صفر ۱۳۹۸ھ

عرضِ ناشر

قرآنِ مجید میں دین ودنیا کی تمام بھلائیاں جمع ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے سے متعلق تعلیمات اللہ کی آخری کتاب میں موجود ہیں۔ قرآنی علوم پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی، اس کے باوجود کتاب اللہ کے کامل علوم کا احاطہ کرنے کا کوئی انسان دعویٰ نہیں کرسکتا۔ علمائے اسلام میں سے امام طبری، امام قرطبی، امام رازی، ابوحیان اندلسی، حافظ ابن کثیر، علامہ ابن قیم اور علامہ محمود آلوسی رحمہم اللہ جیسی سینکڑوں ہستیوں نے قرآن مجید کی جو تفاسیر لکھی ہیں وہ اسلامی کتب خانے کا ایک بہت بڑا اور بیش بہا حصہ ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن مجید سے مستنبط احکام پر امام ابوبکر جصاص، رازی، امام ابن العربی اور دیگر علماء رحمہم اللہ نے بھی گراں قدر کام کیا ہے۔

گزشتہ صدی میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اپنی نگرانی میں "احکام القرآن" پر تحقیقی کام کا ایک سلسلہ شروع کرایا جس میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمہ اللہ اور حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی رحمہ اللہ جیسے بزرگوں نے عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کی تفسیر بیان القرآن کے عربی حواشی میں مندرج "مسائل السلوک" اور حضرت کے مواعظ اور کئی دیگر تصانیف میں قرآن مجید کے معارف پر ایسے وقیع نکات اور اسرار وغوامض ملتے ہیں جو کہیں اور نہیں پائے جاتے۔

مولانا عبدالرحمٰن حیدرآبادی (حالِ مقیم جدہ) نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے "مسائل السلوک" کی روشنی میں "قرآنی تعلیمات" کے نام سے تزکیہ وسلوک سے متعلق قرآن مجید کے معارف ودقائق کو بڑی نفاست اور سلیقے کے ساتھ عوام کے لیے پیش کیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم اس عظیم الشان دینی خدمت کو پاکستان میں بہترین انداز سے شائع کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے امتِ مسلمہ کے لیے نافع اور مصنف کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

المنہل پبلشرز

حاصل تصوف

وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جس طاعت میں سستی محسوس ہو، سستی کا مقابلہ کر کے طاعت کو ادا کرے۔

اور جس گناہ کا تقاضہ ہو، تقاضے کا مقابلہ کر کے اُس گناہ سے بچے۔

اور جس کو یہ بات حاصل ہوگئی اُس کو پھر کچھ بھی ضرورت نہیں، کیونکہ یہی بات تعلق مع اللہ پیدا کرنے والی ہے اور یہی اُس کی محافظ ہے اور یہی اُس کو بڑھانے والی ہے۔

(وعظ التقویٰ)

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ

المتوفی ۱۳۶۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدیم

کسی واعظ سے خواہش کی گئی کہ ہمیں سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ سنایا جائے۔

فرمایا: پدرے بُود، پسرے داشت، گم کرد و باز یافت۔

ایک باپ تھے، اُن کا چہیتا بیٹا تھا، وہ گم ہو گیا پھر مل گیا۔

باقی تفصیل قرآن حکیم کی سورۂ یوسف پارہ ۱۲ میں دیکھ لی جائے۔

تصوّف کا معاملہ بھی کچھ ایسے ہی ہے۔ ایک قرآن (ہزار سال گزر گئے) اختلاف کو ختم نہ ہونا تھا، ختم نہ ہوا، جوابُ الجواب پھر جوابُ الجواب کا سلسلہ آج تک قائم ہے اور شاید...... قائم رہے۔

تفصیل کے لئے ہر دو جانب رسائل ہی نہیں ضخیم کتابیں بھی موجود ہیں، جوئندہ یابندہ، ڈھونڈنے والوں کو حقیقت مل ہی جاتی ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کتنا ہے۔

چونکہ زیرِ مطالعہ کتاب کا یہ موضوع نہیں ہے لہٰذا ہم اس سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنی اس کتاب "قرآنی تعلیمات" کا تعارف کروانا چاہتے ہیں زہے قسمت قبول اُفتد۔

مذکورہ کتاب کا موضوع تصوّف، بیعت وارشاد وسُلوک سے متعلق ہے۔

علم تصوّف دیگر علوم اسلامیہ کی طرح ایک مستقل علم ہے جیسا کہ علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ، علم کلام، علم تاریخ، علم سیرت وغیرہ علوم اسلامیہ ہیں۔ تاہم یہ علوم عہد نبوت میں ان ناموں سے معروف نہ تھے۔

علم تصوّف کا ترجمہ "علم اخلاق" کیا جاتا ہے جو مذکورہ بالا علوم میں ایک مستقل علم کی حیثیت سے ظاہر ہوا اور علوم اسلامیہ میں شامل ہو گیا اور یہ واقعہ ہے کہ اِن تمام علوم کی روح عہد نبوت، عہد صحابہ اور تابعین کرام کے دور میں موجود تھی اور آج بھی ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ قرآن وحدیث میں علم تصوّف کے اصول صراحتاً وکنایۃً موجود ہیں اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ علم تصوّف قرآن وحدیث میں نہیں وہ یا تو بے علم ہیں یا کم علم ہیں۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم، چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔

اندھی چمگادڑ اگر دن کی روشنی میں آفتاب کو دیکھ نہ پائے تو اس میں آفتاب کا کیا قصور ہے؟

حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان میں وہ پہلے عالم ہیں جنہوں نے علم تصوّف پر مستقل توجہ فرمائی اور تجدیدی کارنامہ انجام دیا۔

اس سلسلے میں دو اہم کتابیں تالیف فرمائیں۔ "① حقیقت الطریقت، ② مسائل السلوک۔"

پہلی کتاب میں تصوّف کے مسائل کو احادیث نبویہ سے ثابت کیا ہے اور دوسری کتاب میں انہی مسائل کو قرآن حکیم کی آیات سے مستنبط کیا ہے۔

ان دونوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد ایک حق طلب وحق پسند عالم کو پورا اطمینان ہوجاتا ہے کہ علم تصوّف قرآن وحدیث ہی کی تعلیمات کا نام ہے اور وہ تصوّف ہی نہیں جو قرآن وحدیث میں نہ ہو۔

حکیم الامّت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تو قرآن وحدیث سے تصوف کے تقریباً ② دو ہزار مسئلے صاف صاف دلالت سے ثابت کردیئے ہیں۔ اگر مزید غور کرتا تو اتنے ہی اور ثابت ہوتے۔

ان مسائل میں اکثر تو منصوص ہیں اور دوسرے بعض اعتباراً وتاویلاً ہیں۔

اپنی ایک خانگی مجلس منعقدہ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۱ھ، علماء وصالحین کی موجودگی میں بطور تحدیث بالنعمۃ فرمایا:

"یہ علم دنیا سے بالکل ہی مفقود ہوچکا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ اب مدّتوں بعد زندہ ہوگیا۔" (اشرف السوانح)

کون نہیں جانتا کہ قرآن وحدیث میں زہد، قناعت، خشوع وخضوع، تواضع، اخلاص، صبر وشکر، محبت وخشیت الٰہی، رضا بالقضا، توکل وتسلیم وغیرہ کی فضیلت اور اس کی تحصیل کا حکم موجود ہے۔

اسی طرح ان خلاق کریمہ کے اضداد حُبّ دنیا، حُبّ جاہ ومال، حرص وہوس، ریا وتکبر، وغیرہ۔

شہوت، غضب، عُجب، حسد، بُغض وعناد وغیرہ کی مذمت ہے اور اُن پر وعید ونکیر آئی ہے اور ان بُرے اخلاق سے دُور رہنے کی تاکید موجود ہے۔

علم تصوّف میں انہی اعمال کی اصلاح اور نیک اخلاق کی تعلیمات ہیں تو پھر اس علم کو قرآن وحدیث کے خلاف سمجھنا امانت ودیانت کے خلاف نہیں تو اور کیا ہے؟

تصوّف کی ان تعلیمات کو بیعت وارشاد اور سُلوک کا نام دیا گیا ہے۔ ان تعبیرات پر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ عنوانات عہد نبوّت میں نہیں ملتے لہٰذا بدعت ہیں تو یہ نہایت سطحی قسم کا اعتراض ہوگا۔

اُوپر لکھا جاچکا ہے کہ علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ، علم کلام وغیرہ کا ذکر بھی اُس عہد مبارک میں نہیں تھا، اس کے باوجود اِن علوم کو کسی بھی عالم نے بدعت نہیں کہا تو پھر علم تصوّف کو بدعت کس لئے کہا جائے گا؟ جب کہ اس کی حقیقت قرآن وحدیث میں موجود ہے تاہم بیعت وارشاد کی اسلامیت کو ہم یہاں ② دو محکم اسلامی مآخذ سے نقل کررہے ہیں جس کے جاننے کے بعد معلوم ہوگا کہ علم تصوّف قرآن وحدیث ہی کی تعلیمات کا نام ہے۔

قرآن: سورة الممتحنة پارہ ۲۸ آیت ۱۲ میں بیعت علی الاعمال کی صراحت اس طرح آئی ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰۤى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْرِقْنَ وَ لَا يَزْنِيْنَ وَ لَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

ترجمہ: اے نبی! جب مسلمان عورتیں آپ کے پاس آئیں کہ آپ سے ان باتوں پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ نہ کسی کو شریک کریں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی اور نہ کوئی بہتان کی اولاد لائیں گی جسے اپنے آپ گڑھ لیا ہو اور نہ نیک باتوں میں آپ کی نافرمانی کریں گی تو آپ ان کو بیعت کرلیا کریں اور ان کے لئے اللہ سے مغفرت طلب کیا کریں۔ بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔

سیّدہ عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عورتوں سے بیعت لیتے وقت اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھوں میں رکھا نہیں کرتے تھے (بلکہ زبانی بیعت لیا کرتے)۔ (بخاری) تفصیل معارف القرآن: ۴۱۶/۸۔

حدیث: حدیث صحیح میں مردوں سے بیعت کی تصریح اس طرح مذکور ہے:

حضرت عوف بن مالک الاشجعی ؓ کہتے ہیں کہ ہم سات آٹھ نو افراد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں موجود تھے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم رسول اللہ سے بیعت نہ کرو گے؟

ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! کس بات پر آپ سے بیعت کریں؟

ارشاد فرمایا کہ اللہ کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، پانچ وقت کی نماز پڑھیں اور دین کی باتیں سُنیں اور اُن کو قبول کریں۔ (مسلم، ابوداوٗد، نسائی)

عورتوں اور مردوں کی یہ بیعت نہ بیعت علی الجہاد ہے، نہ بیعت علی الاسلام بلکہ خالص بیعت علی الاعمال سے متعلق ہے تو پھر بیعت وارشاد کو بدعت یا غیر ضروری سمجھنا کس قدر بے علمی کی بات ہوگی۔ ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾

حضرت حکیم الامت ؒ نے اپنی مشہور زمانہ تفسیر ''بیانُ القرآن'' کے حاشیہ پر عربی زبان میں مسائل السُلوك مِنْ كلام مَلِكِ الملوك نام سے اُن مسائل تصوّف کی نشاندہی کی ہے جو آیات قرآنی سے ماخوذ ہوتے ہیں پھر اُن مسائل کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے، انہی مسائل سے زیر مطالعہ کتاب ''قرآنی تعلیمات'' مرتب کی گئی ہے لیکن یہ حقیقت بھی جاننا ضروری ہے کہ قرآن حکیم کے منشاو مراد کو ''تفسیر قرآن'' کہا جاتا ہے اور یہی قرآن کا حقیقی مفہوم ہوا کرتا ہے۔

البتہ آیت کے منشاو مراد سے ہٹ کر اُسی آیت سے کوئی ایسی بات اخذ کی جائے جو اُس آیت کے منشاو مراد

کے نہ خلاف ہو اور نہ اصول دین سے ٹکراتی ہو، ایسی کوشش کو ''تاویل قرآن'' کہا جاتا ہے جو اجتہاد واستنباط کی ایک شرعی قسم ہے۔

ہر زمانے میں اہل علم حضرات نے ایسی کوششیں کی ہیں جس طرح تفسیر قرآن پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں ایسے ہی ''تاویلاتِ قرآن'' پر بھی کتابیں موجود ہیں۔

لیکن تاویلات قرآن کا وہ درجہ نہیں ہوتا جو تفسیر قرآن کا ہوا کرتا ہے تاہم دونوں علوم قرآن حکیم سے متعلق ہیں اس لئے اہل علم حضرات نے تاویل قرآن کو بھی علوم شرعیہ میں شمار کیا ہے۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ کتاب ''مسائل السلوک'' جو زیر مطالعہ کتاب ''قرآنی تعلیمات'' کا ماخذ ہے، اسی استخراج واستنباط سے تعلق رکھتی ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''مسائل السلوک'' کے تمام مسائل کو زیر مطالعہ کتاب ''قرآنی تعلیمات'' میں جمع نہیں کیا گیا بلکہ کتاب مذکور سے صرف وہی مسائل لئے گئے ہیں جو سالک کی عملی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں۔ باقی تصوفی اشارات، لطائف، معارف، رموز سے تعرض نہیں کیا گیا۔ ایسے نکات اہل علم کے لئے تو مفید ہیں عامۃ الناس کو ان کی ضرورت نہیں۔

کتاب ''مسائل السلوک'' کے علاوہ دیگر تفسیری کتابیں مثلاً تفسیر روح المعانی، تفسیر کبیر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر ابن کثیر، تفسیر معالم التنزیل، تفسیر قرطبی، موضح القرآن، تفسیر معارفُ القرآن، تفسیر ماجدی سے بھی بعض مسائل سلوک نقل کئے گئے ہیں اور وہاں ان کا حوالہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب ''قرآنی تعلیمات'' میں آٹھ سو سے زائد قرآنی آیات کا ترجمہ، تفسیر اور ان سے اخذ کردہ مسائل جمع کئے گئے ہیں۔ ان میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں جو شریعت کے منشاو مراد سے ٹکراتا ہو اور ہم نے اسے نقل کر دیا ہو۔ اس سلسلے میں جابجا ان مسائل کی تردید بھی ملے گی جو قرآن وحدیث کے منشاو مراد سے ٹکراتے ہوں۔

ابوعبداللہ الحمیدی (المتوفی ۴۸۸ھ) مشاہیر محدثین میں شامل ہیں ان کا یہ شعار رہا ہے جو ایسے مواقع پر سنایا گیا۔

كِتَابُ اللهِ عَزَّوَجَلَّ قَوْلِيْ
وَمَا صَحَّتَ بِهِ الْاٰثَارُ دِيْنِيْ

قرآن حکیم میرا قول ہے اور احادیث نبویہ میرا عمل ہے۔

امام ابوعبداللہ الحمیدی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۴۲۰ھ وفات ۴۸۸ھ) کو شیخ ابواسحق اسفرائینی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کے قریب دفن کیا گیا تھا پھر کسی ہنگامی ضرورت کے تحت ۴۹۱ھ میں ان کی لاش کو نکال کر حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب دفن کیا گیا اس عرصہ میں ان کا کفن اور جسم صحیح وسالم اور معطر تھا۔

ہمارا بھی یہی شعار ہے اور قارئین حضرات سے بھی یہی خواہش کی جاتی ہے۔ آخر میں شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے ابدی پیغام پر اپنا پیش لفظ ختم کیا جاتا ہے۔

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہر گز لفظ بہ منزل نخواہد رسید

مپندار پیمبر کے راہِ صفا
تواں رفت جزبر پئے مصطفٰی

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾

خادمُ الکتاب والسنۃ
محمد عبدالرحمن
استاذ حدیث وتفسیر
حال مقیم جدّہ (سعودی عرب)
فون نمبر:6896059
یکم رجب ۱۴۱۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآنی تعلیمات

مسائل السلوك

سُورَةُ الفَاتِحَةِ

(1) ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ [سورة الفاتحة: 4]

ترجمة: ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

تفسیر: سورۂ فاتحہ کی اس آیت میں عبادت اور استعانت (مدد طلبی) کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کیا گیا ہے ایسے طور پر کہ اس میں کسی غیر کی ذرا بھی گنجائش باقی نہ رہی۔

سُلوك: حکیم الامت ؒ لکھتے ہیں کہ بندگی کی نسبت سالک کے مقام کا منتہیٰ ہوا کرتی ہے اور کوئی مقام (درجہ) اس سے بُلند تر نہیں ہے۔

مطلب یہ کہ کامل بندہ ہو جانا انسانیت کی معراج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء کرام ؑ کو عباد اللہ (اللہ کے بندے) کہا گیا ہے اور خود کلمۂ شہادت میں رسول ﷺ کو ''عبداللہ ورسولہ'' کے لقب سے مشرف کیا گیا جو اللہ تعالیٰ کے کامل ترین بلکہ اکمل ترین بندے اور رسول ہیں۔

آیت کا دوسرا جز ﴿وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ہے۔ اقرارِ عبادت کے بعد اللہ سے مدد طلبی کی درخواست کرنا سالک کا مقام تمکین ہے۔ یعنی اظہارِ بندگی کے بعد اس میں رسوخ و پختگی کی درخواست کرنا اور اس کا خواہش مند ہونا انسان کو درجۂ تمکین میں داخل کر دیتا ہے۔

اور ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ سے (کہ گمراہ اور بے دین لوگوں سے محفوظ رہے) مقامِ تلوین سے مؤمن پناہ چاہتا ہے۔ علم تصوّف کی یہ چار اصطلاحات:

مقام، سالک، تمکین، تلوین کی علم تصوّف میں یہ وضاحت کی جاتی ہے:

مقام: درجے اور رُتبے کو کہا جاتا ہے جو ایمانیات سے تعلق رکھتا ہے۔

سالك: اس شخص کو کہتے ہیں جو صراط مستقیم اختیار کر چکا ہو اور اُس پر گامزن بھی ہو۔

تمکین: نفس کی اُس کیفیت کو کہتے ہیں جو مسلسل عبادت وکثرت ذکر وفکر کی وجہ سے نفس میں پختہ ہوجاتی ہے۔
اس کیفیت کے حاصل ہوجانے کے بعد عبادات میں دوام اور اخلاص کی دولت نصیب رہتی ہے۔ ایسی کیفیت والے کو صاحبِ تمکین کہا جاتا ہے۔

تلوین: تمکین کے بالمقابل تلوین کی کیفیت ہے۔ یعنی نفس کی وہ کیفیت جو غیر یقینی اور متزلزل سی رہا کرتی ہے کہ وہ کبھی عبادات میں مشغول رہتا ہے، کبھی غفلت ونسیان کا شکار ہوجاتا ہے، کبھی گناہ کر بیٹھتا ہے اور پھر نادم وشرمندہ بھی ہوجاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں سالک کا مقام ظاہر ہوتا ہے جو عبادت میں لگا ہوا ہے۔

﴿اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ میں صاحبِ تمکین کا مقام مفہوم ہوتا ہے جو عبادت پر مزید استعانت طلب کرتا ہے۔

﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ سے مقام تلوین کا ثبوت ملتا ہے۔

ملحوظه: سالک کو مقام تمکین نصیب ہوجانے کے بعد عبادات، معاملات، اخلاقیات غرض دین کے ہر شعبہ میں استقامت واخلاص کی دولت نصیب رہتی ہے گویا وہ ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اُس کو دیکھ رہے ہیں۔ حدیث صحیح میں ایسی کیفیت کو ''احسان'' کہا گیا ہے۔

قَالَ مَا الْاِحْسَانُ؟ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ. (بخاري و مسلم)

❷ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ﴾ [سورة الفاتحة: 5]

ترجمة: لا ہم کو سیدھا راستہ، راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔

تفسیر: صراطِ مستقیم سے تکوینی (دُنیاوی) راستہ مراد نہیں ہے، وہ تو ساری مخلوقات کو حاصل ہے۔ بلکہ تشریعی راہ (اُخروی راہ) مراد ہے جو آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے جس راہ پر چل کر آدمی انعام یافتہ حضرات میں شامل ہوتا ہے۔ وہ انعام یافتہ حضرات نبیین، صدیقین، شہداء، صالحین ہیں۔ [سورة النسآء: 69]
ان کی زندگی کے حالات وواقعات قرآن حکیم میں بکثرت نقل کئے گئے ہیں۔ (ہماری کتاب ''ہدایت کے چراغ'' حصہ اول ودوم انہی واقعات پر مشتمل ہے۔ مطالعہ کیجئے)

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے مذکورہ آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ صراط مستقیم میسّر نہیں آتی جب تک کہ اہل صراط مستقیم کی پیروی نہ کی جائے۔ محض اوراق وکتب بینی کافی نہیں ہیں۔

(شریعت میں بیعت کی یہی حقیقت ملتی ہے کہ اہل علم سے علم ملتا ہے اور اہل عمل سے عمل کی توفیق نصیب ہوتی ہے، یہی تصوف کی رُوح اور اُس کا خلاصہ ہے)

سُورَةُ البَقَرَة

پارہ: ①

① ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ [سورة البقرة: 3]

ترجمة: جولوگ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں۔

تفسير: آیت میں متقین کی پہلی اور دوسری صفت بیان کی گئی ہے۔

صلوٰۃ کے لفظی معنی دعا ہیں۔(راغب) لیکن شریعت کی زبان میں ایک مخصوص طریقے کی عبادت کا نام صلوٰۃ ہے۔ اہلِ تحقیق علماء نے کہا ہے کہ نماز تو سراپا دعا ہے، دعا زبان سے بھی دل سے بھی اور اعضاء ظاہری سے بھی یعنی دعا قولی، دعا قلبی، دعا فعلی، تینوں کے مجموعے کا نام صلوٰۃ ہے۔

سُلوك: مذکورہ آیت میں اقامت صلوٰۃ کا ذکر ہے، ادائے صلوٰۃ کا نہیں۔ اقامت صلوٰۃ اور ادائے صلوٰۃ میں فرق یہ ہے کہ چند ظاہری اشکال کا نام تو صلوٰۃ ہے اور اقامت صلوٰۃ کے معنی نماز کو کامل مکمل طور پر ظاہری و باطنی کیفیت سے ادا کرنا۔

(عربی لغت کے امام راغب ؒ نے اقامت کے یہی معنی لکھے ہیں)

''اِقَامَةُ الشَّيِ تَوْفِيَةُ حَقّه'' (راغب) اقامت شئی کے معنی اس کے حق کو پورا ادا کرنا۔ جس کا خلاصہ یہ کہ نماز مداومت کے ساتھ، تعدیل ارکان اور خشوع وخضوع سے اللہ کے سامنے جھک جانا، سرِ عبودیت خم کر دینا اور اللہ کا گہرا ربط و تعلق قائم کر لینا۔ (ابن جریر، تفسیر کبیر)

''يَأْتُوْنَ بِهَا بِحُقُوْقِهَا'' (جلالین) نماز کو اس کے تمام حقوق کے ساتھ ادا کرنا، ایک عام سالک تو ادائے صلوٰۃ کا فریضہ انجام دیتا ہے لیکن اہل تمکین (جس کی تعریف لکھی جا چکی ہے) اقامت صلوٰۃ کا فریضہ انجام دیا کرتے ہیں۔

② ﴿وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ [سورة البقرة: 3]

ترجمة: اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔

تفسير: متقین کی یہ تیسری صفت بیان کی گئی ہے۔

لفظ رزق قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کے معنی میں وسعت اور تنوع پایا جاتا ہے۔ ہر قسم کی نعمت خواہ وہ ظاہری و مادی ہو جیسے مال و دولت، اولاد و تخت، تاج وغیرہ۔(راغب)

یا معنوی و روحانی ہو جیسے علم و حکمت، فہم و فراست، محبت و خشیت، تقویٰ و طہارت وغیرہ۔

(اَلرِّزْقُ فِیْ کَلَامِ الْعَرَبِ هُوَالْحَظُّ.) (تفسیر کبیر)

اللہ کی ہر عطاو بخشش کورزق کہا جاتا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے نیک بندے اللہ کی دی ہوئی ظاہری و باطنی نعمتیں راہِ حق میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔احکام الٰہی کی مخالفت اوراس کی ناشکری میں صرف نہیں کرتے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ کثرتِ عبادت وکثرتِ ذکر وفکر سے اہل اللہ کو جو انوارات معرفت وکیفیات قلبی ملتی ہیں یہ حضرات ان کا افاضہ اپنے طالبین پر برابر کرتے رہتے ہیں۔

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا
(اکبر)

﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ [سورة البقرة: 4]

ترجمة: اور جولوگ ایمان رکھتے ہیں اس کتاب پر جوآپ پر نازل کی گئی ہے اور (ان کتابوں پر) جوآپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اتاری گئی ہیں۔

تَفسِیر: متقین کی یہ چوتھی صفت بیان کی گئی کہ وہ نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام کو دل سے قبول کرتے ہیں بلکہ گزشتہ سارے انبیاء ورسل کی ذوات اوران کے پیغامات کی بھی تصدیق کرتے ہیں گویا مومن متقی کے لئے صرف خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کافی نہیں بلکہ سارے انبیاء ورسل کی تصدیق کرنی ضروری ہے۔خواہ اجمالی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔البتہ اطاعت وپیروی صرف خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی کی جائے گی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ اعتقاد تو تمام اہل حق مشائخ سے ایسے ہی رکھنا چاہیے جیسا اپنے شیخ ومرشد سے رکھا جاتا ہے،البتہ اتباع وپیروی اپنے شیخ کی کرنی چاہیے۔جیسا کہ بعینہ یہی حکم انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں آیا ہے۔تصدیق وتعظیم تو تمام انبیاء کرام کی یکساں رکھنی چاہیے البتہ اطاعت وپیروی صرف خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوگی۔

﴿یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ [سورة البقرة: 3]

ترجمة: چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اوران لوگوں سے جوایمان لاچکے ہیں۔

تَفسِیر: یہاں منافقوں کی ایک بدخصلت کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنے زعم میں ایمان واسلام کا اقرار کرکے اللہ تعالیٰ اور ایمان والوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم بھی مسلمانوں جیسے مؤمن ہیں۔اس طرح اس

چالبازی سے اسلام کے منافع حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اللہ کو دھوکہ دینے سے مراد رسول اللہ ﷺ کو دھوکہ دینا مراد لیا ہے۔ (مدارک)

مقصود یہ ہے کہ یہ بدخصلت لوگ اللہ ورسول کو تو کیا دھوکہ دیتے خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں جس کا عنقریب وہ مزہ چکھیں گے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے اس مضمون سے یہ اخذ کیا ہے کہ اہل اللہ سے ایسا کوئی معاملہ کرنا جو فریب یا عداوت کی شکل کا ہو ایسے ہی ہے جیسا اللہ اور رسول سے فریب کرنا۔

(ایک حدیث قدسی سے بھی اس کی تائید ملتی ہے)

((مَنْ عَادٰي لِيْ وَلِيّاً فَقَدْ اٰذنْتُه لِلْحَرْبِ.)) (حديث)

ترجمة: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو کوئی میرے ولی (دوست) سے عداوت رکھے گا، اُس سے میرا اعلانِ جنگ ہے۔

⑤ ﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ [سورة البقرة: 10]

ترجمة: ان کے دلوں میں بڑا مرض ہے سو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھا دی۔

تفسير: منافقوں کی بدباطنی کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کی یہ بدخصلتیں درحقیقت ان کے دل کی بیماری کا سبب ہے، دل میں کھوٹ و مرض (کفر و شرک، بغض و عناد) بھرا ہوا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے یہ تنبیہ فرمائی کہ جیسے جسم کی بیماریاں ہیں، دل کے بھی امراض ہیں۔ تصوّف میں دل کی بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ حسد، کینہ، بغض و عداوت، غضب و شہوت، کبر و عُجب، ریا و تفاخر وغیرہ یہ سب قلبی امراض ہیں جن کو علم تصوّف میں امراض قلب کہا جاتا ہے۔

⑥ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ [سورة البقرة: 26]

ترجمة: یقیناً اللہ تعالیٰ تو نہیں شرماتے اس بات سے کہ بیان کر دیں کوئی مثال بھی خواہ مچھر کی ہو خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو۔

تفسير: شرک و کفر کی مذمت کے سلسلے میں قرآن حکیم نے بُتوں کی بے بسی و بے کسی کا ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ جن جن بتوں کی پوجا کر رہے ہیں وہ تو مکھی مچھر تک بھی پیدا نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ انسان و زمین و آسمان پیدا کر سکیں۔ اس مثال پر منافقوں نے مذاق اڑایا کہ اللہ کا کلام اور پھر اس میں مکھی مچھر حقیر جانوروں کا بیان؟ یہ بھی کوئی خدائی کلام ہو سکتا ہے؟ اس پر آیت مذکورہ میں جواب دیا گیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے مذکورہ آیت سے یہ آگاہی دی کہ حضرات صوفیاء کرام بھی عوام کی تفہیم و تذکیر کے لیے کوئی بھی مثال بیان کرنے میں عرفی شرم و عار کی پروا نہیں کرتے۔

(مطلب یہ کہ کسی بھی کلام کا یہ مقصد ہوا کرتا ہے کہ وہ سننے والوں کو فائدہ پہنچائے اب اسی غرض کے تحت جس مثال سے بھی یہ مقصد حاصل ہوگا اس کے بیان کرنے میں شرم وحیا کا لحاظ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔)

(حضرات صوفیاء کرام میں خاص طور پر مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ برجستہ مثالیں دینے میں عام شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب مثنوی میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔)

⑳ ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ [سورة البقرة: 30]

ترجمة: اور (وہ وقت یاد کرو) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں۔

تفسیر: جس وقت سیّدنا آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نیابت وخلافت کے لیے پیدا کرنا چاہا اور اس کا ذکر فرشتوں سے کیا، اس وقت سب فرشتوں نے بارگاہِ الٰہی میں یہ معروضہ پیش کیا تھا کہ ہم آپ کی تسبیح وتقدیس کے لیے موجود ہیں پھر نئی مخلوق پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو زمین پر فتنہ وفساد مچائے گی، ہم آپ کی منشا ومراد کو پورا کرنے کے لیے حاضر ہیں۔ (تفصیل مذکورہ آیات میں دیکھ لی جائے) پھر اللہ تعالیٰ نے سیّدنا آدم علیہ السلام کو دولتِ علم سے نوازا جو فرشتوں کو حاصل نہ تھی پھر یہی علم وحکمت خلافت ونیابت کا معیار ثابت ہوا۔

سلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسان کی خلافت کا مدار علم وفہم پر رکھا گیا ہے بشرطیکہ بدعملی نہ ہو، مجاہدۂ اعمال اور کثرت ذکر وفکر معیارِ خلافت نہیں ہیں۔

اسی بنیاد پر مشائخِ طریقت نے خلافت دیتے وقت اس کی زیادہ رعایت رکھی ہے۔

(مطلب یہ کہ خلیفہ اس شخص کو بنایا جائے گا جو علم وفہم، معاملہ فہمی، مزاج شناسی اور ماحول سازی کی صلاحیتیں رکھتا ہو۔ ان اوصاف کے علاوہ بدعمل یا بے عمل بھی نہ ہو۔)

بنی اسرائیل کے ایک نبی نے (جن کا نام شموئیل بیان کیا جاتا ہے) طالوت کو جب اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہا تو قوم کو یہی جواب دیا تھا: طالوت علم وطاقت میں تم سب سے بڑا ہے۔ [سورة البقرة: 247]

㉑ ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ [سورة البقرة: 35]

ترجمة: اور قریب نہ جاؤ (اس درخت کے ورنہ تم بھی ان لوگوں میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔

تفسیر: سیّدنا آدم علیہ السلام کو جنّت میں پہنچا دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کی بیوی کو حکم دیا کہ وہ فلاں درخت کے قریب تک نہ جائیں (مقصود اس درخت کا پھل نہ کھانا تھا) لیکن ابلیس لعین سیّدنا آدم علیہ السلام کو دھوکہ وفریب سے درخت کے قریب لے آیا اور اس کا پھل کھلا دیا۔

سلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے مشائخ اہل طریقت کے اس عمل کی توثیق کی کہ وہ کبھی اپنے مریدوں کو جائز اور

ناجائز کام سے بھی روک دیتے ہیں تاکہ وہ عمل غیر مباح و ناجائز عمل کا ذریعہ نہ بنے۔ جیسا کہ درخت کے قریب ہونا فی نفسہ منع نہ تھا۔ صرف پھل کھانا ممنوع تھا۔ تاہم سیدنا آدم علیہ السلام کو درخت کے قریب ہونے سے منع فرما دیا گیا۔

﴿فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ﴾ [سورة البقرة: 36]

ترجمة: پس لغزش دے دی شیطان نے آدم علیہ السلام اور حوا کو اس درخت کی وجہ سے سو برطرف کر کے رہا ان دونوں کو اس عیش سے جس میں وہ دونوں تھے۔

تفسیر: سیّدنا آدم علیہ السلام یقیناً اشرف المخلوقات تھے اور ابلیس لعین مردود و ملعون قسم کا تھا۔ اس کے باوجود ناقص نے کامل و اعلیٰ رتبے والی مخلوق کو دھوکہ دے دیا۔ سیّدنا آدم علیہ السلام اس سے متاثر ہو گئے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے اس حادثے سے یہ اخذ کیا کہ امت کے کاملین بھی شیطانی مکر و فریب سے محفوظ نہیں ہوتے، انہیں ہر وقت نفس و شیطان کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ [سورة البقرة: 45]

ترجمة: اور مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے۔

تفسیر: ایمان و اخلاص کی زندگی بسر کرنے کے لیے صبر اور نماز کا سہارا لیا جانا آیت مذکورہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اسلامی زندگی بسر کرنے میں خواہشاتِ نفسانی اور تقاضائے کبر و نخوت حائل ہوتے ہیں۔ اس لیے ایمان والوں کو صبر (روزہ) اور نماز کا حکم دیا گیا۔

روزہ شہوت کو توڑتا ہے اور نماز تواضع پیدا کرتی ہے اور کبر و نخوت کو دور کرتی ہے۔ (جلالین)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا کہ جن لوگوں میں شہوت و غرور و کبر کا غلبہ ہو انہیں کثرت سے روزے اور نمازوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

حضرات مشائخ ایسے لوگوں کو انہی امور کی تلقین کیا کرتے ہیں۔

﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ﴾ [سورة البقرة: 45]

ترجمة: اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی بھاری نہیں۔

تفسیر: آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ نماز ان لوگوں پر بھاری نہیں جنہیں یقین ہے کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچنا ہے اور آخرت ہماری آخری و دائمی منزل ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ مراقبۂ موت نماز کو آسان اور محبوب بنا دیتا ہے۔ (یعنی موت کا اور مابعد الموت کا استحضار اور اس کا دائمی خیال انسان میں فکر آخرت پیدا کرتا ہے۔ اور فکر

آخرت سے نماز آسان ہو جاتی ہے۔)

⑫ ﴿وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ [سورة البقرة: 51]

ترجمة: اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس ⑩ راتوں کا وعدہ کر لیا تھا۔ پھر تم نے ان کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کر لیا اور تم سخت ظالم تھے۔

تفسير: اللہ تعالیٰ نے سیّدنا موسیٰ علیہ السلام کو اپنی کتاب تورات دینے سے پہلے چالیس دن کا اعتکاف اور روزہ رکھنے کا حکم دیا تھا۔ سیّدنا موسیٰ علیہ السلام نے ان ایام کی تکمیل کی اور کوہِ طور سے کتابِ الٰہی لے آئے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اہلِ سلوک کے ہاں چلّہ (چالیس دن رات) کی جو میعاد متعارف ہے، اس کی اصل اسی آیت سے نکالی گئی ہے،

(اگرچہ قصہ سیّدنا موسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہے لیکن جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کو ہمارے لیے نقل فرمایا اور کوئی نکیر نہیں فرمائی تو ہمارے لیے ممانعت کی کوئی وجہ نہیں، علاوہ ازیں اس سلسلے میں ایک حدیث بھی موجود ہے۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص چالیس ⑩ دن اللہ کے لیے اخلاص (کے ساتھ عبادت) اختیار کر لے، اس کے قلب سے علم وحکمت کے چشمے (اُبل کر) اس کی زبان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ (رزین) شریعت وطریقت ص ۴۲۷

⑬ ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا﴾ [سورة البقرة: 38]

ترجمة: ہم نے حکم دیا: نیچے اتر جاؤ اس جنّت سے سب کے سب پھر اگر تمہارے پاس میری جانب سے کسی قسم کی ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو ان پر نہ کچھ اندیشہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

تفسير: درخت کا پھل کھانے کے بعد سیّدنا آدم علیہ السلام کو اغواءِ شیطانی کا احساس ہوا، فوری توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ جو نیتوں کا جاننے والا ہے سیّدنا آدم علیہ السلام کو معاف کر دیا تاہم ان کو اور ان کی بیوی کو زمین پر اتر جانے کا حکم فرمایا، زمین پر اتر جانے کا یہ حکم بطور سزا یا عتاب نہ تھا کیونکہ خطا تو معاف ہو چکی تھی، البتہ یہ خطا و لغزش کے طبعی اثرات تھے جو شجرۂ ممنوعہ کے پھل کھانے سے پیدا ہو رہے تھے۔ اس لحاظ سے اب جنّت میں قیام کی گنجائش نہ تھی، علاوہ ازیں خلافتِ ارضی بھی جاری کرنی تھی۔

سلوك: عارفین کہتے ہیں کہ توبہ واستغفار سے روح کے داغ دھبّے تو دُھل جاتے ہیں لیکن جسم ومادّہ پر خطا ونسیان کے نقوش بہرحال باقی رہتے ہیں مثلاً کوئی شخص خودکشی کے ارادے سے زہر کھا لے پھر معاً اسے اپنی خطا و نسیان پر تنبہ ہو اور وہ اللہ کی جناب میں روئے گڑگڑائے، دل سے توبہ کرے تو اس عمل سے گناہ تو عجب نہیں معاف ہو جائے لیکن زہر کے طبعی اثرات جو نظامِ جسم پر مرتب ہوتے ہیں وہ بہرحال ہو کر رہیں گے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے گو سیّدنا آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمالی لیکن دنیا میں رہنے کا جو حکم تھا وہی برقرار رہا۔ محققین اہلِ طریقت نے یہ اخذ کیا کہ گناہوں کے طبعی اثرات کبھی ظاہری جسم پر بھی مرتسم ہو جاتے ہیں، گناہ گار کے چہرے مہرے سے ایسی کیفیات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

⑭ ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا﴾ [سورة البقرة: 48]

ترجمة: اور ڈرو اس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی اور قبول نہ ہو اس کی طرف سے سفارش اور نہ لیا جائے گا اس کی طرف سے کوئی بدلہ اور نہ وہ مدد کئے جائیں گے۔

تفسير: بنی اسرائیل جو سیّدنا موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا نام ہے انہیں یہ زعم پیدا ہو گیا تھا کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں ان کا سہارا کافی ہے آخرت میں ہمیں کسی بات کا اندیشہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے اس زعم کو باطل قرار دیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس میں یہ صراحت ہے کہ محض خاصانِ خدا سے تعلق ہو جانا بغیر ایمان و عمل صالح کے مفید نہیں۔

⑮ ﴿وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى﴾ [سورة البقرة: 57]

ترجمة: اور سایہ کیا ہم نے تم پر بادل کا اور اتارا تم پر منّ و سلویٰ۔ کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں۔ انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا بلکہ اپنا ہی نقصان کر رہے تھے۔

تفسير: یہ صحراء سینا میں وادی تیہ کا واقعہ ہے جب سیّدنا موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر اس وادی میں مقیم تھے اللہ تعالیٰ نے اس لق و دق وادی میں قوم کو طرح طرح کی نعمتیں مہیّا فرمادی تھیں لیکن یہ قوم بغاوت و نافرمانی پر اس نعمت کے ماحول میں بھی قائم رہی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس واقعہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ گناہوں کی کثرت کے باوجود اللہ تعالیٰ کا رزق بند نہیں ہوتا، لیکن اس حالت کو استدراج کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے غضب و ناراضگی کی خطرناک علامت ہے۔ بعض جاہل صوفیاء نے کثرتِ مال و جاہ کو مقبولیت کی علامت سمجھا ہے۔

⑯ ﴿وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾ [سورة البقرة: 61]

ترجمة: اور جب کہا تم نے: اے موسیٰ علیہ السلام! ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی قسم کے کھانے پر سو تو دعا کر ہمارے لیے اپنے پروردگار سے کہ نکال دے ہمارے لیے جو زمین سے اگتا ہے، ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور (دال) اور پیاز۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا تم وہ چیز لینا چاہتے ہو جو ادنیٰ درجے کی ہے اس کے بدلہ میں جو بہتر ہے؟ لہٰذا اُترو تم کسی (قریب کے) شہر میں تم کو ملے گا جو کچھ طلب کرتے ہو۔ (اس نازیبا فرمائش پر) اور ڈال دی گئی ان پر ذلت اور محتاجی اور وہ لوٹے اللہ کا غضب لے کر۔ یہ اس لیے

ہوا کہ وہ تسلیم نہیں کرتے تھے اللہ کے احکام کو اور خون کیا کرتے تھے نبیوں کا ناحق۔ یہ اس لیے کہ وہ نافرمان لوگ تھے اور کسی حد پر قائم نہیں رہتے تھے۔

تَفسِیر: یہ واقعہ بھی وادی تیہ کا ہے جہاں قوم پر آسمان سے تازہ تازہ رزق منّ وسلویٰ کی شکل میں نازل ہوا کرتا تھا۔ نہ زراعت وکھیتی کی ضرورت تھی، نہ پکانے و تیار کرنے کی۔ اس عظیم نعمت کا شکر ادا کرنے کے بجائے آسمانی نعمت کی بے قدری کرنے لگے اور دال، ترکاری کی فرمائش کی کہ ہم خود زراعت کریں گے اور سبزی وترکاریاں کھائیں گے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے اس واقعہ سے یہ درس دیا کہ عارف کو ان لوگوں سے عبرت حاصل کرنی چاہیے جو لوگ قضائے الٰہی پر راضی نہ ہوئے اور نعمت پر شکر اور بلاؤں پر صبر نہ کیا۔

ایسے لوگ ذلّت اور مشقت کے علاوہ غضبِ الٰہی میں بھی مبتلا ہو گئے۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ جو بندوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے اس کو بدلنا اور اپنی تجویز پر اصرار کرنا، مثلاً متوکّل آدمی کا تلاشِ معاش میں پڑ جانا، اسی طرح صاحبِ کسب ومحنت کا بلاضرورت ترکِ کسب کرنا، اللہ تعالیٰ کی ناخوشی کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسا کہ قوم بنی اسرائیل کو بلا محنت ومشقت رزق ملتا تھا مگر انہوں نے اسباب کو طلب کیا اور پھر ذلیل وخوار ہو گئے۔

17 ﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ [سورة البقرة: 61]

ترجمة: یہ سب (یعنی قتل انبیاء اور احکام الٰہی کا انکار) اس لیے ہوا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حدود سے تجاوز کر جاتے تھے۔

تَفسِیر: قوم بنی اسرائیل کی سرکشی اور بغاوت کا آیت میں تجزیہ کیا گیا ہے کہ یہ بڑے بڑے جرائم نبیوں کو ناحق قتل کرنا، آیاتِ الٰہی کا انکار کرنا وغیرہ اطاعت گریزی اور گناہوں پر جمے رہنے کی وجہ سے تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے یہ آیت سے استنباط کیا ہے کہ کسی بھی گناہ کو خفیف (ہلکا) سمجھنا نہ چاہیے۔ ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب بن جاتا ہے یہاں تک کہ کفر تک لے آتا ہے۔

جیسا کہ مذکورہ آیت میں بنی اسرائیل کا عصیان اور تجاوز عن الحدود ان کو کفر اور قتل انبیاء تک لے آیا۔

مفسر بیضاوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جیسے چھوٹی نیکی بڑی نیکی کا سبب ہو جاتی ہے ایسے ہی چھوٹا گناہ بڑے گناہ تک پہنچ جاتا ہے۔

یہاں فقہاء کرام نے یہ حقیقت اخذ کی ہے کہ صغائر (چھوٹے گناہ) پر اصرار کرنا (یعنی دائمی کرتے رہنا) کبیرہ گناہ بن جاتا ہے۔

⑱ ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾

[سورة البقرة: 65]

ترجمة: اورتم خوب جان چکے ہو جنہوں نے تم میں سے ہفتہ والے دن میں زیادتی کی تھی تو ہم نے ان سے کہا: ہوجاؤ بندر ذلیل وخوار، پھر کیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ان لوگوں کے لئے جو پیچھے آنے والے تھے (مستقبل کے انسانوں کے لیے) اور نصیحت ڈرنے والوں کے لیے۔

تفسیر: آیت میں زمانۂ قدیم کے اس رسوا کن واقعہ کا تذکرہ ہے جس کو ''اصحاب السبت'' کہا جاتا ہے۔ (واقعہ کی تفصیل ہماری کتاب ''ہدایت کے چراغ'' جلد (۲) دوئم ص ۱۸۹ پر مطالعہ کیجئے جو اس واقعہ کی مکمل تفصیل ہے۔)

خلاصہ یہ کہ قوم بنی اسرائیل کو ہفتہ کا دن عبادت کے لیے مقرر کیا گیا تھا اور حکم دیا گیا تھا کہ اس دن مچھلی کا شکار نہ کریں۔ اس قوم کا گذر بسر مچھلی کے شکار پر تھا لیکن ان لوگوں نے حیلہ وچالبازی سے ہفتے کے دن شکار کرنا شروع کر دیا۔ اس مکر وفریب کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو بندر کی شکل میں مسخ کر دیا۔ یہ اس حالت میں ایک دوسرے کو دیکھتے اور روتے تھے مگر بات نہیں کر پاتے تھے، تین دن اسی حالت میں رہے پھر انہیں فنا کر دیا گیا۔

یہ واقعہ سیّدنا داوٗد علیہ السلام کے عہد کا تھا المتوفی ۱۰۲۴ قبل مسیح۔

سُلوک: تفسیر روح المانی کے مفسّر علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اہلِ عرفان کے لیے یہ نکتہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عبادات کو مخصوص صورت اور شکلوں میں خاص خاص اوقات میں متعین کیا ہے۔

تاکہ عبادتوں سے طبعی ظلمت وقساوت دور ہوں لہٰذا جو شخص ان خاص ہیئتوں کی رعایت نہیں کرتا اس کا نور ایمان ضائع ہوجاتا ہے اور وہ اصحاب السّبت کی طرح معنوی مسخ کر دیا جاتا ہے یعنی جس جانور کے اوصاف اس میں راسخ ہوں انہی کی طبیعت اس میں پیدا کر دی جاتی ہے۔

لہٰذا انسان کو عبادات کی مقررہ صورتیں اور شکلیں اور اوقات کا پاس ولحاظ رکھ کر اپنی انسانیت کو باقی رکھنے کی کوشش میں رہنا چاہیے۔ (رُوح المعانی)

چنانچہ بعض اہلِ کشف ایسے بھی پائے گئے ہیں جنہوں نے انسان کو اسی حیوانی شکل میں دیکھا ہے جو اُس پر غالب تھی مثلاً جس شخص میں ظلم وشقاوت غالب ہوتی ہے اسے آتا دیکھ کر پکار اٹھے: بھیڑیا آرہا ہے یا جس پر حرام خوری کی گندگی غالب ہوتی ہے اس کو دیکھ کر یوں بول پڑے: سور آرہا ہے۔

اسی طرح بعض صالحین کو آتا دیکھ کر کہنے لگے: مردُماں می آیند، مرَدُماں می آیند (انسان آرہے ہیں)

(ارواحِ ثلاثہ)

⑲ ﴿قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ [سورة البقرة: 67]

ترجمة: وہ بولے: (اے موسیٰ!) کیا آپ ہم سے مذاق کر رہے ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ مجھے اس سے پناہ میں رکھے کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں۔

تفسیر: قوم بنی اسرائیل میں ایک شخص عامیل نامی مارا گیا تھا۔ اس کے قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ سیّدنا موسیٰ علیہ السلام نے بطور معجزہ یہ فیصلہ دیا کہ ایک گائے ذبح کر کے اس کا ایک ٹکڑا مقتول پر مارا جائے تو وہ مُردہ زندہ ہو کر خود اپنے قاتل کا نام بتا دے گا (چنانچہ ایسا ہی ہوا) لیکن اس تجویز پر قوم نے کہا: یہ کیا مذاق کی باتیں ہیں؟ سیّدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ٹھٹھا، مذاق کرنا تو جاہلوں کا کام ہے اور وہ بھی احکام شرعیہ میں پیغمبر سے ہرگز ممکن نہیں۔

سُلوك: فقہاء مفسرین نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ دین اور احکام دین کا مذاق اڑانا جہل اور گناہِ عظیم ہے۔ البتہ مزاح و خوش طبعی کو تمسخر اور استہزا سے تعلق نہیں ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے، خوش طبعی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی ہے۔ (روح المعانی)

⑳ ﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [سورة البقرة: 94]

ترجمة: (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ کہہ دیجیے کہ اگر عالم آخرت (جنت) صرف تمہارے لیے خاص ہے دوسروں کو چھوڑ کر تو پھر موت کی آرزو کر کے دیکھو اگر تم سچے ہو۔

تفسیر: یہودیوں کا یہ زعم تھا کہ عالم آخرت کی نعمتیں صرف ہمارے لیے ہیں کیوں کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں اور ان کے وارث بھی اور عالم آخرت تو نبیوں کا گھر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس خام خیالی کو اس طرح باطل قرار دیا کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر جلد موت کی تمنا کرو، کیونکہ موت کے بغیر آخرت میں داخلہ ممکن نہیں۔ اور یہودیوں سے یہ تمنا ممکن ہی نہ تھی۔

قرآن حکیم نے یہ صراحت کی ہے کہ لوگ ﴿اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ﴾ (دنیاوی زندگی پر سب سے زیادہ حریص و طماع ہیں) دنیا سازی اور دنیا پرستی ان کا محبوب مشغلہ ہے پھر یہ مرنے کی تمنا کیونکر کر سکیں گے؟ تو خود بخود ان کا دعویٰ خام خیالی ثابت ہو جاتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ موت کی محبت خواہ طبعی ہو یا عقلی، ولایت (اہل اللہ) کی علامتوں میں سے ہے۔

(قرآن حکیم نے نیک بندوں کی علامتوں میں لِقاءِ ربّ کو بھی شمار کیا ہے)

﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ﴾ [سورة العنكبوت: 5]

جوشخص اللہ کی ملاقات چاہتا ہے سواللہ کا وہ معیّن وقت ضرور آنے والا ہے۔

حدیث شریف میں بھی یہ حقیقت بیان کی گئی ہے۔

(مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَه وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَه.)

(حديث)

جوشخص اللہ سے ملاقات پسند کرتا ہے اللہ بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو اللہ کی ملاقات کو پسند نہیں کرتا اللہ بھی اس کی ملاقات کو پسند نہیں کرتا۔

21 ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾

[سورة البقرة: 98]

ترجمة: جوکوئی مخالف ہو اللہ کا یا اس کے فرشتوں کا یا اس کے رسولوں کا یا جبرئیل کا یا میکائیل کا تو اللہ بھی یقیناً ایسے کافروں کا مخالف ہے۔

تفسير: یہودی کہا کرتے تھے کہ جبرئیل فرشتہ محمد ﷺ کے پاس وحی لایا کرتا ہے۔ وہ تو ہمارا دشمن ہے، ہمارے آباؤاجداد کو اس سے بہت تکلیفیں پہنچی ہیں، اگر جبرئیل کے بجائے اور کوئی فرشتہ وحی لائے تو ہم محمد ﷺ پر ایمان لائیں گے۔

اس خام خیالی پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ استنباط کیا کہ اہل اللہ (اللہ والوں) سے عداوت رکھنا خود اللہ تعالیٰ سے عداوت کا سبب بن جاتا ہے۔

(فرشتے، جبرئیل، میکائیل اور انبیاء ورسل خاصان خدا ہیں، ان سے عداوت رکھنا اللہ سے عدوات کا سبب بن گیا۔)

22 ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا﴾ [سورة البقرة: 104]

ترجمة: اے ایمان والو! تم (نبی سے خطاب میں) رَاعِنا نہ کہو (بلکہ) اُنْظُرْنا کہہ دیا کرو اور سنتے رہو۔

تفسير: بعض دفعہ یہودی آپ ﷺ کی مجلسِ مبارکہ میں آبیٹھتے اور آپ کی باتیں سنا کرتے تھے۔ کبھی کوئی بات اچھی طرح سُن نہ پاتے تو اس کو مُکرر سننا چاہتے تو کہا کرتے: رَاعِناَ (یعنی ہماری جانب توجّہ فرمائیے) اور ہماری رعایت کیجئے۔ یہ کلمہ سن کر کبھی صحابہ بھی ایسا ہی کلمہ کہہ دیا کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسے کلمہ کے کہنے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا: اگر ایسا کلمہ کہنے کی ضرورت ہو تو

اُنْظُرْنَا کہہ دیا کرو اس لفظ کے بھی وہی معنی ہیں جو رَاعِنَا کے ہیں۔ لیکن یہودی لفظ رَاعِنَا کو بدنیتی اور فریب سے کچھ زبان دبا کر رَاعِیْنَا کہتے تھے جس کے معنی (اے ہمارے چرواہے) توہین آمیز کلمہ بن جاتا تھا۔

علاوہ ازیں یہودیوں کی زبان میں رَاعِنَا کے معنی بیوقوف اور احمق کے بھی ہیں۔

اس طرح یہ بے ادب اپنے زعم میں رسول اللہ ﷺ کی توہین کرنا چاہتے تھے۔

سُلوك: فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جن الفاظ سے (غیر شرعی طور پر) اہانت یا بے ادبی کا پہلو نکلتا ہو ایسے الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ (ابن العربی)

بلکہ امام مالک رحمہ اللہ کے قول کے مطابق ایسے کلمات استعمال کرنے والے پر حد (شرعی سزا) جاری کی جائے گی۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اگر کسی معاملہ سے اپنے شیخ کے ادب و احترام میں خلل پڑنے کا امکان ہو تو ایسے معاملہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔

(23) ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ [سورة البقرة: 106]

ترجمة: ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو (کوئی) اس سے بہتر یا اس کے مثل لے آتے ہیں۔

تفسیر: قرآن حکیم میں نسخ کے معنی کسی بات کو دل و دماغ سے بھلا دینا ہے۔ (راغب) اور ایسا نسخ قرآن حکیم کی صرف چند ہی آیات میں جاری رہا ہے جو احکام سے متعلق تھے۔ مثلاً کوئی وقتی حکم تھا وہ اٹھالیا گیا پھر دوسرا حکم نازل کیا گیا یا کوئی خاص حکم تھا اس کو عام کر دیا گیا یا کوئی مطلق حکم تھا، اس کو مقید کر دیا گیا وغیرہ۔

بہرحال مذکورہ آیت میں اس بات کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ جو حکم بھی اٹھالیا جاتا ہے یا تبدیل کر دیا جاتا ہے اس سے بہتر اور مفید حکم آجاتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا: آیت سے یہ اشارہ سمجھا جاتا ہے کہ سالک کا کوئی نیک حال یا روحانی وارد بلا اختیار زائل ہو جائے یا مغلوب ہو جائے اللہ تعالیٰ اس سے بہتر یا اس کے مثل دوسرا حال عطا کر دیتے ہیں لہٰذا بندے کو چاہیے کہ زائل شدہ حال پر حسرت یا افسوس نہ کرنا چاہیے۔

(24) ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ﴾ [سورة البقرة: 113]

ترجمة: اور یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ (قوم عیسیٰ علیہ السلام) کسی بنیاد پر نہیں ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی (قوم موسیٰ علیہ السلام) کسی بنیاد پر نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ سب ایک ہی کتاب پڑھتے ہیں۔ (یعنی اللہ کی

کتاب) اسی طرح وہ لوگ بھی ایسا کہنے لگے جو کچھ بھی علم نہیں رکھتے (یعنی مشرکین عرب) سو اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن اس بات کا فیصلہ کردیں گے جس میں وہ جھگڑتے رہتے ہیں۔

تَفسِیر: یہ جھگڑا تو قدیم جاہلی مذاہب کا تھا جو آج بھی ان قوموں میں باقی ہے لیکن معلوم نہیں کس زمانے میں یہ بلا مسلمانوں میں بھی پھیل گئی ہے۔ ہر جماعت اپنے آپ کو حق پرست، صراط مستقیم پر دائم وقائم کہنے لگی ہے اور دوسرے کو ناحق، باطل و گمراہ۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں چشتیہ نقشبندیہ کی تنقیص کرتے ہیں اور نقشبندیہ چشتیہ کی۔ اسی طرح قادریہ، سہروردیہ کی اور سہروردیہ قادریہ کی، حالانکہ یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

25 ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ [سورة البقرة: 148]

ترجمة: اور ہر ایک کے لیے کوئی ایک رُخ ہوتا ہے جدھر وہ متوجہ رہتا ہے سو تم نیکیوں کی طرف بڑھو۔

تَفسِیر: یعنی ہر قوم اور ہر امت نماز وعبادت کے لیے ایک مرکزی رُخ مقرر کرتی ہے لہٰذا امت اسلامیہ کے لیے بھی ایک متعین قبلہ ضروری ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسجد الحرام (بیت اللہ شریف) ساری دنیا کا قبلہ ہے اور خانہ کعبہ اس مسجد کا قبلہ ہے۔

نماز میں جو استقبال قبلہ فرض ہے وہ نماز پڑھنے والے کے صدر (سینے) کا ہے، چہرے کا استقبال سنت ہے۔

مصلی نماز سے اس وقت خارج سمجھا جائے گا جب قبلہ سے سینہ پھر جائے، منہ پھرنے سے نہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ بعض عارفین نے مذکورہ آیت کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ.) ''ہر ایک کے لیے وہی عمل آسان ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔'' سے مؤید کر کے اس کی شرح میں کہا ہے کہ تکوینی وتشریعی (دنیاوی واخروی) دونوں حیثیتوں سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے حالات مختلف رکھے ہیں اور متعدد طبقے ان میں پیدا کردیئے ہیں۔ کوئی کاشتکاری میں لگا ہوا ہے، کوئی تجارت میں، کوئی صنعت وحرفت میں، اسی طرح تشریعی حیثیت سے بھی کوئی احادیث نبوی میں مشغول ہے، کوئی حفظِ قرآن کررہا ہے، کوئی مسائل فقہ کا استنباط کررہا ہے، کوئی قرآن کی تفسیر وترجمانی میں لگا ہوا ہے۔ یہ سب اللہ کی طرف مختلف طریقے اور راستے ہیں، اللہ تعالیٰ ان طریقوں کو اپنے بندوں کے ذریعہ آباد رکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا جو شخص جس طریقے پر بھی اللہ کی رضا و خوشنودی کی نیت سے چلے گا اللہ اس کے لیے قبول اور وصول آسان کردے گا (اسے صوفیاء کرام اپنی اصطلاح میں ''واصل باللہ'' کہا کرتے ہیں)

㉖ ﴿وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْکُمْ وَ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ [سورة البقرة: 150]

ترجمة: اور تاکہ میں اپنا انعام تم پر پورا کروں اور تاکہ تم راہ پر قائم رہو۔

تفسیر: نماز میں استقبالِ قبلہ کی یہ غرض وغایت بیان کی گئی ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ اپنی نعمتیں پوری کرتے ہیں اور ہدایت نصیبی باقی رہتی ہے۔

نماز میں استقبال قبلہ بہر حال ضروری ہے خواہ سفر ہو یا حضر، دُور ہو یا نزدیک، مکاں ہو یا صحرا، قبلہ کی یہ مرکزیت ہر وقت دائم وقائم رہے گی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) پہلے ہی کی سی ہدایت پر قائم ہیں ان کو ہدایت نصیبی سے سرفراز کرنا اس بات کی علامت ہے کہ مدارجِ قُرب میں ترقی کی کوئی متعین حد نہیں ہے۔

㉗ ﴿فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ﴾ [سورة البقرة: 152]

ترجمة: سو تم مجھ کو یاد کرتے رہو، میں بھی تم کو یاد کرتا رہوں گا۔

تفسیر: ذکر اللہ کا مفہوم نہایت وسیع ہے۔ اس میں ذکرِ لسانی، ذکرِ قلبی بھی شامل ہیں یعنی زبان وقلب سے ذکر کرنا بھی ذکر اللہ میں شامل ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بندے کے ذکر الٰہی کا یہی ثمرہ اور انعام ہے کہ ابھی اس نے اللہ کا نام لیا ادھر سے سرفرازی شروع ہوگئی۔

(اس لیے صوفیاء کرام کے ہاں ذکر اللہ کی کثرت سے تلقین کی جاتی ہے۔)

㉘ ﴿وَ لَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ﴾ [سورة البقرة: 155]

ترجمة: اور ہم تمہاری آزمائش کر کے رہیں گے کچھ خوف اور بھوک اور مال اور جان اور پھلوں کے کچھ نقصان سے اور آپ خوشخبری دیجئے صبر کرنے والوں کو۔

تفسیر: صبر کے یہ معنی نہیں کہ بندہ بالکل بے حس ہوجائے اور غم کو محسوس نہ کرے، اس کا نام صبر نہیں بلکہ اس کو بے حسی کہا جاتا ہے۔ صبر کے معنی یہ ہیں کہ انتہائی غم ناک اور درد انگیز واقعات پر بھی عقل کو نفس پر غالب رکھے اور دل وزبان کو شکوہ وناشکری سے آلودہ نہ کرے، نظر مسبب الاسباب پر ہو۔

اکبر الٰہ آبادی کہتے ہیں:

غم میں بھی قانون فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں
یہ سمجھتا ہوں کہ میرا دوست ہے دشمن نہیں

سُلوك: حکیم الامت ﷫ آیت سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ بندے کو کبھی اضطراری مجاہدہ پیش آ سکتا ہے جس میں اس کے عمل و نیت کو دخل نہیں ہوتا لیکن ایسے مجاہدۂ اضطراریہ سے بھی اس کو نفع ہوا کرتا ہے۔

(لہٰذا سالک کو ایسے موقع پر صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے)

⑳ ﴿الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ [سورة البقرة: 156]

ترجمة: جب ان صبر کرنے والے بندوں پر مصیبت آ پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب اللہ ہی کے ہاں جانے والے ہیں۔

تَفسِیر: اس کلمہ کو کلمۂ استرجاع کہا جاتا ہے (رجوع الی اللہ کے کلمات)

آیت میں نیک بندوں کی علامت بیان کی گئی ہے کہ وہ ہر آفت و مصیبت میں یہی کلمہ دہرایا کرتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ فرماتے ہیں کہ کلمۂ استرجاع تمام مصیبتوں کا علاج ہے اور انہی مصیبتوں میں حالتِ قبض بھی داخل ہے جو سالکوں کو اکثر پیش آیا کرتی ہے۔

(قبض دراصل قلب کی اس مضمحل حالت کا نام ہے جس میں بندے کو خستگی، پستگی اور بے لطفی کی کیفیات محسوس ہوتی ہیں، عبادتی ذوق وشوق، لطف و مسرّت مغلوب ہوجاتے ہیں، سالک کو اپنی زندگی "بے بندگی" محسوس ہونے لگتی ہے لیکن یہ کیفیت عارضی ہوا کرتی ہے پھر سابقہ کیفیت لوٹ آجاتی ہے۔)

㉛ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى﴾ [سورة البقرة: 159]

ترجمة: بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جو ہم کھلی نشانیوں اور ہدایت میں سے نازل کر چکے ہیں بعد اس کے کہ ہم اسے لوگوں کے لیے کتاب الٰہی میں کھول چکے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور ان پر لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔

تَفسِیر: علم اور احکام کو چھپانے والے یہودی ہیں جو کتاب تورات میں رسول ﷺ کی تصدیق اور آپ کی اور آپ کے اصحاب کی علامات وغیرہ درج تھیں۔

لعنت کے معنی اللہ کی رحمت سے دوری کے ہیں اور یہ لعنت کرنے والے انسان و جنات اور فرشتے حتی کہ سب حیوانات ہیں کیونکہ حق پوشی اور حق کشی کی وجہ سے دنیا میں قحط و وبا اور طرح طرح کی بلائیں زمین پر پھیلتی ہیں تو اس سے کل مخلوقات کو تکلیف پہنچتی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ مذکورہ آیت سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ آیت میں ایسے شخص کی مذمت ہے جو اپنے مریدوں کے سوا دوسروں سے علوم شریعت کو چھپاتا ہے۔

البتہ علوم مکاشفہ کا دوسرا حکم ہے۔ (اس کے لیے اہلیت شرط ہے)

(31) ﴿لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ [سورة البقرة: 164]

ترجمة: (ان سب امور میں) ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔

تفسیر: یعنی رات دن کا آنا جانا، سمندروں میں کشتیوں اور جہازوں کا چلنا پھرنا، بادلوں سے پانی برسنا، زمین پر حیوانات کا منتشر رہنا، ہواؤں اور بادلوں کا ہجوم کرنا، نظام فلکی کے بے شمار اجزا وعناصر کی باہمی ترکیب وترتیب وغیرہ یہ سب اللہ عظیم وقدیر کے علاوہ اور کس کی مشیت اور قدرت کے ماتحت ہیں؟

اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں سوالات پر انسان جس قدر بھی غور وفکر کرے گا، توحید اور توحیدی حکمتوں کا نقش دل پر اور زیادہ ہوتا جائے گا۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے مراقبہ کی اصل اس آیت سے ثابت کی ہے۔

(اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا تصور اس غرض سے کرنا کہ اس کا دائمی استحضار ہو جائے، اصطلاح صوفیاء میں اس کو مراقبہ کہا جاتا ہے، مراقبہ کا تعلق قلب کے عمل سے وابستہ ہے، صوفیاء کرام میں یہ عمل بکثرت رائج ہے۔)

(32) ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ﴾ [سورة البقرة: 165]

ترجمة: اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے سوا دوسروں کو بھی شریک بنائے ہوئے ہیں، ان سے ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اللہ سے رکھنی چاہیے۔

تفسیر: آیت کا مصداق یہود اور نصاریٰ اور مشرکین عرب ہیں۔ چنانچہ آج بھی عیسائیوں کو محبت وتعلق خاطر اللہ سے کہیں زیادہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس اور مقدس کنواری مریم (علیہا السلام) سے پائی جاتی ہے اور یہودیوں کو سیدنا عزیر علیہ السلام سے اور ہندوستان کے ہندوؤں کو اپنے ایشور و پرماتما سے کہیں زیادہ محبت وتعلق درگا مائی، لکشمی مائی، اگنی دیوتا، رشیوں، منیوں، سادھوؤں سے ہے اور ایسا ہی کچھ معاملہ مسلمانوں کے جاہل سلسلوں میں بھی چل پڑا ہے۔

سلوك: امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صوفیاء عارفین کے ہاں اللہ کے سوا کسی بھی شئے کی محبت جو قلب کو مشغول کر دے، شرک کی تعریف میں آجاتی ہے۔ (تفسیر کبیر)

(33) ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ [سورة البقرة: 172]

ترجمة: اے ایمان والو! پاک چیزوں میں جو ہم نے تمہیں دی ہیں کھاؤ پیو اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہو اگر تم خاص اس کی بندگی کرنے والے ہو۔

تفسیر: آیت میں پاک اور حلال غذاؤں کے کھانے کا حکم دیا جارہا ہے۔حرام اور ناپاک چیزوں سے پرہیز کرنے کی تاکید مفہوم ہوتی ہے۔(ترجمان القرآن) سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: سیّدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ دعا فرمادیں کہ اللہ مجھ کو مستجاب الدعوات (ایسا شخص جس کی دعائیں قبول ہوتی ہوں) بنادے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لقمہ حلال کا اہتمام رکھو، خود بخود مستجاب الدّعوات ہو جاؤ گے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ پاکیزہ لذائذ کا تناول کرنا نہ تقویٰ کے خلاف ہے نہ زُہد وقناعت کے بلکہ یہ عمل کبھی اللہ تعالیٰ کی محبت وشکر گزاری تک پہنچادیتا ہے۔

﴿وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [سورة البقرة: 179]

ترجمة: اور تمہارے لئے (قانون) قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

تفسیر: قتل کے بدلے کو قصاص کہا جاتا ہے (یعنی قاتل کو مقتول کے بدلے میں قتل کردیا جاتا ہے۔)

یہ بدلہ قاتل کے علاوہ اور لوگوں کے لیے بھی حیات کا سبب بن جاتا ہے اس طرح عام زندگی محفوظ ہو جاتی ہے۔قصاص کا منظر قاتلوں خاص طور پر مجرموں کو عبرت اور غور وفکر کا سامان فراہم کرتا ہے۔جن ممالک میں (خاص طور پر سعودی عرب میں) قصاص اور تعزیرات کا جو سلسلہ قائم ہے پورے ملک میں جرائم خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے ''فنا وبقا'' کا جو صوفیاء کی معروف اصطلاح ہے، اثبات کیا ہے کہ فنا میں بقا ہے۔

(فنا کی حقیقت یہ ہے کہ نفس کی صفات ذمیمہ اور خصائص رذیلہ مغلوب ہو جائیں ایسے طور پر کہ ارادۃً گناہ نہ ہوں اور قلب غیر اللہ کی محبت سے خالی ہو جائے۔اور بقا کی حقیقت اس کے برعکس ہے کہ نفس میں اخلاقِ حمیدہ، صبر، شکر، زہد وقناعت، خشوع وخضوع، رضا وتسلیم، توکل، تقویٰ وطہارت، خشیت وانابت، محبت وشوق الٰہی پیدا ہو جائیں۔فنا وبقا کا یہ مطلب نکلا کہ انسان اپنے اخلاق رذیلہ سے پاک ہو کر اخلاق حسنہ سے آراستہ ہو جائے)

اسی کو شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

گفت قدوسی فقیری در فنا و در بقا

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ [سورة البقرة: 189]

ترجمة: (اے نبی ﷺ!) آپ سے لوگ چاند کی (مختلف کیفیات) کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔آپ کہہ دیجئے کہ چاند لوگوں کے لیے اور حج کے لیے شناخت اوقات کا آلہ ہے۔

تفسِیر: سورج ہمیشہ ایک صورت پر قائم رہتا ہے البتہ چاند کی شکل وصورت بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔ اس لئے لوگوں نے چاند کی اس کیفیت کے بارے میں آپ سے سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟

آیت سے اس کا جواب دیا گیا کہ اس سوال سے کیا حاصل ہے۔ البتہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ اپنے معاملات، عبادات، ادائے قرض، مدت حمل، مدت رضاعت، عدّت، روزہ، زکوٰۃ، حج کے اوقات معلوم کر لیتے ہیں، بس یہی حقیقت چاند کے گھٹنے بڑھنے کی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے جواب سے یہ اخذ کیا کہ مشائخ کو فضول اور بے جا سوالات کا جواب نہ دینا چاہیے بلکہ اس کا کوئی مفید جواب دینا چاہیے جیسا کہ آیت میں جواب دیا گیا ہے۔

36 ﴿وَ لَیۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ ظُهُوۡرِهَا﴾ [سورة البقرة: 189]

ترجمة: یہ تو کوئی نیکی نہیں کہ تم اپنے گھروں میں اس کی پُشت کی طرف سے آؤ۔

تفسِیر: زمانۂ جاہلیت کا دستور تھا کہ جب آدمی گھر سے احرام باندھ کر باہر نکل گیا پھر کسی ضرورت سے گھر میں داخل ہونے کی ضرورت پیش آئے تو اب عام دروازے سے داخل نہ ہوتا تھا بلکہ چھت پر چڑھ کر یا گھر کی پُشت میں نقب لگا کر داخل ہوا کرتا، اور یہ عمل بہت بڑی نیکی وعبادت خیال کیا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو فضول اور غلط قرار دیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا کہ اہل باطل کے کسی بھی رسوم وعادات کی نقل کرنی درست نہیں ہے۔

37 ﴿لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّکُمۡ﴾ [سورة البقرة: 198]

ترجمة: تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ روزی کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے مقرر ہے۔

تفسِیر: زمانۂ قدیم میں حج کے موقع پر لوگ تجارت بھی کر لیا کرتے تھے۔ مسلمانوں کو اس پر شبہ ہوا کہ یہ بات حج کی عبادت کے ساتھ درست نہیں ہے، آیت نے اس شُبہ کی تردید کر دی۔

یعنی جس کا مقصود اصلی حج ہو اور اس کے ضمن میں تجارت بھی کرلے تو حج کے ثواب میں کمی نہ ہوگی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ استنباط کیا کہ دنیا سے دین پر استعانت لینا بھی طاعت ہے۔ (اس لیے کہ جو دنیا حصولِ دین کا ذریعہ بنے، وہ بھی دین بن جاتی ہے۔) دنیا دراصل ہر اس معاملہ کو کہا جاتا ہے جو دین وآخرت سے غافل کردے اور ایسی ہی دنیا کی مذمّت بیان کی گئی ہے۔ ویسے اپنی ذات میں دنیا بُری نہیں ہے۔

صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ ((کُلُّ مَا اَلۡهَاكَ فَهُوَ دُنۡیَا)) "جو عمل آخرت سے غافل کردے وہ دنیا ہے۔"

38 ﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ﴾ [سورة البقرة: 219]

ترجمة: اورلوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے کہ جتنا آسان ہو۔

تفسير: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عفو سے مُراد اتنا خرچ جو خود پر بار نہ ہو۔ (بیان القرآن)

شاہ رفیع الدین صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ''جو حاجت سے زیادہ ہو''

شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جو بچے اپنے خرچ سے''

امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: «اَلْفَاضِلُ عَنِ الْحَاجَةِ.» حاجت ضروری سے زیادہ۔ (جلالین)

حضرت سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: «مَا فَضَلَ مِنَ الْقُوْتِ وَاكْلِ الِعيَال.» ''جو اپنی اور بچوں کی ضرورت سے زیادہ ہو''

بہر حال صحابہ کے سوال پر کہ کتنا خرچ کریں؟ قرآن حکیم نے مقدارِ عَفْو اس کا جواب دیا ہے۔

عفو سے مراد خواہ آسان خرچ یا حاجت سے زیادہ خرچ یا جو بھی مراد لی جائے وہ آیت کا منشاء و مراد ہوگی۔

صحابہ کرام میں چند حضرات ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے کل کا خرچ آج رکھنا یا شام کا اندوختہ صبح کو رکھنا پسند نہیں کیا ہے «يَوْمٌ جَدِيْدٌ رِزْقٌ جَدِيْدٌ.» کے اصول پر قائم تھے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس آیت میں اصل ہے زخیرہ نہ رکھنے کی جیسا کہ بعض بزرگوں کی عادت رہی ہے۔

39 ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ [سورة البقرة: 229]

ترجمة: طلاق تو دو (2) ہی بار کی ہے۔

تفسير: میاں بیوی میں موافقت نہ ہونے کی وجہ سے اگر طلاق دینی ضروری ہو جائے تو شوہر کو چاہیے کہ صرف ایک (1) یا دو (2) طلاق دے کر قصہ ختم کردے۔ تین طلاق سے پرہیز کرنی چاہیے کیوں کہ اس کے بعد طلاق کو واپس لینے کا اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ (تفصیل کتب فقہ میں دیکھ لی جائے)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ آیت سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ کسی بھی معاملہ میں فوری ترک تعلقات کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔

40 ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ﴾ [سورة البقرة: 232]

ترجمة: اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدّت گزرنے پر پہنچ جائیں تو تم انہیں اس بات سے نہ

روکو کہ وہ اپنے (پہلے) شوہروں سے پھر نکاح کرلیں۔

تَفسِیر: عورتوں کو طلاق مل جانے کے بعد عورت کے ولی الامر کو یہ اختیار نہیں کہ وہ عورت کو اس بات کا پابند کرے کہ وہ اپنے پہلے شوہر سے پھر نکاح نہ کرے۔

عورت کو طلاق کی عدّت گزارنے کے بعد کامل اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اپنے سابقہ شوہر سے پھر نکاح کرلے یا کسی اور مرد سے اپنا رشتہ طے کرلے، ہر دو صورت عورت کے لیے جائز ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ ہدایت میں یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امرِ مباح (جائز کام) کے منع کرنے میں تشدّد نہ کرنا چاہیے (جیسا کہ بعض خشک و متشدد مفتی صاحبان کیا کرتے ہیں۔)

41 ﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ [سورة البقرة: 245]

ترجمة: اور اللہ (روزی کے بارے میں) کمی کرتے ہیں اور فراخی کرتے ہیں اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

تَفسِیر: یعنی کسی کی روزی گھٹا دیتے ہیں اور کسی کی بڑھا دیتے ہیں، رزق کا مسئلہ اپنے دست خاص میں رکھا ہے۔ کسی کی قوت و طاقت، جدّ و جہد اور قابلیت پر موقوف نہیں ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ قبض و بسط (جو صوفیاء کی خاص اصطلاح ہے) دونوں اللہ تعالیٰ کا عمل ہے جو وصول الی اللہ کا ذریعہ ہیں۔

(قبض و بسط کی تعریف سلوک 31 میں آچکی ہے)

42 ﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ [سورة البقرة: 248]

ترجمة: اِن سے اُن کے نبی نے فرمایا کہ (طالوت) کے بادشاہ ہونے کہ یہ علامت ہے کہ (اس کے عہد میں) تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تسکین کی چیزیں ہیں تمہارے ربّ کی طرف سے اور کچھ اثاثہ ہے جس کو موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کی اولاد چھوڑ گئے ہیں۔

تَفسِیر: بنی اسرائیل کے خاندان میں زمانہ قدیم سے ایک صندوق چلا آرہا تھا، اس میں کچھ تبرکات تھے سیّدنا موسیٰ و سیّدنا ہارون علیہما السلام کے (لباس، عصا اور آسمانی کتاب تورات کا اصلی نسخہ وغیرہ)۔

قوم بنی اسرائیل اس صندوق کو جہاں بھی رکھتے خیر و برکت اور کامیابی ہوا کرتی تھی حتیٰ کہ جنگی موقعوں پر بھی یہ صندوق ان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس کی برکت سے دشمنوں پر کامیابی حاصل ہوتی تھی۔

موجودہ یہودیوں کے علماء کی تحقیق کے مطابق اس صندق کی پیمائش حسب ذیل تھی۔

طول ۲/۱۲ فٹ، عرض ۲/۱۱ فٹ، مدّت ہوئی اس صندوق کو فلسطینی بنی اسرائیل سے چھین کر لے گئے تھے،

طالوت کی بادشاہت کے وقت ۱۰۱۲ تا ۱۰۲۸ قبل مسیح یہ صندوق من جانب اللہ بنی اسرائیل کو پھر مل گیا۔ سیّدنا سلیمان علیہ السلام المتوفی ۹۳۳ قبل مسیح تک یہ صندوق باقی رہا۔

یہودیوں کا عام خیال ہے کہ یہ صندوق سیّدنا سلیمان علیہ السلام نے ہیکل سلیمانی (مسجد) کی بنیادوں میں رکھ دیا تھا اور آج تک اسی میں مدفون ہے۔ واللہ اعلم

تفصیل کے لیے ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۱ صفحہ ۲۰۹ دیکھیے۔

43 ﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ [سورة البقرة: 256]

ترجمة: سو جو کوئی طاغوت (شیطان) سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کو کسی قسم کی شکستگی نہیں ہے۔

تفسیر: طاغوت کا لفظی ترجمہ اردو میں ممکن نہیں۔ اس کا قریب ترین لفظ ''شیطان'' کیا جا سکتا ہے۔ عربی زبان میں ہر باطل معبود اور سرکش مخلوق کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس میں شیطان ابلیس اور سرکش جن و انس بھی شامل ہیں۔ مطلب یہ کہ ہر باطل سے منہ موڑ کر جو اللہ پر ایمان لایا اس نے مضبوط حلقہ یا رسّی کو تھام لیا۔ عروۃ الوثقیٰ کے معنی مضبوط رسی یا حلقہ ہیں جو ٹوٹ نہ سکے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بعض اہل تحقیق صوفیاء نے عروۃ الوثقیٰ سے ''نسبت مع اللہ'' مراد لی ہے جو حاصل ہو جانے کے بعد زائل نہیں ہوتی۔

(نسبت کہتے ہیں دائمی ذکر اللہ اور معصیت سے کامل پرہیز کرنے کی پختہ عادت و کیفیت کو)

44 ﴿اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ﴾ [سورة البقرة: 258]

ترجمة: جب کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس (نمرود) سے کہا: میرا ربّ تو وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے۔

تفسیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بادشاہ نمرود کو دوبدو یہ جواب دیا تھا جو اپنے آپ کو ربّ کہا کرتا تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت سے مناظرہ، مباحثہ کرنا ثابت ہوتا ہے جب کہ دینی ضرورت داعی ہو۔ علاوہ ازیں یہ عمل تجرید (گوشہ نشینی) کے خلاف بھی نہیں ہے (جیسا کہ بعض جاہل صوفیوں نے سمجھا ہے)، دین میں مداہنت کسی کے لیے بھی درست نہیں ہے۔ (یعنی اظہار حق سے چشم پوشی کر لینا)

45 ﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ﴾ [سورة البقرة: 260]

ترجمة: اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے پروردگار! مجھے دکھا دیجئے کہ

آپ مُردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ ارشاد ہوا: کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟ عرض کیا: ضرور ہے لیکن (درخواست) اس لیے ہے کہ قلب کو (مزید) اطمینان ہو جائے۔

تفسیر: سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ واقعہ مذکورہ آیات میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

(ہدایت کے چراغ جلد ۱ رصفحہ ۱۹۸ پر اس کی پوری تفصیل موجود ہے)

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام اپنی ظاہری آنکھوں سے حیات بعد الممات کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے جیسا کہ سیّدنا عزیر علیہ السلام نے بھی ایسی درخواست پیش کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس زمین پر سو (۱۰۰) سال موت کی آغوش میں رکھ کر زندہ کیا۔ [سورة البقرة: 259]

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ کامل سکون کا نہ ہونا ایمان و عرفان کے مخالف نہیں ہے۔

(مطلب یہ کہ ایمان کامل اور یقین صادق کے باوجود انسان چین وسکون کا طالب رہا کرتا ہے، انسانی طبیعت کبھی بھی سیر نہیں ہوا کرتی خاص طور پر صفاتِ الٰہی کی معرفت اور عرفان کے لیے انبیاء کرام ہر وقت طالب رہے ہیں، سکون واطمینان کے سینکڑوں درجے میں سیّدنا ابراہیم علیہ السلام انہی درجاتِ عالیہ کے متلاشی رہے ہیں)

ملحوظہ: ایمان کی ترقی سے قلب میں اطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ترقی کبھی تو مشاہدہ اور معائنہ سے ہوتی ہے (جیسا کہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی تمنّا تھی) اور کبھی محض وجدان و ذوق وشوق سے پیدا ہو جاتی ہے۔

46 ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [سورة البقرة: 272]

ترجمة: ان کافروں کی ہدایت یابی آپ کے ذمّے نہیں ہے بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

تفسیر: تعلیم وتبلیغ تو رسولوں کا منصب ہوا کرتا ہے البتہ ہدایت نصیبی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا کہ کسی کی تعلیم وتبلیغ کے زیادہ درپے نہ ہونا چاہیے۔ تدبیر میں بھی بہت زیادہ انہماک نہ رکھا جائے۔

(مطلب یہ کہ دعوت وتبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے، غم وفکر میں گھلنا نہ چاہیے۔)

47 ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ﴾

[سورة البقرة: 272]

ترجمة: اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدے کی غرض سے کرتے ہو اور تم اور کسی غرض سے خرچ نہیں کرتے سوائے اللہ کی رضا جوئی کے لیے۔

تفسیر: آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کی غرض وغایت بیان کی گئی ہے کہ خرچ کا نفع خود خرچ کرنے والے کو ملتا

ہے، اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے جس کا انجام جنّت اور اس کے روح و ریحان ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ استنباط کیا کہ کسی بھی نیک عمل سے ثواب کی نیت کرنا اخلاصِ عمل کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ بعض بے علم صوفیاء نے سمجھا ہے۔

48 ﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ﴾

[سورۃ البقرۃ: 273]

ترجمۃ: (صدقات کا) اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو اللہ کی راہ میں مقیّد ہو گئے ہیں، وہ لوگ ملک میں کہیں چلنے پھرنے کا امکان نہیں رکھتے ناواقف ان کو تونگر خیال کرتا ہے۔

تفسیر: یعنی ایسے لوگوں کا دینا دلانا بڑا ثواب کا کام ہے جو اللہ کی راہ میں اس کے دین کی نشر و اشاعت میں مشغول ہو کر چلنے پھرنے، کھانے کمانے سے معذور ہو گئے ہیں، وہ کسی پر اپنی ضرورت اور احتیاج ظاہر نہیں کرتے ہیں جیسے اصحابُ الصفّہ نے اپنا گھر بار چھوڑ کر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کر لی تھی، علم اور دین حاصل کرنے میں مشغول تھے انہیں اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ روزی کمانے کے لیے محنت مزدوری کر لیں۔ آیت میں ایسے لوگوں پر خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ جو لوگ دینی خدمات میں مشغول ہو گئے ہیں انہیں طلب روزگار کی فرصت نہیں ملتی انہیں اسبابِ معیشت کا ترک کرنا ہی افضل ہے اگرچہ اختیار کرنے میں منافات نہیں۔

49 ﴿یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ [سورۃ البقرۃ: 273]

ترجمۃ: ناواقف (ان حاجت مندوں کو) غنی خیال کرتا ہے ان کے سوال نہ کرنے پر۔ (اے مخاطب!) تو ان کو ان کے چہرے بشرے ہی سے پہچان لے گا (کہ یہ حاجت مند ہیں) وہ لوگ کسی سے لگ لپٹ کر نہیں مانگتے۔ اور تم مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو، اللہ اس کو خوب جاننے والا ہے۔

تفسیر: آیت میں ان غریب نادار صحابہ کا تذکرہ ہے جو غیرت و خودداری کی وجہ سے اپنی حاجات کا ذکر کسی سے بھی نہیں کرتے اور اپنے تقاضوں کو دبائے رکھتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا کہ سالکین کو اپنی کوئی خاص ہیئت نہ بنانی چاہیے جو عام لوگوں میں امتیاز پیدا کر دے۔

(جیسا کہ موجودہ دور میں بعض سلسلے والوں نے سیاہ، سبز، لال پیلے لباس سے اپنا تشخّص پیدا کر لیا ہے۔)

50 ﴿اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ

الْمَسِّ﴾ [سورة البقرة: 275]

ترجمة: جو لوگ سود کھارہے ہیں وہ (قیامت کے دن) کھڑے نہ ہوسکیں گے سوائے اس کے کہ جیسے کھڑا ہوتا ہو وہ شخص جس کو شیطان نے چھوکر خبطی بنادیا ہو۔

تفسیر: سود خوروں کا یہ منظر ہے قیامت کے دن جب وہ اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو سیدھے کھڑے ہونے کی طاقت کھودیں گے، کھڑے ہونا بھی چاہیں گے تو متوالوں، خبطیوں، دیوانوں کی طرح گرتے پڑتے لڑکھڑاتے ہوئے رہیں گے، دنیا کی حرام خوری کا یہ ابتدائی اثر ہوگا، انجام اس سے کہیں شدید تر ہے۔

ان کا یہ قیامتی نقشہ کچھ دنیا کی زندگی میں بھی نظر آتا ہے کہ مہاجن، ساہوکار جو روپے پیسے کے پیچھے دیوانہ باؤلا رہتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو جن یا بھوت نے پکڑ لیا ہے۔ اٹھتے بیٹھے، چلتے پھرتے، جاگتے سوتے ہر وقت اس پر سود بیاج کا بھوت سوار رہا کرتا ہے، چوبیس گھنٹے بیس اکیس کے چکر میں۔

سُلوك: اہل کشف محققین کا بیان ہے کہ قیامت کے دن حشر میں انسان اسی صورت کے ساتھ اٹھے گا جس قسم کی سیرت اور خصلت دنیا میں اس پر غالب تھی۔

ایک حدیث میں اس کی تائید ملتی ہے: «اِنَّكُمْ تَمُوْتُوْنَ كَمَا تَحْيَوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ.» (حدیث) تمہاری موت اسی حالت پر آئے گی جیسی تم نے زندگی بسر کی ہے اور تمہارا حشر اسی حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئی تھی۔

﴿51﴾ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ﴾

[سورة البقرة: 282]

ترجمة: اے ایمان والو! جب ادھار کا معاملہ طے کرنے لگو ایک میعاد معین تک تو اس کو لکھ لیا کرو۔

تفسیر: معاملات، تجارت، لین دین میں جو بھی طے ہوجائے، اس کو لکھ لینا چاہیے، اس کو نظام معاشرت کہا جاتا ہے جو اصولی وغیر نزاعی زندگی کے لیے مفید ہوا کرتا ہے۔ فقیہ ابن العربی مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے ذیل میں باون (52) مسائل استنباط کیے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ آیت مسائل بیع وشراء میں اہم ترین آیت ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ معاشرت وتمدن کی اصلاح کے لیے کام کرنا طریقِ تصوّف کے خلاف نہیں ہے۔ (جیسا کہ بعض غالی قسم کے صوفی اس کو دنیاداری، دنیا سازی کہہ دیا کرتے ہیں)

﴿52﴾ ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۖ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [سورة البقرة: 282]

ترجمة: اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور اللہ تمہیں (حکمت کی) باتیں سکھاتا ہے۔

تَفسِیر: تقویٰ اللہ کا اردو ترجمہ ''اللہ سے ڈرنا''، ''خوف کرنا'' کیا جاتا ہے لیکن اس خوف سے مراد وہ خوف نہیں جو انسان کو کسی موذی درندے یا ظالم ڈاکو یا وحشی قاتل کو دیکھ کر پیدا ہوا کرتا ہے، یہ طبعی خوف ہے جو ایسے وقت ہر انسان اپنے آپ میں محسوس کرتا ہے۔

عربی میں تقویٰ کے یہ معنی مراد نہیں ہوتے۔

اس کے علاوہ ایک ڈر اور خوف وہ بھی ہے جو بیٹے کو باپ سے، بیوی کو شوہر سے، شاگرد کو استاد سے، رعایا کو اپنے عادل بادشاہ سے یا چھوٹوں کو اپنے بزرگوں سے ہوا کرتا ہے۔

یہ خوف وڈر قلب کا وہ گہرا احساس اور پاس ولحاظ ہوا کرتا ہے جو آدمی کو ادب واحترام، اطاعت شعاری و فرمانبرداری کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔ اس احساس کے بعد انسان بغاوت یا مخالفت کے لیے قطعاً آمادہ نہیں ہوتا۔

قرآن حکیم میں جہاں بھی تقویٰ اللہ کا ذکر آیا ہے اس سے یہی پاس ولحاظ، فکر واحساس مراد ہے۔

الغرض آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی تعلیم فرمائی ہے اور علم وحکمت کا احسان جتلایا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بعض اہل علم حضرات نے آیت کے ایک جز ﴿يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ﴾ کو سابق نقرہ ﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ سے مربوط پا کر یہ استنباط کیا ہے کہ علمِ حقیقی نتیجہ ہوا کرتا ہے تقویٰ الٰہی کا، تقویٰ اختیار کرو، از خود علم الٰہی مرحمت ہونے لگے گا۔

53 ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ [سورة البقرة: 207]

ترجمة: اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ اللہ کی خوشنودی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتے ہیں۔

تَفسِیر: اس سے پہلے کی آیت میں اس مُنافق کا ذکر ہے جو دین کے بدلے دنیا لیتا تھا۔

مذکورہ آیت میں اس مخلص کامل الایمان کا ذکر ہے جو دنیا بلکہ اپنی جان تک کو دین کے لیے صرف کر دیتا ہے اور یہ صرف اللہ کی رضا وخوشنودی کے لیے۔

روایات میں حضرت صُہیب رومی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ملتا ہے جب یہ مکۃ المکرمۃ سے ہجرت کی نیت سے مدینہ مُنوّرہ جانے لگے تو درمیان راہ مشرکوں نے انہیں روک لیا، صُہیب رومی رضی اللہ عنہ اپنی سواری سے اُتر پڑے اور اپنی تیر کمان سنبھال لی اور اس طرح خطاب کیا:

اے قریش کی جماعت! تم کو معلوم ہے کہ میں تیر اندازی میں کیسا کچھ ماہر ہوں؟ اللہ کی قسم جب تک میرے ترکش میں تیر باقی رہے گا، تم میں سے ایک شخص بھی میرے قریب نہ آسکے گا۔ اس کے بعد اپنی تلوار ہاتھ میں لے لوں گا اور اس کے ٹوٹنے تک تمہارا مقابلہ جاری رکھوں گا اس کے بعد پھر تم کو جو کچھ کرنا ہو کر لینا۔

اور اگر تم میرا گھر اور تمام مال ومتاع لے کر مجھے مدینہ منورہ جانے کی اجازت دے دو اور ہجرت سے نہ روکو تو

میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ مشرکوں نے اس پیش کش کو قبول کرلیا۔

صُہیب رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ یہ ابھی مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم شریف میں داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو بشارت دی کہ صہیب رضی اللہ عنہ اپنی جان و مال کو راہ خدا میں فروخت کر کے آرہا ہے، اس نے اپنی تجارت میں خوب نفع پایا، اس نے اپنی تجارت میں خوب نفع پایا۔ (بیان القرآن)

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ آیت سے یہ اخذ کیا کہ آیت میں فناءِ نفس پر دلالت ہے کیونکہ اس کا حاصل دواعی نفس کا ترک کرنا ہے۔

علم تصوّف میں فناءِ نفس کی اصطلاح معروف ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خواہشات نفسانی کا امالہ کردیا جائے۔ نفس کی خواہشات دو قسم کی ہوا کرتی ہیں:

1. حرام و ناجائز خواہشات
2. جائز اور حلال خواہشات۔

ناجائز خواہشات کا رخ جائز خواہشات کی طرف موڑ دیا جائے ایسے طور پر کہ اب کوئی خواہش حرام و ناجائز پیدا ہی نہ ہو، نفس کی ایسی حالت کو فناءِ نفس کہا جاتا ہے۔

سُورَةُ آلِ عِمْرَانَ

پَارَہ: ③

⑬ ﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ﴾ [سورة آل عمران: 13]

ترجمة: ابھی گزر چکا ہے تمہارے سامنے ایک نمونہ ② دو فوجوں کا جن میں مقابلہ ہوا۔ ایک فوج ہے کہ لڑتی ہے اللہ کی راہ میں اور دوسری فوج کافروں کی ہے۔ دیکھتے ہیں یہ ان کو اپنے سے دو چند صریح آنکھوں سے اور اللہ زور دیتا ہے اپنی مدد کا جس کو چاہے۔ اسی میں عبرت ہے دیکھنے والوں کو۔

تفسیر: آیت میں جنگ بدر کا تذکرہ ہے جو اسلام اور کفر کا پہلا میدانی مقابلہ تھا۔ اس جنگ میں مشرکین مکہ تقریباً ایک ہزار تھے جن کے پاس سات سو (۷۰۰) اونٹ، ایک سو (۱۰۰) گھوڑے تھے۔

دوسری جانب مسلمانوں کی تعداد صرف تین سو تیرہ (۳۱۳) تھی جن کے پاس ستر ⑦⓪ اونٹ، دو ② گھوڑے، چھ ⑥ زرہ، آٹھ ⑧ تلواریں تھیں۔ معرکہ کے ایک موقع پر کافروں کو مسلمان اپنے سے دو چند تعداد نظر آنے لگے جس کا یہ اثر پیدا ہوا کہ کفار کے دل مسلمانوں کی کثرتِ تعداد سے لرزاں و مرعوب ہونے لگے اور دلوں میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا۔ اس موقع پر مسلمان بھی اپنی اصلی تعداد کو دو چند دیکھ کر فتح و نصرت کی امید میں دلیری اور کامل استقلال قدمی سے اپنے دلوں میں جرأت و قوت محسوس کر رہے تھے۔ پھر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان دشمن پر بے تحاشہ ٹوٹ پڑے۔ کافروں کی جماعت نے شکست کھائی اور منہ پھیر لیا۔

آیت کی یہ تشریح مفسرین کے اس قول کے مطابق کی گئی جس میں ﴿يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ﴾ کی ضمائر کا مصداق مختلف قرار دیا ہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے اس واقعہ سے "خوارقِ عادت" کا اثبات کیا ہے۔

خارقِ عادت صوفیاء کی ایک اہم اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ کوئی بات یا عمل ایسا سرزد ہو جائے جو عام قانونِ فطرت کے خلاف ہو مثلاً پتھر، مٹی یا جانور جو کلام کرنے کی طاقت نہیں رکھتے یہ کبھی بول پڑیں یا آگ میں جلانے اور فنا کرنے کی طاقت ہے لیکن وہ کبھی گل و گلزار ہو جائے یا پانی حیات کا ذریعہ ہے لیکن یہ کبھی موت کا پیغام ثابت ہو جائے وغیرہ۔

ایسے واقعات کو "خارق عادت" کہا جاتا ہے جو عام طور پر پیش نہیں آتے ہیں غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو کافروں کی تعداد کم نظر آنا یا اپنی تعداد زیادہ نظر آنا یہی "خارق عادت" عمل تھا جو من جانب اللہ ہوا کرتا ہے۔ اب اگر یہی

خارق عادت کسی غیر مسلم یا بے دین واہی تباہی انسان سے سرزد ہو تو اس کو استدراج، سحر، مسمریزم، نظر بندی وغیرہ کہا جائے گا۔ اس میں اللہ کی تائید یا نصرت نہیں ہوتی اس کے اجراء میں پوشیدہ اسباب کارفرما ہوا کرتے ہیں۔

(تفصیل کے لئے "ہدایت کے چراغ جلد ۱ صفحہ ۱۵۳ دیکھئے)

﴿فَإِنْ حَآجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ [سورة آل عمران: 20]

ترجمة: پھر اگر یہ لوگ آپ ﷺ سے حجت کئے جائیں تو آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ میں تو اپنا رخ اللہ کی طرف کر چکا ہوں اور وہ لوگ بھی جو میری پیروی کرتے ہیں (یعنی صحابہ)۔

تفسیر: اصل خطاب اس میں شہر نجران کے عیسائیوں سے ہے جب کہ یہ بحث کرنے مدینہ منورہ آئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کے سوالات کا جواب دیا لیکن یہ لوگ بغض وعناد میں واپس چلے گئے۔

سلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ سے یہ مسئلہ مستنبط کیا کہ کسی بھی معاملہ میں جب حق واضح ہو جائے اور مخاطب اس کو قبول نہ کرے تو اب بحث ومباحثہ، قیل وقال ترک کر دینا چاہیے۔

﴿قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ إِلَى بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾

[سورة آل عمران: 26]

ترجمة: آپ کہیے! اے سارے ملکوں کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے دے اور جس سے چاہے حکومت چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے۔ تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے۔

تفسیر: شہر نجران (یمن) کے رئیس ابو حارثہ بن علقمہ اور اس کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے اسلام کے بارے میں بات چیت کرنے مدینہ منورہ آئے، اثنائے گفتگو اس رئیس نے کہا: اگر ہم آپ کی اطاعت قبول کر لیں اور ایمان لے آئیں تو روم کا بادشاہ جو ہماری عزت کرتا ہے اور مالی خدمت بھی، یہ سب بند ہو جائے گا۔

آیت میں اسی کا جواب بطور مناجات دیا جا رہا ہے کہ کل سلطنتوں اور عزتوں کا مالک خداوند قدوس ہے، اسی کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے۔

سلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾ کے کلمہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ کائنات میں وجود ایجابی صرف خیر کا ہے اس لیے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے مقابل کی چیز شر ہے جو سلبی حقیقت کا نام ہے۔

آیت میں ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾ کہا گیا جب کہ شر بھی اللہ کے دست قدرت میں ہے۔ عارفین نے اس سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ جس چیز میں بندے کے قصد واختیار کو دخل نہ ہو وہ خیر ہی خیر ہے، اس کو ناگوار نہ سمجھے اور نہ عذاب ومصیبت۔

(یعنی اگر کوئی چیز بے قصد واختیار آجائے اس کو مِنَ اللّٰہ ہی سمجھنا چاہیے، اسی میں خیر ہے۔)

❹ ﴿لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ [سورة آل عمران: 28]

ترجمة: مومنوں کو نہیں چاہیے کہ مومنوں کے ہوتے ہوئے کافروں کو اپنا دوست بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ کے ہاں کسی شمار میں نہیں۔

تفسیر: آیت میں کافروں سے دوستی نہ رکھنے کا حکم دیا جا رہا ہے جو اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کے دشمن ہیں، ایسے لوگوں سے اسلام اور مسلمانوں کی فلاح وبہبود کی کیونکر توقع کی جاسکتی ہے۔ خواہ مخواہ دشمنانِ دین سے دوستی وتعلق خاطر رکھ کر اپنا اور دین کا نقصان کیوں کیا جائے؟

ایک مسلمان کی ساری امیدیں اور خوف صرف اللہ ربُّ العزت سے وابستہ ہونا چاہیے۔

سورۃ مائدۃ میں کافروں خصوصاً یہود ونصاریٰ سے دوستی رکھنے کی صراحتاً ممانعت موجود ہے۔

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ﴾ [سورة المائدہ: 51]

اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست مت بنانا۔

دوسری آیت میں مشرکین کو بھی مسلمانوں کا شدید دشمن قرار دیا ہے۔ [سورة المائدہ: 82]

سُلوك: تفسیر روح المعانی کے مفسر علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس آیت کے تحت اہل اللہ نے اپنے مریدوں کو منکرین کے ساتھ دوستی رکھنے سے منع کیا ہے کیوں کہ انکار کی ظلمت وتاریکی کفر کی ظلمت وتاریکی سے مشابہت رکھتی ہے اور بعض دفعہ دونوں ظلمتیں (ظلمت کفر اور ظلمت انکار) جمع ہو کر مومن کے نورِ ایمان کو کمزور کر دیتی ہیں۔ البتہ ان لوگوں سے کچھ اندیشہ ہو تو ظاہراً دوستی کر لینا جائز ہے اور یہ اجازت بھی صرف ضعیف وکمزور ایمان والوں کے لیے ہوگی۔ لیکن جو لوگ اللہ پر کامل یقین رکھتے ہیں انہیں اس ظاہری دوستی کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

ملحوظہ: کافروں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تین صورتیں ہیں:

❶ موالات (قلبی تعلق) ❷ مواسات (احسان ونفع رسانی) ❸ مدارات (ظاہری خوش خلقی وخاطر داری)

اہل علم کی تحقیق یہ ہے کہ مُوالات تو کافروں سے کسی بھی صورت میں جائز نہیں (کیونکہ دل کا یہ گہرا تعلق صرف اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں ہی سے وابستہ رہے گا)

دوسری صورت مواسات کی تو اہل حرب (برسرپیکار کافروں) کے ساتھ جائز نہیں، غیر اہل حرب کے ساتھ جائز ہے۔

تیسری صورت مدارات کی تو یہ کافروں کے ساتھ تین صورتوں میں جائز ہے۔

اوّل: دفع ضرر کے لیے ان لوگوں سے تعلق رکھنا کہ ان کے نقصان سے حفاظت رہے۔

دوم: خود کافروں کی مصلحت دینی کے لیے تعلق رکھنا یعنی اسلام لانے کی توقع پر تعلق رکھنا۔

سوم: اکرامِ ضیف کے طور پر جب کہ کوئی کافر ہمارے ہاں مہمان ہو، اس کی بھی خاطر مدارات کرنا درست ہے۔

بس ان صورتوں کے علاوہ اپنے کسی ذاتی غرض ومنفعت کے لیے کافروں سے مدارات درست نہیں ہے۔

5 ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾ [سورة آل عمران: 37]

ترجمة: جب کبھی زکریا علیہ السلام مریم کے حجرے میں آتے تو ان کے پاس کوئی چیز کھانے پینے کی پاتے۔ (ایک بار) بولے: اے مریم! یہ چیزیں کہاں سے تجھے مل جاتی ہیں؟ وہ بولیں: یہ اللہ کی طرف سے آتی ہیں۔

تفسیر: سیّدنا زکریا علیہ السلام سیّدہ مریم کے خالو ہوتے ہیں۔ سیّدہ مریم کے بچپن میں سرپرست اور مربی تھے جب کہ سیّدہ مریم بیت المقدس کی خدمت کے لیے مسجد کے حجرے میں مقیم تھیں۔

سیّدنا زکریا علیہ السلام جب بھی نگرانی وانتظام کے لیے سیّدہ مریم کے حجرے میں آتے تو وہاں بے موسم تازہ تازہ پھل اور میوے رکھے ہوئے دیکھتے۔ ایک دفعہ پوچھ ہی لیا۔ سیّدہ مریم نے مذکورہ جواب دیا۔

سُلوك: تفسیر روح المعانی کے مفسّر علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے اس واقعہ سے ''کرامات'' کا اثبات کیا ہے۔ سیّدہ مریم اپنی ساری عظمت وجلالتِ شان کے باوجود نبی یا رسول نہ تھیں، ولی اور صدیقہ تھیں۔ غیب سے ہر روز تازہ تازہ پھل آجانا کرامت ہی کہا جائے گا۔

6 ﴿هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾

[سورة آل عمران: 38]

ترجمة: بس وہیں (حجرۂ مریم میں) زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا کی۔ عرض کیا: اے میرے ربّ! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا کر۔ بے شک تو دعاؤں کا سننے والا ہے۔

تفسیر: سیّدنا زکریا علیہ السلام بالکل بوڑھے ہو چکے تھے۔ بیوی بانجھ تھی، اولاد سے گود خالی، بظاہر اولاد سے ناامیدی سی تھی۔ سیّدہ مریم کے حجرے میں کرامت دیکھ کر غیب سے ہر روز تازہ تازہ پھل آجاتے ہیں، اپنے لیے بھی گود کے پھل کی دعا کی، دعا قبول ہوگئی اور وہیں بشارت بھی ملی کہ تم کو لڑکا ہوگا جس کا نام ہم نے یحییٰ دیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت سے تین مسئلے معلوم ہوئے۔

پہلی بات تو یہ کہ اولاد کی خواہش کرنا تقویٰ وزہد کے خلاف نہیں۔ (انبیاء کرام سے ایسی خواہشات کا اظہار ہوا ہے)

دوسری بات یہ کہ دعا کرنے والے کی نظر عالم اسباب میں اسباب سے کہیں زیادہ مسبب الاسباب پر رہنی چاہیے۔ سیدنا زکریا علیہ السلام کے ہاں اسباب ولادت موجود نہ تھے۔

تیسری بات یہ کہ صرف اولاد کی خواہش نہیں بلکہ اولادِ صالحہ (نیک اولاد) کی خواہش کرنی چاہیے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے مزید ایک مسئلہ اور مستنبط کیا ہے کہ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً کی قید سے دعا کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ مشائخ طریقت کو اپنا خلیفہ بناتے وقت صلاحیت اور قابلیت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے نہ کہ محض اولاد ہونا یا مرید یا عقیدت مند ہونا کافی نہیں۔

(٧) ﴿وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [سورة آل عمران: 42]

ترجمة: اور جب کہا فرشتوں نے: اے مریم! بے شک اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور پاک کر دیا ہے اور جہاں بھر کی عورتوں کے مقابلے میں تم برگزیدہ کرلیا ہے۔

تفسیر: سیّدہ مریم رضی اللہ عنہا سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہونے والی تھیں جو انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم النبیین ہونے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سیّدہ مریم رضی اللہ عنہا کو کمالات و فضائل سے نوازا تھا، اسی کا تذکرہ آیت میں کیا جا رہا ہے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ فرشتوں کا نبیوں کے علاوہ غیر نبیوں سے کلام کرنا ثابت ہوتا ہے۔ البتہ جو کلام فرشتوں کا انبیاء کرام سے ہوا کرتا ہے، وہ پیام برائے تبلیغ ہوا کرتا ہے۔

سیّدہ مریم رضی اللہ عنہا یقیناً غیر نبی تھیں، ولی اور صدیقہ صفت تھیں، ان کے علاوہ سیّدہ امِ موسیٰ رضی اللہ عنہا سیّدہ سارہ رضی اللہ عنہا، سیّدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا وغیرہا سے فرشتوں کا کلام کرنا ثابت ہے۔ یہ سب مقدس خواتین تھیں، نبی یا رسول نہ تھیں۔

نوٹ: تفصیل کے لیے "ہدایت کے چراغ" جلد ۲ رصفحہ ۵۷۳ دیکھیے۔

(٨) ﴿قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ [سورة آل عمران: 52]

ترجمة: کہا: کوئی ایسے بھی آدمی ہیں جو میرے مددگار ہو جائیں اللہ کے واسطے؟ حواریوں نے کہا: ہم ہیں اللہ کے مددگار۔

تفسیر: سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام نے دین کی دعوت و تبلیغ کے لیے عام لوگوں سے تعاون چاہا۔ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کی مدد کرنے کے لیے حاضر ہیں۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت سے دو (٢) مسئلے ثابت ہوتے ہیں۔

پہلا مسئلہ تو یہ کہ دین کی دعوت و تبلیغ کے لیے مدد طلب کرنا جائز ہے، یہ بات توکل کے خلاف نہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ کہ اہل اللہ کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا ایسا ہے جیسا کہ اللہ کے ساتھ کرنا ہے۔

کیونکہ سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پکار پر کہ کوئی میری مددگار کرے گا؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ اصل

جواب اس طرح ہونا چاہیے تھا ''نَحْنُ اَنْصَارُكَ اِلَى اللّٰهِ'' ہم اللہ کے بارے میں آپ کے مددگار ہیں۔

معلوم ہوا کہ اہل اللہ کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ملحوظہ: حواری کپڑے دھونے والوں کو کہا جاتا ہے۔سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر سب سے پہلے دو ② حواریوں نے اپنی خدمات پیش کیں تھیں پھر رفتہ رفتہ اور بھی شریک ہوگئے۔ان سب کا لقب حواری پڑ گیا۔

⑨ ﴿وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ﴾ [سورة آل عمران: 73]

ترجمة: اور کسی شخص کے روبرو اقرار نہ کرو مگر ایسے شخص کے روبرو جو تمہارے دین کا پیرو ہو۔

تفسیر: یہ اہل کتاب نصاریٰ کا باہمی مشورہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی باتوں کا اقرار نہ کریں بلکہ انہی لوگوں کا کہا مانا جائے جو ہمارے دین و مذہب کی پابندی بھی کرتے ہیں۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے ان جاہل مشائخ کا رد کیا ہے جو اپنے سلسلہ کی تعلیمات کو اوروں سے چھپاتے ہیں اور صرف انہی لوگوں کو تعلیم و تلقین کرتے ہیں جو ان کے مسلک و سلسلے سے وابستہ ہیں۔

⑩ ﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾

[سورة آل عمران: 79]

ترجمة: (کوئی بھی نبی و رسول اپنی عبادت نہیں کروائے گا) بلکہ وہ کہے گا کہ تم اللہ والے بن جاؤ کیونکہ تم اللہ کی کتاب کی تعلیم کرتے ہو اور اس کو پڑھا کرتے ہو۔

تفسیر: آیت میں انبیاء کرام کا مقام و منصب بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنی اطاعت میں اللہ کی عبادت کرواتے ہیں یعنی وہ انسانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ ربّانی ہو جاؤ۔

سلوك: تفسیر روح المعانی کے مفسّر نے سیّدنا علی رضی اللہ عنہ، سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت نقل کی ہے کہ ربّانی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو عالم اور فقیہ ہو۔

مشہور صوفی حضرت شبلی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ربّانی وہ شخص ہے جو ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے: ربّانی وہ عالم باعمل ہے جو لوگوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے تربیت کرتا ہو۔

⑪ ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ [سورة آل عمران: 64]

ترجمة: آپ کہہ دیجئے: اے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ)! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان میں برابر ہے کہ سوائے اللہ کے ہم اور کسی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ شریک کریں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی اور کو اللہ کے سوا ربّ نہ قرار دے لے۔

تفسیر: شہر نجران (یمن) کے عیسائیوں نے رسول اللہ ﷺ سے جھگڑا کیا اور کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام بندہ نہیں اللہ کے بیٹے ہیں۔ پھر کہنے لگے: اگر وہ اللہ کے بیٹے نہیں تو بتاؤ کس کے بیٹے ہیں؟ کیونکہ سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام سیّدہ مریم کے بطن سے بے باپ پیدا ہوئے ہیں۔

ان کے اس سوال پر یہ آیت نازل ہوئی کہ عیسیٰ کی مثال اللہ کے ہاں آدم علیہ السلام کی سی ہے۔ ان کے نہ تو باپ تھے اور نہ ماں۔

عیسیٰ علیہ السلام کے صرف باپ نہ ہوں تو تعجب کیا ہے؟ (موضح القرآن) سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ سیّدنا آدم علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دینے پر زور دینا چاہیے حالانکہ عیسائی بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔

اور سیّدہ حوا جو حضرت آدم علیہ السلام کی بیوی ہیں بغیر ماں کے پیدا ہوئیں، سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کی ماں تو موجود تھیں۔

مذکورہ آیت میں ایک ایسی بات کی دعوت دی جا رہی ہے جو مسلمانوں اور عیسائیوں میں مشترک ہے یعنی، عبادت صرف اللہ کی کرنی چاہیے، کسی اور کو رب قرار نہ دیا جائے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جو لوگ شیوخ کی اطاعت و تعظیم میں خواہ وہ زندہ ہوں یا وفات یافتہ، غلو کرتے ہیں ان کی اس آیت میں تردید ہو رہی ہے۔ (کہ بندہ کو بندہ ہی رہنے دینا چاہیے)

⓬ ﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ [سورة آل عمران: 81]

ترجمة: اور جب اللہ نے عہد لیا تمام نبیوں سے کہ جو کچھ میں تم کو کتاب وعلم دوں پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو تمہاری تصدیق کرنے والا ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم اس رسول پر ضرور اعتقاد رکھنا اور اس کی طرف داری بھی کرنا۔

تفسیر: تمام انبیاء ورسل سے یہ جو عہد لیا گیا جس کا تذکرہ آیت میں موجود ہے یہ عالم ارواح کا واقعہ ہے جہاں دنیا میں آنے سے پہلے سب کی روح کا مستقر تھا۔ تمام انبیاء ورسل کی مشترکہ تعلیم ایک ہی رہی ہے یعنی توحید کا اقرار کرنا اور شرک سے دور رہنا، اس دعوت میں ہر نبی دوسرے کی تصدیق کرنے والا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ سلسلے کے شیوخ پر لازم ہے کہ جو کوئی علم وعمل میں ان سے بڑا ہو، ان کے مساوی بھی ہو تو ایسے شخص سے استفادہ کرنا چاہیے، اعراض وتکبر نہ کرنا چاہیے۔

⓭ ﴿وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾

[سورة آل عمران: 134]

ترجمۃ: اور وہ بندے غصّہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔ اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تفسیر: آیت میں نیک بندوں کی صفات بیان کی گئی ہیں کہ وہ فراخی اور تنگی میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور غصّہ کو پی جاتے ہیں اور عام لوگوں کے قصور اور زیادتیوں کو معاف بھی کردیتے ہیں۔ غصّے کو پی جانا خود بڑا کمال ہے اس پر مزید یہ کہ لوگوں کی زیادتیوں کو معاف کردینا اور نہ صرف معاف کردینا بلکہ معافی کے بعد ان پر احسان و نیکی کرنا انسان کو فرش سے عرش تک پہنچادیتا ہے، ایسے لوگوں کو اللہ اپنا دوست بنالیتا ہے۔

محدث بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے متعلق ایک روایت نقل کی ہے کہ: آپ کو ان کی باندی وضو کروارہی تھی کہ اچانک پانی کا لوٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آپ پر گر پڑا۔ غصّہ کے آثار دیکھ کر باندی نے فوراً الفاظ قرآنی ﴿الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ پڑھ دیا۔ حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما کا غصّہ دور ہوگیا، پھر باندی نے ﴿وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ کہا۔ آپ نے فرمایا: میں نے تجھ کو معاف بھی کردیا۔ پھر باندی نے آیت کا آخری جملہ ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ پڑھا۔ آپ نے فرمایا: جا میں نے تجھے آزاد بھی کردیا۔ (روح المعانی)

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ سے یہ حقیقت استنباط کی ہے کہ غصّہ آنا کمال کے منافی نہیں ہے۔

(مطلب یہ کہ کاملین اور اونچے درجے کے لوگوں کو بھی غصّہ آسکتا ہے، یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ البتہ اس کا بے جا اظہار عیب ہے۔)

14 ﴿اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ﴾ [سورة آل عمران: 144]

ترجمۃ: سو اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم انتقال کرجائیں یا شہید ہوجائیں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے؟

تفسیر: یہ آیت غزوۂ احد ۳ھ کے سلسلے کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُحد میں بنفس نفیس جنگ کا نقشہ قائم فرمایا تھا۔ تمام صفوں کو درست کرنے کے بعد پہاڑ کا ایک درّہ باقی رہ گیا تھا جہاں سے دشمن کی یلغار کا اندیشہ تھا۔ اس درّے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس تیراندازوں کو جن کے سردار حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہما تھے، مامور فرمایا اور تاکید فرمادی کہ میدان میں ہم کسی بھی حالت میں ہوں، تم لوگ اس جگہ سے حرکت نہ کرنا، مسلمان غالب ہوں یا مغلوب حتیٰ کہ اگر تم یہ دیکھو کہ پرندے ان کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہوں تب بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا ہم برابر اس وقت تک غالب رہیں گے جب تک تم اپنی جگہ پر قائم رہوگے۔

الغرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری ہدایات دے کر جنگ کا آغاز کیا، میدان کارزار گرم ہوا۔ مسلمانوں نے بڑھ

بڑھ کر جوہر شجاعت دکھائی، حضرت ابوُ جانہ ؓ، حضرت علی ؓ اور دوسرے مجاہدین کی بے جگری اور بسالت کے آگے دشمنوں کی کمریں ٹوٹ چکی تھیں۔ اب ان کو راہِ فرار کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا، بدحواس ہو کر بھاگنے لگے۔ ان کی عورتیں جو غیرت دلانے کے لیے میدانِ جنگ میں آئی تھیں۔ اپنے پائنچے چڑھا کر بھاگ کھڑی ہوئیں، مجاہدین نے مالِ غنیمت جمع کرنا شروع کیا، میدان دشمنوں سے خالی ہوگیا۔ یہ منظر دیکھ کر درّے والے بعض تیراندازوں نے سمجھا کہ اب کامل فتح ہو چکی ہے۔ دشمن چاروں طرف سے بھاگ رہا ہے، اب درّے پر ٹھہرے رہنے کا مقصد پورا ہو چکا ہے، چلو ہم بھی مالِ غنیمت جمع کریں اور دشمنوں کا تعاقب کریں۔ حضرت عبداللہ بن جبیر ؓ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یاد دلایا اور تیراندازوں کو روکا اور منع کیا لیکن ان کی اکثریت نے کہا: رسول اللہ ﷺ کا یہی مقصد تھا کہ فتح تک درّے پر ٹھہرے رہیں۔ فتح ہو چکی ہے لہٰذا اب یہاں ٹھہرنا ضروری نہیں، یہ خیال کر کے سب نکل پڑے، درّے پر حضرت عبداللہ بن جبیر ؓ اور ان کے صرف گیارہ ساتھی رہ گئے۔

مشرکین کے سواروں کا دستہ جو خالد بن ولید ؓ کی زیرکمان تھا (خالد ابھی مسلمان نہ تھے، مشرکین کی جانب سے لڑنے آئے تھے) موقع شناسی سے کام لیا، بھاگتے بھاگتے پلٹ کر درّے کی طرف سے حملہ کردیا۔

دس بارہ تیرانداز ڈھائی سو سواروں کی اچانک یلغار کا کہاں تک مقابلہ کرسکتے تھے تاہم حضرت عبداللہ بن جبیر ؓ اور ان کے ساتھیوں نے مدافعت کی اور اسی حالت میں سب نے جان دے دی اور شہید ہوگئے۔

میدان احد کے مسلمان مجاہدین اپنے عقبی والے درّے سے مطمئن تھے، سامنے سے بھاگی فوج اچانک پلٹ کر حملہ آور ہوگئی تھیں عقبی جانب سے خالد بن ولید ؓ کا دستہ ٹوٹ پڑا، مسلمان دونوں جانب سے گھر گئے اور بہت زور کا رن پکڑا، ستر (70) مسلمان شہید ہوگئے اور بیسیوں زخمی، اسی افراتفری میں بدنصیب ابن قمہ نے ایک بھاری پتھر رسول اللہ ﷺ پر پھینکا، آپ کا چہرۂ اقدس زخمی ہوا اور خود کی آہنی کڑیاں چہرے مبارک میں دھنس گئیں، دندانِ مبارک شہید ہوئے، آپ ایک گڑھے میں گر پڑے۔

مردود ابن قمہ نے آپ کو قتل کرنا چاہا مگر حضرت مُصعب بن عمیر ؓ جن کے ہاتھ میں اسلامی جھنڈا تھا سامنے آگئے اور آپ کو اپنی آڑ میں لے لیا۔

شیطان نے یہ افواہ عام کردی کہ آپ قتل کردیئے گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی مسلمانوں کے حوصلے پست ہوگئے اور پیر اکھڑنے لگے، مجاہدین میں افراتفری پھیل گئی، جس کا رُخ جس پر تھا دوڑ پڑا۔ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت میں صرف چند مسلمان رہ گئے تھے۔ بعض منافقین جو مسلمانوں کی صفوں میں تھے، یہ اعلان کردیا کہ جب محمد ﷺ قتل کردیئے گئے ہیں تو پھر سب کو اسلام چھوڑ کر اپنے سابقہ دین پر آجانا چاہیے، اسی میں نجات ہے۔

حضرت انس بن مالک ؓ کے چچا انس بن نظر ؓ نے بلند آواز سے اعلان کرنا شروع کیا: مسلمانو! اگر محمد

ﷺ مقتول ہو گئے ہوں تو رب محمد ﷺ مقتول نہیں ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد ہمارا رہنا کس کام کا ہے؟ جس کام پر آپ ﷺ شہید ہو گئے ہیں، ہم بھی شہید ہو جائیں۔ یہ کہہ کر بے تحاشہ دشمنوں کی صفوں میں گھس پڑے اور پھر ایسی بے جگری سے وار کرنا شروع کیا کہ دشمنوں کی صفوں میں انتشار پھیل گیا، دشمنوں کی درجنوں گردنیں کٹ کٹ کر گرنے لگیں، آخری لمحے خود بھی شہید ہو گئے، تیر و تبر کے ستر (70) سے زائد زخم صرف سینے پر شمار کیے گئے۔

اللّٰھم ارفع درجته

اس وقت رسول اللہ ﷺ کو کچھ افاقہ محسوس ہوا تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو آواز دی:

اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ

اے اللہ کے بندو! میری طرف آؤ، میں اللہ کا رسول ہوں۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی آواز سنی اور مسلمانوں کو للکارا کہ لوگو! رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں۔ آواز کا سننا ہی تھا کہ مسلمانوں کا منتشر مجمع واپس آیا پھر سب نے مل کر مشرکوں کی فوج کو منتشر کر دیا پھر فتح و کامیابی نصیب ہوئی۔

اس حادثے پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں تھیں۔ جس کا خلاصہ یہ کہ محمد ﷺ خدا تو نہیں ہیں بلکہ رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں جن کے بعد ان کی پیروی کرنے والوں نے ان کا دین سنبھالا اور جان و مال فدا کر کے دین قائم و باقی رکھا۔ لہٰذا اگر کسی وقت رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو جائے یا آپ ﷺ شہید کر دیے جائیں تو کیا تم دین کی خدمت و حفاظت چھوڑ بیٹھو گے؟

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا آیات سے یہ اخذ کیا ہے کہ کسی بزرگ اور صاحبِ سلسلہ کی موت پر اتنا جزع و فزع کرنا کہ دین کی خدمت متزلزل ہو جائے بری بات ہے جیسا کہ عوام بلکہ بعض خواص کا بھی یہ طرز رہا ہے۔

(15) ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [سورة آل عمران: 104]

ترجمة: اور ضروری ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت بھی رہے جو نیکی کی طرف بلایا کرے اور بھلائی کا حکم دیا کرے اور برائی سے روکا کرے اور ایسے ہی لوگ کامل فلاح پانے والے ہیں۔

تفسیر: اسلامی معاشرے کی بقا و تحفظ کے لیے مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت کا ہر وقت رہنا ضروری ہے جو عام مسلمانوں کو نیکی کی دعوت دے اور برائیوں سے منع کرتی رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام وہی حضرات کر سکتے ہیں جو قرآن و سنت سے واقف ہوں اور معروف و منکر کا علم رکھتے ہوں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے مذکورہ آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ اہل طریق مشائخ میں جو لوگ اہل دعوت

وارشاد ہیں، وہ ان مشائخ سے افضل ہیں جو دعوت وارشاد کا کام نہیں کرتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کو ﴿هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ فرمایا ہے جو دعوت وتبلیغ کے کام میں مشغول ہیں۔ (یہی کامل فلاح والے ہیں)

(غالباً قطب الارشاد کی اصطلاح اسی مضمون سے نکالی گئی ہو)

⑯ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا﴾ [سورة آل عمران: 155]

ترجمة: یقیناً جو لوگ تم میں اس دن پھسل گئے تھے جس دن دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوگئیں تھیں (یہ پھسل جانا) اس سبب سے ہوا تھا کہ شیطان نے انہیں ان کے بعض کرتوتوں کے سبب لغزش دے دی تھی۔

تفسیر: آیت میں وہی لوگ مراد ہیں جنہوں نے شیطانی افواہ پر مرکز چھوڑ دیا تھا خاص طور پر وہ تیرانداز بھی مراد ہیں جنہوں نے جبل احد کے عقبی درّے کو خالی کر دیا تھا۔ (تفسیر الدالمنثور للسیوطی رحمہ اللہ)

اللہ تعالیٰ نے ایسے بھولے بھالے مسلمانوں کی خطا کو معاف کر دیا کیونکہ ان کے اس اقدام میں رسول اللہ ﷺ سے بغاوت یا اطاعت گریزی نہ تھی بلکہ شیطان نے اپنے مکروفریب سے انہیں لغزش دے دی تھی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مخالفتِ رسول سے دل میں ظلمت پیدا ہوتی ہے اور شیطان کا تصرف صرف انہیں قلوب ہی پر چلتا ہے جس میں ظلمت ہو۔

(قرآن حکیم کی دیگر آیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں)

آیت سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ ہر پچھلا گناہ سبب بن جاتا ہے مزید اور جدید گناہ کا ﴿بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا﴾ آیت میں اس ادب کی تعلیم ملتی ہے کہ جو گناہ بھی سرزد ہو جائے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں بلکہ شیطان کی طرف کرنی چاہیے۔ (تفسیر کبیر، مدارک)

⑰ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ [سورة آل عمران: 159]

ترجمة: اور ان (صحابہ) سے معاملات میں مشورہ لیتے رہیے۔

تفسیر: مشورہ کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ مشورہ کرنے والا ناکام نہیں ہوتا۔ جب مشورہ کا حکم رسول اللہ ﷺ کو دیا جا رہا ہے تو دوسروں کے لیے اس کی ضرورت کہیں زیادہ ہی ہوگی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ بعض حالات میں چھوٹوں سے مشورہ لینا بھی بڑوں کو مفید ثابت ہوا ہے۔

⑱ ﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ

الْأَرْضِ﴾ [سورة آل عمران: 191]

ترجمة: علم وعقل والے لوگ وہ ہیں جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بھی، بیٹھے بھی، لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں۔

تفسیر: ایسے لوگوں کا ذکر وفکر کرنا قلوب میں اللہ کی خالقیت ومالکیت کا یقین پیدا کرتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے دو مسئلے مستنباط کئے ہیں۔

❶ ذکر کی طرح فکر بھی عبادت ہے۔

❷ فکر خالق کی ذات میں نہیں بلکہ مخلوقات کی پیدائش اور اس کی حکمتوں میں کی جاتی ہے۔

(اہل تحقیق علماء نے لکھا ہے کہ ذات الٰہی میں بحث وغور وفکر کرنا ممنوع ہے۔ احادیث میں بھی یہ مضمون ملتا ہے۔)

سُورَةُ النِّسَاء

پارہ: ④

④ ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ﴾ [سورة النساء: 1]

ترجمة: اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطے سے آپس میں سوال کیا کرتے ہو اور خبردار رہو قرابت والوں سے۔ بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے۔

تفسیر: مطلب یہ کہ تم لوگ اپنی تمام حاجات وضرورتوں میں اللہ کے محتاج ہو، تم اللہ ہی کے واسطے سے ایک دوسرے سے اپنے حقوق اور فوائد طلب کرتے ہو اور قرابت داری کا بھی پاس ولحاظ رکھو، ان کے حقوق اور ذمہ داریوں کو پورا کرو، قطع رحمی اور بدسلوکی سے احتیاط کرو۔

رحم کہتے ہیں قرابت ورشتہ داری کو۔ جو جتنا قریب ہے اس کے حقوق اتنے ہی قریب تر ہیں۔

رحم کے سلسلے میں ایک حدیث صحیح آئی ہے۔ اللہ نے اپنی مخلوقات کے ساتھ رحم کو بھی پیدا کیا اور اس کو اپنے پاس عرش پر رکھا۔ وہ عرش الٰہی سے معلّق دعا کرتا رہتا ہے کہ جو مجھے جوڑے رکھے اللہ اسے جوڑے رکھے اور جو مجھے کاٹے اللہ اُسے کاٹے۔ (الحدیث)

سُلوك: فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ قرابت ورشتہ داری کا لحاظ رکھنا واجب ہے اور اسے قطع کرنا جُرم ہے۔ (قرطبی)

② ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ [سورة النساء: 3]

ترجمة: اور عورتوں میں تم کو جو پسند ہوں نکاح کر لو دو دو عورتوں سے، تین تین عورتوں سے، چار چار عورتوں سے پھر اگر تم کو اندیشہ ہو کہ ان میں عدل وانصاف قائم نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو۔

تفسیر: ملّت کے مردوں کو بیک وقت چار عورتوں سے نکاح کر لینا جائز ہے لیکن اس میں یہ شرط بھی ہے جس کو عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ آپس میں سب کے حقوق مساوی مساوی ادا کئے جائیں اور اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر ایک سے زائد نکاح ممنوع ہو جاتا ہے۔ قیامت کے دن ایسا شخص فالج زدہ اٹھے گا جس کا ایک پہلو زمین سے گھسٹتے ہوئے رہے گا۔ یہ وہ شخص ہوگا جو دنیا میں ایک سے زائد بیویوں میں عدل وانصاف نہ کرتا ہوگا۔

تفسیر ماجدی کے مفسر (مولانا عبدالماجد دریا آبادی) لکھتے ہیں کہ تعدد ازواج کی اجازت ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں جس پر کسی مغرب زدہ انسان کو شرمانے اور اس کی طرح طرح تاویلیں کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ مرد کے قوی اور اس کی جسمانی ساخت وترکیب ہی اس نوعیت کی ہے کہ عورتوں میں ایک بیوی اس کی طبعی خواہش کی تشفی

کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ مرد اور عورت کے اتحاد و تناسل کا جہاں تک تعلق ہے مرد کا عمل چند منٹ میں ختم ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد مرد پر جسمانی حیثیت سے کوئی ذمہ داری ہی نہیں رہتی، برخلاف اس کے عورت کے لیے اس دو منٹی عمل کے نتائج کا سلسلہ دنوں اور ہفتوں نہیں، حمل و رضاعت (بچہ کو دودھ پلائی) کی مدت ملا کر ڈھائی ڈھائی سال تک سلسلہ پھیلا ہوا رہتا ہے۔

علاوہ ازیں حمل کے بغیر بھی ہر جوان و تندرست عورت کے لیے ہر ماہ ایک ہفتہ کی معذوری ایک طبعی امر بھی ہے لہٰذا مرد کو تقاضائے فطرت پوری کرنے کے لیے ایک سے زائد عورتوں کی ضرورت ہے۔ قطع نظر ان سب کے مرد کی شہوانی جبلّت تنوع پسند بھی ہے جس سے عورت فطرۃً خالی ہے۔ ایک تندرست مرد ایک عورت کی طبعی خواہش کے لیے کافی ہو جاتا ہے اس لیے شریعتِ اسلامی نے ہر ایک کی جبلّت اور فطرت کی رعایت رکھی ہے لہٰذا عورت کو ایک مرد کافی ہے۔

جو مذاہب اپنے ہاں ان فطری تقاضوں کی رعایت نہیں رکھتے وہ خواہ کچھ بھی ہوں لیکن خدائی اور فطری مذاہب نہیں کہے جاسکتے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ مُباحات (جائز چیزوں) سے لذّت حاصل کرنا اور اس میں کسی قدر کثرت کرنا اور اچھی اچھی چیزیں منتخب کرنا زہد و تقویٰ کے خلاف نہیں (بعض اہل اللہ کے ہاں اس کا اہتمام پایا جاتا ہے۔) البتہ جس شخص کو افراط یا تفریط کا اندیشہ ہو اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ قدرِ ضرورت پر اکتفا کرے۔

③ ﴿فَإِنْ تَابَا وَ أَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ۝﴾ [سورة النساء: 16]

ترجمة: پھر اگر دونوں (میاں بیوی) توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان سے تعرّض (چھیڑ خانی) نہ کرو۔ بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔

تَفسِیر: اس سے اُوپر والی آیات میں میاں بیوی کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے آپس کا اختلاف اور ایک دوسرے کی خطاؤں کا محاسبہ کیا گیا ہے پھر یہ بھی ہدایت دی گئی کہ اگر دونوں سچی توبہ کرلیں اور اپنا حال درست کرلیں تو پھر ان کو معاف کردیا جانا چاہیے۔ یہ نہیں کہ ان کی سابقہ غلطیوں کو دُہرایا جائے اور انہیں بار بار شرم دلائی جائے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ توبہ کرلینے والے پر طعن و تشنیع نہ کرنی چاہیے کیونکہ یہ ایذا پہنچانا ہے۔ (اور مسلمان کو ایذا دینا حرام ہے)

④ ﴿فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا﴾ [سورة النساء: 34]

ترجمۃ: پھر اگر وہ اطاعت کرنے لگیں تو ان کے خلاف بہانہ نہ تلاش کرو۔

تفسیر: آیت میں میاں بیوی کی معاشرت کا ذکر ہے اور بیوی کی اصلاح و تربیت کا طریقہ بیان کیا گیا ہے جب کہ اس سے بدکلامی یا نافرمانی سرزد ہونے لگے۔ اگر بیوی نے اپنی اصلاح کر لی اور شوہر کی شکایات کو دور کر دیا تو پھر شوہر کو درگزر کر دینا چاہیے اور بعد میں بہانے تلاش کر کے بیوی کو پریشان نہ کرنا چاہیے۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ محض بغض نفسانی کی وجہ سے کسی کو سزا دینا درست نہیں (جیسا کہ بعض ذمہ دار لوگ اپنے ماتحت ملازمین اور شاگردوں کو سزا دینے میں زیادتی کر دیتے ہیں)

5 ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ﴾ [سورة النساء: 49]

ترجمۃ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو مقدس بتاتے ہیں؟

تفسیر: توحید اور تقویٰ الٰہی جو تقدّس کا معیار ہے اس کو چھوڑ کر لوگوں نے رشتہ ناطہ، حسب و نسب، نسبت و تعلق کو معیار شرف و بزرگی بنا لیا ہے، ان بنیادوں پر اپنے آپ کو معظم و محترم سمجھنے لگے ہیں۔

اپنے آپ کو نیک اور مقدس سمجھنا اکثر احوال میں فخر و کبر کی وجہ سے بھی ہوا کرتا ہے جو نفس امارہ کے مخفی امراض میں شمار کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے اپنے آپ کو پاکیزہ سمجھنے سے منع کیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ لکھتے ہیں کہ تقدّس کا دعویٰ کرنے کی آیت میں مذمّت نکلتی ہے۔ اس مرض میں سوائے اہل فنا اکثر مشائخ مبتلا ہیں۔ (اہلِ فنا کی تعریف سلوک (۳۶) میں آ چکی ہے)

6 ﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ﴾ [سورة النساء: 77]

ترجمۃ: پھر جب حکم ہوا ان پر لڑائی کا تو اُسی وقت ان میں سے ایک جماعت لوگوں سے ڈرنے لگی جیسا کہ اللہ کے (عذاب سے) ڈرا جاتا ہے یا اُس سے بھی زیادہ ڈر۔

تفسیر: ہجرت مدینہ سے پہلے کافر لوگ مسلمانوں کو مکّۃ المکرمۃ میں بہت ستایا کرتے تھے اور ظلم بھی کرتے تھے۔ بعض مسلمان رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر شکایت کرتے اور اجازت طلب کرتے کہ ہمیں کافروں سے مقابلہ کرنے کی اجازت دی جائے لیکن آپ ایسے لوگوں کو صبر و تحمل کی تلقین فرماتے اور ارشاد فرمایا کرتے: اللہ تعالیٰ نے کافروں سے جنگ و جدال کرنے کی ابھی اجازت نہیں دی ہے۔

جب ہجرت ہو چکی اور مسلمان مدینہ منورہ میں آ گئے، یہاں جنگ و جدال کی اجازت نازل ہوئی۔ بعض عافیت طلب مسلمانوں پر یہ حکم بھاری محسوس ہوا اور لڑنے مرنے کا اندیشہ کرنے لگے۔ اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی اور انہیں مکّۃ المکرمۃ کا جوش و جذبہ یاد دلایا گیا اور نصیحت کی گئی۔

سُلوك: امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا یہ خوف وڈر طبعی قسم کا تھا جیسا کہ کسی درندے، موذی جانور کو دیکھ کر دل میں خوف پیدا ہوتا ہے۔ ایسے خوف واندیشے پر گناہ نہیں اور نہ یہ خوف ایمان و اعتقاد کے خلاف ہے البتہ غیر اللہ کا وہ خوف جو اعتقاداً پیدا ہوتا ہے وہ شرک کہلاتا ہے۔

❼ ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰٓى أَهْلِهَا﴾ [سورة النساء: 58]

ترجمة: بے شک اللہ تم کو حکم دیتے ہیں کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کو۔

تَفسِیر: لفظ امانت اُردو میں بھی اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ امانت میں خیانت کئی طرح سے ہوا کرتی ہے۔ ایک یہ کہ امانت ہی کا انکار کر دیا جائے یا اس میں کسی قسم کی کمی کر دی جائے یا اس کو اپنے استعمال میں لایا جائے یا اس سے نفع کمایا جائے یا اس میں ردّ وبدل کر دیا جائے یا اس میں نقصان پیدا کر دیا جائے یا اس کی حفاظت نہ کی جائے یا پھر اس کے مالک کو واپس کرنے میں ٹال مٹول کی جائے وغیرہ۔

بعض روایات میں منقول ہے کہ فتح مکہ والے دن رسول اللہ ﷺ نے خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہا تو آپ کو کلید بردار عثمان بن طلحہ نے خانہ کعبہ کی کنجی دینے سے انکار کر دیا تھا (زمانۂ قدیم سے کلید برداری کی خدمت اسی خاندن میں چلی آرہی تھی۔) سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کے ہاتھ سے کنجی چھین کر خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا، رسول اللہ ﷺ اندر داخل ہوئے اور نماز پڑھ کر باہر تشریف لائے۔ سیّدنا عباس رضی اللہ عنہ نے آپ سے گزارش کی کہ کنجی ہمیں دے دی جائے۔

اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی اور کنجی ہمیشہ کے لیے عثمان بن طلحہ کے حوالہ کر دی گئی (اور آج ۱۴۱۵ھ اسی خاندان میں کلید برداری کا یہ منصب باقی ہے۔) پھر عثمان بن طلحہ بعد میں مسلمان ہو گئے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ آیت مذکورہ سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ آیت میں امانت کے معنی کو عام لیا جائے تو اس سے مشائخ طریقت پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنے فیوض وبرکات کو ان حضرات تک پہنچا دیں جو خلافت ارشادیہ کے اہل ہیں۔ ایسے حضرات کو خلافت کی اجازت دینی چاہیے۔

❽ ﴿وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهٖ﴾ [سورة النساء: 83]

ترجمة: اور انہیں جب کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو یہ اسے پھیلا دیتے ہیں۔

تَفسِیر: آیت میں منافقوں کی اس عادت کا ذکر کیا گیا ہے کہ کسی بھی اڑتی ہوئی خبر کو فوری عام کر دیتے ہیں۔ تحقیق کرنا یا اس پر غور کرنا نہیں چاہتے کہ واقعہ کی کیا حقیقت ہے۔ بس جونہی سنا اس کو پھیلا دیا۔

ایسے ہی بعض کمزور وضعیف مسلمان بھی اس افواہ میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ ایسے لوگوں کو تنبیہ کی گئی کہ کسی بھی خبر کے سننے پر اس کو عام کرنے سے پہلے ذمہ داروں سے اس کی حقیقت معلوم کر لینی چاہیے پھر ضروری ہو تو اس کا

اعلان کر دینا چاہیے ورنہ سن کر خاموش ہو جانا چاہیے۔

عہد نبوت میں ایک شخص کو زکوۃ وصول کرنے کے لیے ایک قبیلہ کی جانب روانہ کیا گیا تھا۔ وہ قوم اس کے استقبال کے لیے باہر نکلی، اس شخص نے خیال کیا کہ میرے قتل کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، فوری لوٹ کر مدینہ منورہ آ گیا اور یہ خبر دی کہ فلاں قوم مرتد ہو گئی ہے اور میرے قتل کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے۔

سُلوك: امام رازی رحمہ اللہ نے آیت سے یہ ثابت کیا ہے کہ عام لوگوں کو اہلِ علم حضرات کی تقلید کرنی ضروری ہے۔ (جو ذمہ دار لوگ ہیں، انہی کی بات تسلیم کر لینی چاہیے۔)

⑨ ﴿وَإِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِأَحْسَنَ مِنْهَآ أَوْ رُدُّوْهَا﴾ [سورة النساء: 86]

ترجمۃ: اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر طور پر سلام کرو یا اُسی (الفاظ) کو لوٹا دو۔ بے شک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔

تَفسِیر: اسلامی معاشرت کی یہ چھوٹی چھوٹی باتیں راہ نما اصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلامی تہذیب و تمدن اس سے پروان چڑھتے ہیں۔ سلام کا جواب دینا تو بہر حال واجب ہے البتہ جواب دینے والے کو دو اختیار دیئے گئے ہیں۔ سلام کا جواب ان الفاظ سے بہتر دو تم کو جن الفاظ میں سلام کیا گیا ہے یا پھر وہی الفاظ لوٹا دو جو سلام میں مخاطب نے استعمال کئے ہیں۔

بہترین قول بعض صحابہ اور تابعین حضرات کا ہے جو حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ سلام کرنے والا اگر مسلمان ہو تو اس کا جواب الفاظ کی زیادتی کے ساتھ دیا جائے۔ مثلاً کسی نے السلام علیکم کہا تو تم وعلیکم السلام کہو اور اگر اس نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا تو تم وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہو اور اگر سلام کرنے والا غیر مسلم ہو تو جواب میں اُسی کے الفاظ لوٹا دو۔ (ابن عباس رضی اللہ عنہما)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی تعلیم ہے۔ (یعنی آپس میں اعلیٰ ترین برتاؤ کرنا چاہیے۔)

⑩ ﴿وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ﴾

[سورة النساء: 101]

ترجمۃ: اور جب تم سفر کرو ملک میں تو تم پر کوئی گناہ نہیں نماز کو کچھ کم کر لو۔

تَفسِیر: یہ حالتِ سفر کے احکام ہیں جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ چار رکعت والی نماز کو دو رکعت کر لینا درست ہے اس عمل کو قصر فی الصلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ سفر خواہ جہاد فی سبیل اللہ کا ہو یا سیر و سیاحت،

ملاقات وزیارت یا تعلیم وتجارت یا کسی بھی قسم کا ہو، دوران سفر چار رکعت والی نماز کو دو رکعت بنا کر ادا کرنی چاہیے۔ یہ اللہ کا فضل وانعام ہے، اس کو شکریہ کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جب سفر میں فرض نمازوں کے اندر تخفیف رکھی گئی تو سالک کے روزمرّہ اَورادووظائف میں بدرجہ اولیٰ تخفیف روا رکھی جائے گی۔

⑪ ﴿فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ﴾ [سورة النساء: 103]

ترجمة: پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو قاعدے کے موافق پڑھنے لگو۔

تفسیر: یہ حکم حالتِ سفر ختم ہو جانے کے بعد کا ہے۔ سفر خواہ جہاد فی سبیل اللہ کا جس میں ہر وقت دشمن کا خطرہ لگا رہتا ہے یا اپنا خانگی سفر ہو جس میں حرج مرض کا اندیشہ رہا کرتا ہے۔ جب یہ ہر دو صورتیں ختم ہو جائیں اور وطن میں قیام ہو جائے تو پھر نمازیں قاعدے کے مطابق ادا کی جائیں گی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ سفر میں عذر کی وجہ سے جو اورادووظائف چھوٹ جاتے ہیں بعد زوال عذر ان کی تکمیل کرنی چاہیے۔

⑫ ﴿لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ﴾ [سورة النساء: 114]

ترجمة: سرگوشیاں بہت سی ایسی ہیں جن میں کوئی بھلائی نہیں البتہ بھلائی یہ ہے کہ کوئی صدقہ کی ترغیب دے یا کسی نیک کام کی یا لوگوں کے درمیان اصلاح کی۔

تفسیر: منافق اور حیلہ باز لوگ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آکر آپ سے سرگوشیاں کرتے تھے تاکہ مسلمانوں میں اپنا اعتبار پیدا کرلیں، لیکن جب وہ اپنی مجلسوں میں بیٹھتے تو بے ہودہ سرگوشی کرتے، مسلمانوں کی غیبت کرتے اور اسلام کے خلاف سازشیں بنایا کرتے تھے۔

آیت میں اس راز کو فاش کیا گیا ہے اور ہدایت کی گئی کہ اچھی باتوں کے چھپانے یا سرگوشی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ جو مخفی تعلیم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے موافق نہ ہو جیسا کہ بعض جاہل صوفیاء میں کچھ باتیں سینہ بہ سینہ جاری ہیں، اس آیت سے اس کا باطل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

⑬ ﴿وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ [سورة النساء: 119]

ترجمة: اور انہیں حکم دوں گا پھر وہ اللہ کی بناوٹ میں تبدیل کریں گے۔

تَفسِیر: آیت کا یہ جملہ "نقل حکایت" ہے یعنی سیدنا آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے پر ابلیس کو آسمانوں سے نیچے پٹخ دیا گیا تھا۔ اس وقت اس مردود نے اللہ کی جناب میں اس طرح خطاب کیا تھا:

میں تیرے بندوں میں اپنی گمراہی کا حصہ لے کر رہوں گا اور انہیں گمراہ کر کے رہوں گا اور ان میں طرح طرح کی امیدیں اور خواہشات پیدا کروں گا اور انہیں تعلیم دوں گا وہ اللہ کی بنائی صورت کو بگاڑا کریں۔

سُلوك: قدیم مفسرین نے صورت بگاڑنے میں ڈاڑھی منڈانے کو بھی شامل کیا ہے، بعض جاہل صوفیاء نے ڈاڑھی منڈانے کو طریقِ قلندریہ کہا ہے۔ مذکورہ آیت میں اس کو شیطانی عمل قرار دیا ہے۔

(اسی طرح مرد کو عورتوں کی شکل اختیار کرنا اور عورت کو مردوں کی نقل کرنا، لباس، چال ڈھال، وضع قطع میں یا آپریشن کروا کر جنس تبدیل کروالینا وغیرہ سب کچھ اسی شیطانی عمل میں آجاتا ہے)

⑭ ﴿وَ اُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ﴾ [سورة النساء: 128]

ترجمة: اور طبیعتوں میں تو بخل ہوتا ہی ہے۔

تَفسِیر: الشّح ایسے بخل کو کہا جاتا ہے جس میں حرص و ہوس بھی ہو یعنی شدید قسم کا بخل۔

بخل ویسے بھی روحانی مرض ہے لیکن حرص و ہوس کے ساتھ ہو تو ایسا بخل خود بخیل کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔ آیت میں طبیعت انسانی کا مزاج بیان کیا جا رہا ہے کہ ہر نفس میں اپنے مال ونفع کی حرص گھسی ہوئی ہے۔ طبیعتوں میں بخل کا وجود ایک حقیقت ہے لیکن اس کا استعمال دوسری نوعیت ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ آیت سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ امور طبعیہ کاملین سے بھی زائل نہیں ہوتے۔ لہٰذا اگر کسی انسانِ کامل میں بخل کے کچھ اثرات کبھی نظر آجائیں، اس کے کمال کے منافی نہیں ہے۔ (البتہ بخل کے ناجائز تقاضوں پر عمل کرنا عیب وگناہ ہے۔)

⑮ ﴿وَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَیۡنَ النِّسَآءِ وَ لَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِیۡلُوۡا کُلَّ الۡمَیۡلِ﴾ [سورة النساء: 129]

ترجمة: اور تم سے تو یہ کبھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیویوں میں برابری رکھو گو تمہارا جی کتنا ہی چاہے تو تم بالکل ہی ایک طرف ڈھل نہ جاؤ۔

تَفسِیر: ایک سے زائد بیویوں میں عدل و انصاف و مساوات کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن مساوات حقوق اور ضروریات میں واجب ہے۔ البتہ کسی ایک بیوی کی جانب قلبی رجحان اور لگاؤ زیادہ ہو تو یہ بات عدل و انصاف کے خلاف نہیں سمجھی جائے تاہم ایسی صورت میں دوسری بیوی کی ایسی حالت نہ کر دینی چاہیے کہ وہ معلق ہو کر رہ جائے، اس کے ساتھ کچھ قلبی رجحان کا تعلق رکھنا چاہیے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ کسی بھی عمل کے اعلیٰ درجے پر قدرت نہ ہو، ادنیٰ درجے ہی پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ اعلیٰ درجے کی امید میں ادنیٰ کو بھی ترک کر دیا جائے، بعض لوگوں کی عمر اسی انتظار میں ختم ہو جاتی ہے، وہ ادنیٰ سے بھی محروم رہتے ہیں۔

⑯ ﴿الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [سورة النساء: 139]

ترجمة: وہ لوگ جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائے ہوئے ہیں، کیا یہ لوگ ان کے پاس عزت کی تلاش کر رہے ہیں؟

تَفسِیر: منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن کافروں سے ساز باز کرتے ہیں اور اپنا قلبی لگاؤ ان سے ظاہر کیا کرتے ہیں۔

سُلوك: فقہاء کرام نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ منکروں اور کافروں سے میل جول، خلا ملا رکھنا اور ان کی وضع قطع بنانا، ان کا فیشن اختیار کرنا، ان کی تہذیب وتمدن کو عزت وفخر کی چیز سمجھنا یہ سب باتیں داخل نفاق ہیں۔

⑰ ﴿يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ [سورة النساء: 153]

ترجمة: آپ ﷺ سے اے نبی! اہلِ کتاب (یہود ونصاریٰ) فرمائش کرتے ہیں کہ آپ ان کے لیے ایک کتاب آسمان سے نازل کروا دیں۔

تَفسِیر: یہ فرمائش کرنے والے مدینہ منورہ کے یہودی تھے جن کا سرغنہ کعب بن اشرف تھا۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ ہم ایسی وحی کے قائل نہیں جو فرشتے کے ذریعہ سے نبی پر نازل کی جاتی ہو، ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح لکھی لکھائی تختیاں آسمان سے نازل ہوں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جو لوگ برکات سماوی کو اپنے شیخ کے اختیار میں سمجھ کر اس سے اضافہ کی درخواست کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

⑱ ﴿وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ [سورة النساء: 142]

ترجمة: اور یہ لوگ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کو صرف دکھانے کے لیے اور اللہ کا ذکر بھی نہیں کرتے مگر مختصر طور پر۔

تَفسِیر: یہ منافقین کی صفات ہیں کہ اوّل تو یہ نماز ہی نہیں پڑھتے اور اگر کبھی شرما شرمی میں پڑھ لیتے ہیں تو صرف ظاہری لحاظ سے اٹھک بیٹھک کر لیتے ہیں محض لوگوں میں اپنی ساکھ رکھنے کے لیے کہ ہم

مسلمان ہیں اور بس۔

سُلوك: عارفین نے لکھا ہے کہ اخلاص کا عمل خواہ قلیل ہی کیوں نہ ہو اللہ اس کو کثیر قرار دیتا ہے۔ (مدارک)

حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں نماز کے لیے کاہلی سے کھڑا ہونا (کسلِ اعتقادی) مراد ہے۔ یعنی نماز کی فرضیت کا اعتقاد ہی نہیں ہے، کسل طبعی مراد نہیں یعنی سُستی وغفلت۔

(کسل اعتقادی کفر کی قسم ہے اور کسل طبعی فسق وگناہ سمجھا جاتا ہے)

⑲ ﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ [سورة النساء: 148]

ترجمة: اللہ کو پسند نہیں کسی کی بُری بات کا ظاہر کرنا مگر جس پر ظلم ہوا ہو (وہ ظاہر کر سکتا ہے)

تفسیر: اگر کسی میں دین یا دنیا کا عیب معلوم ہو تو اس کو مشہور نہ کرنا چاہیے۔ اللہ سب کی بات سنتا ہے اور سب کے کام جانتا ہے۔ ہر ایک کو اسی کے موافق جزا دے گا۔ کسی کا عیب ظاہر کرنا غیبت کہلاتا ہے جو بدترین گناہ ہے۔ البتہ مظلوم کو اجازت ہے کہ وہ ظالم کی ظلم وزیادتی لوگوں سے بیان کرے تاکہ دوسرے بھی اس کے ظلم سے محفوظ رہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جب ظالم سے انتقام لینے کی اجازت ہے تو اس میں ایک صورت یہ بھی ہے کہ دوسروں سے حکایت شکایت کی جاسکتی ہے۔ اس میں کمزور اور ضعیف لوگوں کی رعایت ہے۔ (ظاہر ہے کمزور آدمی اور کیا انتقام لے سکتا ہے؟) اس عمل سے ان کے دل کا بخار اتر جاتا ہے۔ (وہ ظاہر کر سکتا ہے۔)

⑳ ﴿اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝﴾

[سورة النساء: 149]

ترجمة: تم کسی بھلائی کو ظاہر کرو یا چھپاؤ یا کسی برائی سے درگزر کر جاؤ تو اللہ بہر صورت بڑا معاف کرنے والا بڑی قدرت والا ہے۔

تفسیر: نیکی کے اخلاقی حیثیت سے تین درجے الگ الگ ہیں:

① پہلا درجہ تو یہ کہ نیکی کر کے اس کا اظہار بھی کر دیا جائے (بشرطیکہ اس میں ریا وشہرت نہ ہو) یہ نیکی کا ادنیٰ درجہ ہے۔

② دوسرا درجہ یہ کہ نیکی کرے اور اس کو پوشیدہ رکھے بلکہ اس کو مخلوق کے علم میں آنے ہی نہ دے۔ مقصود صرف رضائے الٰہی ہو، نیکی کا یہ کامل درجہ ہے۔

③ تیسرا درجہ یہ کہ انسان کو ناگواریاں پیش آئیں اور وہ انہیں نظر انداز کر دے اور برائی کرنے والوں سے

بدلہ نہ لے یہ نفس کے لئے بہت شاق ہے، اس کا مرتبہ علم سلوک و اخلاق میں سب سے اونچا ہے۔ یہ کامل ترین انسان ہی کو میسر ہوتا ہے۔

سُلوک: امام رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت کے ان مختصر فقروں میں سلوک و اخلاق کا خلاصہ آ گیا ہے۔ (تفسیر کبیر)

حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ پہلی آیت (ظلم کا بدلہ لینا) میں کمزور اور ضعیف لوگوں کی رعایت ہے، دوسری آیت (معاف و درگزر کرنا) اہل ہمت لوگوں کے مناسب حال ہے۔

(21) ﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ﴾ [سورة النساء: 160]

ترجمة: سو یہودیوں کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے حرام کر دی ان پر بہت سی پاک چیزیں جو ان پر حلال تھیں۔

تفسیر: یہودیوں کی اپنے نبیوں کے ساتھ مسلسل بغاوت و سرکشی کا انجام یہ ظاہر ہوا کہ ان کی شریعت میں جو چیزیں پاک و حلال تھیں، انہیں حرام کر دی گئیں اور ان کی شریعت کو سخت ترین شریعت بنا دیا گیا تھا۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا کہ گناہوں کے سبب سالک کے واردات کا قبض ہو جاتا ہے۔ (قلب کی ان کیفیات کو واردات کہا جاتا ہے جو علم و یقین، ذوق و شوق، محبت الٰہی اور لذّت عبادات سے تعلق رکھتی ہیں۔)

(22) ﴿يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ﴾ [سورة النساء: 170]

ترجمة: اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کے بارے میں کوئی بات حق کے سوا نہ کہو۔

تفسیر: دین میں غلو کرنے کے معنی یہ ہیں کہ عقائد یا اعمال میں کمی یا زیادتی کر دی جائے نیت خواہ کسی بھی قسم کی ہو۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہودیوں کا یہ غلو تھا کہ وہ ظاہری احکام میں کانٹ چھانٹ کیا کرتے تھے اور باطنی احکام (قلبی احکام) سے آنکھ بند کئے ہوئے تھے۔

اور عیسائی باطنی احکام میں شدت کرتے تھے اور ظاہری احکام سے منہ موڑے ہوئے تھے۔

لیکن طریق حق یہ ہے کہ ظاہر و باطن دونوں کو جمع کیا جائے۔

(23) ﴿لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ [سورة النساء: 172]

ترجمة: مسیح علیہ السلام اس سے عار نہ کریں گے کہ وہ اللہ کے بندہ ہیں اور نہ مقرب فرشتے۔

تفسیر: سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام اور مقرب فرشتے دنیا میں کثرت سے پُوجے گئے ہیں۔

مشرکوں نے فرشتوں کو دیوی، دیوتاؤں کا نام دے کر پوجا ہے اور عیسائیوں نے سیدنا مسیح علیہ السلام کو خدائی درجہ دے کر خدا، خدا کا بیٹا، تین خداؤں میں ایک خدا قرار دیا ہے۔

آیت میں بیان کیا جا رہا ہے کہ اللہ کی عبدیت کوئی توہین والی چیز نہیں ہے بلکہ اللہ کا بندہ ہونا کمال انسانیت کی دلیل ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام ہوں یا مقرب فرشتے، انہیں عبدیت پر ناز اور فخر ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بزرگی کے مراتب میں عبدیت (بندۂ کامل ہونا) اعلیٰ درجے کی بزرگی ہے، غالی قسم کے مریدوں اور عقیدت مندوں نے اپنے شیوخ و مرشدوں کو عبدیت سے باہر نکال کر اتنا اونچا کرنا چاہا کہ وہ عبدیت سے کچھ اوپر ہی ہیں۔

ضَلُّوْ فَاَضَلُّوْا خود بھی گمراہ تھے اوروں کو بھی گمراہ کیا۔

عارفین نے لکھا ہے:

اَلْعَبْدُ عَبْدٌ اِنْ تَرَقیٰ وَالرَّبُّ رَبٌّ اِن تَنَزَّلْ

"بندہ عرش پر پہنچ کر بھی بندہ ہی رہے گا اور اللہ نیچے اتر کر بھی اللہ ہی رہے گا۔"

قرآن حکیم نے عبدیت سے عار کرنے والوں کو دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔[سورة النساء: 173]

سُوْرَةُ المَائِدَة

پَارَہ: 6

1 ﴿وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا﴾ [سورة المائدة: 2]

ترجمة: اور جب احرام سے نکلو تو شکار کر لیا کرو۔

تفسیر: حج یا عمرہ کے احرام میں جن امور کا کرنا منع ہے ان میں جنگل کا شکار کرنا بھی شامل ہے، البتہ احرام سے فارغ ہو کر شکار وغیرہ کر سکتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جس مباح (جائز) کام کے ترک کرنے پر بظاہر اس کے ممنوع ہونے کا شبہ پیدا ہو جائے اس جائز کام کا کرنا پسندیدہ عمل ہوگا۔

بعض شدت پسند سالکین جائز کاموں کے ترک کرنے میں حرام کی طرح احتیاط کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل غلو اور تشدد قسم کا ہے۔ (جو قابل اصلاح ہے)

2 ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا﴾

[سورة المائدة: 2]

ترجمة: اور ایسا نہ ہونا چاہیے کہ کسی قوم سے تمہیں بیزاری اس بناء پر ہو کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روک دیا تھا کہ تم اس بیزارگی کے باعث (ان پر) زیادتی کرنے لگو۔

تفسیر: یعنی عقلی ناگواری اور طبعی بیزارگی کے باوجود اپنے فریق مخالف سے عدل و انصاف ہی کا معاملہ رکھا جائے۔ آیت میں مکۃ المکرمۃ کے کافر مراد ہیں جنہوں نے ٦ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو بیت اللہ تک پہنچنے اور عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ ایسے موذی اور ظالم دشمنوں سے بھی اچھا سلوک کرنے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جس کسی سے بھی بغض فی اللہ ہو اس کے ساتھ معاملات میں بھی حدود شرعی سے تجاوز کرنا درست نہیں ہے۔

3 ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾

[سورة المائدة: 2]

ترجمة: ایک دوسرے کی مدد نیکی اور تقویٰ کی باتوں میں کرتے رہو اور گناہ و زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔

تفسیر: تقویٰ کی تعریف سلوک (54) پر آچکی ہے۔ دیکھ لی جائے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ مجالس خیر میں جس کا مقصد اشاعت دین ونصرت دین ہو شرکت کرنا واجب ٹھہرا، اسی طرح ان اداروں میں شرکت کرنا جن سے بے دینی یا بدعملی کی تائید ہوتی ہو، ممنوع اور ناجائز قرار پاتا ہے۔ اس ہدایت کے بعد وَاتَّقُو اللّٰه کی صراحت اس پر دلالت کرتی ہے کہ خشیت الٰہی ایسی چیز ہے جو ہر مجاہدہ کو آسان اور ہر پابندی کو سہل بنا دیتی ہے۔

(54) ﴿وَ اَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ ؕ ذٰلِکُمۡ فِسۡقٌ﴾ [سورة المائدة: 3]

ترجمة: (تم پر حرام کی گئی ہیں مذکورہ چیزیں) اور یہ کہ تم تقسیم کرو جوے کے تیروں سے۔ یہ گناہ کا کام ہے۔

تفسیر: ازلام سے مراد وہ تیر ہیں جن کے ذریعہ زمانۂ جاہلیت میں مشرکین مکہ کسی اشکال یا تردد کے وقت اپنے ارادوں اور کاموں کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ یہ تیر خانہ کعبہ میں قریش کے سب سے بڑے بت ہبل کے قریب رکھے رہتے تھے، ان میں کسی تیر پر اَمَرَنِیْ رَبِّیْ (میرے رب نے حکم دیا ہے) کسی دوسرے پر نَهَانِیْ رَبِّیْ (میرے رب نے منع کیا ہے) اس طرح ہر تیر پر اٹکل پچو باتیں لکھ چھوڑی تھیں۔ جب کسی کام میں تردد ہوتا تو ایک تیر نکال کر دیکھ لیتے۔ اگر اس پر اَمَرَنِیْ رَبِّیْ والا تیر نکل آیا تو کام شروع کر دیتے اور اگر اس کے خلاف والا تیر نکل آتا تو کام سے رُک جاتے گویا یہ بتوں سے ایک قسم کا مشورہ اور استعانت سمجھی جاتی تھی، قرآن حکیم نے ایسے خیالی وہمی عمل کو فسق (گناہ) قرار دیا ہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا کہ آج کل چٹھی ڈالنے کا جو رواج چل پڑا ہے وہ اسی جُوے کی ملتی جلتی شکل ہے۔

(55) ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا﴾
[سورة المائدة: 3]

ترجمة: آج کے دن میں پورا کر چکا تمہارے لیے تمہارا دین اور پورا کر دیا تم پر اپنا احسان اور پسند کرلیا تمہارے لیے دین اسلام کو۔

تفسیر: حجۃ الوداع ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ مطابق ۱۵، ۱۶ مارچ ۶۳۲ء یوم جمعہ بعد نماز عصر میدان عرفات میں جب کہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کے اردگرد چالیس ہزار سے زائد کا مجمع تھا مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد آپ صرف اکیاسی (۸۱) دن اس دنیا میں جلوہ افروز رہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ فقہاء ظاہر و باطن نے آیات سے جو مسائل اخذ کیے ہیں وہ سب دین ہیں ورنہ اکمالِ دین کے بعد اس کی اجازت نہ ہوتی۔ (حالانکہ روز اوّل سے آج

تک یہ عمل جاری رہا ہے) نیز آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مجتہدین ومشائخ کی اتباع کرنی چاہیے۔
نیز آیت میں تکمیل دین کی بشارت دی گئی ہے، اس سے کسی خوشخبری کا اعلان کرنا مفہوم ہوتا ہے۔ (مرتب)

⑥ ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [سورۃ المائدۃ: 3]

ترجمۃ: پھر جو شخص شدت بھوک سے بے تاب ہو جائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ معاف کرنے والے، رحمت والے ہیں۔

تفسیر: یعنی حلال وحرام کا قانون تو مکمل ہو چکا، اب اس میں کوئی تغیر وتبدیل کی گنجائش نہیں البتہ مضطر جو بھوک و پیاس کی شدت سے بے تاب اور لاچار ہو جائے وہ اگر حرام چیز کھا پی کر اپنی جان بچا لے تو اس کو اجازت ہے لیکن اس اجازت میں یہ شرط بھی ہے کہ مقدار ضرورت سے زیادہ نہ کھائے اور لطف ولذت مطلوب نہ ہو۔ (غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ)

ایسے کھانے پینے کو اللہ نے اپنے فضل وکرم سے معاف کر دیا ہے گویا وہ چیز اپنی ذات میں حرام ہی رہے گی مگر اس کو کھا پی کر اپنی جان بچانے والا گنہگار نہ ہوگا۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جس حرام چیز کی ضرورۃً اجازت حاصل ہو گئی اس سے حظ نفس (لطف اندوزی) کی اجازت نہیں ہوگی۔ جیسے ڈاکٹر وطبیب، علاج ومعالجہ کرنے والے حضرات کو عورت یا اس کے جسم کو دیکھنا یا چھونا پڑے تو بقصد شہوت دیکھنا یا چھونا حرام ہوگا۔ نیز آیت میں قلب کی حفاظت کا خاص اہتمام کرنا ثابت ہوتا ہے۔

⑦ ﴿مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ﴾ [سورۃ المائدۃ: 6]

ترجمۃ: اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے۔

تفسیر: آیت میں وضو اور تیمم کے مسائل بیان کئے گئے ہیں اور اس میں سہولت بھی دی گئی ہے کہ اگر پانی دستیاب نہ ہو تو مٹی سے تیمم کر لیا جائے۔ ایسے ہی پانی کے استعمال سے تکلیف ہونے کا اندیشہ ہو تو تیمم کر لیا جا سکتا ہے، یہ اللہ کی طرف سے سہولت اور نرمی ہے۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ شرعی رخصتوں سے تنگدل ہونا اور اس پر نفس پرستی کا شبہ کرنا حق کی مزاحمت ہے۔ (جو بڑی خطرناک حالت ہے)

(یعنی شریعت نے جن مسائل میں سہولت ونرمی دی ہے ان سے استفادہ نہ کرنا یا اس کو اچھا خیال نہ کرنا حق کی مخالفت جیسا عمل سمجھا جائے گا۔ (سبحانہٗ وتعالیٰ)

⑧ ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭاِعْدِلُوْا ۣهُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾

[سورۃ المائدۃ: 8]

ترجمۃ: اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے تم اس کے ساتھ انصاف ہی نہ کرو۔ انصاف کرتے رہو۔ یہ بات تقویٰ سے بہت قریب ہے۔

تفسیر: گویا ادائے حقوق کا دوسرا نام تقویٰ بھی ہے۔ جس قوم یا جماعت سے مسلمانوں کو دشمنی ہوگی ظاہر ہے وہ دشمن ہی ہوں گے۔ تو مطلب یہ نکلا کہ دشمنوں تک سے ادائے حقوق میں کمی نہ ہونی چاہیے۔ جب کافروں سے ادائے حقوق کی تعلیم دی جا رہی ہو تو پھر کفر سے کم درجہ اہلِ فسق و اہل بدعت وغیرہ کے ساتھ کیونکر انصاف نہ کیا جائے گا؟

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ معاملات میں طبیعت کے تقاضوں کے خلاف کرنا ایک مجاہدہ ہے اور یہاں اسی کی تعلیم دی جا رہی ہے (یعنی شریعت کے منشاء و مراد کو اپنی طبیعت کے تقاضوں کی وجہ سے ترک نہ کیا جائے)

عام طور پر معاملات میں بے انصافی کے دو سبب ہوا کرتے ہیں۔ یا تو کسی فریق کی رورعایت کرنا یا کسی فریق کی عداوت و مخالفت کرنا۔

سورۃ النساء آیت (۱۳۵) میں عدل و انصاف کا حکم سبب اوّل کی وجہ سے ہے اور یہاں سورۃ المائدۃ آیت (۸) میں سبب دوم کی وجہ سے ہے۔

⑨ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ﴾ [سورۃ المائدۃ: 11]

ترجمۃ: اے ایمان والو! اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے یاد کرو جب ایک قوم نے ٹھان لی تھی کہ تم پر اپنے ہاتھ دراز کریں لیکن اللہ نے ان کے ہاتھ تم سے روک لیے۔

تفسیر: مکۃ المکرمۃ کے مشرکین نے ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو مٹا دینے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن اللہ نے ان کی ساری تدبیروں کو الٹا کر دیا اور وہ لوگ اپنے ناپاک ارادوں میں ناکام ہوگئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مدینہ طیبہ کے یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کی دعوت کی اور کھانے میں زہر ملا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے وقت سے پہلے آپ کو مطلع فرما دیا، اس طرح ایک بڑے حادثے سے حفاظت ہوگئی۔ (ابن کثیر) اسی احسان کو آیت میں بیان کیا جا رہا ہے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا: اس آیت میں تردید ہے ان افراط پسند صوفیوں کی جو دنیا کی نعمتوں کو حقیر

سمجھتے ہیں۔(نعمت خواہ آخرت کی ہو یا دنیا کی بہرحال وہ فضل الٰہی ہے)

⑩ ﴿وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا﴾

[سورة المائدة: 12]

ترجمة: اور بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا اور ہم نے ان میں بارہ نقیب (سردار) مقرر کیے تھے۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں پر بارہ سردار مقرر فرما دیے تھے جو ان کے دینی و دنیاوی معاملات کی نگرانی کیا کرتے تھے۔اس طرح چین وسکون سے ان کی زندگی بسر ہوا کرتی تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہجرت سے پہلے مکۃ المکرمۃ میں جب انصار مدینہ نے لیلۃ العقبۃ میں نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی ان میں سے بھی آپ نے بارہ نقیب کو نامزد فرمایا تھا۔ان ہی بارہ آدمیوں نے اپنی قوم کی طرف سے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس آیت سے تائید ہوتی ہے مشائخ کے اس عمل کی جو اپنے مریدوں کی اصلاح کے لیے نائب مقرر کرتے ہیں تا کہ ان پر نگرانی قائم رہے۔

⑪ ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً﴾ [سورة المائدة: 13]

ترجمة: غرض ان کی عہد شکنی کی بناء پر ہم نے انہیں رحمت سے دور کر دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

تفسیر: رحمت الٰہی سے دوری کو لعنت کہا جاتا ہے یعنی اللہ کے فضل و انعامات سے محرومی و تنگی ہو جائے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض گناہوں سے قبض طاری ہو جاتا ہے۔ (قبض کی تعریف سلوک ۱۳ میں آچکی ہے) نیز جس طرح گناہوں سے قبض طاری ہو جاتا ہے اسی طرح قبض سے بھی گناہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

⑫ ﴿وَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ﴾

[سورة المائدة: 14]

ترجمة: اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان سے بھی عہد لیا تھا سو جو کچھ انہیں نصیحت کی گئی تھی اس کا بڑا حصہ وہ بھلا بیٹھے تو ہم نے ان میں باہم بغض و عداوت قیامت تک ڈال دی۔

تفسیر: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ گناہ جس طرح عذاب آخرت کا سبب بنتے ہیں اسی طرح عذاب دنیا کا بھی سبب بن سکتے ہیں (خانہ جنگی بھی یقیناً دنیا کا عذاب ہے)

⑬ ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ [سورة المائدة: 15]

ترجمۃ: اے اہل کتاب (یہود ونصاریٰ)! تمہارے پاس ہمارے یہ جو رسول آئے ہیں یہ تمہارے آگے کتاب الٰہی کے وہ مضامین کثرت سے کھول دیتے ہیں جنہیں تم چھپاتے رہتے ہو اور بہت سے امور کو نظر انداز بھی کر دیتے ہیں۔

تفسیر: یہود ونصاریٰ کی اس خیانت کا ذکر کیا جا رہا ہے جو آسمانی کتاب تورات وانجیل میں انہوں نے بہت سی باتوں کو چھپا دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان خیانتوں کو ظاہر کر دیا اور اپنے حلم وعفو کی خصلت کی وجہ سے تمہاری بہت ساری شرارتوں سے بھی صرف نظر کر لیا ہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ایسے ہی کچھ عادت اہل اللہ کی رہی ہے جب تک کوئی دینی مصلحت نہ ہو اپنے غیظ وغضب پر عمل نہیں کرتے اور اگر کسی سے عداوت بھی کرتے ہیں تو اپنے نفس کی تسکین کے لیے نہیں کرتے۔ (بلکہ اس کی اصلاح یا شعائر اسلامی کی سربلندی کے لیے کرتے ہیں)۔

۱۴ ﴿قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ [سورة المائدة: 27]

ترجمۃ: کہا: اللہ تو متقین کا عمل قبول کرتا ہے۔

تفسیر: حضرت آدم u کے دونوں بیٹے ہابیل وقابیل کا واقعہ ان آیات میں بیان کیا گیا ہے جب کہ ہابیل کے ایک نیک عمل کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرما لیا تھا اور قابیل کا عمل مردود ہو گیا تھا۔ اس پر ہابیل نے اپنے بھائی قابیل سے کہا تھا کہ اللہ تو صرف متقین کا عمل قبول کرتے ہیں۔ (تفصیل کے لیے "ہدایت کے چراغ" جلد ۱: صفحہ ۴۸ دیکھیے)

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ اپنے کسی کمال کا اظہار کرنا بطور شکر گزاری جائز ہے۔

۱۵ ﴿لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ﴾ [سورة المائدة: 28]

ترجمۃ: اگر تو مجھ پر میرے قتل کرنے کے لیے دست درازی کرے گا تب بھی میں تجھ پر تیرے قتل کے لیے ہرگز دست درازی نہ کروں گا، میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

تفسیر: قابیل اپنے بھائی ہابیل کو قتل کرنے کے درپے ہو گیا تھا لیکن ہابیل جو اللہ والا تھا، اپنے بھائی کے خون سے اپنے ہاتھ ملوث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ ہابیل نے اپنے بھائی قابیل کو جواباً قتل نہیں کیا اور خود قتل ہو گیا۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ ہابیل نے جواباً اپنے بھائی کے قتل سے احتیاط برتی معلوم ہوا کہ شُبہات سے احتیاط کرنا چاہیے۔ (چونکہ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب کہ مدافعۃً قتل کرنے کی اجازت نازل نہ ہوئی تھی۔)

ملحوظہ: شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ محدث لکھتے ہیں کہ اگر کوئی کسی کو ناحق مارنے لگے تو اس کو اجازت ہے کہ ظالم کو مار دے اور اگر صبر کرے گا تو شہادت کا درجہ پائے گا۔

یہ حکم اپنے مسلمان بھائی کے مقابلے میں ہے ورنہ جہاں انتقام و مدافعت میں شرعی مصلحت وضرورت ہو وہاں ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھے رہنا جائز نہیں، مثلاً کافروں اور ظالموں سے قتال کرنا ضروری ہے۔

جہاں تک شرعاً گنجائش ہے مسلمان بھائی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہ کئے جائیں۔

حضرت ایوب سختیانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امت محمدیہ میں پہلا شخص جس نے مذکورہ آیت پر عمل کر دکھایا وہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے باغیوں کے محاصرے کے وقت اپنا گلا کٹوا دیا لیکن کسی مسلمان کی انگلی کٹنے نہ دی۔ (ابن کثیر)

⑯ ﴿فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ﴾ [سورة المائدة: 31]

ترجمۃ: پھر وہ بڑا شرمندہ ہوا۔

تفسیر: قابیل اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر کے شرمندہ ہوا کیونکہ روئے زمین پر قتل انسانی کا یہ پہلا حادثہ تھا، اس سے پہلے کسی کو مرتا ہوا نہ دیکھا گیا تھا اور نہ مردہ انسان کی لاش کا انجام معلوم تھا (کہ کیا کیا جائے)۔

آخر ایک حقیر پرندے کوّے کی ہدایت و رہنمائی پر بھائی کے مردہ جسم کو دفن کر دیا، پھر حسرت وندامت میں یہ کہنے لگا: افسوس! مجھے اس حقیر پرندے کے برابر بھی عقل وشعور نہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قابیل کی یہ ندامت، توبہ واستغفار کی قسم نہیں ہے کیونکہ توبہ کی حقیقت میں ندامت وشرمندگی کے ساتھ معذرت اور فکر تدارک بھی شامل ہے (جو قابیل سے ثابت نہیں) بلکہ یہ طبعی ندامت تھی۔

⑰ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ﴾ [سورة المائدة: 35]

ترجمۃ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اللہ کا قرب تلاش کرو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

تفسیر: وسیلہ کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما مجاہد رحمہ اللہ قتادہ رحمہ اللہ حسن بصری رحمہ اللہ وغیرہم نے "قربت" لکھی ہے۔ وسیلہ تلاش کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ کا قُرب اور وصول تلاش کرو اور یہ نیک اعمال اختیار کرنے اور گناہوں سے دور رہنے سے حاصل ہوتا ہے۔ (ابن جریر، قرطبی، ابن قتیبہ، مدارک، روح المعانی)

اور جن لوگوں نے وسیلہ کے لفظ سے بزرگانِ دین سے استعانت اور استغاثہ (فریاد کرنا) ثابت کیا ہے انہوں نے عربی لفظ وسیلہ کو اردو لفظ وسیلہ کا ہم معنی سمجھا ہے جو ایک فاش غلطی ہے۔

روح المعانی کے مفسر علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس پر تفصیل سے بحث کر کے لکھا ہے کہ میت یا غائب شخص سے

دعا کروانے کے ناجائز ہونے میں کسی عالم کو بھی شک نہیں اور یہ ایسی بدعت ہے جس کا ارتکاب سلف صالحین میں سے کسی نے بھی نہیں کیا ہے۔

حضرات صحابہ سے بڑھ کر نیکی وثواب کا اور کون حریص ہوگا لیکن کسی ایک صحابی سے بھی ثابت نہیں کہ انہوں نے کسی بھی صاحب قبر سے کچھ طلب کیا ہو۔

نبی کریم ﷺ کے روضۂ مبارکہ کے سامنے دعا کرنے اور آپ کے وسیلے سے دعا کرنے سے بڑھ کر اور کوئی مقام نہیں ہوسکتا لیکن یہاں بھی صحابہ کرام نے دعا کرتے وقت قبلہ رخ ہوکر دعا کی ہے۔ حالانکہ روضۂ مبارکہ عرش عظیم سے بھی افضل مقام ہے۔

علاوہ ازیں وفات نبوی ﷺ کے بعد مسلمانوں پر بے پناہ مصائب وحوادث پیش آئے ہیں لیکن کسی صحابی نے بھی مرقد رسول اللہ ﷺ سے استعانت یا استغاثہ نہیں کیا۔

تو پھر بزرگان دین اولیاء اللہ کی قبروں سے استغاثہ کرنا کہاں درست ہوگا؟ یہ ساری گمراہی لفظ وسیلہ کے اردو معنی لینے سے پیدا ہوئی ہے جب کہ وسیلہ عربی لفظ ہے جس کے معنی قرب ونزدیکی ہیں (یعنی اللہ کی رضا و خوشنودی) اور اللہ کی رضا خوشنودی صرف اعمال صالحہ سے ملتی ہے نہ کہ بزرگانِ دین کی نذر و نیاز، یا دوفریاد، استعانت واستغاثہ سے۔ ولا حول ولا قوة الا بالله۔

سُلوك: روح المعانی کے مفسر نے لکھا ہے کہ توسل بالصالحین کے مسئلہ کو اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

⑱ ﴿فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ﴾ [سورة المائدة: 39]

ترجمة: پھر جو شخص اپنی ناشائستہ حرکت سے توبہ کرلے اور اپنی اصلاح کرلے تو بے شک اللہ اس پر توجہ کرے گا یعنی اس کا گناہ معاف کردے گا۔

تفسیر: آیت میں توبہ کے ساتھ اصلاح کا لفظ بھی آیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اسی کی توبہ قبول فرمائیں گے جو توبہ کے بعد اپنی اصلاح بھی کرلے مثلاً چوری، رشوت وغیرہ کا جو مال لیا تھا وہ اس کے مالک کو واپس کردے یا اس سے معاف کروالے اور جب مالک کو معلوم نہ ہو تو اتنا مال فقیروں میں صدقہ کردے۔ اسی طرح جھوٹ، غیبت، عزت ریزی وتہمت انگیزی وغیرہ میں صاحب حق سے معافی حاصل کرلینا بھی ضروری ہوگا۔

سُلوك: حکیم الامت ؒ نے فرمایا: توبہ کا معتبر ہونا اصلاح پر موقوف ہے۔

⑲ ﴿اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝﴾ [سورة المائدة: 50]

ترجمة: اب کیا جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہو؟ اور جو قوم اللہ پر ایمان رکھتی ہو اللہ سے بہتر فیصلہ کس کا ہوسکتا ہے۔

تَفسِیر: آیت میں ان لوگوں پر لتاڑ ہے جو خدائی نظام کے مقابلہ میں غیر قوموں کے قانون چلاتے ہیں یا اپنے خود ساختہ نظریات کو جاری کرنا چاہتے ہیں۔

سُلوك: علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ نے ایسے لوگوں کو قطعی کافر ٹھہرایا ہے اور ان سے جہاد کرنا واجب قرار دیا ہے۔

20 ﴿فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾ [سورة المائدة: 56]

ترجمة: اللہ کی جماعت ہی سب پر غالب ہے۔

تَفسِیر: اللہ کی جماعت سے مراد اہلِ ایمان ہیں جن میں اہل اللہ و خاصان خدا شامل ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ اہل اللہ پر اسبابِ مغلوبیت کا بظاہر کتنا ہی ہجوم ہو لیکن بوجہ توکل و تعلق مع اللہ ان کے قلوب غالب اور پرہمت ہی رہتے ہیں۔

21 ﴿قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ﴾
[سورة المائدة: 60]

ترجمة: آپ کہہ دیجئے: میں تم کو بتلاؤں ان میں سے کس کی بری جزا ہے اللہ کے ہاں؟ وہی جس پر اللہ نے لعنت کی اور ان پر غضب نازل کیا اور ان میں سے بعض کو بندر کر دیا اور بعض کو سور بنا اور جنہوں نے بندگی کی شیطان کی وہی لوگ بدتر ہیں درجے میں اور بہکے ہیں سیدھی راہ سے۔

تَفسِیر: یہودیوں کے ان فرقوں کا حال بیان کیا گیا ہے جو سرکشی و بغاوت میں اتنی دور نکل گئے تھے کہ آخر ان کا انجام حسف و مسخ کی شکل میں ظاہر ہوا، انہیں ذلیل و خوار بندر اور سور بنا دیا گیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ اگر دینی مصلحت ہو تو کسی کی مذمت کو کھول کر بیان کر دیا جائے، یہ عمل صبر و حلم کے خلاف نہیں ہوگا۔

22 ﴿وَ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ﴾
[سورة المائدة: 62]

ترجمة: اور آپ ان میں بہت سے ایسے آدمی دیکھتے ہیں جو دوڑ دوڑ کر گناہ اور ظلم اور حرام کھانے پر گرتے ہیں۔

تَفسِیر: یہودیوں کے عام اخلاق و عادات کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ ان کے اکثر افراد بہت ہی شوق و ذوق سے ہر قسم کے گناہوں کی طرف جھپٹتے ہیں۔ ان گناہوں کا اثر خواہ اپنی ذات تک محدود ہو یا دوسروں تک پہنچ جائے۔

(اثم سے مراد لازمی گناہ جس کا اثر ان کی اپنی ذات تک رہتا ہے اور عدوان سے مرد متعدی گناہ جس کا اثر دوسروں تک بھی پہنچ جائے) اس کے علاوہ حرام خوری تو ان کا عام شیوہ رہا ہے۔

یہ تو عام یہودیوں کے اخلاق و کردار تھے۔ ان کے خاص علماء و مشائخ کا حال اس سے بھی بدتر تھا جس کا

دوسری آیت میں تذکرہ موجود ہے۔[سورة التوبة: 34]

سُلوك: قدیم حکماء کی نفسی تحلیل کے مطابق اثم قوتِ نطقیہ سے صادر ہوتا ہے اور عدوان قوت غضبیہ سے پیدا ہوتا ہے اور حرام خوری قوت شہوانیہ سے پیدا ہوتی ہے۔

(علم تصوّف میں ان قوتوں کو ملکات نفسیہ کہا جاتا ہے۔انہی کی اصلاح سے انسان کامل ہوجاتا ہے)

﴿ يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ﴾

[سورة المائدة: 67]

ترجمة: اے پیغمبر! جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے وہ سب کا سب لوگوں تک پہنچادیں۔اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کا پیغام پہنچایا ہی نہیں۔

تفسير: آیت میں منصب رسالت کو بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی جانب سے جو بھی اعلانات، احکامات، ہدایات و تذکیر نازل ہورہی ہیں، ان کو مِنْ وعَنْ انسانوں تک پہنچادیا جائے، اس میں کسی قسم کی رو رعایت، خوف واندیشہ نہ کیا جائے، اللہ آپ کی حفاظت کے لیے کافی ہیں۔

منصب رسالت کی تکمیل وتعمیل کے لیے آپ کو ایسے الفاظ سے نصیحت کی گئی کہ اس سے زیادہ مؤثر عنوان اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ اگر آپ نے آیات کا کوئی حصہ چھپالیا یا نظر انداز کردیا تو سمجھا جائے گا کہ رسالت کا حق ادا نہ کیا۔

چنانچہ آپ نے بیس بائیس سال تک جس بے نظیر اولوالعزمی، جانفشانی، مسلسل صبر واستقلال سے منصب رسالت کو ادا کیا ہے اس کی مسلمانوں ہی نے نہیں، غیر مسلموں نے بھی کھلی شہادت دی ہے۔

پھر خود آپ نے بھی اپنی وفات سے ڈھائی ماہ پہلے حجۃ الوداع کے موقعہ پر چالیس ہزار سے زائد مسلمانوں کے اجتماع میں علی الاعلان یہ فرمادیا: ''اے اللہ! تو گواہ رہ میں نے تیری امانت کو پہنچادیا۔''

ملحوظه: آیت مذکورہ سے شیعہ مذہب کی کھلی تردید ہوجاتی ہے کہ ان لوگوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ قرآن حکیم ناقص ہے، اصل قرآن ان کے بارہویں امام ''غَارِ سُرَّ مَنْ رَّای'' (غار کا فرضی نام) میں لیے بیٹھے ہیں۔جب شیعہ برادری دنیا میں غالب آجائے گی تو وہ قرآن کا اصلی نسخہ لے کر باہر آئیں گے اور صحیح اسلام (یعنی شیعوں کا مذہب) پیش کریں گے پھر قیامت تک شیعہ مذہب ہی باقی رہے گا،

اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

اس پر سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا مقولہ کس قدر برمحل معلوم ہوتا ہے۔فرماتی ہیں: اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کا کوئی سا بھی جزء چھپایا ہوتا تو کم از کم یہی آیت ہوتی: ﴿ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ﴾ ۔(ابن کثیر)

سُلوك: فقہاء کرام نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح علماء امت کے لیے بھی کسی مسئلہ

شرعی کو چھپانا جائز نہیں۔ (قرطبی)

اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حق پرست علماء دین کے کام کو اپنے ذمے سمجھیں اور اپنی ضرورتوں کا کفیل اللہ کے فضل و کرم ہی کو سمجھتے رہیں۔

㉔ ﴿كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ﴾

[سورة المائدة: 70]

ترجمة: جب کبھی کوئی پیغمبر ان کے پاس ایسا حکم لایا جس کو ان کا نفس نہیں چاہتا تھا تو بعض کو تو جھٹلاتے تھے اور بعض کو قتل ہی کر ڈالتے تھے۔

تفسیر: یہودیوں کی قدیم تاریخ قتل انبیاء سے بھری پڑی ہے۔ یہ بے نصیب قوم نبیوں کو قتل کرنا اپنا کارنامہ سمجھا کرتی تھی تاریخی کتابوں میں لکھا ہے کہ بسا اوقات ایک ایک دن میں ستر نبیوں کو قتل کیا ہے۔

اُولوالعزم رسولوں میں سیّدنا زکریا اور سیّدنا یحیٰ علیہما السلام کو انہوں نے قتل کر دیا تھا، سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے بھی درپے ہو گئے تھے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا کہ تمام گناہوں کی بنیاد "اتباع ہویٰ" (نفسانی خواہشات کی پیروی) ہے۔

اس لیے صوفیاء کرام اس کو ضعیف و کمزور کرنے کے لیے سخت کوشش کرتے ہیں (مجاہدات کی غرض و غایت یہی ہوا کرتی ہے۔)

㉕ ﴿وَحَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ﴾ [سورة المائدة: 71]

ترجمة: اور وہ لوگ یہی گمان کرتے رہے کہ وبال کچھ نہ پڑے گا سو اندھے اور بہرے ہو گئے پھر اللہ نے ان پر رحمت سے نظر فرمائی پھر بھی ان میں بہت سارے اندھے و بہرے ہی رہے۔

تفسیر: آیت میں یہودیوں کی آخرت فراموشی اور دنیا سازی کا حال بیان کیا گیا ہے کہ پختہ عہد و پیمان، اطاعت توڑ کر اللہ سے بغاوت کی، اس کے رسولوں کو جھٹلایا، بعض کو قتل کیا اور بعض کو قید کیا۔ ایسے شدید جرائم کر کے مطمئن و بے فکر ہو گئے کہ اس کا انجام کچھ نہ ہوگا، اس طرح خدائی نظام سے بالکل ہی اندھے و بہرے ہو گئے، اللہ نے ان پر ظالم بادشاہ بُخت نصر (بابل کا بادشاہ) مسلط کر دیا جس نے صرف ایک دن میں ستّر ہزار یہودیوں کو قتل کیا اور بیت المقدس کو ویران کیا اور ستّر ہزار سے زائد یہودیوں کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ بابل لے آیا۔ اس وقت ان لوگوں نے توبہ کی، اللہ ان پر متوجہ ہوا پھر

فارس کے بادشاہوں نے انہیں بخت نصر کی غلامی سے نجات دلا کر بیت المقدس واپس کروا دیا۔
لیکن اس کے کچھ عرصے بعد پھر وہی شرارتیں کرنے لگے اور بالکل اندھے بہرے ہوگئے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت مذکورہ سے استنباط کیا کہ گناہوں پر اصرار سے استعداد بالکل ہی مضمحل ہوجاتی ہے۔ اسی کو بطلان استعداد کہا جاتا ہے۔

(یعنی گناہوں کو مسلسل کرتے رہنے سے حق قبول کرنے کی صلاحیت جو ہر انسان کے قلب میں اللہ نے ودیعت رکھی ہے، سست و کمزور ہوجاتی ہے پھر نیکی اور سچائی کی طرف قلب مائل نہیں ہوتا، صوفیاء کی اصطلاح میں اسی کو بطلانِ استعداد کہا جاتا ہے)

قرآن و حدیث میں بھی اس بُری کیفیت کا ذکر ملتا ہے۔

﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [سورة التطفيف: 14]

ان کے دلوں میں زنگ چڑھ گیا ہے۔

26 ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ [سورة المائدة: 72]

ترجمة: یقیناً وہ کافر ہوگئے جنہوں نے کہا: خدا ہی تو مسیح بن مریم ہے۔

تَفسِیر: عیسائیوں کا بنیادی عقیدہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حقیقی خدا سمجھا کرتے ہیں اور اس کی تاویل ان لوگوں نے یہ کی کہ خدا خود اپنے آپ مسیح بن مریم میں حلول (جذب) کرچکا ہے۔

دنیا کے عجائبات میں ایک یہ بھی ہے کہ عقلاً جو عقیدہ جتنا زیادہ مستبعد ہو، اسی قدر خوش عقیدگی سے قریب ہوتا ہے۔ عیسائیوں کے ہاں یہی حال مسیح بن مریم کا ہے کہ وہ بندہ اور خدا ایک ہونے پر غور تک نہیں کرنا چاہتے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مذکورہ آیت میں حلول و اتحاد کا کھلا ردّ ہے جیسا کہ بعض جاہل صوفیاء اس کے قائل رہے ہیں۔

27 ﴿قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا﴾ [سورة المائدة: 76]

ترجمة: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کے سوا ایسے کی عبادت کرتے ہو جو تمہیں نہ نقصان پہنچا سکے نہ نفع۔

تَفسِیر: عیسائیوں کے ہاں یہ بات نہایت فخر سے بیان کی جاتی ہے کہ کلیسا نے اپنی طویل تاریخ میں کبھی ایسا نہیں کیا کہ خدا کے ساتھ مسیح سے بھی دعا نہ کی ہو۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت میں تردید ہے ان لوگوں کی جو مشائخ کو مستقل متصرف سمجھتے ہیں۔ (اور اختیارات کا انہیں حامل سمجھتے ہیں۔)

28 ﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا﴾

[سورة المائدة: 82]

ترجمة: آپ لوگوں میں ایمان والوں کے ساتھ سب سے بڑھ کر دشمنی رکھنے والے یہود اور مشرکین کو پائیں گے اور ایمان والوں کے ساتھ دوستی میں سب سے زیادہ قریب انہیں پائیں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں۔

تفسیر: آیت میں مسلمانوں کا شدید دشمن یہودیوں اور مشرکین کو بتایا گیا ہے اور دوستی و محبت میں قریب تر نصاریٰ کو کہا گیا ہے کہ یہ لوگ دوستی میں مسلمانوں سے قریب تر ہیں اور یہ اس وجہ سے کہ ان میں علم دوست شب بیدار علماء اور تارک دنیا درویش ہوا کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان کے قلوب میں تواضع و انکساری پائی جاتی ہے (جو اسلامی اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں۔)

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ علم و اخلاق کو اعمال میں عظیم دخل ہے۔ اس لیے مشائخ طریقت نے علم و اخلاق کا اہتمام عمل سے زائد رکھا ہے۔

ملحوظه: مذکورہ آیت میں نصاریٰ کو مسلمانوں کا قریبی دوست قرار دیا گیا ہے۔ یہاں عوام الناس کو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ انہوں نے لفظ نصاریٰ اور عیسائیوں کو ایک ہی سمجھا ہے اور پھر یہ فرض کرلیا ہے کہ یہودیوں اور مشرکوں کی بہ نسبت عیسائی لوگ مسلمانوں کے قریبی دوست ہیں، یہ ایک قدیم غلط فہمی چلی آرہی ہے جس میں بعض اہل علم بھی شریک ہوگئے ہیں۔

آیت میں عیسائی یا مسیحی سرے سے مراد ہی نہیں ہیں بلکہ نصاریٰ سے مراد نصاریٰ ہی ہیں (جمع نصرانی)۔ یہ فرقہ توحید کا قائل تھا اور سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کو نبی و رسول تسلیم کرتا تھا، خدا یا خدا کا بیٹا یا شریک خدا نہیں کہتا تھا۔

عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہی فرقہ حق پر تھا، اسی فرقے کا ذکر قرآن حکیم کی مذکورہ بالا آیت میں کیا جارہا ہے۔ یہ حق پرست فرقہ نصرانی یا ناصری کہلاتا تھا جو عہد نبوت میں موجود تھا۔ اسی فرقے کے نصرانی بکثرت اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ موجودہ زمانے ۱۹۹۶ء میں ان کا وجود خال خال ہی پایا جاتا ہے۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا آبائی وطن ناصرہ ملک شام (موجودہ فلسطین) کا چھوٹا شہر تھا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام یہاں آکر بس گئے تھے۔ اسی نسبت سے جو لوگ آپ پر ایمان لائے، انہیں ناصری یا نصرانی کہا جانے لگا۔ یہ لوگ اصلی دین پر قائم تھے اور اس کی سچی پیروی کرتے تھے۔ یہ لوگ موجودہ اناجیل اربعہ کے قائل نہ تھے۔ صرف انجیل متیٰ کو تسلیم کرتے تھے جو حقیقی آسمانی کتاب تھی۔ یہ کتاب بھی صدیوں سے اب غائب ہے، اس کا کوئی صحیح نسخہ موجودہ دنیا میں پایا نہیں جاتا بس ترجمے در ترجمے رہ گئے ہیں۔

29 ﴿وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ﴾ [سورة المائدة: 83]

ترجمۃ: اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو پیغمبر پر نازل کیا گیا ہے تو آپ ان کی آنکھیں دیکھیں گے ان سے آنسو بہہ رہے ہوں گے، یہ اس لیے انہوں نے حق کو پہچان لیا۔

تفسیر: اسلام کی پہلی ہجرت جو مکۃ المکرمۃ سے ملک حبشہ کی طرف کی گئی تھی اس کے شرکاء میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ بھی تھے جنہوں نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے دربار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا تعارف کروایا تھا، شاہ نجاشی کی خواہش پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم کی آیات تلاوت کیں، نجاشی اور اہل دربار رو پڑے اور اقرار کیا کہ بے شک یہ وہی کلام ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ایک وفد جو ستر نومسلم نصاریٰ پر مشتمل تھا، مدینہ منورہ آیا۔ یہ لوگ مسجد نبوی میں قرآن پاک کی سماعت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آنکھوں سے آنسو اور زبان پر رَبَّنَآ اٰمَنَّا کے الفاظ جاری ہو گئے۔

سلوك: تفسیر قرطبی کے مفسر نے لکھا ہے کہ اکثر ایسے مواقع پر اہل علم کا تاثر اسی قسم کا ہوا کرتا ہے۔ وہ ہائے وائے نہیں کرتے البتہ ان کے آنسو بہنے لگتے ہیں (زیادہ ہنسنا جس طرح غفلت کی دلیل ہے اسی طرح رقت قلب بیداری روح کی علامت ہے۔)

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کلام حق سے متاثر ہو کر آبدیدہ ہونا اور گریہ طاری ہو جانا صالحین کی سنت ہے۔

⑳ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا﴾ [سورۃ المائدۃ: 87]

ترجمۃ: اے ایمان والو! اپنے اوپر ان پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ کرلو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں اور حدود سے آگے نہ نکلو۔ بے شک اللہ حدود سے آگے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

تفسیر: اہل علم حضرات نے لکھا ہے کہ شریعت میں جو چیزیں حلال و پاکیزہ ہیں، ان کو ترک کر دینے میں کوئی فضیلت نہیں ہے کہ جیسا کہ بعض خود ساختہ مذہبوں نے ترک لذائذ کو ایک معیاری اور بزرگی سمجھی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے کے علاوہ مرغ کا گوشت بھی تناول کیا ہے، فوائد اور حلوے و شیرینی اور دوسری لذیذ اشیاء بھی آپ نے نوش فرمائی ہیں۔ (جصاص، مدارک)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جو چاہو کھاؤ پیو البتہ اسراف اور فخر و نمائش سے احتراز رکھو۔ (جصاص)

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت میں ترک حیوانات کا ابطال ہے جو بعض مدعیان طریقت کا شیوہ رہا ہے۔

㉚ ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ﴾ [سورۃ المائدۃ: 91]

ترجمۃ: شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں دشمنی اور کینہ، شراب اور جوے کے ذریعہ ڈال دے

اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، سواب بھی تم باز آؤ گے؟

تفسیر: شراب نوشی اور جوے بازی کی مضرتوں اور آفتوں پر اگر لکھا جائے تو ضخیم کتاب مرتب ہو جائے گی لیکن قرآن حکیم نے اس کی دو ② بنیادی مضرتیں بیان کی ہیں جو جسم وروح سے متعلق ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ملت میں اختلاف وفساد کا ذریعہ ہیں اور دوسری مضرت یہ کہ وہ اللہ کی یاد اور نماز سے دور کر دیتی ہیں۔ شرابی اور جواری کو نماز پڑھتے کم دیکھا گیا ہے۔

ہندوستان کے قدیم ترین قصے مہابھارت، عرب جاہلیت کی عام معاشرت کے علاوہ موجودہ دنیا کے فرہنگی نظام کی مہذب آبادی اس نجاست کی وجہ سے جس دلدل میں پھنسی ہوئی ہے، اس کا مشاہدہ آنکھوں سے کیا جا سکتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ گناہوں میں جہاں اُخروی مضرتیں ہیں دنیاوی قباحتیں بھی بہت ہیں۔

ملحوظہ: صحابہ کرام جو آیت کے اول مخاطب ہیں آیت کے سنتے ہی پکار اٹھے: اِنْتَهَيْنَا رَبَّنَا، اِنْتَهَيْنَا رَبَّنَا اے رب! ہم باز آ گئے، ہم باز آ گئے، اس دن مدینہ کی نالیوں میں شراب بہہ رہی تھی۔

یہ انقلاب عرب کے اس امی صفت معلم ﷺ کی تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا کہ دم کے دم میں بڑے بڑے پرانے عمر بھر کے شرابیوں، جواریوں کو پاک باز و متقی بلکہ پاک بازوں اور صالحین کا سردار بنا دیا۔

اکبرالٰہ آبادی کہتے ہیں:

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کردیا (ﷺ)

㉛ ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَقۡتُلُواْ ٱلصَّيۡدَ وَأَنتُمۡ حُرُمٞ ﴾ [سورة المائدة: 95]

ترجمة: اے ایمان والو! شکار نہ مارو جب کہ تم حالت احرام میں ہو اور اگر تم میں سے کوئی اس کو دانستہ مارے گا تو اس کا جرمانہ اسی طرح کا جانور ہو گا جس کو اس نے مارا ہے اور اس کا فیصلہ تم میں دو (۲) معتبر آدمی کریں گے، خواہ وہ جرمانہ جانوروں کا ہو جو نیاز کے طور پر خانہ کعبہ تک پہنچائے جاتے ہوں، خواہ مسکینوں کو کھانا کھلا دیا جائے یا اس کے مساوی روزے رکھ لیے جائیں تا کہ وہ اپنے کیے کی شامت کا مزہ چکھے۔

تفسیر: اللہ کی طرف سے مطیع فرمانبردار بندوں کا امتحان لیا جاتا ہے جیسا کہ سابقہ امتوں کے انسانوں کا امتحان لیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ حالت احرام میں (خواہ وہ احرام حج کا ہو یا عمرہ کا) شکار نہ کیا جائے جب کہ شکار سامنے ہو۔ یہ سہولت پکڑنے کی صورت بھی موجود ہے، ظاہراً یہ حکم وہی شخص پورا کر سکتا ہے جو اللہ کے احکام پر یقین رکھتا ہے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب یہ حکم نازل ہوا تھا تو اس وقت شکار اس قدر قریب اور کثیر تھا کہ ہاتھوں اور نیزوں سے مار سکتے تھے مگر صحابہ کرام نے اس کا ایسا امتحان دیا کہ ان کے برابر دنیا کی کوئی قوم کامیاب نہ ہوسکی۔

مسئلہ یہ ہے کہ اگر حالت احرام میں شکار پکڑ لیا ہو تو ضروری ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے اور اگر مار دیا ہو تو دو تجربہ کار معتبر آدمی (جنہیں جانوروں کی خرید وفروخت کا تجربہ ہو)، اس مارے ہوئے جانور کی قیمت کا تعین کریں پھر اس قیمت سے ایک جانور خرید کر کعبہ کے قریب حدود حرم میں ذبح کردیں اور اس کا گوشت صدقہ کردیا جائے۔

یا دوسری صورت یہ کہ اسی قیمت کا غلّہ خرید کر محتاجوں میں ہر ایک مسکین کو بقدر صدقۃ الفطر تقسیم کردیا جائے یا تیسری صورت یہ بھی ہے کل غلّہ بقدر صدقۃ الفطر جتنے فقیروں کو پہنچتا ہے اتنے دنوں کے روزے رکھے جائیں (مثلاً جس کی صدقۃ الفطر کی مقدار دس مسکینوں کو ملتی ہو تو دس ⑩ روزے رکھے جائیں۔)

ملحوظہ: حالت احرام میں جنگل کا شکار کرنا تو منع ہے لیکن دریا کا شکار یعنی مچھلی پکڑنا جائز ہے۔ اسی طرح دریا کا طعام یعنی جو مچھلی پانی سے جدا ہو کر مرگئی ہو، وہ بھی حلال ہے۔ ﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ﴾

البتہ حدود حرم کے اندر شکار پکڑنا یا مارنا ممنوع ہے بلکہ شکار کو ڈرانا اور وحشت زدہ کرنا بھی ممنوع ہے۔ خواہ حالت احرام میں ہوں یا غیر احرام میں عام حالت میں ہوں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس پوری آیت میں اہل ریاضت کے اس طریق کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ لوگ اپنی پہلی خطا پر اپنے نفس کو ایسی سزا دیتے ہیں جس کا تحمل کچھ آسان ہوتا ہے اور اگر وہ خطا پھر عود کر آئے تو اسے ایسی سزا دیتے ہیں جو اس پر قدرے بھاری و دشوار ہو۔

㉜ ﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ﴾ [سورة المائدة: 96]

ترجمة: تمہارے لیے دریائی شکار اور اس کا طعام حلال کیا گیا ہے تمہارے لیے اور قافلوں کے لیے۔

تفسیر: حالت احرام میں مطلقاً شکار کرنا تو منع تھا لیکن دریائی سمندری شکار جائز رکھا گیا ہے۔ یہ حاجیوں اور مسافروں کی نفع رسانی اور فائدے کے لیے حلال کیا گیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ زہد میں تعدیل رکھنی چاہیے، غلو شدت سے احتراز ضروری ہے۔ (زہد کے معنی یہ نہیں کہ ترک حیوانات، ترک لذات کردیا جائے بلکہ اس میں اعتدال رکھا جائے، نہ اسراف ہو، نہ بے جا خرچ ہو اور نہ نام ونمود وشہرت ہو۔)

㉝ ﴿قُل لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ﴾ [سورة المائدة: 100]

ترجمة: آپ فرمادیں کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں ہوسکتے گو تم کو ناپاک کی کثرت تعجب میں ڈالتی ہو۔

تفسیر: ناپاک وحرام چیزوں کی کثرت خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو اور وہ بھلی بھی لگتی ہوں، اس کے قریب نہ جانا

چاہیے، ہر زمانے میں بدی اور ناپاک چیزوں کی کثرت رہی ہے اور آج بھی موجود ہے۔
ایمان والوں کے لیے یہی چیزیں ابتلاء و آزمائش کی حیثیت رکھتی ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: عالم روحانیت میں جو چیزیں گندی اور خبیث ہیں، وہ عالم جسمانیت میں خوبصورت اور لذت والی دکھائی دیتی ہیں۔
لیکن ان کی ظاہری کثرت اور لطف و لذت عالم آخرت میں دائمی و ابدی لذتوں سے محروم کر دینے والی ہیں۔
اس لیے آیت میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ پاکی اور ناپاکی کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ (تفسیر کبیر)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ حق پرستوں کی قلت کے مقابلہ میں اہل باطل کی کثرت سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔ (کہ حق انہی کے پاس ہے)
(سنت اللہ یہی رہی ہے کہ حق قلت ہی میں رہا ہے)

34 ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ﴾ [سورة المائدة: 103]

ترجمة: اللہ نے بحیرہ کو جائز کیا ہے نہ سائبہ کو اور نہ وصیلہ کو اور نہ حامی کو البتہ جو لوگ کافر ہیں وہی اللہ پر جھوٹ جوڑتے رہتے ہیں۔

تَفسِير: بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حامی یہ زمانہ جاہلیت میں بتوں کے نذر و نیاز والے جانور کے نام ہیں۔
حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ نے ان کی وضاحت اس طرح کی ہے:

بحيرہ:

ایسا جانور جس کا دودھ بتوں کے نام وقف کیا جاتا تھا، کوئی اپنے استعمال میں نہیں لایا کرتا۔

سائبة:

ایسا جانور جو بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا پھر اس کا کوئی مالک نہ ہوا کرتا۔

وصيلة:

وہ اونٹنی جو مسلسل مادہ بچے جنے درمیان میں نر بچہ نہ جنی ہو۔

حامی:

وہ نر اونٹ جو ایک خاص عدد جفتی کر چکا ہو اس کو بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ (بخاری)
مذکورہ بالا آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کی گھڑی ہوئی رسمیں اور ایسے جانوروں کا ادب و احترام من گھڑت اور خام خیالی ہے، ان کی نہ کوئی حقیقت ہے اور نہ یہ جانور اس طرح قابل احترام ہو جاتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت شریفہ میں اہل جاہلیت کی ان بدعتوں کا ابطال ہے جو جانوروں کو غیر اللہ (بتوں) کے نامزد کر دیا کرتے تھے، جیسا کہ آج کے دور میں بعض جہلاء ارواح طیبہ سے تقرب

حاصل کرنے کے لیے ایسا ہی کرتے ہیں (جیسا شاہ مدار کی گائے، شیخ سدو کا بکرا، جہانگیر پیران کی بکری، اجالے شاہ کا مرغا، بی بی کی صینک، شیخ جیلانی کے کنڈے، اجمیر شریف کا حلوہ وغیرہ وغیرہ۔)

۳۵ ﴿وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَی الرَّسُوۡلِ قَالُوۡا حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡهِ اٰبَآءَنَا﴾ [سورة المائدة: 104]

ترجمۃ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ نازل کیا ہے اس کی طرف اور رسول کی طرف آؤ تو کہتے ہیں: ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا ہے۔

تفسیر: زمانہ قدیم کے ہر دور میں اسی جواب سے نبیوں کا انکار کیا گیا ہے اور ہر قوم نے یہی بات دوہرائی ہے اور آج بھی جاہلی مذاہب اسی فلسفہ پر قائم ہیں۔ ہندوستان کی بڑی آبادی کے پاس آج نہ کتاب ہے نہ کسی آسمانی رسول کی تعلیم محفوظ ہے۔ بس رسومات کا ایک مجموعہ ہے جو مجہول الحال پنڈتوں، رشیوں، جوگیوں، برہمنوں سے چلا آرہا ہے اور اس پر آنکھیں بند کر کے پوجا ہو رہی ہے۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں تردید ہے جاہل صوفیوں کے ان طریقوں کی جب ان کے سامنے کتاب اور سنت پیش کی جاتی ہے تو وہ اپنے مشائخ کے معمولات سے سند پکڑتے ہیں اور اس کو کافی سمجھتے ہیں۔

۳۶ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَیۡكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ ۚ لَا یَضُرُّكُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اهۡتَدَیۡتُمۡ﴾ [سورة المائدة: 105]

ترجمۃ: اے ایمان والو! تم اپنی فکر میں لگے رہو۔ کوئی بھی گمراہ ہو جائے اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں جب کہ تم راہ پر ہو۔

تفسیر: مطلب یہ کہ آباؤ اجداد کی اندھی تقلید، کفر و شرکیہ رسم و رواج سے نصیحت کرنے کے بعد بھی لوگ باز نہیں آتے لہٰذا تم اس غم میں نہ پڑو، کسی کی گمراہی سے تمہارا نقصان ہونے والا نہیں جب کہ تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو۔ سیدھی راہ یہ ہے کہ ایمان و تقویٰ اختیار کر لیں، خود برائی سے بچتے رہیں اوروں کو بھی روکنے کی امکانی کوشش میں لگے رہیں اور بس۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہی طریقہ عارفین سالکین کا ہے کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کر دینے کے بعد نتائج کا انتظار نہیں کرتے۔

۳۷ ﴿اِذۡ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ هَلۡ یَسۡتَطِیۡعُ رَبُّكَ اَنۡ یُّنَزِّلَ عَلَیۡنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ [سورة المائدة: 112]

ترجمة: جب حواریوں نے کہا: اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا آپ کا رب یہ کرسکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے بھرا دسترخوان اتارے؟

تفسیر: یہ بیہودہ فرمائش یہودیوں کی کوئی نئی نہ تھی۔ اس سے پہلے بھی عجیب وغریب فرمائشیں کرتے رہے ہیں جس سے صرف نبیوں کو پریشان کرنا مقصود ہوا کرتا تھا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اولیاء اللہ سے خرقِ عادت اشیاء کا طلب کرنا اسی قسم میں شمار ہوتا ہے۔ (خرقِ عادت قانون فطرت کے خلاف عمل کو کہا جاتا ہے)

﴿وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [سورة المائدة: 116]

ترجمة: (اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب اللہ فرمائے گا: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے علاوہ مجھے اور میری ماں (مریم) کو بھی معبود بنالو؟

عیسیٰ (علیہ السلام) عرض کریں گے: پاک ہے تو (اس نسبت سے) میرے لیے یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں ایسی بات کہہ دوں جس کا مجھے کوئی حق ہی نہ تھا۔ اگر میں نے کہا ہوتا تو یقیناً آپ کو اس کا علم ہوتا۔

تفسیر: اللہ کے اس سوال کا منشاء، استفہام یا استفسار کرنا نہیں ہے بلکہ مسیح پرستوں اور مریم پرستوں پر مزید حجت قائم کرنا اور انہیں اور زیادہ لاجواب کرنا ہے۔

سلوك: امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوال کا جواب بجائے "مَا قُلْتُ" (میں نے ایسا نہیں کہا) کہنے کے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اس علم کو اللہ تعالیٰ کے حوالے قرار دیا کہ "آپ بہتر جانتے ہیں۔" یہی عنوان ادب واحترام کے زیادہ مناسب ہے کہ بڑوں کو دوبدو جواب دینے میں اکثر بے ادبی کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔

سُوْرَةُ الْاَنْعَام

پَارَہ: 7

❶ ﴿وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ﴾ [سورة الأنعام: 7]

ترجمۃ: اور اگر ہم کاغذ پر لکھا ہوا کوئی نوشتہ آپ ﷺ پر نازل کرتے پھر اس کو یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے تب بھی کافر لوگ یہی کہتے کہ یہ کچھ بھی نہیں مگر کھلا ہوا جادو ہے۔

تفسیر: کافروں کے ضد وعناد کی کیفیت بیان کی جارہی ہے کہ یہ لوگ قرآن سننا تو درکنار اس بارے میں غور و فکر کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں تو پھر انہیں ہدایت و رہنمائی کیونکر ملے گی۔

جیسا کہ بعض معاندین کا اصرار تھا کہ اگر قرآن اللہ کی کتاب ہے تو پھر تورات وانجیل کی طرح کتابی شکل میں کیوں نازل نہیں ہوئی؟ آیت میں اسی کا جواب دیا جارہا ہے کہ اگر کوئی حق قبول کرنے کا ارادہ ہی نہ کرے بلکہ اس کی مخالفت ہی کرنی مقصود ہے تو کوئی بھی دلیل کرنے کا ارادہ ہی نہ کرے بلکہ اس کی مخالفت ہی کرنی مقصود ہے تو کوئی بھی دلیل اس کے لیے بے کار اور غیر مؤثر ہوجاتی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت میں معاندین (عناد والوں) کا حال بیان کیا جارہا ہے کہ وہ کسی بھی طرح مستفید نہیں ہوتے، اہل طریق ایسے لوگوں کے زیادہ درپے نہیں ہوا کرتے ہیں۔

❷ ﴿قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾

[سورة الأنعام: 14]

ترجمۃ: آپ فرمادیں گے کہ مجھ کو حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے اسلام قبول کروں اور تم کہیں مشرکین میں نہ ہوجانا۔

تفسیر: ایمان اور ایمان کے تقاضوں کا سب سے پہلے خود نبی ورسول کو پابند ہونا پڑتا ہے، وہ امت کے لیے نمونہ اور رہنما دونوں حیثیت والا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اہل ایمان کی صفوں میں سب سے آگے ہوا کرتا ہے، اسی کا ذکر کیا جارہا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تکالیف شرعیہ (احکامات وہدایات شرعیہ) کسی سے تاحیات ساقط نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ نبیوں سے بھی (زندگی کے آخری لحہ تک وہ پابند شریعت ہی رہتے ہیں)۔

❸ ﴿وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ﴾ [سورة الأنعام: 17]

ترجمۃ: اور اگر اللہ تجھ کو کچھ دکھ پہنچائے تو اس کا دور کرنے والا کوئی نہیں سوائے اللہ کے اور اگر وہ تجھ کو بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر: آیت مذکورہ توحید کی اساس ہے کہ دنیا کا کوئی نفع یا نقصان اللہ کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا۔ کائنات کی تمام حرکات وسکنات اللہ کے قائم کردہ نظام کے تحت قائم ہیں، وہ اس کائنات میں جو چاہے تصرّف کرسکتا ہے، ساری مخلوق جواب دہ ہے، وہ کسی جواب کا پابند نہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت میں نفی ہے غیر اللہ سے مستقل تصرّف کی حتّٰی کہ مقبولین بارگاہ سے بھی۔

4 ﴿وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِن يُهْلِكُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾﴾

[سورة الأنعام: 26]

ترجمة: اور یہ لوگ اس نبی سے اوروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی اس سے الگ رہتے ہیں۔ ایسے لوگ خود اپنے آپ کو تباہ کررہے ہیں اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔

تفسیر: آیت کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ خاندانِ نبوت کے بعض لوگ جیسے خواجہ ابو طالب اور ان کے ماتحت لوگ مخالفین کے ضرر ونقصان کو نبی کریم ﷺ سے روکا کرتے تھے لیکن خود یہ لوگ آپ پر ایمان لانے سے دور رہا کرتے تھے، گویا رسول اللہ کی حفاظت ودفاع میں مستعد تھے لیکن اپنی نجات کی انہیں فکر نہ تھی۔ اس طرح یہ لوگ خود اپنے آپ ہلاکت سے دوچار رہے ہیں۔ (تفسیر کبیر)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اہل اللہ کے ساتھ طبعی محبت بغیر عقلی محبت کے مفید نہیں۔ مطلب یہ کہ جب کسی سے طبعی محبت ہے تو اس کا اتباع کرنا چاہیے اور اس کے منشاء ومراد کو بھی پورا کرنا چاہیے، محض رشتہ ناطہ آخرت کی نجات کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ عقلی محبت یہ ہے کہ عقل سے کام لے اور ایمان قبول کرلے۔

5 ﴿فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [سورة الأنعام: 44]

ترجمة: پھر جو وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی انہیں نصیحت کی جاتی رہی ہے تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ اترانے لگے ان نعمتوں پر جو انہیں دی گئیں، اچانک انہیں ہم نے پکڑ لیا اور پھر وہ ناامید رہ گئے۔

تفسیر: آیت میں انسان کی اس خطرناک غفلت پر تنبیہ کی جارہی ہے کہ کسی بھی جرم وگناہ پر انسان کو متنبہ ہوجانا چاہیے لیکن مجرم نے ایسا نہ کیا اور مستقل گناہ وغفلت میں پڑا رہا تو سنت اللہ یہی رہی ہے کہ مجرم کو لمبی ڈھیل دی جاتی ہے اور اس کو اللہ کی نعمتوں میں اضافہ ہی نظر آنے لگتا ہے اور وہ اس پر مزید بھول وغفلت میں پڑجاتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی بھی وقت اس کو دفعۃً پکڑ لیا جاتا ہے اور ساری نعمتیں اور چین وسکون چھین لیے جاتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ بعض سالکین کو گناہ اور غفلت کے باوجود ذوق وحال

باقی رہا ہے جس پر وہ فخر کرنے لگتا ہے کہ اب اللہ کا فضل و کرم شامل حال ہوگیا ہے، نسبت مع اللہ مضبوط ہوگئی ہے، اب کوئی اندیشہ نہیں۔ یہ کیفیت استدراج کہلاتی ہے۔ (خطرناک ڈھیل) جو کسی بھی وقت سلب کر لی جاسکتی ہے۔

⑯ ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾[سورة الأنعام: 52]

ترجمة: اور آپ ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کیجئے جو صبح وشام اپنے رب کو اس کی رضاجوئی کے لیے پکارا کرتے ہیں۔

تَفسِیر: مراد اس سے وہ غریب مسلمان ہیں جنھوں نے اخلاص کے ساتھ ایمان قبول کیا ہے۔ ان کی غربت اور ان کا خستہ پستہ حال ایسا نہیں ہے کہ محض اس وجہ سے انہیں اپنے سے دور رکھا جائے۔

یعنی کسی شخص کی عزت وتکریم اس کی خوش لباسی کی بناء پر اور کسی کی تحقیر وتذلیل اس کی بدلباسی کی بناء پر کرنا دونوں درست نہیں۔ (قرطبی)

اصل عزت وفضیلت ایمان اور نیک عمل کی وجہ سے ہوا کرتی ہے، دنیا کے مال ومتاع کی کثرت یا قلت عزت وذلت کا معیار نہیں ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا: آیت سے یہ بھی اخذ ہوسکتا ہے کہ مشائخ اپنے مریدوں کو بلا مصلحت شرعی اپنے سے دور نہ رکھیں، ان کے پاس مقید ہو کر بیٹھیں رہیں اور انہیں رحمت وسلامتی کی بشارت دیں۔

⑰ ﴿قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً﴾

[سورة الأنعام: 63]

ترجمة: آپ کہیے کہ تمھیں کون نجات دیتا ہے خشکی وسمندر کی تاریکیوں سے اور تم اسے پکارتے رہتے ہو عاجزی سے اور چپکے چپکے کہ اگر وہ ہم کو نجات دے دے ان مصیبتوں سے تو ہم یقیناً شکر گزاروں میں داخل ہو کر رہیں گے۔

تَفسِیر: آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مصائب وآلام کے وقت جب کہ تمام ظاہری اسباب ختم ہوجاتے ہیں اور نجات وخلاصی سے ناامیدی ہوجاتی ہے، خاص طور پر سمندروں میں سفر کرتے وقت تو ایسے مواقع پر تمہاری بشری فطرت خود بخود پکار اٹھتی ہے اور اللہ کی جانب متوجہ ہو کر دعا وزاری کے لیے ہاتھ اٹھوا دیتی ہے۔ اس وقت آدمی سوائے خدا کے سہارے کے اور کوئی سہارا نہیں پاتا۔ کیا یہ بات کافی نہیں کہ خدا ہی تمہارا مالک اور خالق ہے؟

پھر اس کو چھوڑ کر دوسروں کا سہارا کیوں تلاش کرتے ہو۔

توحید کا یہ فطری تقاضہ ہے جو اللہ نے ہر انسان کے قلب میں امانت رکھی ہے۔ اسی تقاضے سے انسان اپنے

رب کو پہچان لیتا ہے اور یہی فطری احساس ایمان لانے کے لیے حجت و دلیل بھی ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت میں مصیبت زدہ انسان کے لیے چار صفات کا اثبات کیا ہے۔

① دعا ② تضرّع ③ اخلاص قلب ④ احساس شکر گزاری

گویا مصیبت کو دور کرنے کے لیے یہ چار عمل ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مذکورہ آیت کے عموم سے ذکر الٰہی کی مختلف صورتیں مفہوم ہوتی ہیں۔ خفی، جلی، قلبی، لسانی، آیت سے ہر قسم کے ذکر کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

⑧ ﴿وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ [سورة الأنعام: 70]

ترجمة: اور ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کش ہو جایئے جنہوں نے اپنے دین کو لہو و لعب بنا رکھا ہے اور دنیاوی زندگی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔

تفسیر: دین کی دعوت و تبلیغ سے صرف وہی لوگ ہدایت پاتے ہیں جن میں اپنے انجام کا احساس باقی ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے دین و مذہب کو خواب و خیال سمجھ رکھا ہے اور دنیا کی زندگی ہی کو اپنا میدان سمجھ رکھا ہے، ایسے لوگ نصیحت و خیر خواہی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ایسے لوگوں سے دور رہنا ہی بہتر ہوا کرتا ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر روح المعانی میں آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ مذکورہ آیت میں دین کے ایک معنی عادۃً بھی ہیں اور عید کو عید اس وجہ سے بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ہر سال عود کر آتی ہے۔ (روح المعانی)

کافروں نے اپنی عیدوں کو کھیل کود کی طرح بنالیا ہے لہٰذا آپ ان کے میلے ٹھیلوں سے دور رہیے۔ اسلام کی عیدیں لہو و لعب کی طرح نہیں، یہ خالص عبادتیں ہیں جن کو عبادت ہی کے طور پر منانا چاہیے اور عبادات بندگی کے قوانین میں جکڑی ہوئی ہیں، کھیل تماشہ نہیں جیسا کہ غیر مسلموں کی عیدوں کا حال ہے۔

قرآن حکیم نے کافروں اور مشرکوں کی عبادات کا یہی حال نقل کیا ہے۔

﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً﴾ [سورة الأنفال: 35]

ان کی نمازیں (عبادت) بیت اللہ کے پاس صرف سیٹیاں بجانا اور تالی پیٹنا ہی تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے روح المعانی کی تفسیر سے اخذ کیا ہے کہ موجودہ زمانے کے عرس و اعراس، میلے ٹھیلے، منکرات و بدعات کی شمولیت کی وجہ سے مشرکین کی عبادات کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

⑨ ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً﴾ [سورة الأنعام: 74]

ترجمة: اور وہ وقت یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا: کیا تم بتوں کو معبود قرار دیتے ہو؟ بے شک میں تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں۔

تفسیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام اولوالعزم انبیاء کے جدِّ اعلیٰ ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں اسی لقب سے یاد فرمایا ہے۔ قرآن حکیم نے اسلام کو "ملت ابراہیم" اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مسلمانوں کا باپ قرار دیا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ساری زندگی بت پرست، ستارہ پرست مشرکوں سے بحث ومناظرہ، دعوت وتبلیغ میں صرف ہوئی ہے۔ طبقۂ انبیاء میں توحید کے علمبردار اور داعی کی حیثیت سے ممتاز رہے ہیں۔

مذکورہ آیت میں اپنے باپ آزر اور اپنی قوم سے توحید پر بحث کررہے ہیں۔ (تفصیل ہدایت کے چراغ، جلد ا رصفحہ ۱۷ پر دیکھئے)

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ مشغول مع الحق اور اہل باطل سے بحث ومناظرہ کرنے والوں میں کوئی تنافی نہیں بشرطیکہ حدود سے تجاوز نہ ہو۔

(مطلب یہ کہ کامل طور پر اپنے اکثر اوقات عبادات میں مشغول رکھنا یا اہل باطل فرقوں سے بحث ومناظرہ میں اپنے اوقات صرف کرنا دونوں ہی عبادت ہیں، ہر دو عمل کی حدود ہیں جن کا پاس ولحاظ رکھنا دونوں صورتوں میں ضروری ہے۔)

⑩ ﴿وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا﴾ [سورة الأنعام: 80]

ترجمة: میں ان سے نہیں ڈرتا جنہیں تم اللہ کا شریک ٹھہرا رہے ہو، البتہ اگر میرا رب ہی کوئی بات چاہے۔

تفسیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اس دعوت وتبلیغ، بحث ومناظرہ کا ذکر کیا جارہا ہے جب کہ قوم کے بڑوں نے انہیں دھمکی دی کہ اگر ہمارے بتوں کو ایسے ہی برا بھلا کہا جاتا رہے گا تو یاد رکھو وہ تمہاری ایسی خبر لیں گے کہ تم کو نجات کا کوئی راستہ نہ ملے گا، ان کی قوت وغضب سے تم واقف نہیں ہو وہ تمہیں کسی بھی وقت تہس نہس کرڈالیں گے۔

جیسا کہ آج کے دور میں توحید وسنت کے حامیوں کو قبر پرست، مردہ پرست، ضعیف الاعتقاد مسلمان ڈراتے ہیں کہ تم پر فلاں بزرگ کی مار پڑے گی، فلاں ولی کا غضب ٹوٹ پڑے گا، فلاں شاہ صاحب کی رحمت وبرکت سے محرومی رہے گی وغیرہ وغیرہ۔)

بہرحال مشرکوں کی دھمکی پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مذکورہ جواب دیا کہ میں ان سے ذرہ برابر بھی نہیں ڈرتا جن کو تم لوگوں نے خدا کا شریک قرار دے رکھا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ آیت سے ایک ادب اخذ کیا ہے۔ وہ یہ کہ قوم کی دھمکی پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: وَلَآ اَخَافُ (میں قطعی نہیں ڈرتا) اس عنوان میں دعویٰ اور شان کا پہلو نکل سکتا تھا جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام جیسے باادب، خاشع، متواضع نبی ورسول سے ممکن نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ "اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ

رَبِّیْ'' کہہ کر اپنے کلام کی صورت دعویٰ کو دور کر دیا (البتہ میرا رب چاہے تو اور بات ہے، میں ڈر بھی سکتا ہوں اور نقصان بھی اٹھا سکتا ہوں) بات چیت اور کلام و خطاب میں شان و فخر کا عنوان نہ ہونا چاہیے۔

⑪ ﴿وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [سورة الأنعام: 87]

اور ہم نے ہدایت ان کے باپ داداؤں اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے چند ایک ہی کو دی اور ہم نے ان کو پسند کیا اور انہیں سیدھی راہ چلایا۔

تَفسِیر: سابقہ آیتوں میں اٹھارہ اولوالعزم رسولوں کے نام مسلسل ذکر کئے گئے ہیں کہ یہ سب انبیاء صدقین اللہ کے برگزیدہ اور مطیع و فرمانبردار بندے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد و خاندان میں بعض کو ہدایت دی گئی اور بعض کو منتخب کر لیا گیا۔ یہ سب رسول واجب الاتباع، ہادی، مہدی شخصیات ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت نے آیت کے لفظ ''اِجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ'' سے یہ اخذ کیا ہے کہ اجتباء (منتخب کرلینا) کا حاصل ''جذب'' ہے اور ہدایت (رہنائی) کا حاصل ''سلوک'' ہے۔

(جذب و سلوک علم تصوف کی خاص اصطلاح ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ راہ کی نشاندہی کر دی جائے کہ اس پر چل کر بندہ اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے، اس کو ''طریق سلوک'' کہا جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے فضل و کرم سے کسی کو منزل تک پہنچا دیں، اس کو ''طریق جذب'' کہا جاتا ہے۔) ہر دو طریق میں عبادت و ریاضت ضروری رہتی ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کو ''طریق جذب'' سے سرفراز کیا جاتا ہے اور غیر انبیاء کو دونوں طریق سے ہدایت نصیبی دی جاتی ہے۔

⑫ ﴿وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [سورة الأنعام: 88]

ترجمة: اور اگر بالفرض یہ سب نبی شرک کرتے تو ان کا سارا کیا کرایا ضائع ہو جاتا۔

تَفسِیر: اوپر کی آیات میں جن اٹھارہ انبیاء و رسل کے نام آئے ہیں، ان کا تذکرہ کر کے فرمایا گیا کہ یہ سب توحید کے داعی و علمبردار تھے۔ اگر یہ حضرات بھی (نعوذ باللہ) شرک کرتے تو ان کی زندگی کے سارے اعمال غارت ہو جاتے یعنی شرک ایسا گھناؤ جرم ہے کہ نبیوں سے بھی بخشا نہ جاتا۔ ان کی مقدس و پاکیزہ زندگی بھی ضائع ہو جاتی۔ ''وَقَدْ اَعَاذَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ''

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اللہ جل شانہ کا ایسا کوئی خاص بندہ نہیں جس پر کسی بھی حال میں مواخذہ نہ ہو سکے جیسا کہ بعض جاہل صوفی امت کے بعض اولیاء اللہ کو ''اللہ کا معشوق'' سمجھا

کرتے ہیں (کہ ان پر اللہ کا عقاب یا عتاب ہو ہی نہیں سکتا)

⑬ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ﴾
[سورة الأنعام: 93]

ترجمة: اور اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جو اللہ پر جھوٹ، تہمت گھڑ لے یا کہنے لگے کہ میرے اوپر وحی آتی ہے جب کہ اس پر کچھ بھی وحی نہیں کی گئی۔

تفسیر: عہد نبوت میں چند ایک ایسے افراد بھی گذرے ہیں جنہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اللہ کے کلام کی طرح ہم بھی کلام پیش کر سکتے ہیں۔ احادیث کی کتابوں میں کم از کم ایسے دو نام ملتے ہیں:

① نضر بن حارث　　② عبداللہ بن ابی سرح

عبداللہ بن سرح تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی ہوتے تھے۔ یہ رسول اللہ کے کاتب وحی رہ چکے ہیں، لوگوں میں اپنی شہرت کے لیے یہ مشہور کر دیا کہ رات کے کسی خاص حصے میں ایک جن آیا کرتا ہے اور وحی کے نام سے اپنا کلام محمد کو سنا جاتا ہے جس کو محمد ﷺ صبح میں مجھ سے لکھوا لیتے ہیں۔ یہ اسلام چھوڑ کر مشرکین سے جا ملے ایک مدت تک مرتد اور واجب القتل رہے۔ فتح مکہ کے دن جب انہوں نے اپنے واجب القتل ہونے کی خبر سنی تو روپوش ہو گئے پھر سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سفارش کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا اور آخرت وقت تک اسلام پر قائم رہے۔

عہدِ خلافت میں بڑے بڑے معرکہ انجام دیئے، ان میں فتح مصر اور فتح حبشہ شامل ہیں۔

یہ زندگی بھر دعا کرتے رہتے تھے کہ اپنی موت نماز کی حالت میں آجائے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا فجر کی نماز کا سلام پھیر رہے تھے کہ وفات ہو گئی۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَه وَارْحَمْه

بہر حال مذکورہ بالا آیت عہد نبوت کے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت مذکورہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی خواب تراشے یا کسی وارد قلبی وجھوٹے الہام کا دعویٰ کرے یا اپنے اوہام وخیالات کو فیضانِ غیبی ظاہر کرے، ایسا شخص بھی آیت کے مفہوم میں آجاتا ہے۔

بعض فقہاء کرام ومفسرین حضرات نے کہا ہے کہ جو شخص فقہ وسنت وآثار صحابہ سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھ کر خود رائی اختیار کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ میری رائے فلاں مسئلہ میں یہ ہے یا یہ مسئلہ عوام الناس کے لیے ہے، مجھ جیسے خواص کے لیے نہیں وہ بھی مذکورہ آیت کی وعید میں آجاتا ہے۔ (قرطبی)

⑭ ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾

[سورة الأنعام: 108]

ترجمة: اور تم ان لوگوں کو گالی نہ دو جن کو یہ کافر لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں ورنہ یہ لوگ بھی اللہ کو حد سے گزر کر براہ جہالت گالی دیں گے۔

تفسير: مطلب یہ کہ غیر مسلموں کو تو تبلیغ کی جائے گی البتہ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی جانب سے ان کے مزید کفر و شرک کے سبب نہ بنیں۔ مثال کے طور پر ان کے مذہب کی تردید یا بحث و مناظرہ میں غصہ ہو کر ان کے معبودوں اور مقتدیوں کو برا بھلا کہنے لگو جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ بھی جواب میں اللہ اور اس کے رسولوں کی بے ادبی اور گستاخی کرنے لگیں، اس صورت میں آپ کا گالی دینا اللہ اور رسولوں کو برا کہنے کا ذریعہ بنے گا۔ لہٰذا ایسے عمل سے احتراز کرنا ضروری ہے تنقید تو بہر حال کرنی ہوگی لیکن تحقیر نہ کی جائے گی۔

سُلوك: فقہاء کرام نے اس آیت سے یہ قاعدہ مستنبط کیا ہے کہ جو غیر واجب طاعت گناہ کا سبب بن جائے، اس طاعت کو ترک کر دیا جائے گا (جیسا کہ یہاں بتوں کو برا بھلا کہنا جائز تھا (لیکن واجب نہیں) لیکن جب یہ برا بھلا کہنا اللہ اور رسولوں کی بے ادبی و گستاخی کا ذریعہ بنا تو اب بتوں کو برا کہنا جائز نہ ہوگا۔)

حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اہل ارشاد علماء کو دیکھا گیا ہے کہ وہ بعض دفعہ اپنے مریدوں کو ایسے امور سے منع کر دیتے ہیں جو بظاہر طاعت معلوم ہوتے ہیں (جس سے لوگوں کو شبہ ہو جاتا ہے) حالانکہ ان کی نظر میں یہ مفضی الی المفاسد ہوتے ہیں جو دوسرے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔

⑮ ﴿وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا﴾ [سورة الأنعام: 111]

ترجمة: اور خواہ ہم ان پر فرشتوں ہی کو اتار دیں اور خواہ ان سے مردے بھی کلام کرنے لگیں اور خواہ ہم ہر چیز کو ان کے پاس سامنے لا کر جمع کر دیں تب بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں تھے۔

تفسير: آیت میں مشرکین کا ضد و عناد کا ذکر ہے کہ اگر ان کی ہر خواہش پوری بھی کر دی جائے حتیٰ کہ آسمان سے فرشتے اتر کر یہ تصدیق کر دیں کہ اسلام حق مذہب ہے تب بھی یہ لوگ ضد و عناد میں حق کو تسلیم کرنے والے نہیں کیونکہ ہدایت و نصیحت اسی کو ملتی ہے جو حق کا طالب اور اس کا خواہش مند ہو، محض دنیا بھر کے معجزات و کرامات سے نفع نہیں ہو سکتا۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ اپنے شیخ میں بھی کشف و کرامات تلاش نہ کرنی چاہیے بلکہ اس کے کمال علم و عمل کی تحقیق کے بعد اس کا اتباع کر لیا جائے (ہدایت نصیب ہو جاتی ہے) خوارق و کرامات سے نفع ہونا ضروری نہیں ہے۔

⑯ ﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ﴾ [سورة الأنعام: 116]

ترجمة: یہ لوگ تو بس اٹکل ہی کی پیروی کرتے ہیں اور محض گمان ہی میں پڑتے رہتے ہیں۔

تفسیر: وحی الٰہی کے سوا دنیا میں جتنے بھی علوم ہیں خواہ ارسطو کی منطق ہو یا کینٹ کے مقولات ہوں سب کے سب ظن وتخمین کے دائرے سے باہر نہیں، وحی الٰہی صرف اور صرف ایک ہی علم ہے جو قطعی، یقینی، لازوال، ترمیم وتغیر وتبدیل سے پاک اور محفوظ ہے۔

((وَمَا قَالَ الرَّسُوْلُ فَصَدِّقُوْهُ فَاِنَّ الْقَوْلَ مَاقَالَ الرَّسُوْلُ.))

رسول اللہ ﷺ جو بھی ارشاد فرماویں اس کی تصدیق کر دو، قول اسی کو کہا جاتا ہے جو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ شرعی احکام میں کشف والہام حجت ودلیل نہیں بنتے، خاص طور سے ہر کشف والہام پر یقین کرنا تو بالکل باطل ہے۔

ملحوظه: دل کی بات یا پیش آنے والی بات کا ظاہر کر دینا علم غیب نہیں بلکہ کشف وکرامات کہلاتا ہے۔ علم غیب ایسے علم کو کہتے ہیں جو بلا کسی ظاہری وباطنی اسباب کے حاصل ہو۔ جیسا کہ علم الٰہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو براہِ راست بلا کسی واسطہ کے حاصل ہے ایسے علم کو غیب کہا جاتا ہے۔

اور جو علم بذریعہ کشف والہام حاصل ہو اس میں کشف والہام واسطہ ہیں اس لیے اس کو علم غیب نہیں کہا جائے گا۔

⑰ ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾ [سورة الأنعام: 119]

ترجمة: اور تم کو کون سا امر اس کا باعث ہو سکتا ہے کہ تم ایسے ذبح شدہ جانور کا گوشت نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے جب کہ حرام چیزوں کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔

تفسیر: حلال چیزوں کو حرام کر لینا یا ان کے ساتھ حرام اشیاء جیسا معاملہ کرنا ایمان کے منافی ہے۔ اہل تحقیق نے یہ بھی لکھا ہے کہ جائز ومباح اسی وقت ہے جب کہ اس کو اپنے ذائقہ ولطف کے لیے کھایا جائے۔ باقی اگر نیت یہ ہو کہ اس اکل وشرب سے طاعت الٰہی میں مدد ملے گی تو یہی چیز باعث اجر بن جاتی ہے۔

سُلوك: تفسیر روح المعانی میں امام ابو منصور سے منقول ہے کہ بعض مسلمان بطور زہد وقناعت عمدہ چیزیں کھایا نہیں کرتے تھے، اس پر آیت نازل ہوئی۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ زہد وقناعت اگرچہ اعلیٰ صفت ہے لیکن اس میں غلو کرنا درست نہیں جیسا کہ بعض جاہل صوفی کیا کرتے ہیں۔

⑱ ﴿وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ﴾ [سورة الأنعام: 120]

ترجمة: اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی کو بھی چھوڑ دو۔ بے شک جو لوگ گناہ کر رہے ہیں ان کو ان کے

کیئے ہوئے کی عنقریب سزا ملے گی۔

تَفسِیر: آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کرنا انسان کا اختیاری عمل ہے۔ ایسا عمل نہیں کہ جو انسان کی ہمت و ارادے سے باہر ہو کیونکہ قرآن حکیم نے گناہ کو ترک کرنے کی بارہا ترغیب دی ہے۔ گناہ کرنا اگر اختیار سے باہر ہوتا تو اللہ تعالیٰ بندوں کو ایسا حکم نہیں دیتے جو ان کے اختیار میں نہ ہو ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾

گناہ دو 2 قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ گناہ جو دوسروں کو بھی نظر آ جائے، اس کو ظاہری گناہ کہا جاتا ہے جیسے جھوٹ بولنا، غیبت، شراب کباب، زنا، چوری ورشوت وغیرہ۔

دوسرے وہ گناہ جو دوسروں کو نظر نہیں آتے، گناہ گار آدمی خود گناہ دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے اس کو باطنی گناہ کہا جاتا ہے جیسے حسد، کینہ، بغض، تکبّر، ریا، حرام محبت وغیرہ۔

اس تفصیل کو آسان عنوان میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ جو گناہ اعضاء و جوارح سے جاری ہوں، ان کو ظاہری گناہ کہا جائے گا اور جو گناہ قلب و نگاہ سے جاری ہوں، ان کو باطنی گناہ کہا جاتا ہے۔

بہرحال ہر دو قسم گناہ ہی ہیں۔ مذکورہ آیت میں ان سب گناہوں سے احتراز کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ گناہ کی اس قرآنی تقسیم سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اعضاء و جوارح سے گناہ جاری ہوتے ہیں، اسی طرح دل و دماغ سے بھی گناہ سرزد ہوتے ہیں۔

19 ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ﴾ [سورة الأنعام: 125]

ترجمة: اللہ جس کے لیے ارادہ کر لیتا ہے کہ اسے ہدایت نصیب کرے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے۔

تَفسِیر: اللہ کے ارادے سے مشیّت تکوینی یعنی اللہ کی مرضی مراد ہوا کرتی ہے۔ اللہ جس کو چاہے، ہدایت دے اور جس کو چاہے روک دے۔ جب وہ چاہتا ہے تو اسباب فراہم ہو جاتے ہیں (عمل تو بہرحال آدمی کو کرنا ہی پڑتا ہے)۔ جب اسباب فراہم ہو جاتے ہیں تو انسان کا ارادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور وہ اسلام قبول کرنے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ یہی مشیت تکوینی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آیت سے قبض و بسط کے بعض اقسام نکلتے ہیں جو سلوک میں ہر سالک کو پیش آیا کرتے ہیں (قبض و بسط کی تعریف سلوک ۲۱ میں آ چکی ہے۔)

20 ﴿ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۫ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ﴾ [سورة الأنعام: 146]

ترجمة: (یہودیوں پر بعض حلال جانور حرام کر دیئے گئے تھے) ان کی شرارت کے سبب سے ہم نے سزا دی تھی اور ہم اس معاملہ میں یقیناً سچے ہیں۔

تفسیر: یہودیوں کو اپنے نبیوں سے بغاوت وسرکشی کرنے پر بطور سزا انہیں بعض حلال چیزوں سے محروم کردیا گیا تھا۔ یہ دنیاوی سزا تھی جو نبیوں کی مخالفت کرنے پر دی گئی، آخرت کا معاملہ تو بہرحال پورا ہونا ہی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا کہ بعض دفعہ دنیاوی نعمتوں سے محرومی کا سبب گناہ بھی ہوا کرتے ہیں۔ (نیکیوں سے جہاں خیر وبرکت آتی ہے، ایسے ہی گناہوں سے ناکامی ومحرومی پیدا ہوجاتی ہے)

㉑ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا﴾ [سورة الأنعام: 160]

ترجمة: جو کوئی (قیامت کے دن) نیکی لے کر آئے گا، اس کو اس کے مثل دس ⑩ نیکیاں ملیں گی اور جو بدی لے کر آئے گا بس اس کو اس کے برابری ہی بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

تفسیر: یعنی آخرت میں ہر نیکی پر دس گنا اجر وثواب ملے گا یا اس نے وہ نیکی دس بار کی ہے۔ اللہ کے فضل وکرم کا یہ اقل درجہ ہے ورنہ بعض نیکیوں پر سات سو اور اس سے بھی زائد نیکیوں کا وعدہ بیان کیا گیا ہے۔

لیکن بدی کے بارے میں ایسا نہیں ہوگا بلکہ اس میں قانون عدل ہی کو باقی رکھا گیا ہے کہ ایک بدی ایک ہی گناہ کے مساوی ہوگی اور اس کی سزا جو ہوگی، وہی ملے گی۔

سُلوك: اہل علم صوفیاء نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جب ہر نیکی پر کم از کم دس گنا اجر وثواب ہے اور یہ حقیقت ہے کہ محبت الٰہی اور شوق لقاءِ خداوندی بھی ایک بڑی نیکی ہے تو جن بندوں نے اپنے آپ کو لقاءِ الٰہی کا مشتاق ومنتظر بنائے رکھا ہے تو انہیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ اللہ جل شانہ، خود ان کی لقاء کا کم از کم دس گنا مشتاق ہوگا۔

㉒ ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ [سورة الأنعام: 162]

ترجمة: آپ کہہ دیجئے کہ میری نماز اور میری ساری عبادتیں اور میری زندگی اور میری موت سب جہاں کے پروردگار اللہ ہی کے لیے ہے۔

تفسیر: آیت میں ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اور لُبِ لُباب بیان کیا گیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا: آیت توحید کامل کی دعوت دیتی ہے۔ اس میں تفویض وتسلیم کی تعلیم ہے۔

(تفویض وتسلیم علم تصوف میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں یعنی اپنی زندگی کے سارے معاملات کو اللہ کے حوالے کردیا جائے اور جو بھی فیصلہ نازل ہو، اس کو دل سے قبول کرلیا جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسباب ترک کردیئے جائیں۔ اسباب تو بہرحال کیے جائیں گے لیکن نتیجہ کو قلب کی گہرائیوں سے اللہ کا فیصلہ یقین کیا جائے خواہ وہ فیصلہ اپنی خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اسی کا نام توکل ہے اور اسباب ترک کرکے اللہ سے امید رکھنا تعطل کہلاتا ہے جو ممنوع ہے۔)

سُوْرَۃُ الْاَعْرَافِ

پَارَہ: 8

❶ ﴿كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ﴾ [سورة الأعراف: 2]

ترجمة: یہ ایک کتاب ہے جو آپ پر نازل کی گئی کہ آپ اس کے ذریعہ لوگوں کو خبردار کریں (آخرت سے اور بدی کے انجام سے) لہٰذا آپ کے دل میں اس سے بالکل تنگی نہ ہونا چاہیے۔

تفسیر: قرآن حکیم سے نصیحت تو صرف وہی لوگ لیں گے جو حق کے متلاشی ہیں البتہ ضد وعناد والے تو اپنی حالت ہی پر قائم رہیں گے، لہٰذا آپ یہ خیال کر کے اپنا دل تنگ نہ کریں کہ یہ لوگ ہدایت کیوں نہیں قبول کرتے؟ آپ اپنا کام جاری رکھیں، نصیحت تو ایمان لانے والوں کو مفید ہوا کرتی ہے۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا: شیخ و مرشد کے لیے اس میں اشارہ ہے کہ مخاطب اگر اس کی بات قبول نہ کرے تو مرشد کو غم نہ کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو مستغنی بھی نہ سمجھنا چاہیئے، اپنا کام جاری رکھے۔

❷ ﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝﴾

[سورة الأعراف: 10]

ترجمة: بے شک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کو جگہ دی اور ہم نے تمہارے لیے اس میں سامانِ زندگی پیدا کیا۔ تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

تفسیر: آیت میں تمام عالم انسانی کو خطاب کیا جارہا ہے کہ زمین کو تمہارے رہنے بسنے کے لیے بنایا اور اس میں کھانے پینے کا سامان بھی مہیا کیا گیا لیکن اتنی صاف بات کو بھی تم نہیں سمجھتے، شکر گزاری تو کیا ناشکری کرتے رہتے ہو۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ مستفاد کیا ہے کہ جن دو نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے (تمکین فی الارض اور سامان معیشت) ان میں اول کا حاصل جاہ اور دوسرے کا خلاصہ مال ہے (یعنی مال و جاہ بھی اللہ کی بڑی نعمتیں ہیں) جاہ و مال کا ذکر نعمت کے عنوان میں قابل شکر ہوتا ہے البتہ اس میں بالکل انہماک برا ہے۔

❸ ﴿قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝﴾ [سورة الأعراف: 12]

ترجمة: کہا: میں اس (آدم علیہ السلام) سے بہتر ہوں۔ مجھ کو تو نے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔

تفسیر: ملعون ابلیس کا یہ جواب اس وقت کا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا، جواب کا خلاصہ یہ کہ آگ مٹی سے افضل ہے کیونکہ آگ کی طبیعت بلندی چاہتی ہے اور مٹی کی طبیعت

پستی ونزول چاہتی ہے لہٰذا آگ غیر افضل کے آگے نہیں جھک سکتی۔

جاہلوں اور بد دماغوں کے جوابات ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ ہر ایسا شخص شیطان کا وارث ہے جو اپنی رائے ورویت کو خواہ وہ کشف ووجدان پر مبنی ہو، شریعت کے مقابلہ میں ترجیح دیتا ہو۔

4 ﴿قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ۝﴾

[سورة الأعراف: 13]

ترجمة: اللہ نے فرمایا: تو جنت سے اتر جا تو اس کے لائق نہیں کہ جنت میں رہ کر بڑائی کرتا رہے۔ پس تو نکل، بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے۔

تفسیر: جنت تو اطاعت گزار، صالحین، خاشعین کی جگہ ہے، بڑائی جتانے والے کا یہاں کیا کام، لہٰذا ذلیل و خوار ہو کر جنت سے نکل جا، چنانچہ بیک بینی ودو گوش جنت سے نکال دیا گیا۔

سُلوك: مفسرین نے آیت سے یہ ثابت کیا ہے کہ معصیت ونافرمانی میں بندے کی ذلت ہے۔ (قرطبی)

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کبر وغرور کی بناء پر جنت سے نکالا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ کبر وصول حق سے مانع ہے (یعنی جن کے قلوب میں کبر ونخوت ہوگا، انہیں رضائے الٰہی حاصل نہیں ہوتی)

5 ﴿قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۝﴾

[سورة الأعراف: 14 تا 15]

ترجمة: بولا: مجھے اس دن تک مہلت دے جب کہ سب اٹھائے جائیں گے۔ اللہ نے فرمایا: بے شک تجھے مہلت دے دی گئی۔

تفسیر: ابلیس ملعون کو جب جنت سے نکالا جارہا تھا، اس وقت اس نے اللہ سے مذکورہ دعا مانگی کہ قیامت تک میری عمر دراز کردی جائے، چنانچہ اس کی درخواست منظور کرلی گئی۔

اللہ کی رحمت وعلم کا کیا ٹھکانہ ہے کہ ایسے نازک وانتہائی عتاب کے وقت بھی گستاخ ابلیس کی درخواست کو قبول کرلیا گیا اور اس وقت تک کے لیے مہلت زندگی دے دی گئی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ کسی کی دعا کا قبول ہوجانا اللہ کے ہاں مقبولیت یا رضائے الٰہی کی کافی دلیل نہیں ہے، دعا تو شیطان مردود کی بھی قبول ہوگئی لیکن مرُدود تو مرُدود ہی رہا۔

6 ﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْآتِهِمَا﴾

[سورة الأعراف: 20]

ترجمة: پھر دونوں کے دل میں شیطان نے وسوسہ ڈالا تاکہ کھول دے ان پر وہ چیز جو ان کی نظروں سے پوشیدہ تھی (یعنی دونوں کا ستر)

تفسیر: جنت میں سیدنا آدم وسیدہ حوا علیہما السلام کا لباس نور کا تھا جو جسم سے کبھی نہ اترتا تھا اور نہ اترنے کی ضرورت پیش آتی تھی لیکن جب شیطان کی وسوسہ اندازی سے متاثر ہو کر دونوں نے درخت کا پھل کھالیا جس کے قریب ہونے سے بھی منع کر دیا گیا تھا تو سیدنا آدم علیہ السلام کی یہ لغزش بھول کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ اس لغزش میں نیت وارادے کا کوئی دخل نہ تھا، خطا یا گناہ اس عمل کو کہا جاتا ہے جس میں ارادہ یا کم از کم نیت شامل ہو، سیدنا آدم علیہ السلام کا یہ عمل دونوں سے خالی تھا۔ [سورۂ طٰہٰ: 115]

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے واقعہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ عصمت انبیاء کے باوجود شیطان کا تصرف واثر اندازی ممکن ہے (البتہ شیطان کے لیے گناہ کروا دینا ممکن نہیں) اہل تحقیق علماء نے لکھا ہے کہ انبیاء کرام کے ان جیسے واقعات کو زلات کہا جاتا ہے جس کا اردو ترجمہ لغزش کہا جاتا ہے۔

⑦ ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾ [سورة الأعراف: 23]

ترجمة: دونوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جان پر بڑا ظلم کیا ہے اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ فرمائیں اور ہم پر رحم نہ کریں تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے۔

تفسیر: یہ دعا سیدنا آدم علیہ السلام وسیدہ حوا علیہا السلام کی لغزش کھا جانے کے بعد کی ہے جو دونوں نے حضور رب میں پیش کی تھی جو قبول کر لی گئی۔

سُلوك: تفسیر ماجدی کے مفسر نے لکھا ہے کہ ابوالبشر اور ام البشر کی اس مؤثر مناجات میں ادب واستغفار کی تعلیم، سارے آدم زادوں کے لیے قیامت تک ہے۔

⑧ ﴿اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ [سورة الأعراف: 27]

ترجمة: بے شک وہ (ابلیس) اور اس کا لشکر تم کو ایسے طور پر دیکھ لیتا ہے کہ تم انہیں نہیں دیکھتے۔

تفسیر: شیطان اور اس کی ذریت چونکہ آگ سے پیدا کی گئی ہے جو مٹی کی جنس سے بالکل مختلف ہے، اس مخالف جنسیت کی وجہ سے انسان، شیطان اور جنات کو دیکھ نہیں پاتا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ شیاطین یا جنات کا نظر نہ آنا عام عادت کے مطابق ہے کہ عام طور پر وہ نظر نہیں آتے لیکن ان کو دیکھ لینے کی قطعی نفی بھی نہیں ہے چنانچہ بعض اوقات انبیاء کرام اور اولیاء اللہ بلکہ عام انسانوں نے بھی جنات کو دیکھا ہے۔ یہ بات مذکورہ آیت کے خلاف نہیں ہے۔

⑨ ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ﴾ [سورة الأعراف: 43]

ترجمة: اور جو کچھ ان کے قلوب میں غبار رہا ہوگا اسے ہم دور کر دیں گے، ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

تفسیر: اہل جنت کی حالت بیان کی جا رہی ہے جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو ان کے سینے کینہ و بغض و حسد وغیرہ سے پاک وصاف ہوں گے حتیٰ کہ اگر کچھ میل کچیل بھی ہوگا وہ بھی دور کر دیا جائے گا۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ایسا کینہ و بغض جو طبعی اور غیر اختیاری ہو، مضر نہیں (البتہ اختیاری کینہ مذموم رہے گا، ایسے لوگ جنت میں داخل نہ ہو سکیں گے۔)

⑩ ﴿وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ﴾ [سورة الأعراف: 50]

ترجمة: اور دوزخ والے جنت والوں کو پکاریں گے کہ ہمارے اوپر تھوڑا پانی ہی ڈال دو یا اور کوئی چیز دے دو جو اللہ نے تم کو عطا کی ہے۔

تفسیر: دوزخی بدحواس ہو کر اہل جنت کے آگے دست سوال دراز کریں گے کہ ہم جلے بھنے جا رہے ہیں، تھوڑا پانی ہی ہم پر ڈال دو یا جو نعمتیں اللہ نے تمہیں دی ہیں ان کا کچھ بچا کھچا ہی دے دو؟

اہل جنت انہیں جواب دیں گے کہ اللہ نے کافروں پر ان چیزوں کی بندش کر دی ہے۔

اہل دوزخ اور اہل جنت کا یہ مکالمہ اپنے اپنے مقام ہی سے ہوگا، عالم آخرت کی جغرافیائی حدود عالم دنیا سے بالکل مختلف ہیں، نزدیکی و دوری اس عالم کی حدود ہیں جس پر عالم آخرت کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ بعض عادتیں مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہیں۔ چونکہ کفار دنیا کی زندگی میں شکم پروری اور کھانے پینے کے حریص وطماع تھے اور اسی حالت میں فوت بھی ہوئے تو اسی حالت میں ان کا حشر بھی ہوگا کہ کھانا پینا مانگتے رہیں گے۔

⑪ ﴿وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا﴾ [سورة الأعراف: 58]

ترجمة: اور جو سرزمین صاف ستھری ہوتی ہے، اس کی پیداوار اللہ کے حکم سے خوب نکلتی ہے اور جو خراب ہے، اس کی پیداوار بہت کم نکلتی ہے۔

تفسیر: ہدایت نصیبی اور محرومی کی مثال بارش اور زمین سے دی گئی کہ زمین میں صلاحیت اور پاکیزگی ہو تو بارش سے اس میں سبزہ اور پھل پھول پیدا ہوتے ہیں اور اگر یہی زمین کھاری اور پتھریلی ہو تو اسی بارش سے خس وخاشاک پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء ورسل جو خیر و برکت لے کر آتے ہیں ان سے مستفید

ہونا بھی انسان کی استعداد پر موقوف ہے۔ جولوگ ان سے منتفع نہیں ہوتے دراصل ان کی استعداد ناقص اور خراب ہو چکی ہے، وہ آیاتِ الٰہی سے فیض یاب نہیں ہوتے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ ادا کیا ہے۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست　　　در باغ لالہ روید و درشورہ بوم خس

بارش کی لطافت و نظافت میں کوئی کلام نہیں ہے البتہ جب یہ باغ میں گرتی ہے تو پھل و پھول پیدا کرتی ہے ورکھاری وبنجر زمین میں خس وخاشاک اگتے ہیں۔

سلوک: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جن لوگوں پر وعظ ونصیحت اثر کرتا ہے ان کی استعداد و صلاحیت زندہ اور عمدہ ہے اور جولوگ نصیحت قبول نہیں کرتے ان کی استعداد ناقص ومردہ ہو چکی ہے۔

﴿۱۲﴾ أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ

(سورۃ الاعراف: ۶۳)

ترجمہ: اور کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت نصیحت آئی ہے جو تم ہی میں کا ایک ہے تا کہ وہ تمہیں ڈرائے۔

تفسیر: قدیم زمانے میں نبیوں کی ہدایت سے اکثر قوموں نے یہ تاثر لیا ہے کہ یہ تو ہم جیسا ہی آدمی ہے۔ کمزور بے طاقت، نہ اس کی شان وآن ہے، نہ مال ودولت، نہ ریاست وحکومت۔ قوم نوح سے لے کر خاتم النبین ﷺ تک ہر قوم نے اپنے نبی ورسول کو یہی طعنہ دیا ہے اور ان کی تعلیمات کا انکار بھی۔

(تفصیل ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۱ رصفحہ ۱۸ پر دیکھئے جو اس حادثہ کی قرآنی تشریح ہے۔)

سلوک: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس عنوان سے یہ اخذ کیا ہے کہ ہر زمانے میں اولیاء اللہ کے ساتھ بھی جاہلوں نے یہی طرز اختیار کیا ہے۔ اپنے زمانے کے اولیاء اللہ سے محض ہم زمانہ ہونیکی وجہ سے دور رہے ہیں۔

(گویا مُردہ ولی کو تو تسلیم کیا ہے، تب ہی تو قبروں پر سجدے ہوتے ہیں لیکن زندہ ولی کا اعتراف نہیں)۔

﴿۱۳﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ (سورۃ الاعراف: ۶۶)

ترجمہ: ہود کی قوم میں جو کافر سردار تھے، کہنے لگے کہ اے ہود! ہم دیکھتے ہیں کہ تجھ میں بالکل عقل نہیں ہے۔

تفسیر: ہر زمانے میں قوم کے روشن خیالوں نے داعیانِ حق کو ایسا ہی کہا ہے۔ سیدنا ہود علیہ السلام کو بھی ان کی قوم کے روشن خیالوں نے یہی طعنہ دیا کہ تم بے عقلی کی باتیں کرتے ہو، کیا ہمارے بڑوں عقل نہیں تھی کہ وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے؟ بھلا ایک خدا کتنے کام انجام دے گا؟ اور کس کس کی مدد کرے گا؟ سیدنا ہود علیہ السلام نے فرمایا: اے قوم! کوئی بات بے عقلی کی نہیں ہے۔ جو منصب مجھے دیا گیا ہے، میں اس کا حق ادا

کررہاہوں۔ یہ تمہاری بے عقلی ہے کہ اپنے خیر خواہوں کوجن کی امانت وصداقت کا تم سب کو پورا یقین ہے، بے عقل کہہ کر خود اپنا نقصان کررہے ہو، میں نے تو تم سے کبھی بھی کوئی بدلہ وصلہ طلب نہیں کیا، میرا اجر تو اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔

سُلوك: حکیم الامت ؒ نے لکھا ہے کہ دین کے خیر خواہوں کو بے عقل وفرسودہ کہنا قدیم زمانے سے آج تک چلا آرہا ہے۔

⑭ ﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِى الْخَلْقِ بَصْۜطَةً﴾

[سورة الأعراف: 69]

ترجمة: اور وقت یاد کرو جب اللہ نے تمہیں قوم نوح کے بعد زمین پر آباد کیا اور ڈیل ڈول میں تمہیں پھیلاؤ بھی زیادہ دیا، سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تا کہ فلاح پاؤ۔

تفسیر: سیدنا ہود علیہ السلام نے اپنی قوم عاد کو اللہ کی نعمتیں یاد دلائی جو انہیں میسر تھیں۔ ان میں یہ کہ قوم نوح کے بعد جب کہ کوئی حکومت وسرداری باقی نہ تھی، اللہ نے تمہیں زمین کا مالک بنایا اور تمہاری حکومتیں قائم کیں، علاوہ ازیں مال ودولت کے ساتھ جسمانی قوت وطاقت بھی نسبتاً دوسری قوموں کے کچھ زیادہ ہی دی، اللہ کے دیگر احسانات کو یاد کرو اور نافرمانی وبغاوت سے احتراز کرو۔

سُلوك: حکیم الامت ؒ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ قوت وجسامت بھی اللہ کی نعمت ہے، دنیاوی نعمتوں سے احتراز کرنا زہد وتقویٰ کے خلاف ہے جیسا کہ بعض متشدد صوفیاء کا مذاق ہے۔

⑮ ﴿وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ [سورة الأعراف: 80]

ترجمة: اور ہم نے لوط علیہ السلام کو بھیجا جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا: ارے! تم ایسا بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا جہاں والوں نے کبھی نہیں کیا ہے۔

تفسیر: اس بے حیائی کے کام سے لواطت (اغلام بازی) مراد ہے جو اس قوم نے تاریخ عالم میں پہلی مرتبہ ایجاد کیا تھا۔ مرد، مردوں سے (اغلام بازی) اور عورت، عورتوں سے (مساحقت) کیا کرتے تھے۔

نہ مردوں کو عورتوں سے رغبت، نہ عورتوں کو مردوں سے دلچسپی۔ یہ حد درجہ غلاظت پسندی اور گھناؤنے پن کا ناپاک عمل قوم میں عام ہو چکا تھا۔

موجودہ زمانے میں:

یورپ وامریکی تمدن اس خبیث حرکت کی بھرپور تائید کررہے ہیں اور اس ناجنس عمل کو طبعی تحریک قرار دیا جارہا ہے:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے ایک جزء "مَا سَبَقَكُمْ بِهَا" سے استدلال کیا ہے کہ اس بدکاری کو اس قید کے ساتھ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اغلام بازی کے عمل سے زیادہ شدید برائی اس عمل کا ایجاد کرنا تھا۔ اس طرح منکرات پر عمل کرنے سے کہیں زیادہ برا عمل ایجاد منکرات ہے۔

پھر حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ بھی تنبیہ فرماتے ہیں کہ یہاں غور کرو بدعات کی شناعت کس قدر شدید ہوگی۔

⑯ ﴿وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ﴾ [سورة الأعراف: 85]

ترجمة: اور لوگوں کا نقصان ان کی چیزوں میں نہ کرو۔

تَفسِير: سیدنا شعیب علیہ السلام اپنی دعوت وتبلیغ میں قوم کو یہ نصیحت کر رہے ہیں کہ ناپ تول میں کمی وزیادتی نہ کرو، یہ حق تلفی ہے جو بہت بڑا ظلم ہے، قوم میں یہ مرض عام ہو چکا تھا۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے مدلول پر قیاس کر کے لکھا ہے کہ جو اہل علم حضرات اپنے ہم زمانہ علماء وفضلاء کی تعظیم وتکریم کا حق ادا نہیں کرتے ہیں، وہ اس آیت کی زد میں آجاتے ہیں۔

⑰ ﴿وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا﴾ [سورة الأعراف: 89]

ترجمة: اور ہم سے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم تمہارے دین میں آجائیں، البتہ ہمارے پروردگار ہی کی مرضی ہو تو اور بات ہے۔

تَفسِير: سیدنا شعیب علیہ السلام کی قوم کے متکبرین نے دھمکی دے دی کہ اے شعیب علیہ السلام! اپنی دعوت وتبلیغ بند کردو ورنہ ہم تم سب کو شہر بدر کر دیں گے یا پھر یہ کہ تم اور تمہارے ساتھی ہمارے مذہب میں داخل ہو جاؤ۔

سیدنا شعیب علیہ السلام نے جواب دیا: جب اللہ نے ہم پر جاہلی مذہب کی حماقتیں واضح کر دی ہیں تو کیا ہم جانتے بوجھتے اس جہالت کو اختیار کرلیں گے؟ یہ تو ہم سے ممکن ہی نہیں ہے اِلَّآ یہ کہ اللہ کی مشیت ہی ہو تو اور بات ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ عارف ہمیشہ تقدیر الٰہی کے سامنے لرزاں وترساں رہا کرتا ہے۔

(تفصیل اس کی یہ ہے کہ سیدنا شعیب علیہ السلام نے پہلے تو قوم کے متکبرین پر اپنا مضبوط ارادہ ظاہر کر دیا کہ ہم کفر ہرگز اختیار نہ کریں گے لیکن چونکہ یہ عنوان ایک دعویٰ اور خود اختیاری کی صورت میں تھا اس لیے معاً یہ جملہ بھی اضافہ کر دیا کہ لیکن اللہ ہی کی مشیت ہو تو اور بات ہے۔

اللہ کے مقبول بندے دعویٰ اور بڑائی کے اظہار سے اپنے آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھتے ہیں جو عام طور پر جرأت و بیباکی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ رہا انبیاء کرام کا اپنی نبوت وصداقت کا اعلان کرنا، اظہار رسالت کے تحت ہوا کرتا

ہے جو فرائض نبوت کے لوازم میں شامل ہے، اکابر انبیاء سے ایسے کلمات برابر منقول ہوتے رہے ہیں۔

⑱ ﴿فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝﴾ [سورة الأعراف: 93]

ترجمة: اس وقت شعیب قوم سے منہ موڑ کر چلے اور بولے: اے میری قوم! میں نے تو تمہیں اپنے پروردگار کے پیامات پہنچا دیئے تھے اور تمہاری خیر خواہی بھی کی تھی تو پھر میں کافر لوگوں پر کیوں غم کروں؟

تفسیر: سیدنا شعیب علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ بڑی صبر آزما رہی ہے طبقۂ انبیاء میں آپ کو ''خطیب الانبیاء'' کہا جاتا ہے۔ باغی و سرکش قوم کو نہایت دل سوزی سے بلیغ عنوانات میں سمجھاتے رہے ہیں لیکن قوم کا انکار اور کفر بڑھتا ہی رہا۔ آخر اللہ کے عذاب نے ایک بھیانک زلزلے کی شکل میں پوری قوم کو غارت کر دیا۔

سرسبز و شاداب شہر مُردوں کا قبرستان بن گیا، سیدنا شعیب علیہ السلام نے عذاب کے بعد مُردوں کی آبادی سے اس طرح خطاب کیا جس طرح زندوں سے خطاب کیا جاتا ہے۔ یہ عنوان صرف نبیوں کے ساتھ مخصوص رہا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے غضب یافتہ لوگ مستحق ترحم نہیں ہوتے ہیں۔

⑲ ﴿ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا﴾ [سورة الأعراف: 95]

ترجمة: پھر ہم نے بدحالی کی جگہ بدل کر خوشحالی پھیلا دی چنانچہ انہیں خوب ترقی ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ تنگی اور خوشحالی تو ہمارے باپ داداؤں کو بھی پیش آتی رہی ہے (یہ کوئی خاص نعمت تو نہیں) اس حالت پر ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اس کا اندیشہ بھی نہ رکھتے تھے۔

تفسیر: آیت میں ضدی اور متکبر قوموں پر اللہ کی گرفت کا قانون معلوم ہو رہا ہے کہ انہیں اللہ نے مال و دولت، چین و راحت، طاقت و قوت، حکومت و اقتدار سب کچھ دے کر انہیں لمبی ڈھیل دی لیکن جب وہ خوب بڑھے، خوب پھلے پھولے اور غفلت و مدہوشی میں ڈوب ہو گئے تو کسی نہ کسی عذاب شدید میں انہیں اچانک پکڑ لیا گیا۔

سُلوك: اہل تحقیق علماء نے لکھا ہے کہ جس نعمت کے بعد شکر اور مصیبت کے بعد صبر و رجوع الی اللہ حاصل ہو جائے، ایسی حالت عند اللہ پسندیدہ ہوا کرتی ہے۔

اسی طرح جس نعمت کے بعد غفلت و سرکشی اور مصیبت کے بعد شکایت و بے زارگی ہو یہ حالت سرتاسر مذموم ہے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نبیوں کے مخالفین کو دنیا میں بھی سزا ملی ہے تاکہ اللہ کی حجت پوری ہو جائے اور نبوت واضح ہو، ایسی ہی علانیہ نصرت و اعانت اولیاء اللہ اور صالحین کے لیے بھی ہوتی ہے۔

⑳ ﴿يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ﴾ [سورة الأعراف: 110]

ترجمة: موسیٰ (علیہ السلام) چاہتا ہے کہ تمہیں تمہای زمین سے بے دخل کردے، اب تمہارا کیا مشورہ ہے؟

تفسیر: یہ بات فرعون نے اپنے درباریوں سے کہی کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کا مقصد تو کچھ اور ہے، وہ دراصل تم کو شہر بدر کر کے ملک میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ فرعون نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کو ایک اور پرفریب شکل میں ظاہر کیا تا کہ قوم کو ان کے خلاف اکسایا جائے۔

یہی حال ہر زمانے کے اہل باطل کا ہے کہ عوام کو اہل حق سے نفرت دلانے کے لیے حق بات کو برے برے عنوانات سے ظاہر کرتے ہیں۔

㉑ ﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ قَالَ اَلْقُوْا﴾

[سورة الأعراف: 115]

ترجمة: جادوگر بولے: اے موسیٰ! یا تو تم پہلے ڈالو یا ہم ہی پہلے ڈال دیں۔ موسیٰ نے کہا: تم ہی ڈال دو۔

تفسیر: جادوگروں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کے وقت یہ گفتگو کی تھی کہ مقابلہ کا آغاز تم کرو یا پھر ہم شروع کریں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ٹھیک ہے تم ہی ابتداء کرو۔

جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں زمین پر پھینک دیں جس سے زمین پر سانپ ہی سانپ دوڑتے نظر آئے پھر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر ڈال دیا، وہ اچانک پھرتیلا سانپ بن کر جادوگروں کے کرتب کو نگلنے لگا، حق کا حق ہونا ظاہر ہوگیا اور باطل فنا ونا کام۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کو سحر کرنے کی اجازت اس لیے دی کہ کفر کو شکست دینے کا اس وقت یہی ذریعہ تھا اور اپنے معجزے کا معجزہ ثابت ہونا بھی اسی اجازت پر موقوف تھا۔ (یہ وضاحت اس لیے کی گئی کہ سحر کی اجازت دینا بھی ممنوع ہے۔)

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ایسی ہی مصلحت کے تحت بعض مشائخ نے ایسے امر میں اپنے بعض مریدوں کو اجازت دی ہے جس کا بظاہر معصیت ہونا معلوم ہوتا ہے مگر حقیقتاً وہ معصیت نہیں ہوتی، کوئی دینی مصلحت ہوتی ہے اور وہی مصلحت ان کو مقصود ہوا کرتی ہے جو گناہ نہیں۔

㉒ ﴿فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ﴾

[سورة الأعراف: 116]

ترجمة: پھر جب جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں ڈال دیں، لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان پر

ہیبت غالب کر دی اور بڑا جادو کر دکھایا۔

تَفسِیر: ساحر اپنے فن کے ماہر تھے، انہوں نے اس موقع پر اپنے کمال فن کا پورا ثبوت دیا، زمین پر ڈالی ہوئی رسیاں سانپوں کی طرح دوڑتی نظر آنے لگیں، یہ نظر بندی اور سحر اندازی کا اثر تھا، جادو نے بھی وہی شکل دکھلائی جو عصائے موسیٰ علیہ السلام نے دکھلایا تھا لیکن انجام بالکل مختلف تھا۔ عصائے موسیٰ علیہ السلام جادوگروں کے ایک ایک کرتب کو اس طرح نگلنے لگا جیسے بھوکا پیاسا جانور پانی کے گھونٹ نگلنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر میں میدان صاف ہو گیا اور جادوگر سجدہ میں گر پڑے۔

آیت میں یہ بھی تصریح ہے کہ جادوگروں کے کرتب نے ابتداء موجودہ آدمیوں کو خوف زدہ کر دیا جس میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام بھی شامل ہیں جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی آیت نمبر ۶۷ میں مذکور ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت مذکورہ سے چار امور مستنبط ہوتے ہیں۔

1. خوارق سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے اس لیے کہ یہ اہل باطل سے بھی صادر ہو سکتے ہیں۔
2. سحر کی ایک قسم خیال میں تصرف کرنا بھی ہے۔ اسی قسم میں مسمریزم وغیرہ داخل ہیں۔
3. سحر اور مسمریزم وغیرہ سے متاثر ہونا باطنی کمال کے منافی نہیں چنانچہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام بھی خوف زدہ ہو گئے تھے۔
4. اہل حق کا ایسے امور پر یا ان کے ابطال پر قادر ہونا ضروری نہیں۔

23 ﴿قَالَ عَسٰى رَبُّكُمۡ اَنۡ يُّهۡلِكَ عَدُوَّكُمۡ وَ يَسۡتَخۡلِفَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرَ كَيۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ ۝﴾ [سورة الأعراف: 129]

ترجمة: موسیٰ علیہ السلام نے کہا: عنقریب تمہارا پروردگار تمہارے دشمنوں کو ہلاک کر دے گا اور تم کو زمین کا حاکم بنا دے گا پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔

یعنی خلافت ارضی کے فرائض و ذمہ داریاں کہاں تک پوری کر سکو گے، سو دیکھنے اور فکر کرنے کی اصل چیز انسان کے اپنے اعمال ہیں نہ کہ انسان کا عالمی و تکوینی موقف کہ وہ غالب ہے یا مغلوب وغیرہ۔

شاہ عبد القادر محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا یہ مذکورہ کلام مسلمانوں کو سنانے کے لیے نقل کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ سورۃ مکی ہے، اس وقت مکۃ المکرمۃ میں مسلمان ایسے ہی مظلوم و محکوم تھے جیسے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی دور میں بنی اسرائیل مظلوم و محکوم تھے۔ گویا آیت میں مسلمانوں کو بشارت دی جا رہی ہے کہ عنقریب اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ ہوگا اور کفر اور اہل کفر مغلوب و مقہور ہوں گے، چنانچہ فتح مکہ ۸ھ کے بعد ایسا ہی ہوا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت دلالت کرتی ہے کہ کافروں کا مغلوب ہونا اور مسلمانوں کا غالب ہونا ایک عظیم نعمت ہے۔ لہٰذا ترک دنیا کے یہ معنی نہیں کہ مومن کافروں کے ہاتھ میں بلا کسی عذر و

مجبوری، ذلت وخواری کے ساتھ پڑا رہے۔

24 ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ﴾ [سورة الأعراف: 136]

ترجمة: غرض ہم نے انہیں سزا دے دی اور انہیں سمندر میں ڈبو دیا اسی لیے کہ وہ ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے اور ان کی طرف سے بالکل غفلت میں پڑے رہتے تھے۔

تفسیر: انتقام کے معنی عربی میں عذاب وعقاب کے ذریعہ کسی نعمت کو چھین لینے کے آتے ہیں، فرعون اور قوم فرعون کی گناہ ومعصیت کاری نے انہیں اس انجام تک پہنچا دیا کہ نعمت اور حیات دنیا دونوں سے محروم ہو گئے یعنی پوری قوم کو ڈبو دیا گیا۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ دنیاوی سزا کبھی گناہوں پر بھی مرتب ہو جاتی ہے۔

25 ﴿اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [سورة الأعراف: 139]

ترجمة: یہ لوگ (مشرکین اور کافرین) جس میں لگے ہیں، یہ تباہ ہو کر رہے گا اور یہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ بھی باطل (ضائع ہونے والا) ہے۔

تفسیر: یعنی ان کا شغل بت پرستی بجائے خود باطل ہے اور انجام کار تباہی و بربادی بھی ہے۔ پھر مسلمانوں کو خطاب ہے کہ کیا تم ایسوں کی تقلید کی طرف جانا چاہتے ہو؟

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے لکھا ہے کہ اہل باطل کے ساتھ تشبہ تو دنیاوی عادت واطوار تک میں برا ہے چہ جائیکہ عبادات کے طور طریقوں میں۔

26 ﴿وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾

[سورة الأعراف: 142]

ترجمة: اور ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے تیس (۳۰) راتوں کا پھر ان کا تکملہ مزید دس 10 راتوں سے اور کیا۔ سو موسیٰ کے پروردگار کی مدت (مقررہ) چالیس 40 راتیں پوری ہوئیں۔

تفسیر: یہ چالیس راتیں کوہ طور پر اعتکاف کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھیں تاکہ کتاب تورات دی جائے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے یہ مدت پوری کی اور کتاب تورات لے کر اپنی قوم میں تشریف لائے۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے مذکورہ آیت سے دو مسئلے اخذ کئے ہیں۔

اوّل 1 لفظ لَيْلَةً سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کا حساب رات سے شروع ہونا چاہیے جیسا کہ اسلامی تاریخ، غروب آفتاب کے بعد شروع ہوتی ہے۔ (قمری حساب)

دوم ② لفظ أَربَعِيْنَ لَيْلَةً سے صوفیاء کرام کے چلّہ کی اصل مفہوم ہوتی ہے۔ اس مخصوص عدد کی برکتیں مشہور اور معروف ہیں جو مشاہدہ کی جا سکتی ہیں۔

㉗ ﴿وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ﴾ [سورة الأعراف: 142]

ترجمة: اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ میری قوم میں تم میری جانشینی کرنا اور ان کی اصلاح کرتے رہنا۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام کتاب تورات لینے کے لیے جب کوہِ طور جا رہے تھے، اس وقت اپنے بھائی سیدنا ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب اور جانشین بنایا اور مذکورہ ہدایت فرمائی۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی یہ نیابت وخلافت اسی طرح کی تھی جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی مدینہ طیبہ سے باہر تشریف لے جاتے (سفر یا غزوات وغیرہ کے لیے) تو کبھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور کبھی سیدنا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اور کبھی کسی اور صحابی کو اپنا نائب مقرر کرتے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اس میں اصل ہے شیوخ کے اس عمل کی کہ وہ اپنے بعض مُریدوں کو اپنے خلفاء کے سپرد کر دیتے ہیں تا کہ ان پر نگرانی قائم رہے۔

㉘ ﴿اِتَّخَذُوْهُ وَ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ﴾ [سورة الأعراف: 148]

ترجمة: اسی کو انہوں نے معبود بنا لیا اور وہ اپنے بارے میں بڑا ظلم کر بیٹھے۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی کتاب تورات لینے کے لیے کوہِ طور پر چالیس راتوں کا اعتکاف کیا تھا۔ اس عرصے میں اپنے بھائی سیدنا ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب اور قوم کا ذمہ دار قرار دیا تھا لیکن قوم نے انہیں خاطر میں نہ لایا اور سونے چاندی کا ایک بچھڑا بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی۔ بچھڑے کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ اس کے اندر سے بھیں بھیں کی آوازیں آتی تھیں جیسے بعض الموینیم کے کھلونوں سے مختلف جانوروں کی آوازیں پیدا کی جاتی ہیں۔

جاہل قوم نے اس کو خدائی حیثیت دے دی اور اس کی پرستش شروع کر دی۔ یہ فریب سامری نامی شخص نے ایجاد کیا تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ دلائل شرعیہ کی موجودگی میں خوارق وکرشموں سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے، یہ کم عقلی کی بات ہے۔

㉙ ﴿وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ﴾ [سورة الأعراف: 150]

ترجمة: اور موسیٰ نے تورات کی تختیاں تو ایک طرف ڈال دیں اور اپنے بھائی ہارون کا سر پکڑ کر اپنی جانب کھینچنا شروع کیا۔

تَفسِیر: یہ واقعہ بھی اس وقت پیش آیا جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر چالیس یوم تکمیل کر کے قوم میں واپس آئے تو دیکھا کہ ساری قوم گوسالہ پرستی میں مبتلا ہے۔ اپنے بھائی ہارون پر ناراض ہوئے کہ تمہاری موجودگی میں یہ کیا ہوتا رہا؟ غیظ وغضب میں تورات کی تختیاں تو ایک جانب رکھ دیں اور بھائی پر برس پڑے۔ سیدنا ہارون علیہ السلام اپنی مجبوری ظاہر کرنے لگے لیکن سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنا غصہ اتار ہی دیا۔

سُلوک: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے واقعہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا یہ عمل غیرت توحید کے جوش میں سرزد ہوا ہے اس لیے نہ ان پر گرفت کی جاسکتی ہے اور نہ یہ عمل دوسروں کے لیے حجت ودلیل بن سکتا ہے۔

بعض جاہل صوفیوں نے ان اعمال موسوی سے وجد اور رقص میں اپنے کپڑے پھاڑ دینے کو سند اور نظیر بنایا ہے، یہ قیاس مع الفارق ہے جو باطل نظریہ ہے۔ (قرطبی)

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی گوسالہ پرستی کی ذمہ داری اپنے بھائی سیدنا ہارون علیہ السلام پر ڈال دی تھی جو بعد میں غلط ثابت ہوئی۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کاملین سے جب اجتہادی خطا ہوسکتی ہے تو شیوخ سے بھی ممکن ہے کیونکہ یہ معصوم بھی نہیں ہیں۔

﴿61﴾ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ سَیَنَالُهُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَ ذِلَّةٌ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا﴾

[سورة الأعراف: 152]

ترجمة: بے شک جن لوگوں نے گوسالہ کو اپنا معبود بنالیا تھا ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے غضب اور ذلت بہت جلد پڑے گی اسی دنیا کی زندگی میں اور یہی سزا دیتے ہیں ہم بہتان باندھنے والوں کو۔

تَفسِیر: چنانچہ اللہ کا غضب اس طرح ہوا کہ جن لوگوں نے گوسالہ کو سجدہ کیا تھا، انہیں سجدہ نہ کرنے والوں سے قتل کروایا گیا۔ اس طرح شام تک ستر ﴿70﴾ ہزار آدمی مارے گئے اور ذلت یہ کہ دشمنوں نے نہیں خود اپنوں نے قتل وغارت کیا۔ [سورة البقرة: 54]

سُلوک: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ دنیا میں ذلت ورسوائی کبھی گناہوں کے سبب سے ہوجاتی ہے۔

﴿61﴾ ﴿کَذٰلِكَ ۚ نَبۡلُوۡهُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ۝﴾ [سورة الأعراف: 163]

ترجمة: ہم نے ان کی آزمائش اس طرح کی کہ وہ نافرمانی کررہے تھے۔

تَفسِیر: یہ واقعہ سیدنا داؤد علیہ السلام کے زمانے کا ہے۔ شہر اَیۡلَہ جو بحر قلزم کے کنارے آباد تھا یہاں کے لوگ مچھلی کے شکار پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ لوگ نبیوں کی مخالفت ونافرمانی کے عادی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے

اپنے نبی کے ذریعہ ان پر ہفتہ کا دن شکار کرنے سے منع کر دیا تھا تاکہ یہ دن عبادت میں گزاریں لیکن یہ لوگ چند دن تو پابندی کیے پھر حیلہ سازی میں پڑ گئے۔ ہفتہ کے دن شکار تو نہیں کرتے تھے البتہ دریا کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے حوض بنا لیا کرتے تھے۔ مچھلیاں ان میں آ جاتی تھیں، دوسرے دن پکڑ لیا کرتے تھے۔ اس حیلہ سازی سے ہفتہ کے دن شکار بھی نہ کیا اور مچھلیوں سے بھی محروم نہ رہے۔

سُلوك: اہل علم نے لکھا ہے کہ احکام شریعت سے بچنے کے لیے حیلہ حوالہ کرنا حرام ہے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جن حیلوں کا جائز ہونا فقہاء امت سے ثابت ہے وہ احکام شرعی کی تعمیل کے لیے ہے (یعنی شریعت کا منشاء پورا کیا جائے) نہ کہ ان سے بچنے اور دور رہنے کے لیے اختیار کیا جائے۔

(قرآن حکیم میں انبیاء علیہم السلام کے بعض حِیَل کا ذکر موجود ہے۔ ہماری کتاب ''ہدایت کے چراغ'' جلد ا رصفحہ ۲۱۱ مطالعہ کیجیے جو اس مسئلہ کی قرآنی تشریح ہے۔)

32 ﴿وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ﴾ [سورة الأعراف: 164]

ترجمة: اور جب ان میں سے ایک جماعت نے کہا: تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا کسی سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے؟ وہ بولے: ہم اپنے پروردگار کے ہاں عذر پیش کرنے کے لیے اور شاید کہ یہ لوگ احتیاط کریں۔

تفسیر: یعنی ہمارے سمجھاتے رہنے پر شاید وہ لوگ (مچھلی کا شکار کرنے والے) مان جائیں اور اپنی حیلہ بازی سے باز آ جائیں ورنہ کم از کم ہم اپنے رب کے آگے عذر پیش کر سکیں گے کہ باری تعالیٰ! ہم نے انہیں خوب سمجھایا اور ڈرایا تھا لیکن انہوں نے نہ مانا، ہم تو ان کے عمل سے دور تھے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا کہ جب نصیحت کے مؤثر ہونے کی قطعاً امید نہ رہے تو نصیحت کرنا واجب نہیں رہتا اگرچہ عالی ہمتی تو یہی ہے کہ نصیحت جاری رکھی جائے۔

33 ﴿وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝﴾ [سورة الأعراف: 168]

ترجمة: اور ہم انہیں خوشحالیوں اور بدحالیوں سے آزماتے رہے ہیں کہ شاید وہ باز آ جائیں۔

تفسیر: حسنات وسیئات سے جہاں نیکی وبرائی مراد ہے وہاں خوشحالی و بدحالی بھی مراد لی گئی ہے۔ زمانے کے حوادث صرف عذاب ہی عذاب نہیں ہوتے ان میں بھی خیر کے پہلو بکثرت پوشیدہ ہوا کرتے ہیں۔

قومی خوشحالی کی مثالیں یہ ہیں کہ قوم معزز ہو، دولت مند، صحیح وتندرست، قوت وطاقت والی ہو وغیرہ۔

اور قومی بدحالی کی مثالیں یہ ہیں کہ قوم محکوم وماتحت ہو، ذلیل وخوار، مفلس وتنگدست ہو وغیرہ۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں اگرچہ ظاہری ومادّی تنگی وفراخی کا ذکر ہے لیکن بندے کا

ابتلاء کبھی حسناتِ باطنی سے بھی کیا جاتا ہے۔

مثلاً بعض آدمی کو معصیت شعاری کے ساتھ ذوق وشوق الٰہی بھی قائم رہتا ہے، اس سے بندے کو دھوکہ لگ جاتا ہے کہ میں حق پر ہوں حالانکہ وہ باطل پر ہوتا ہے۔ لہٰذا گناہوں وغفلتوں کے ساتھ بسط (ذوق وشوق) بھی جمع ہوجائیں تو یہ استدراج (الٰہی مہلت وڈھیل) ہے جو خطرناک حالت شمار کی جاتی ہے۔

34 ﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٞ وَرِثُواْ ٱلۡكِتَٰبَ يَأۡخُذُونَ عَرَضَ هَٰذَا ٱلۡأَدۡنَىٰ﴾

[سورة الأعراف: 169]

ترجمۃ: پھران کے بعد ان کے جانشین ہوئے ایسے نالائق کہ کتاب اللہ کو تو ان سے حاصل کیا لیکن اس کے ذریعہ دنیا کا مال حاصل کرتے رہے اور یہ کہتے تھے کہ ہماری تو ضرور مغفرت ہوگی۔

تَفسِیر: یہودی حرام خوری اور رشوت و بددیانتی کے اس قدر حریص کہ آسمانی ہدایات تک کو معمولی معمولی مال و دولت کے عوض میں بیچ ڈالتے تھے حالانکہ ان کی شریعت اتنی سخت تھی کہ رشوت وخیانت تو الگ رہی، دین کی خدمت پر ہدیہ لینا بھی ممنوع تھا۔

جیسے ان کے بڑے مال کے طماع تھے، ان کے اخلاف بھی ان سے آگے ہی نکلے۔

اس کے باوجود یہودیوں کو اپنی نجات ومغفرت پر گھمنڈ تھا۔ وہ اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ ہم نبیوں کی اولاد اور ان کی نسل سے ہیں، ہمیں جہنم سے کیا واسطہ؟

سُلوک: علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جو دوسو (۲۰۰) سال پہلے کے مفسر قرآن ہیں، اپنی کتاب روح المعانی میں لکھتے ہیں: یہی حال ہمارے زمانے کے بکثرت صوفیاء کا ہے۔ شہوات ولذات دنیاوی پر پروانوں کی طرح گرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو یہ بات نقصان دہ نہیں اس لیے کہ ہم واصل باللہ ہوچکے ہیں۔ اور بعضوں کے بارے میں یہ بھی سنا گیا ہے کہ وہ خالص حرام کھاتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ذکر اثبات ونفی ﴿لَآ إِلَٰهَ إِلَّا ٱللَّهُ﴾ اس ضرر کو دفع کردیتا ہے۔ یہ صریح گمراہی ہے، اللہ ہمیں محفوظ رکھے۔ (روح المعانی)

تفسیر ماجدی کے مفسر لکھتے ہیں کہ ہندو پاک کے صوفیاء کے لیے یہ قصہ عبرت ہے۔

35 ﴿وَٱتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَأَ ٱلَّذِيٓ ءَاتَيۡنَٰهُ ءَايَٰتِنَا فَٱنسَلَخَ مِنۡهَا فَأَتۡبَعَهُ ٱلشَّيۡطَٰنُ﴾

[سورة الأعراف: 175]

ترجمۃ: اوران لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا اور شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں داخل ہوگیا۔

تَفسِیر: اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ قصہ بَلْعم بن باعوراء کا ہے جو قوم بنی اسرائیل میں ایک عالم اور صاحب

تصرف درویش تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی آیات کا علم دیا تھا جس کے ذریعہ وہ بڑے بڑے کام کر جاتا تھا لیکن ایک عورت کے عشق ومحبت اور مال ودولت کے حرص میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اپنے تصرفات چلانے اور ناپاک تدبیریں بنانے کے لیے تیار ہو گیا اور آسمانی ہدایات وبرکات سے منہ موڑ کر زمینی لذات وشہوات کی طرف جھک پڑا۔ شیطان اس کا تعاقب کرتا جارہا تھا، آخر گمراہوں کی قطار میں جاملا۔ اس وقت اس کا حال اس کتے کی طرح ہو گیا جو ہر وقت زبان لٹکائے ہانپتا پھرتا ہے۔

سُلوك: محدث طیبی نے لکھا ہے کہ جو شخص اس مثال میں غور کرے گا، اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ علماء سوء (بدعمل عالم) اس سے بھی بدتر حالت میں ہیں، مال وجاہ اور دنیاوی لذتوں میں کھپے ہوئے ہیں۔

(روح المعانی)

حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ انسان جب اپنے ارادے سے فسق وفجور اختیار کر لیتا ہے تو شیطان لازمی طور پر اس سے مستقل رفاقت پیدا کر لیتا ہے، قرآن حکیم نے ایسی رفاقت والے کو قرین کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی ہمیشہ ساتھ رہنے والا دوست۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

36 ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ [سورة الأعراف: 179]

ترجمة: وہ ایسے ہیں جیسے کہ چوپائے بلکہ اس سے بھی زیادہ بے راہ۔ وہی لوگ غافل ہیں۔

تَفسِیر: یعنی آخرت سے غافل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دل ودماغ، آنکھ، کان، احساس وشعور سب کچھ دیئے ہیں لیکن اللہ کی ان نعمتوں کو حق کی تلاش میں صرف نہیں کرتے، بس جانوروں کی طرح شکم سیری میں مشغول ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر حالت ہے۔ کیونکہ جانور اپنے مالک کی آواز پر چلا آتا ہے، اس کے ڈانٹنے پر رک جاتا ہے لیکن یہ غافل لوگ کبھی بھی اپنے خالق ومالک کی آواز پر کان تک نہیں دھرتے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت کا ظاہری مطلب تو یہی ہے کہ اللہ سے غفلت جہنم کا سبب ہوتی ہے لیکن اس کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ اللہ سے غفلت، شہوت اور حرص دنیا کا سبب بن جاتی ہے پھر حرص وشہوت سے جہنم مرتب ہو جاتی ہے۔

37 ﴿وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ﴾

[سورة الأعراف: 188]

ترجمة: اگر میں غیب کو جانتا رہتا تو اپنے لیے بہت سے نفع حاصل کر لیتا اور کوئی مضرت مجھ پر واقع نہ ہوتی۔

تَفسِیر: آیت میں بتلایا گیا ہے کہ کوئی بندہ خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو، نہ اپنے اندر "اختیار مستقل" رکھتا ہے نہ "علم محیط" (یعنی کل علم)۔ سید الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم جو علوم اولین وآخرین کے حامل اور خزائن ارضی کے

کنجیوں کے امین بنائے گئے ہیں، ان کو بھی یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا کہ غیب دانی صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ میں دوسروں کو تو کیا خود اپنی ذات کو بھی کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا، نہ کسی نقصان سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہوں مگر جس قدر اللہ چاہے، اتنے ہی پر میرا قابو ہے۔ اگر میں غیب کی ہر بات جان لیا کرتا تو بہت ساری بھلائیاں، کامیابیاں بھی حاصل کر لیتا جو مجھ کو علم غیب نہ ہونیکی وجہ سے فوت ہو جاتی ہیں نیز مجھ کو کبھی کوئی ناگوار حالت پیش نہ آتی۔

بہر حال مذکورہ آیت میں واضح طور پر یہ بتلایا جا رہا ہے کہ ''اختیار مستقل'' اور ''علم محیط'' (یعنی کل علم) نبوت کے لوازم میں شامل نہیں ہیں نبیوں کو غیب کی اطلاع دی جاتی ہے لیکن عالم الغیب اللہ کی ذات ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مذکورہ آیت صراحتاً بتلاتی ہے کہ ''قدرت مستقلہ'' اور ''علم محیط'' (کل علم) مقبولین سے بھی منفی ہے، جاہل لوگوں نے اپنے اپنے مشائخ سے کس کس طرح کا گمان قائم کر لیا ہے۔ ''وَلاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ اِلاَّ بِاللهِ الْعَظِيْمِ''

38 ﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمۡثَالُکُمۡ فَادۡعُوۡہُمۡ ﴾ [سورة الأعراف: 194]

ترجمة: جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا، وہ تم جیسے بندے ہیں، بھلا پکارو تو ان کو پس چاہیے کہ وہ قبول کریں تمہارے پکارنے کو اگر تم سچے ہو۔

تَفسِير: اللہ کے سوا جن جن ہستیوں کو پکارا جا رہا ہے اور ان سے استغاثہ و فریاد طلب کی جا رہی ہے، وہ سب ہم جیسے بندے ہیں۔ مخلوق ہیں، نہ ان سے فائدہ اور نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ بھی اپنے نفع نقصان میں دوسروں کے محتاج ہیں تو بھلا ایک محتاج دوسرے محتاج کو دینے دلانے کا کیا اختیار رکھ سکتا ہے؟

قرآن حکیم نے یہ واضح اعلان کر دیا ہے:

﴿ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ۚ وَ اللّٰہُ ہُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ ﴿۱۵﴾ ﴾ [سورة الفاطر: 15]

اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو۔ اور اللہ ہی غنی و بے نیاز، سب تعریفوں والا ہے۔

یعنی جن جن کا سہارا ڈھونڈتے ہو، وہ تمہاری پکار نہیں سنتے اور وہ بالفرض توجہ کرتے بھی تو کام نہ آسکتے بلکہ قیامت کے دن تمہاری مشرکانہ حرکات کا علانیہ بیزارگی کا اظہار کریں گے اور بجائے مددگار بننے کے دشمن ثابت ہوں گے۔ [سورة الفاطر: 14]

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے اخذ کیا ہے کہ نداء غیر اللہ بطور استعانت ناجائز ثابت ہو رہی ہے۔ (جیسا کہ بے علم لوگ بزرگانِ دین کو طرح طرح کے ناموں سے پکارا کرتے ہیں۔)

39 ﴿ خُذِ الۡعَفۡوَ وَ اۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰہِلِیۡنَ ﴿۱۹۹﴾ ﴾ [سورة الأعراف: 199]

ترجمۃ: آپ درگذر اختیار کیجیے اور نیک کام کا حکم کرتے رہیے اور جاہلوں سے کنارہ کش ہوجایئے۔

تفسیر: آیت مذکورہ سے اہل علم حضرات نے طرح طرح کے سبق حاصل کیے ہیں۔ حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ سے منقول ہے: وہ فرماتے ہیں: اس سے زیادہ اور کوئی آیت اخلاق کی جامع ترین نہیں ہے۔ (روح المعانی)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا: آیت میں عام لوگوں کے ساتھ شفقت و نرمی کے برتاؤ اور جاہلوں کے ساتھ حلم سے پیش آنے کی تعلیم ہے۔

40 ﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَٰئِفٌ مِّنَ الشَّيْطَٰنِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ ﴾

[سورة الأعراف: 201]

ترجمۃ: یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں، جب انہیں کوئی خطرۂ شیطانی لاحق ہوجاتا ہے تو وہ فوری یادالٰہی میں مشغول ہوجاتے ہیں جس سے یکا یک ان میں سوجھ بوجھ پیدا ہوجاتی ہے۔

تفسیر: گناہ کا نقطۂ آغاز وسوسہ ہوا کرتا ہے پھر بات آگے بڑھتی چلی جاتی ہے لیکن جن کے قلوب خوف الٰہی سے پُر رہتے ہیں، وہ وسوسے پر فوری خبردار ہوکر اللہ سے پناہ طلب کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ شیطانی وسوسہ ناکام ہوجاتا ہے۔

سُلوك: اہل تحقیق علماء نے لکھا ہے کہ شیطانی وسوسے سے تقویٰ میں کوئی نقصان نہیں آتا، کاملین پر بھی وسوسہ اندازی ہوجاتی ہے۔ وسوسہ سے محفوظیت کے تین درجے ہیں۔

1. اعلیٰ درجہ یہ کہ وسوسہ کا اثر ہی سرے سے نہ ہو جیسا کہ سیدنا ابراہیم خلیل اللہ و سیدنا اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہما السلام کے واقعۂ ذبح میں منقول ہے۔
2. اوسط درجہ یہ کہ وسوسہ اثر دکھائے مگر فوراً آگاہی ہوجائے اور وسوسے کے شر سے حفاظت بھی۔ یہ مقام صدیقین کا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام اور زُلیخا کے قصے میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔
3. ادنیٰ درجہ یہ کہ پھسلے مگر معاً سنبھل جائے، ڈرے، جھجکے پھر باز آجائے۔ یہ مقام تائبین (توبہ کرنے والوں) کا ہے۔

ان تینوں مقامات کا صاحب عارف، متقی، ولی، صاحب دل سمجھا جاتا ہے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت میں وسوسہ کا علاج استعاذہ اور ذکر اللہ بیان کیا گیا ہے۔ (یعنی جب برا خیال آجائے تو اللہ سے پناہ طلب کی جائے اور یادالٰہی میں مشغول ہوجائے۔)

ملحوظہ: اہل تحقیق علماء نے وسوسہ کے چار درجے شمار کیے ہیں۔ اس میں ہر درجہ اپنے دوسرے درجے سے بڑا ہوا ہوتا ہے اور آخری درجہ تو عمل کی شکل میں ظاہر ہوجاتا ہے۔

① ہاجس: ایسے وسوسے کو کہتے ہیں جو قلب میں آئے اور گزر جائے۔

② خاطر: ایسا وسوسہ جو بار بار آئے اور چلا بھی جائے۔

③ ہم: ایسا وسوسہ جو دل میں قرار پائے لیکن پختہ نہ ہو۔

④ عزم: ایسا وسوسہ جو پختہ ہو اور نیت اور ارادۂ عمل بھی اس میں شامل ہو جائے۔

41 ﴿وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ۝﴾ [سورة الأعراف: 205]

ترجمة: اپنے پروردگار کو اپنے دل میں یاد کیا کر عاجزی اور خوف کے ساتھ نہ کہ چلّانے کی آواز سے صبح وشام اور اہل غفلت میں شامل نہ ہو جانا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ذکر اللہ کی دو قسمیں خفی وجلی تو ثابت ہیں، مذکورہ آیت سے تیسری قسم یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ غفلت نہ ہو یعنی فکر ہو۔ فکر میں اگرچہ زبان کی حرکت نہیں ہوتی تاہم قلب بیدار رہتا ہے جو ایک قسم کا ذکر ہے۔

(علم تصوف میں ذکر وفکر کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ فکر سے یہی مراد ہے کہ غفلت نہ ہو، یاد الٰہی برابر قائم رہے)

42 ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ۝﴾ [سورة الأعراف: 206]

ترجمة: بے شک جو مخلوق تیرے پروردگار کے قریب (مقرب) ہیں، وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

تفسير: یعنی مقرب فرشتوں کو اللہ کی بندگی وعبادت سے قطعاً عار وشرم نہیں، وہ رات دن اللہ کی یاد اور اطاعت میں مشغول ہیں، انہیں اللہ کی یاد سے عزت وشان حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو وہ فرشتے ہیں جو عرش الٰہی سے غافل نہیں۔

جب ایسے بے شمار فرشتوں کو اللہ کی عبادت سے عار نہیں تو انسان کو اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ اللہ کی یاد و عبادت سے قطعاً غافل نہ ہونا چاہیے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مذکورہ آیت میں عبادت سے پہلے تکبّر سے بری ہونے کا ذکر دلالت کرتا ہے کہ تکبر سے بری ہونا باقی اصلاح پر موقوف ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے آیت کے الفاظ کی ترتیب سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قلوب کے اعمال مقدم ہیں جوارح کے اعمال پر۔ (تکبر قلب سے متعلق ہے۔)

سُورَةُ الأنفَال

پَارَة: 9

1 ﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ ﴾ [سورة الأنفال: 2]

ترجمة: ایمان والے تو بس وہی ہوتے ہیں جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل سہم جاتے ہیں اور جب انہیں آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ یہی لوگ سچے اور پکے مومن ہیں۔

تَفسِير: مذکورہ آیت میں اہل ایمان کی عملی حالت کا بیان ہو رہا ہے کہ ان کا ظاہر و باطن یکساں ہوا کرتا ہے اور اللہ کی آیات و احکام سے ان کے قلوب سہمے ہوئے رہتے ہیں اور ان آیات کا نزول ان کے ایمان میں اضافہ کا ذریعہ بنتا ہے اور اللہ پر مزید اعتماد و توکل بڑھتا ہے، پھر یہ لوگ نماز و زکوٰۃ کے پابند رہا کرتے ہیں۔

سُلوك: مذکورہ آیت میں اعمال باطنی (قلوب کے اعمال) اور اعمال ظاہری (جوارح کے اعمال) ذکر کیے گئے ہیں، اعمال باطنی میں توکل اور اعمال ظاہری میں صلوٰۃ و زکوٰۃ کی تصریح سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ باطنی اور ظاہری زندگی میں یہی اعمال سب سے زیادہ اہم اور قابل اہتمام ہیں۔

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سالکین کے اوصاف کی جامع تصویر ہے کہ اس میں حال (قلب کی حالت) بھی ہے اور عمل (جوارح کی عبادت) بھی ہے اور چونکہ صوفیاء ان سب اوصاف کے جامع ہوتے ہیں اس لیے ان کا کامل الایمان ہونا ثابت ہوتا ہے۔

2 ﴿ كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ ﴾
[سورة الأنفال: 5]

ترجمة: جیسا کہ آپ کے پروردگار نے آپ کو حکمت کے ساتھ آپ کے گھر سے باہر نکالا جب کہ اہل ایمان کی ایک جماعت اس کو گراں سمجھ رہی تھی۔

تَفسِير: آیت کا تعلق معرکۂ بدر سے متعلق ہے جو اسلام کی پہلی جنگ رمضان ۲ ھ (مطابق مارچ ۶۲۴ء) کا واقعہ ہے (اس معرکہ کی تفصیل ''ہدایت کے چراغ'' حصہ دوم ص ۸۸ ۴ پر مطالعہ کیجئے جو اس واقعہ کی قرآنی تشریح ہے۔) صحابہ کی ایک جماعت پہل کرنے میں تردد کر رہی تھی آخر اکابر صحابہ کے مشورہ کے بعد مقام بدر میں دشمنوں کی فوج (کفار مکہ) سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

مدینہ سے چلتے وقت مسلمانوں کی تعداد نہایت قلیل (۳۱۳) تھی، ساز و سامان بھی برائے نام تھا، دشمن کی تعداد ایک ہزار پھر سامان حرب و ضرب سے مسلح ایسی صورت میں مسلمانوں کا پیش قدمی کرنا بظاہر نقصان دہ نظر آ رہا تھا مگر مقابلہ میں فتح عظیم نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ اس معرکے سے اہل کفر کی مجموعی قوت پاش پاش ہوگئی اور خطۂ عرب میں کفر اور اہل کفر کی قوت و طاقت کا توازن بدل گیا۔

۞ ﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾

[سورة الأنفال: 10]

ترجمة: اور اللہ نے یہ صرف اس لیے کیا ہے کہ تمہیں بشارت (خوشخبری) ہو اور تا کہ تمہارے قلوب کو اس سے اطمینان ہو جائے۔ درحقیقت نصرت تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔ بے شک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

تفسیر: آیت میں بشارت (خوشخبری) سے مراد اللہ کا وہ وعدہ ہے جو میدانِ جنگ میں مسلمانوں سے کیا گیا تھا۔ چونکہ مسلمانوں کی تعداد اس معرکہ میں بہت کم تھی (کم و بیش تین سو) اور دشمن کی نفری تعداد سہ چند یعنی ہزار سے اوپر، ایسے وقت خوف و ہراس کا پیدا ہونا فطرتاً ممکن ہے۔ اللہ نے پہلے تو ایک ہزار (دشمن کی تعداد کے مطابق) فرشتوں کے نازل کرنے کا وعدہ فرمایا پھر یہ بشارت تین ہزار فرشتوں کے ساتھ آئی۔ اس کے بعد مزید اور اضافہ کیا یعنی پانچ ہزار فرشتوں کی تائید و نصرت کا اعلان کیا گیا۔

جنگ بدر میں مسلمانوں کے لیے یہ غیبی تائید و نصرت محض اس لیے مہیّا کی گئی کہ مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس دور ہو جائے اور پامردی سے دشمنوں کا مقابلہ کیا جا سکے تا کہ کفر کا زور ٹوٹے اور اس کا بازو کٹ جائے۔

اللہ کی تائید و نصرت براہِ راست بھی ہو سکتی تھی لیکن اللہ اسباب و ذرائع کا پاس و لحاظ رکھتا ہے اس لیے کوئی بھی مدد اسباب کے ذریعہ پہنچاتا ہے۔

سُلوك: اہل علم حضرات نے لکھا ہے کہ اسباب اختیار کرنے میں دل کو تسلی اور تقویت حاصل ہوتی ہے جو شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ عمل بھی ہے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت سے معلوم ہوا کہ اسباب کے غیر مؤثر اور مسببات کے من جانب اللہ ہونے کے باوجود پھر بھی اسباب میں حکمتیں ہوا کرتی ہیں۔

۞ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝ۚۖ﴾

[سورة الأنفال: 20]

ترجمة: اے ایمان والو! اطاعت کرتے رہو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور اس سے روگردانی نہ کرو درآنحالیکہ تم سن رہے ہو۔

تَفسیر: ایک مومن صادق کا یہ کام ہے کہ وہ اللہ اور رسول کا فرمانبردار رہو، ماحول اور تقاضے خواہ کیسے ہی ہوں منہ نہ پھیرنا چاہیے۔ زبان سے جب اقرار کرلیا کہ ہم نے سنا اور تسلیم کیا تو پھر ایسے ہی عمل بھی کرنا چاہیے ۔منافقوں کی طرح ایسا نہیں کہ زبان سے تو اقرار کرتے ہیں لیکن عمل سے جان چراتے ہیں۔

سُلوك: مفسرین نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ مومن کی عملی زندگی پر ایمان کا اثر ظاہر ہونا چاہیے اور اگر کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا تو محض قول بے کار ہی ہے۔ (قرطبی)

﴿وَاعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَ اَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُونَ﴾

[سورة الأنفال: 24]

ترجمة: اور جانتے رہو کہ اللہ آڑ بن جاتا ہے انسان اور اس کے قلب کے درمیان اور یہ کہ تم سب کو اس کے پاس اکٹھا ہونا بھی ہے۔

تَفسیر: یعنی کسی بھی حکم شرعی کی تعمیل میں دیر نہ کرنا چاہیے، ممکن ہے کچھ دیر بعد دل کی کیفیت ایسی برقرار نہ رہے کہ عمل ہو سکے۔ دل کی کیفیت پر انسان کا اپنا قبضہ نہیں ہوتا بلکہ دل اللہ کے قبضے وقدرت میں ہے، جدھر چاہے وہ پھیر دے لیکن اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

سُلوك: اہل علم لکھتے ہیں کہ اللہ کا انسان اور اس کے قلب کے درمیان آڑ بن جانا دو طرح سے ہوتا ہے۔

① ایک اس طرح کہ مومن کے قلب میں طاعت کی برکت سے کفر ومعصیت کو آنے نہیں دیتا۔

② دوسرے اس طرح کہ کافر کے قلب میں مخالفت کی نحوست سے ایمان وطاعت کو آنے نہیں دیتا۔

(ایمان وکفر یہاں بھی دو ② اختیاری سبب ہیں جو ہدایت نصیبی کے لیے آڑ بن گئے۔ ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ اللہ نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جان پر ظلم کر لیتے ہیں۔)

﴿وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ [سورة الأنفال: 25]

ترجمة: اور ڈرتے رہو اس وبال سے جو خاص انہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں اور جانتے رہو کہ اللہ سخت ہیں سزا دینے میں۔

تَفسیر: اسلام مسلمانوں کو جس بلند معیار پر دیکھنا چاہتا ہے اس کے لیے افراد کا صرف نیک ہو جانا کافی نہیں بلکہ ہر فرد بشر کو اپنی حیثیت کے مطابق دعوت وتبلیغ کا کام کرنا چاہیے کیونکہ جرم اور اہل جرم سے صرف نظر کرنا حق کو دبا دینے کے مرادف ہے جس کو شریعت کی زبان میں مداہنت کہا جاتا ہے۔ اور مداہنت خود ایک بڑا جرم ہے تو جن لوگوں نے نہ نصیحت کی اور نہ اظہار بیزارگی کی تو یہ لوگ بھی شریک جرم ہوئے۔ جب کسی جرم پر وبال آجائے تو مداہنت کرنے والے بھی اس میں مبتلا ہوں گے (اسی کو قرآن نے فتنہ کہا ہے)

شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ فِتْنَةً کا ترجمہ (گناہ) کے لفظ سے کرتے ہیں اور آیت کا یہ مطلب لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ایسے گناہ کے ارتکاب سے بچنا چاہیے جس کا برا اثر گناہ کرنے والے کی ذات سے متعدی ہو کر دوسروں تک بھی پہنچتا ہے۔ پھر اس کا وبال سب پر پڑے گا۔ (موضح القرآن)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ آیت سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ جس طرح اپنی اصلاح واجب ہے اسی طرح بقدر وسعت دوسروں کی اصلاح پر توجہ کرنا واجب ہے۔

﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً﴾ [سورة الأنفال: 35]

ترجمة: اور خود ان مشرکوں کی نماز ہی خانہ کعبہ کے پاس کیا تھی سوائے سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کے۔

تفسیر: آیت میں مشرکین کی عبادت کا خلاصہ بیان کیا جا رہا ہے کہ منہ سے سیٹیاں بجانا اور ہاتھ سے تالیاں پیٹنا، بس عبادت ہوگئی۔ قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے جس حقیقت کا اظہار کیا ہے وہ آج بھی جاہل متمدن قومیں اس کا ثبوت پیش کر رہی ہیں۔ مندر ہو یا کلیسا وگرجا یا آستانہ، عبادت کو جس طور طریقے سے ادا کرتے ہیں ان میں عبادت کا جزء اعظم یہی باجا گاجا، ہارمونیم، طبلہ، تالیاں وسیٹیاں ہیں۔

سُلوك: تفسیر قرطبی کے مفسر نے لکھا ہے کہ مذکورہ آیت میں ان جاہل صوفیاء کے لیے بھی وعید (دھمکی) ہے جو اپنے آپ پر وجد وحال لا کر اچھلتے کودتے، تالیاں بجاتے اور ناچتے ہیں اور اس کو کمال روحانی سمجھتے ہیں۔ ان میں مشرکین کی عبادت سے بہت حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ (قرطبی)

﴿وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَكُمْ﴾ [سورة الأنفال: 48]

ترجمة: اور جب شیطان نے انہیں ان کے اعمال خوشنما کر دکھائے اور کہا کہ لوگوں میں آج کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں ہے اور میں تمہارا حامی ہوں پھر جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوگئیں، وہ الٹے پاؤں بھاگ پڑا اور کہنے لگا: میں تم سے بری الذمہ ہوں، میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے، میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ شدید عذاب دیتے ہیں۔

تفسیر: آیت غزوۂ بدر سے متعلق ہے جب کہ ابوجہل اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مکۃ المکرمۃ سے چلا تھا تاکہ ابوسفیان کا تجارتی قافلہ بچا لے لیکن ابھی وہ درمیان راہ تھا کہ اس کو یہ پیام ملا کہ "قافلہ مسلمانوں کی زد سے بچ کر محفوظ حالت میں مکۃ المکرمۃ کی طرف رواں دواں ہے لہٰذا تم اپنا

لشکر لے کر واپس ہو جاؤ''، لیکن قریش مکہ کے سروں پر موت منڈلا رہی تھی، ابوجہل نے نہایت غرور کے ساتھ ساتھیوں سے کہا کہ ہم اس وقت واپس نہ جائیں گے جب تک اسلام اور مٹھی بھر مسلمانوں کا خاتمہ نہ کر دیں پھر بدر کے کنویں پر مجلس طرب ونشاط منعقد نہ کر لیں اور ہماری گانے والی عورتیں خوشی و کامیابی کے گیت نہ گالیں، شراب نوشی ہوگی اور اونٹ ذبح ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

قریش اپنی قوت پر مغرور تھے لیکن اس موقع پر اپنے ایک حریف قبیلہ بنی کنانہ سے جوان کی چھیڑ چھاڑ رہا کرتی، اندیشہ پیدا ہوا کہ وہ کہیں ہماری اس ہونے والی کامیابی میں دخل اندازی نہ کر دیں اور ہم شکست کھا جائیں۔ ابھی قطعی فیصلہ کرنے نہ پایا تھا ابلیس لعین ان کی پیٹھ ٹھونکنے اور ہمت بڑھانے کے لیے بنی کنانہ کے سردار سراقہ بن مالک کی شکل میں اپنی فوج لے کر نمودار ہوا اور ابوجہل اور سرداران قریش کو اطمینان دلایا کہ ہم سب تمہاری مدد وحمایت کے لیے آئے ہیں بس موقعہ بہت اچھا ہے مسلمانوں کی اس مٹھی بھر جماعت کا خاتمہ کر دو پھر اسلام کا نام بھی باقی نہ رہے گا۔ اس حمایت پر ابوجہل آمادۂ قتال ہو گیا اور میدان بدر میں مڈبھیڑ ہو گئی۔

مسلمانوں کی تائید ونصرت کے لیے اللہ تعالیٰ نے میدان بدر میں جبرئیل امین کو ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ نازل کیا۔ شیطان کو جب یہ منظر نظر آیا، ابوجہل کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر الٹے پاؤں بھاگا۔ ابوجہل نے کہا: سراقہ! عین وقت پر کہاں جا رہے ہو؟ کہنے لگا: میں اس وقت تمہارے ساتھ رہ نہیں سکتا۔ مجھے وہ چیزیں نظر آ رہی ہیں جو تم کو نظر نہیں آ سکتیں (یعنی فرشتے)، اب ٹھہرنے کی ہمت نہیں، میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔

امام قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ملعون یہاں بھی جھوٹ بولا، اس کے دل میں اللہ کا خوف کہاں؟ وہ تو اپنی جان کا اندیشہ کر رہا تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ آیت سے کئی مسئلے نکلتے ہیں۔

❶ شیطان جس طرح وسوسہ ڈالتا ہے، کبھی اسے ترک بھی کر دیتا ہے۔ جیسا کہ یہاں ''اِنِّي بَرِيءٌ'' میں اس کی مثال موجود ہے۔ اور یہ ترک وسوسہ اس وقت کرتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ انسان میرے وسوسے کے بغیر بھی گناہ کر لے گا۔

❷ کشف اہل باطل کے لیے بھی ممکن ہے، چنانچہ شیطان کو فرشتے نظر آئے۔

❸ اللہ تعالیٰ سے محض طبعی خوف ہونا کافی نہیں ہے، یہ تو ہر جاندار کو ہوا کرتا ہے۔ خوف ایمانی مطلوب و پسندیدہ ہوا کرتا ہے جو شیطان سے ممکن نہیں۔

❹ امکان تمثل کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ مذکورہ واقعہ میں شیطان سراقہ بن مالک کی شکل میں آیا تھا۔

ملحوظہ: امکان تمثل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی مخلوق کا اپنی اصلی وفطری شکل کے علاوہ دوسری شکل میں ظاہر

ہونا۔ یہ صورت عموماً شیاطین وجنات میں بکثرت پائی جاتی ہے لیکن یہ وقتی وہنگامی شکل ہوا کرتی ہے۔

ایسے ہی فرشتوں میں بھی یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ نبی کرم ﷺ کی جناب میں جبرئیل امین انسانی شکل میں آیا کرتے تھے۔ بسا اوقات دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ (دیہاتی مسلمان صحابی) کی شکل میں آئے ہیں اور غزوۂ بدر وحنین میں فرشتوں کی آسمانی فوج عام انسانوں کی شکل میں تھی۔

⑨ ﴿وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ یَتَوَفَّى الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓىٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ﴾

[سورة الأنفال: 50]

ترجمة: اور کاش آپ دیکھیں جب فرشتے ان کافروں کی جان قبض کرتے جاتے ہوں تو ان کے چہروں اور پشتوں پر مارتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اب آگ کا مزہ چکھو۔

تفسیر: آیت میں کافروں کی موت کے وقت روح نکالے جانے کی کیفیت بیان کی جارہی ہے کہ موت کے وقت فرشتے نہات ذلت وحقارت سے ان کی روح رگ رگ سے کھینچیں گے اور ساتھ ساتھ پٹائی بھی کرتے جائیں گے اور یہ اطلاع دیں گے کہ یہ تو تمہارا استقبال تھا، آگے چلو بھون دینے والا عذاب تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ قرآن حکیم نے نزع وروح وسکرات کی جو ہولناک تفصیلات بیان کی ہیں، وہ تمام تر مشرکین وکافرین سے متعلق ہیں۔

اور جہاں مطلق کا ذکر آیا ہے وہاں غمرات وسکرات وغیرہ جیسے الفاظ آئے ہیں جن کا مفہوم لازمی طور پر تکلیف یا عذاب نہیں ہے بلکہ غفلت، غشی، بے ہوشی مراد ہے جو اہل ایمان کی قبض روح کے وقت پیش آئیں گے بلکہ دیگر آیات واحادیث میں اہل ایمان کی موت کے وقت کی عزت واکرام اور خوشخبری کا تذکرہ ملتا ہے۔

[سورة الفجر: 28]

سُلوك: امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ آیت سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ کافر کی روح جب دنیا سے چلتی ہے تو اس کو دنیا چھوٹنے کا صدمہ تو ہوتا ہی ہے، ادھر آخرت پر جب نظر پڑتی ہے تو اپنے لیے تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے، اس طرح اسے آگے پیچھے دونوں جب سے مار پڑتی ہے۔ اعاذ ناالله منه

⑩ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾

[سورة الأنفال: 53]

ترجمة: یہ سب اس سبب سے ہے کہ اللہ کسی نعمت کو جس کا انعام وہ کسی قوم پر کر چکا ہو، بدلتا نہیں جب تک کہ وہی لوگ اس کو بدل نہ دیں جو کچھ ان کے پاس ہے۔

تفسیر: ہمیشہ سے اللہ کا یہ دستور رہا ہے کہ جب لوگ آیات اللہ کی تکذیب و انکار کرتے ہیں اور اس کے نبیوں کا اقرار و اعتراف نہیں کرتے تو اللہ نے کسی نہ کسی عذاب میں انہیں پکڑ لیا ہے۔

ایسے ہی جب عام لوگ بے اعتدالی اور غلط کاری سے نیکی کی فطری استعداد و صلاحیت کو بدل دیتے ہیں اور اللہ کی عطا کردہ داخلی و خارجی نعمتوں کو اس کے بتلائے ہوئے کام میں خرچ نہیں کرتے بلکہ اس کے خلاف استعمال کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ نعمتیں اس سے چھین لیتے ہیں۔

شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نیت و اعتقاد جب تک نہ بدلے، اللہ کی بخشی ہوئی نعمت چھینی نہیں جاتی۔ (موضح القرآن)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت کے عموم میں یہ بھی شامل ہے کہ سالک سے جب کوئی معصیت سرزد ہوتی ہے یا کوئی طاعت ترک ہوجاتی ہے تو اس سے انوار و برکات بھی منقطع ہوجاتے ہیں۔

⓫ ﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ﴾ [سورة الأنفال: 60]

ترجمة: اور ان کے مقابلہ کے لیے جو کچھ بھی تم سے ہوسکے، سامان درست رکھو قوت سے اور پروردہ گھوڑوں سے جس کے ذریعہ تم اپنا رعب رکھتے ہو اللہ کے دشمنوں پر اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی کہ تم انہیں نہیں جانتے۔ اللہ انہیں جانتا ہے۔

تفسیر: اللہ پر توکل کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ضروری اسباب کو ترک کردیا جائے (کیونکہ یہ تعطل ہے، توکل نہیں) مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہاں تک ہوسکے سامان حرب و ضرب فراہم کریں۔

نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں گھوڑے، اونٹ، شمشیر، تیراندازی کی مشق کرنا سامان جہاد تھا اور یہی اس دور کے آلات جہاد تھے، اسی میں مہارت و طاقت پیدا کرنا ضروری تھی۔ قرآن حکیم نے انہی آلات کی تیاری کرنے کا حکم دیا ہے۔ ایسے ہی آج کے دور میں رائفل، مشین گن، ٹینک، توپ، بمبار، ہوائی جہاز، راکٹ، آبدوز، کشتیاں، جوہری ہتھیار وغیرہ تیار کرنا اور اس کا استعمال جاننا ضروری ہوگا۔

باقی یہ سب سامان و تیاری دشمنوں پر دھاک و رعب کمانے کے لیے ایک ظاہری سبب ہیں لیکن فتح و نصرت تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ان آیات میں جو تدابیر بیان کی گئیں ہیں، ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری سیاسی تدابیر بڑے سے بڑے کمالات باطنی کے خلاف نہیں ہیں جیسا کہ بعض غالی و ناقص صوفیاء نے خیال کر رکھا ہے۔

⑫ ﴿وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۚ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ﴾ [سورة الأنفال: 63]

ترجمة: اور اللہ نے ان کے قلوب میں اتحاد پیدا کر دیا۔ اگر آپ دنیا بھر کا مال بھی خرچ کر دیتے تب بھی ان کے قلوب میں اتحاد پیدا نہ کر سکتے لیکن اللہ نے ان میں اتحاد پیدا کر دیا۔ بے شک وہ بڑی قدرت والا، بڑی حکمت والا ہے۔

تفسیر: اسلام سے پہلے قوم عرب ہی میں نہیں، ساری دنیا میں نسلی، قبائلی، لسانی، ملکی، ملی تفریقیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے تحت رہنا اپنی عار و توہین سمجھا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے ہر قوم میں خانہ جنگی ہوا کرتی تھی لیکن اسلام نے ان سارے امتیازات کو ایک دین، ایک تمدن، ایک تہذیب کے تحت کر دیا، سب کے سب ایک نظریے میں متحد ہو گئے۔

یہ اتحاد و اتفاق کسی انسانی جدوجہد کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اللہ نے محض اپنے فضل و کرم سے دلوں کو جوڑ دیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت کے الفاظ سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ قلب میں کسی حمیدہ صفت کا پیدا کرنا شیخ و مرشد کے اختیار میں نہیں ہے۔ اِلاَّ یہ کہ اللہ ہی چاہے۔

⑬ ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ﴾ [سورة الأنفال: 67]

ترجمة: نبی کی شان کے لائق نہیں کہ اس کے قیدی باقی رہیں جب تک کہ وہ زمین میں خون ریزی نہ کر لے۔ تم لوگ دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ تو تمہارے لئے آخرت چاہتا ہے۔

تفسیر: آیت کا پس منظر یہ ہے کہ معرکۂ بدر میں دشمن کے ستر (۷۰) آدمی گرفتار ہوئے تھے جو سب کے سب سردار دولت مند قسم کے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہیے؟ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ یہ لوگ ائمۃ الکفر (کفر و شرک کے علمبردار) تھے۔ اکثر صحابہ کا مشورہ یہی رہا کہ اس وقت مسلمانوں کو روپئے پیسے کی سخت ضرورت ہے، اس لیے مصالح ملت کا تقاضہ یہی ہے کہ ان سے فدیہ (جرمانہ) لے کر رہا کر دیا جائے، ممکن ہے یہ سہولت انہیں اسلام سے قریب بھی کر دے۔

بعض دیگر صحابہ نے ایسے ظالموں اور دشمنوں کو قتل کر دینے کا مشورہ دیا۔ ان میں خصوصیت سے سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ شریک تھے لیکن خود نبی کریم ﷺ کا فطری و طبعی رجحان عفو و درگزر کرنے کا تھا۔ صحابہ کی اکثریت کے مشورہ پر انہیں فدیہ لے کر آزاد کر دیا گیا اور بعض کو بلا فدیہ چھوڑ دیا گیا اور دیگر بعض کو قتل بھی کر دیا گیا جس کی سیاسی مصلحت تقاضہ کر رہی تھی۔

اس واقعہ پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں عتاب وعقاب کا عنوان ہے۔ مقصود یہ تھا کہ رسول کو قتل و قتال اس وقت تک جاری رکھنا چاہیے تھا کہ جب تک فساد کی بیخ کنی نہ ہوجائے اور کفر کا زور ٹوٹ نہ جائے اور لوگ آزادی سے اسلام میں جوق در جوق داخل نہ ہونے لگیں، ان قیدیوں کے قتل میں یہی منافع تھے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب خطائے اجتہادی نبی معصوم ﷺ تک سے ممکن ہے تو پھر مشائخ کے بارے میں خطا سے امتناع کا اعتقاد رکھنا کس قدر غلو اور بداعتقادی ہوگا؟

ملحوظه: مذکورہ آیت کے نزول پر نبی کریم ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ کیوں رو رہے ہیں؟

ارشاد فرمایا: بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے پر اللہ کا عذاب قریب آ گیا تھا۔ اگر وہ نازل ہوجاتا تو سوائے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے اور کوئی نہ بچتا۔ (صحیح مسلم جلد: ۲/صفحہ ۹۳)

﴿٧٠﴾ ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ﴾ [سورة الأنفال: 70]

ترجمة: اے نبی! ان قیدیوں سے کہہ دیجئے جو آپ کے قبضے میں ہیں: اگر اللہ کو تمہارے قلوب میں نیکی کا علم ہوگا تو جو کچھ بھی تم سے فدیہ میں لیا گیا ہے اس سے بہتر تمہیں دے گا اور تمہیں بخش دے گا۔

تفسیر: بدر کے جن قیدیوں سے فدیہ لیا گیا تھا، انہیں یہ بات سنائی جارہی ہے کہ اگر تمہارے قلوب میں خیر و بھلائی موجود ہے تو جو کچھ تم سے مال لیا گیا ہے، اس سے کہیں زیادہ بہتر دیا جائے گا اور مزید پچھلی خطاؤں سے درگزر بھی کردیا جائے گا۔

اور اگر اظہار اسلام سے رسول کو دھوکہ دینا مقصود ہے تو اس سے پہلے جو لوگ ایسا فریب کیے ہیں، ان کا انجام تمہیں معلوم ہے، اب تم کو اسلام لانے نہ لانے کا اختیار ہے۔ (چنانچہ بعض قیدی اپنا مسلمان ہونا ظاہر کیے تھے۔)

چنانچہ ان قیدیوں میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، انہیں دیگر ذرائع سے بے شمار دولت ملی اور اللہ کا وعدہ پورا ہوا۔

سیدنا عباس رضی اللہ عنہ جو ان قیدیوں میں شامل تھے، فرماتے ہیں کہ اسلام کے بعد مجھ کو اس فدیہ سے زائد مال و دولت ملی، اس طرح اللہ کا وعدہ پورا ہوا۔ قیدیوں میں سب سے زیادہ فدیہ میرا ہی تھا یعنی سو (۱۰۰) اوقیہ سونا (ایک اوقیہ ۳۷ گرام کا ہوتا ہے یعنی تین ہزار سات سو گرام سونا)۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ طاعت سے دنیا و آخرت دونوں کی برکات حاصل ہوتی ہیں خواہ مال کی صورت میں ہو یا احوال باطنی کی صورت میں۔

سُورَةُ التَّوْبَة

پَارَة: 10

❶ ﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ﴾

[سورة التوبة: 17]

ترجمة: مشرکین اس کام کے لائق ہی نہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں جب کہ وہ خود اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں۔

تفسير: مكة المكرمة کے مشرکین بڑے فخر وشان سے اپنے آپ کو مسجد الحرام (خانہ کعبہ) کا متولی اور خادم کہا کرتے تھے۔ انہیں اس پر ناز تھا کہ ہم حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں، انہیں پانی پلاتے ہیں، کھانا کپڑا دیتے ہیں، مسجد الحرام کی مرمت کرتے ہیں، صفائی و روشنی کا انتظام کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

زمانۂ کفر میں سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں اسی طرح کی بحث کی تھی اور خدمت کا حق جتلایا تھا، اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور مشرکین کی تعمیر و ترمیم کا پول کھول دیا گیا۔

سُلوك: فقہاء نے اس آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ کوئی کافر کسی بھی مسجد کا متولی یا بانی و خادم ہونے کے لائق ہی نہیں، کیونکہ کفر بغاوت و انکار کی کیفیت کا نام ہے پھر اللہ کے گھر کی تعمیر و آبادی کا کیونکر حق دار ہوگا۔

❷ ﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ﴾

[سورة التوبة: 18]

ترجمة: اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا تو صرف انہی لوگوں کا کام ہے جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یوم آخرت پر اور پابندی کرتے ہیں نماز کی اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور سوائے اللہ کے کسی سے نہیں ڈرتے، پس ایسے ہی لوگ راہ یاب ہیں۔

تفسير: ظاہر ہے جو لوگ اللہ اور رسول پر ایمان ہی نہیں رکھتے، ان کا اللہ کی مسجدوں کی آبادی سے کیا رشتہ و ناطہ؟ اگر وہ ایسا کرتے بھی ہوں تو ان کے یہ عمل بے روح ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نام و نمود اور اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ مسجد کی آبادی تو اللہ کی عبادت اور اس کے نام بلند کرنے کے لیے ہوا کرتی ہے جو مشرکین سے ممکن ہی نہیں ورنہ وہ مشرک و کافر کیوں رہتے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض اکابر سلف نے آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ جن مسلمانوں کو مساجد میں آباد ہوتے دیکھو اور ان کا تعلق مساجد سے وابستہ دیکھو تو ان کے ایمان کی شہادت دے دو۔

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾

ملحوظہ: امام ترمذی نے حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اِذَا رَائَیْتُمْ الرجلَ یَحتاد المسجدَ فَا شهد واله بالایمان.» (الحدیث)

جب تم کسی مسلمان کو دیکھو کہ وہ مسجد سے رشتہ جوڑے ہوئے ہے تو اس کے ایمان کی شہادت دے دو۔

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ﴾

[سورة التوبة: 24]

ترجمة: آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو، یہ سب اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز تر ہوں تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ بھیج دے اور اللہ نافرمان لوگوں کو منزل تک نہیں پہنچاتا۔

تفسیر: عزیزوں اور رشتہ داروں کی محبت بجائے خود بری نہیں ہوتی البتہ وہ محبت ممنوع اور حرام ہوجاتی ہے جو احکام شریعت کی تعمیل میں آڑے آجائے اور آدمی خلاف شریعت کرنے لگے۔ ماں باپ، اولاد و ازواج، بھائی، بہن یہ سارے عزیز رشتے اس وقت قابل قدر ہیں جب اللہ و رسول کی اطاعت میں مدگار ثابت ہوں ورنہ صرف جسمانی تعلق تو جانوروں کو بھی آپس میں حاصل ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مذکورہ آیت میں تعلیم اس بات کی ہے کہ تعلق مع الخلق کے مقابلہ میں تعلق مع اللہ کی زیادہ رورعایت رکھنی چاہیے۔ (ویسے بھی بہرصورت تعلق مع اللہ غالب ہونی چاہیے)

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾

[سورة التوبة: 26]

ترجمة: اس کے بعد اللہ نے اپنی طرف سے اپنے رسول پر اور مومنین پر سکینہ (تسلی) نازل کی اور ایسے لشکر نازل کیے جنہیں تم دیکھ نہ سکے اور کافروں کو سزا دی اور یہی کافروں کو جزا تھی۔

تفسیر: آیت میں غزوۂ حنین کا تذکرہ ہے۔ یہ غزوہ فتح مکہ کے دو ۲ ہفتے بعد ۶ شوال ۸ھ مطابق یکم فروری ۶۳۰ء میں پیش آیا، حنین مکۃ المکرمۃ کی ایک وادی کا نام ہے جہاں قبیلہ ہوازن اور قبیلہ ثقیف کے مشہور تیر اندازوں سے مسلمانوں کا مقابلہ ہوا۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی جو اس سے پہلے کسی غزوہ میں شریک نہ تھی۔ دس ہزار تو مدینہ منورہ سے آئے تھے اور دو ۲ ہزار مکۃ المکرمۃ کے نومسلم شریک تھے۔ اس بڑی تعداد پر مسلمانوں کو فطرتاً یہ خیال آیا کہ آج تو ہماری فتح یقینی ہوگی،

چنانچہ ابتداءایسے ہی ہوا۔مشرکین بھاگنے لگے اور مسلمان مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔دشمن کے ماہر تیر اندازوں نے موقعہ غنیمت جانا اور پلٹ کر نیا حملہ کر دیا اور اچانک اس قدر شدید تیر اندازی کر دی کہ مسلمانوں کے جمے پیرا کھڑنے لگے۔دشمن کے تیر بارش کی بوندوں کی طرح آنے لگے۔اس اچانک حملے پر ابتداءًان دو ہزار نو مسلموں میں افراتفری پیدا ہوگئی پھر عام مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت میں چند اصحاب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ،عمر رضی اللہ عنہ،عباس رضی اللہ عنہ،ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ تقریباً اسی ۸۰ یا سو(۱۰۰)اصحاب میدان جنگ میں باقی رہ گئے۔

زمین باوجود کشادہ ہونے کے تنگ ہوگئی لیکن رسول اللہ ﷺ کی ہمت و استقامت نے پیٹھ پھیرے مسلمانوں کو یکجا کر دیا۔آپ نے آواز دی: اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ، اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ خدا کے بندو!ادھر آؤ،ادھر آؤ۔میں اللہ کا رسول ہوں۔

پھر کچھ دیر نہ لگی کہ پیٹھ پھیرے مسلمانوں نے میدان جنگ کا رخ کیا اور آناًفاناً آپ کے گرد جمع ہوگئے اور مقابلہ شروع کر دیا۔آسمانوں سے فرشتوں کی مدد آئی اور مسلمانوں پر طمانیت وسکون لوٹ آیا۔

قبیلہ ہوازن کے تیرانداز حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے،میدان جنگ خالی ہوگیا۔لڑائی ختم ہوگئی، مال غنیمت کے ڈھیر جمع ہوگئے اور ہزاروں قیدی بہ زنجیر آپ کی خدمت میں کھڑے تھے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ عجب کا ترک کرنا نزول سکینہ کا باعث ہوا کرتا ہے(جیسا کہ عجب کرنا شکست وہزیمت کا باعث ہوا تھا)۔

ملحوظہ: عجب،تواضع وانکساری کی مخالف کیفیت کو کہا جاتا ہے۔قلب کی اس مکروہ کیفیت پر آدمی اپنے آپ کو لائق وفائق اور دوسروں سے بہتر سمجھنے لگتا ہے،اس کیفیت کو شریعت میں عجب کہا جاتا ہے۔غزوۂ حنین میں یہ کیفیت بعض مسلمانوں کے قلوب میں پیدا ہوگئی تھی۔

۞ ﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ [سورة التوبة: 30]

ترجمۃ: یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔یہ صرف ان کی زبانوں کی بکواس ہے(حقیقت کچھ بھی نہیں)۔

تَفسِیر: یہودی دراصل سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا نام ہے جیسا کہ نصاریٰ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی قوم ہیں،لیکن یہودی میں ایک فرقہ عزیری نام کا پیدا ہوگیا تھا جو سیدنا عزیر علیہ السلام سے وابستہ تھا۔سیدنا عزیر علیہ السلام بھی بنی اسرائیلی نبی تھے جن کے معجزات دیکھ کر ان کی قوم نے انہیں اللہ کا بیٹا قرار دے لیا تھا۔

موجودہ زمانے میں ملک فلسطین کے اطراف واکناف ایسے لوگ اب بھی خال خال پائے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو عُزیری کہا کرتے ہیں۔

سُلوك: آیت مذکورہ سے فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ "نقل کفر کفر نباشد" یعنی جس بات کا ابتداءً کہنا کفر تھا، اگر اس کو بطور عبرت ونصیحت نقل کیا جائے تو کفر نہ ہوگا۔

⑥ ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ﴾ [سورة التوبة: 31]

ترجمة: ان لوگوں نے اللہ کے ہوتے ہوئے اپنے علماء ومشائخ کو رب بنا رکھا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی حالانکہ انہیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ ایک ہی معبود کی عبادت کریں۔ کوئی اور اللہ کے سوا نہیں ہے۔

تفسیر: یہود اور نصاریٰ دونوں نے اپنے اپنے علماء ومشائخ کو اللہ سے برابری کا درجہ دے رکھا تھا یعنی ان مجبور وبے بس انسانوں کو ایسا اختیار دے دیا تھا کہ گویا وہی معبود اور رب ہیں۔ وہ جو چاہیں حلال کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حرام قرار دے دیں، مسیحیوں کے ہاں آج بھی کیتھولک فرقہ اپنے پوپ (پاپائے روم) کو بہ حیثیت نائب مسیح سارے اختیارات کا حامل اختیار کرتا ہے اور پروٹسٹنٹ فرقے نے بھی عملاً سارے اختیارات چرچ (کلیسا) کو دے رکھے ہیں۔

اور یہودیوں کے ہاں بھی رِبّیُون (علماء کی جماعت) کے احکام کتاب تورات کی تعلیمات پر غالب ہیں۔

مذکورہ آیت میں مسلمانوں کے بعض طبقات کے لیے بھی بڑی عبرت ہے۔ انہوں نے بھی اپنے بعض مشائخ کو خدائی نہ سہی، مطاع کا درجہ دے کر ان کے اقوال واعمال کو آخری درجہ دے دیا ہے۔ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

سُلوك: امام رازی رحمہ اللہ نے اپنے استاذ کا قول نقل کیا ہے: وہ کہتے ہیں کہ بعض غالی قسم کے دین داروں کو میں نے دیکھا ہے جب ان کے آگے قرآن کی صریح آیات پڑھ کر سنائی گئیں تو وہ حیرانی سے دیکھنے لگے کہ ان کے اسلاف کے خلاف یہ آیات کیونکر ہو سکتی ہیں؟ پھر انہوں نے ان آیات کو تسلیم نہیں کیا۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مذکورہ آیت میں نصوص کے مقابلہ میں کسی کی تقلید کرنے کی مذمت ہے جیسا کہ جاہلوں کی عادت ہے جب انہیں بدعات ورسومات سے منع کیا جاتا ہے تو وہ اپنے مشائخ کو حجت میں پیش کرتے ہیں۔

⑦ ﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ﴾ [سورة التوبة: 36]

ترجمة: بے شک مہینوں کا شمار اللہ کے ہاں بارہ (12) مہینے ہیں کتاب الٰہی میں اس روز سے جس روز سے زمین و

آسمان پیدا کیے ہیں اور ان میں چار مہینے بزرگی والے ہیں۔

تَفسِیر: اسلام میں قمری سن کے بارہ مہینے ہیں نہ کم نہ زیادہ اور یہ قانون روز اول ہی سے چلا آ رہا ہے۔ان بارہ مہینوں میں چار مہینے (محرم، رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ) اسلام کے ابتدائی دور میں بھی محترم اور مقدس مہینے قرار دیئے گئے تھے۔ان مہینوں میں جنگ وجدال ممنوع تھا (پھر بعد میں یہ حکم اٹھالیا گیا)۔یہ وہ مہینے تھے جس میں طاعت وعبادت مقبول اور گناہ ومعصیت قبیح تر قرار دیا گیا تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا کہ متبرک اوقات میں گناہ کی برائی شدید تر ہوجاتی ہے، پھر اسی پر متبرک مقامات کو قیاس کرلیا جاسکتا ہے کہ ان مقامات میں عبادت ونیکی نیک تر ہوجاتی ہے،لیکن ان لوگوں پر افسوس ہے جو مزارات صالحین پر عرس کے نام سے بدعات ومنکرات،ڈھول طبلہ،راگ راگنی وبے پردگی وقوالی کی محفلیں سجاتے ہیں۔ والی اللہ المشتکی

ملحوظه: اہل علم نے مذکورہ آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے معاملات میں سن قمری ہجری کی پابندی کرنا واجب ہے،سن عجمی اور سن شمسی کی پابندی جائز نہیں۔(تفسیر کبیر،قرطبی)

(38) ﴿لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَلَٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ﴾

[سورة التوبة: 42]

ترجمة: اگر کچھ مال مل جانے والا ہوتا اور سفر بھی معمولی سا ہوتا تو یہ لوگ ضرور آپ کے ساتھ ہوجاتے لیکن انہیں مسافت ہی دور دراز معلوم ہوئی۔

تَفسِیر: آیت میں ان منافقین کا ذکر ہے جو غزوۂ تبوک (ماہ رجب ۹ھ) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تھے۔تبوک کی مسافت مدینہ منورہ سے تقریباً آٹھ سو میل کی ہے،موسم شدید گرمی کا تھا،باغات کے پھل اور کھیتیاں کٹنے والی تھیں،غذائی قلت کا زمانہ تھا۔ایسے حالات میں چھوڑ چھاڑ کر جہاد کے لیے نکل جانا صرف مخلص مسلمانوں کا ہی کام تھا۔چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد پابہ رکاب ہوگئی اور منافقین حیلے حوالے کر کے گھر بیٹھے رہے۔(تفصیل کے لیے ہدایت کے چراغ جلد ۲ رصفحہ ۱۲۶ دیکھئے)

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت میں اخلاص جاننے پہنچاننے کی ایک کسوٹی ملتی ہے یعنی اس طرح غور کرے کہ جس دینی کام میں دنیاوی نفع نہیں بلکہ بظاہر مشقت ہی مشقت ہے،اس میں شرکت کرنے سے نفس کا کیا رنگ ہوتا ہے؟ اگر دنیاوی نفع کی خاطر ہی عمل کرنا چاہتا ہو تو یہ اخلاص کی علامت نہیں۔

(9) ﴿عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ﴾ [سورة التوبة: 43]

ترجمة: اللہ نے آپ کو معاف (تو) کر دیا (لیکن) آپ نے ان کو (ایسی جلدی) اجازت کیوں دے دی؟ یہاں تک کہ ظاہر ہو جاتے آپ پر سچ کہنے والے اور جان لیتے آپ جھوٹوں کو۔

تفسیر: آیت میں انہی منافقین کا ذکر ہے جو غزوۂ تبوک میں شرکت کرنے سے بچ رہے تھے اور حیلے حوالے پیش کر کے نبی کریم ﷺ سے گھر بیٹھے رہنے کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ آپ ان کے مکر و فریب سے چشم پوشی فرما کر انہیں اجازت دے رہے تھے۔ ایسے وقت مذکورہ آیات نازل ہوئیں اور آپ کو آگاہ کیا گیا کہ ان غدار منافقین کو کیوں اجازت دی گئی؟ آپ اجازت نہ دیتے تو اچھا ہوتا کیونکہ اس وقت عام مسلمانوں کو معلوم ہو جاتا کہ یہ لوگ معذور نہیں بلکہ یہ منافقین لوگ ہیں۔ اس طرح ان کا نفاق واضح ہو جاتا اور مسلمان ان سے محتاط ہو جاتے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ شیوخ طریقت کو بھی اس میں تعلیم ہے کہ مریدوں کے عذر قبول کرنے میں احتیاط و بیداری سے کام لینا چاہیے کہ آیا وہ عذر واقعی صحیح بھی ہے یا نہیں؟

﴿لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ﴾ [سورة التوبة: 44]

ترجمة: جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ کبھی آپ سے اجازت نہ مانگیں گے کہ اپنے مال و جان سے جہاد نہ کریں۔ اور اللہ پرہیزگاروں سے خوب واقف ہے۔

تفسیر: وہی غزوۂ تبوک کا تذکرہ ہے کہ ایمان والے جہاد سے جی چرانا تو کیا مطلب، تعمیل حکم میں اپنی جان و مال سے شریک ہو جاتے ہیں اور انہیں اپنی حیات اسی میں نظر آتی ہے کہ راہ خدا میں کام آ جائیں۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مومن جب کسی خبر کو سنتا ہے تو بلا تامل اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے اور اس کا یہ دوڑنا شوق سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا آیت میں ذوق و شوق کا اثبات ہے۔

یعنی قلب میں شوق پیدا کیا جائے۔ (روح المعانی)

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ﴾ [سورة التوبة: 34]

ترجمة: اے ایمان والو! اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے اکثر علماء و مشائخ عام لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے اڑاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

تفسیر: یعنی خود حق کی تلاش اور طلب کرنا تو درکنار، حق کو قبول تک نہیں کرتے گویا عام محاورے میں لوگوں کو ٹھگتے رہتے ہیں۔ مثلاً معتقدین کی مرضی دیکھ کر ان کی مرضی کے مطابق مسئلہ بیان کرتے ہیں اور ان

سے نذرانہ وصول کر لیتے ہیں، اس طرح جائز و ناجائز نذرانے وصول کرتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ یہی حال ان جاہل مشائخ کا ہے جو اپنے مریدوں سے نذرانہ وصول کرتے رہتے ہیں اور اپنے منافع کے ختم ہو جانے کے اندیشے پر حق بات کو ظاہر نہیں کرتے۔

⑫ ﴿وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً﴾ [سورة التوبة: 46]

ترجمة: اگر ان لوگوں نے چلنے کا ارادہ کیا ہوتا تو اس کا کچھ سامان کرتے لیکن اللہ نے ان کے جانے کو پسند ہی نہ کیا اس لیے انہیں اسی پر جما رہنے دیا۔

تفسیر: غزوۂ تبوک ہی کا ذکر ہے۔ اس میں منافقین نے اپنے عذر کا اس طرح اظہار کیا تھا: یا رسول اللہ! مسلمانوں کے ساتھ چلنے کا تو ہمارا پختہ ارادہ تھا لیکن عین وقت پر فلاں فلاں ضرورتیں حائل ہو گئیں اور ہم ان وقتی ضرورتوں میں پھنس گئے۔ مذکورہ آیت میں ان کے عذر لنگ پر تنقید ہو رہی ہے کہ انہوں نے پہلے تو سفر کا ارادہ ہی کہاں کیا تھا جو مجبوری کی وجہ سے ترک کرنا پڑا۔ اگر واقعی کچھ ارادہ ہی کیا تو سامان سفر کی تھوڑی بہت تیاری کر لئے ہوتے۔ یہ کیسا ارادہ کہ عمل نام کو نہیں بلکہ نیت بھی نام تک کو نہیں پھر یہ مکر و فریب نہیں تو اور کیا ہے؟

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے مذکورہ واقعہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ تعطل (عمل نہ کرنا) عدم ارادے کی دلیل ہے (یعنی عمل نہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ تم نے ارادہ ہی نہ کیا تھا)۔ بہت سے لوگ اس دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمیں طاعت و عبادت کی رغبت ہے لیکن ان کا یہ خیال جھوٹا ہے، وسوسہ ہے:

اگر عشق ہوتا تو تدبیر کرتا

⑬ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ﴾ [سورة التوبة: 49]

ترجمة: ان منافقین میں بعض ایسے بھی ہیں جو آپ سے کہتے ہیں: مجھ کو (اجازت) رخصت دے دیجئے اور مجھ کو خرابی میں نہ ڈالیے۔

تفسیر: غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے کے لیے جو حیلے تراش لیے گئے تھے، اس ایک مسخرے نے جس کا نام جد بن قیس بیان کیا جاتا ہے، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آ کر اپنا یہ عذر پیش کیا: یا رسول اللہ! مجھ کو تو آپ مدینہ ہی میں رہنے دیجئے۔ روم کی عورتیں نہایت حسین و جمیل ہوتی ہیں، میں انہیں دیکھ کر دل کو قابو میں نہ رکھ سکوں گا، کہیں کسی بڑے فتنے میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ لہٰذا آپ مجھے اس خطرے سے محفوظ رکھیے۔ غزوہ تبوک کی شرکت سے میں معذرت چاہتا ہوں۔

ملحوظہ: غزوۂ تبوک میں اہل روم سے مقابلہ تھا اور رومی مسیحی لیڈیاں آج کل کی امریکی لیڈیوں کی طرح اپنے

رنگ روپ، بناؤسنگھار اور بے حجابی میں اس وقت بھی مشہور تھیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کبھی کبھی نفس طاعات کی پابندی سے یہ بہانہ کر کے عذر کرتا ہے کہ طاعت میں فلاں فلاں برائی ہے جس کا شر اس کی بھلائی سے بڑا ہوا ہے لہٰذا عمل میں کوتاہی کر جاتا ہے (یہ ایک شیطانی خفیہ مکر ہے جو انسان کو عمل خیر سے محروم کر دیتا ہے)۔

⑭ ﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ [سورة التوبة: 51]

ترجمة: آپ کہہ دیجئے کہ ہم پر کچھ بھی پیش نہیں آسکتا مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے۔ وہ ہمارا مالک ہے اور اللہ ہی کا سہارا اہل ایمان کو رکھنا چاہیے۔

تفسیر: آیت میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ تقدیر الٰہی اور فضل خداوندی پر اعتماد کرنا اہل ایمان کا شیوہ اور ایمان کی علامت ہے کیونکہ جب اللہ ہمارا خالق و مالک ہے تو وہ جو کچھ بھی کرے گا ہمارے حق میں بہتر ہی ہوگا۔

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت کے پہلے جزء میں مراقبہ کی تعلیم ہے جو توکل کو آسان کر دیتی ہے۔ اس کے بعد اصل توکل کا حکم ہے۔

⑮ ﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ﴾

[سورة التوبة: 52]

ترجمة: آپ یہ بھی کہہ دیجیے کہ تم لوگ تو تمہارے حق میں دو ② بھلائیوں میں سے ایک ہی بھلائی کے منتظر رہا کرتے رہو اور ہم تمہارے حق میں انتظار اس کا کرتے رہتے ہیں کہ اللہ تم پر کوئی عذاب واقع کرے گا اپنی طرف سے یا ہمارے ہاتھوں سے۔ لہٰذا تم انتظار کرتے رہو، ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کریں گے۔

تفسیر: مذکورہ آیت میں منافقین کا حال بیان کیا جارہا ہے کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے بارے میں دو باتیں سوچا کرتے ہیں۔

مسلمانوں کو غلبہ و کامیابی نصیب ہوتی ہے تو جلتے اور کڑھتے ہیں اور اگر کبھی کوئی مصیبت پیش آتی ہو تو خوش ہوتے ہیں اور فخر سے کہا کرتے ہیں کہ ہم نے پہلے ہی سے دور اندیشی اختیار کی اور اپنے بچاؤ کا انتظام کرلیا تھا۔ لیکن یہ دونوں پہلو مسلمانوں کے لیے خیر ہی خیر تھے۔ کامیابی اور فتح ہونا تو خیر ہی خیر ہے، شکست و مصیبت کا ہونا وہ بھی مومن کے حق میں رحمت ہے کیونکہ اس کے پیش آنے پر گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں اور درجات بلند ہوا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے دونوں باتیں مومن کے لیے خیر ہی خیر ہیں۔ جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو

دو جواب دینے کی ہدایت دی جا رہی ہے۔

پہلے جواب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک اور حاکم ہیں۔ حاکم ہونیکی حیثیت سے انہیں ہر تصرف کا اختیار ہے، اس لیے ہم اللہ کے فیصلے پر راضی ہیں۔

دوسرے جواب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہیں، شکست و مصیبت میں بھی ہمارے لیے نفع کی رعایت رکھتے ہیں اس لیے ہم کو ہر حال میں فائدے ہی فائدے ہیں۔

بخلاف مشرکین کہ ان کی خوشحالی کا انجام، وبال و نکال ہے۔ اگر دنیا میں نہیں تو آخرت میں ضرور ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ قبض و بسط دونوں حالتیں فضل الٰہی کی ہیں، عارف کو ہر صورت میں مستقل مزاج رہنا چاہیے (قبض و بسط کی تعریف سلوک ۱۳ میں آچکی ہے)۔

⑯ ﴿وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى﴾ [سورة التوبة: 54]

ترجمة: منافقین کے نفقات (خرچ و تعاون) کو قبول لینے میں کوئی چیز مانع نہیں سوائے اس کے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کیا ہے اور یہ لوگ نماز نہیں پڑھتے مگر ہارے جی کے ساتھ اور خرچ نہیں کرتے مگر ناگواری کے ساتھ۔

تَفسِیر: آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ کفر و شرک کے ہوتے ہوئے کوئی بھی اچھا عمل مقبول نہیں ہوتا۔ ایمان کے قبول ہونے کی پہلی اور آخری شرط ایمان و اسلام ہے۔ اگر یہ نہیں تو کوئی بھی اچھا عمل اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔ منافقین کو چونکہ ایمان نصیب نہ تھا اس لیے ان کی کوئی بھی خیر خیرات مقبول نہیں۔

غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے کے جو حیلے حوالے منافقین نے گھڑ لیے تھے ان میں جد بن قیس منافق نے یہ عذر کیا تھا کہ یا رسول اللہ! میں عورتوں کا عاشق ہوں، خاص طور پر خوبصورت عورت کو دیکھ کر بے قابو ہو جاتا ہوں، روم کی عورتیں گوری گمٹی ہوتی ہیں۔ کہیں کسی عورت پر فریفتہ نہ ہو جاؤں جس سے میرا دین و ایمان خراب ہو جائے۔ لہٰذا آپ مجھے اجازت دے دیجئے کہ میں مدینہ ہی میں مقیم رہوں البتہ اس غزوہ میں مالی امداد کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تھی اور منافقت کا پردہ چاک کر دیا گیا۔

سُلوك: علماء نے لکھا ہے کہ جب نماز میں سستی کرنا نفاق کی علامت ہے تو ترک نماز کی کیا حالت ہوگی؟

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ منافقین لذت عبودیت سے محروم اور مشاہدۂ جمال معبود سے محروم ہیں۔

بعض عارفین نے لکھا ہے کہ جس شخص کو آمر (حکم کرنے والا اللہ) کی معرفت نہ ہوگی، وہ امر کی طرف سستی سے اٹھے گا اور جس کے دل میں آمر کی معرفت ہوگی وہ آمر کی طرف رغبت سے اٹھے گا۔

⑰ ﴿فَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ﴾ [سورة التوبة: 55]

ترجمۃ: سو ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈال دیں۔ اللہ کو تو بس یہ منظور ہے کہ انہی نعمتوں کے ذریعہ انہیں دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور ان کی روحیں ایسی حالت میں نکالے کہ وہ کافر ہوں۔

تفسیر: آیت میں اس شبہ کو دور کیا گیا ہے کہ جب یہ کافر اور منافق غیر مقبول اور مردود ہیں تو پھر انہیں دنیاوی خوشی، فراخی، اقبال مندی، مال و دولت و اولاد کی نعمتیں کیوں نصیب ہو رہی ہیں؟ یہ سوال آج بھی بعض نادان مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔

دراصل یہ شبہ قلت فہم کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اپنی نعمتیں صرف ایمان اور اہل ایمان سے وابستہ نہیں رکھی ہیں، دنیا کی عام نعمتوں کو عام ہی رکھا ہے۔ اس میں مسلم، مومن، کافر و مشرک، دین دار بے دین حتیٰ کہ بد دین تک کو فراوانی سے میسر ہوتی ہیں۔ لیکن آخرت کی خوشحالی اور کامیابی صرف اور صرف اہل ایمان کے لیے خاص رکھی گئی ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت میں اہل ایمان کو تنبیہ ہے کہ اہل دنیا کے مال و زینت کو مستحسن نہ سمجھیں۔ کہیں اس کی وجہ سے آخرت کے اعمال سے غافل نہ ہو جائیں۔

فقہاء نے آیت کے عبارۃ النص (ظاہری مفہوم) سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ کافروں اور گنہگاروں کی ظاہری نعمتوں کو دیکھ کر ان کے حال کی تمنا کرنا حرام ہے۔

اس طرح آیت میں ان کافروں اور غافلوں کو تنبیہ ہے کہ جس سامان کو یہ لوگ راحت و عیش کے لیے جمع کرتے رہتے ہیں، اس میں ان کو راحت نہیں ہے، صرف جمع کرنے اور حفاظت کرنے کی زحمت ہی زحمت ہے۔ قناعت اور بے فکری تو اہل ایمان کا حصہ ہے۔

⑱ ﴿وَلَوۡ اَنَّهُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ ۙ وَقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ وَرَسُوۡلُهٗۤ﴾ [سورة التوبة: 59]

ترجمۃ: اور کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ لوگ اس پر راضی رہتے کہ جو کچھ ان کو اللہ نے اور اس کے رسول نے دیا ہے اور یوں کہتے کہ ہم کو اللہ کافی ہے آئندہ اپنے فضل سے ہمیں اور دے گا اور اس کے رسول بھی دیں گے۔

تفسیر: یعنی بہترین طریقہ تو یہی تھا کہ اللہ نے جو کچھ بھی دیا تھا اور جو اپنے رسول سے دلوایا تھا اسی پر قناعت کر لیتے اور آئندہ بھی اللہ سے ملنے کی توقع رکھتے تو انہیں دنیا کی آسودگی حاصل ہو جاتی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اہل رضا و اہل توکل کی علامت یہی ہے کہ انہیں جو کچھ بھی اللہ کی طرف پیش آجائے، اس پر خوش و خرم رہتے ہیں حتیٰ کہ مصیبتوں میں بھی لذت حاصل کرتے ہیں۔

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهَ﴾

⑲ ﴿وَ مِنْهُمُ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ النَّبِیَّ وَ یَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ﴾ [سورة التوبة: 61]

ترجمة: اوران منافقین میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نبی علیہ السلام کو ایذاء دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ہر بات کان دے کر سن لیتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ وہ تمہارے حق میں خیر ہی کے بارے میں کان دے کر سنتے ہیں۔

تفسیر: منافقین کا یہ احساس تھا کہ چونکہ نبی کریم ﷺ ہر ایک کی بات سن لیتے ہیں لہٰذا ان کو دھوکہ میں لے آنا کوئی بڑی بات نہیں۔ چنانچہ یہ فریب خوردہ اکثر اوقات ایسی باتیں کرتے رہتے تھے جو نبی کریم ﷺ کے لیے باعث اذیت ہوا کرتی تھیں۔

آپ کی یہ خوش خلقی اور کریم النفسی تھی جو ہر بات پر توجہ فرماتے تھے، منافقین نے اس کو اپنی کامیابی وچالاکی سمجھی جب کہ یہ خود ان کی سیاہ بختی وفریب خوردگی تھی۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے: آیت نبی کریم ﷺ کے حلم وضبط اور کمال اخلاق کا آئینہ ہے کہ کسی بھی شخص کے اظہار ایمان پر آپ کی شفقت مرتب ہو جاتی ہے۔

⑳ ﴿وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ﴾ [سورة التوبة: 65]

ترجمة: اور اگر آپ ان سے دریافت کریں تو صاف کہہ دیں گے کہ ہم تو صرف مشغلہ اور خوش طبعی کر رہے تھے۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اس کی آیات کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ تم ہنسی کرتے ہو؟ اب تم یہ بے ہودہ عذر نہ کرو، تم اپنے آپ کو مومن کہہ کر کفر کرنے لگے۔

تفسیر: منافقوں سے جب ان کی استہزائی کیفیت کے بارے میں پوچھا جاتا تو صاف کہہ دیتے تھے کہ ہم تو صرف تفریح اور دلچسپی کے لیے ایسی باتیں کہہ دیا کرتے ہیں، باقی ہمارا ایمان ایسا نہیں ہے، ہم اللہ اور اس کے رسول کی شان وعظمت سے باخبر ہیں اور دل وجان سے اللہ اور اس کے رسول کو تسلیم کرتے ہیں۔

سُلوك: فقہاء نے آیت سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ کلمۂ کفر خواہ ارادے وسنجیدگی سے ادا کیا جائے یا محض خوش طبعی ولطیفہ کے طور پر ادا کیا جائے، حکم شرعی کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔

(ایسا شخص اسی وقت اسلام سے خارج ہو جاتا ہے) البتہ جبر واکراہ کا مسئلہ اس سے مختلف ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے یہ اہم بات بھی لکھ دی ہے کہ اللہ کی ذات سے استہزاء کرنا تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتا، لامحالہ اس استہزاء سے مراد احکام شرعی ہوں گے یا اسماء الٰہی وقدرت الٰہی سے مذاق کرنا ہوگا۔ (تفسیر کبیر)

ملحوظه: یہ قدیم جرثومہ آج بھی منافق صفت مسلمانوں کی زندگی میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ محفلوں، ڈراموں، شعر وشاعری، ادب وثقافت کے پردوں میں اللہ اور رسول پر طعن کرنا، شریعت کا مذاق، حور و

قصور پر ٹھٹھا، احکام شریعت کا استہزاء وغیرہ بے خوف و بے حجاب ہوا کرتا ہے اور ہر مرتبہ یہی جواب دیا جاتا ہے کہ یہ تو محض ادبی وثقافتی دلچسپیوں کے لیے تھا، کہیں مذہب پر طعن وتعریض تھوڑی ہی مقصود تھی۔

لیکن ان بے ادب مسخروں نے یہ نہیں سوچا کہ دل لگی اور تفریح کن کن چیزوں پر کی جارہی ہے؟ اللہ سے؟ اس کے رسول سے؟ اس کے احکام سے؟

یہ چیزیں تو کسی حال میں بھی محل استہزاء نہیں ہوسکتیں کہ ان کو موضوع تفریح بنایا جائے۔

㉑ ﴿ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ [سورة التوبة: 72]

ترجمة: اور اللہ کی رضامندی سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ بڑی کامیابی تو یہی ہے۔

تفسیر: یعنی اللہ کی خوشنودی ساری نعمتوں بڑھ کر ہے اور وہ تعمیل حکم سے ہر مسلمان کو حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ نہیں کہ رضائے الٰہی صرف اولیاء اللہ ہی کا حصہ ہے جیسا کہ بعض نادان سمجھتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ رضائے الٰہی جنت میں لے جانے اور ہر قسم کی نعمت پانے کا سبب بھی ہے۔ صوفیاء عارفین کا منتہائے مقصد بھی یہی رضائے الٰہی ہوا کرتی ہے۔

㉒ ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ﴾ [سورة التوبة: 73]

ترجمة: اے نبی! کافروں اور منافقوں پر جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

تفسیر: لفظ جہاد جنگ کے ہم معنی نہیں ہے بلکہ جہاد ہر اس جدوجہد کو کہا جاتا ہے جو دین کی سربلندی اور اشاعت کے لیے کی جائے۔ اس لحاظ سے قتال وجنگ بھی جہاد کی ایک قسم ہوگی۔

کافروں اور مشرکوں کے مقابلے میں جہاد تو جنگ وجدال سے ہوگا اور منافقوں اور فاسقوں سے مقابلے میں قول وعملی برتاؤ سے ہوگا۔ (قرطبی، تفسیر کبیر)

غِلْظَةٌ کے معنی شدت وسختی کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان باغیوں کے مقابلے میں نرم نہ پڑیں، مضبوطی سے قائم رہیں اور ان کے فاسد عقائد کا رد کیجئے۔

آج کے دور دجل فریب میں رواداری کا عام لفظ جس معنی میں چلا ہوا ہے، اسلام اس کا ہرگز قائل نہیں۔

سُلوك: مفسرین نے لکھا ہے کہ جس کسی کے متعلق فساد عقیدہ کی اطلاع مل جائے، اس پر جہاد دلائل سے کیا جائے گا اور اس کے مقابلے میں سختی بھی حسب طاقت وضرورت کی جائے گی۔ (مدارک)

㉓ ﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ ﴾ [سورة التوبة: 75]

ترجمة: ان منافقین میں بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ سے عہد کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے فضائل سے ہمیں بہت سارا مال عطا کرے تو ہم (اللہ کی راہ) میں خوب خوب صدقہ کریں گے اور خوب نیک کام کریں گے۔ پھر

جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے مال عطا کیا تو بخل کرنے لگے اور دین اسلام سے منہ موڑ لیا۔

تَفسِیر: ثعلبہ بن حاطب نامی ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے لیے کثرت مال کی دعا کروائی۔ آپ ﷺ نے اسے سمجھایا کہ اس میں خیر نہیں ہے۔ اس نے کہا: میں نیک کاموں میں خوب خوب خرچ کروں گا۔ اس کے اصرار پر آپ ﷺ نے دعا فرما دی اور وہ بہت جلد مال دار ہو گیا۔ جب زکوٰۃ کا حکم نازل ہوا تو کہنے لگا کہ اس میں اور جزیہ (جرمانہ) میں کیا فرق ہے؟ اور زکوٰۃ نہ دی۔

اس پر مذکورہ آیات نازل ہوئیں اور اس کے نفاق کا اعلان کیا گیا۔ یہ سن کر اپنی بدنامی سے بچنے کے لیے وہ اپنے مال کی زکوٰۃ لے آیا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے قبول نہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اللہ نے تیری زکوٰۃ لینے سے منع کیا ہے۔ اس نے بہت ہائے وائے کی اور چلا گیا۔ پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں دو چند زکوٰۃ لے آیا، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی قبول نہ کیا۔ پھر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت میں سہ چند زکوٰۃ لایا، آپ رضی اللہ عنہ نے بھی قبول نہ کیا۔ آپ کی وفات کے بعد سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بھی زکوٰۃ قبول کر لینے کی گزارش کی۔ آپ نے بھی انکار کر دیا۔ اس طرح وہ ناکام و نامراد ہو کر فوت ہو گیا۔

(عہد نبوت کا یہ عبرتناک واقعہ "ہدایت کے چراغ" حصہ دوم/صفحہ ۶۵۳ پر تفصیل سے مطالعہ کیجیے)

سُلوک: فقہاء نے مذکورہ آیت سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ نذر ماننے والے پر اسکا ادا کرنا واجب ہے۔ (جصّاص)

24 ﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۝﴾ [سورة التوبة: 77]

ترجمۃ: سو اللہ نے ان کی سزا میں ان کے قلوب کے اندر نفاق قائم کر دیا جو اس کے پاس جانے کے دن تک رہے گا اس سبب سے کہ انہوں نے اللہ سے اس کے خلاف کیا جو کچھ اس سے وعدہ کر چکے تھے اور اس لیے کہ وہ جھوٹ کہتے رہے ہیں۔

تَفسِیر: چونکہ ان منافقین نے اپنے ارادے سے گمراہی اختیار کر لی تھی، اللہ بھی ان کے ارادے کے خلاف ان کی گمراہی کو ہدایت سے نہ بدلے گا اور انہیں بدستور اسی حالت میں پڑا رہنے دے گا۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جس طرح طاعات سے ایمان کی نورانیت بڑھتی ہے، ایسے ہی گناہوں سے کفر کی ظلمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

25 ﴿اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِی الصَّدَقٰتِ﴾ [سورة التوبة: 79]

ترجمۃ: یہ ایسے لوگ ہیں جو نفل صدقہ خیرات کرنے والے مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ (خصوصاً) ان مسلمانوں پر جنہیں بجز محنت مزدوری کے کچھ نہیں ملتا۔ سو ان سے یہ مذاق کرتے ہیں۔ اللہ بھی ان کے

مذاق کا جواب دیتا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر: ہر دور میں منافق صفت انسانوں کا یہی حال رہا ہے کہ غریب غرباؤں پر ان کے دینی و اسلامی طور طریقوں کا مذاق اڑایا ہے اور ان کی اسلامی چال ڈھال، وضع قطع، شکل وصورت پر جملے کسے ہیں۔ عہد نبوت کے منافقین کا یہی حال تھا، وہ غریب مسلمانوں کی نیکی وصدقہ خیرات کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے عام مسلمانوں کو صدقہ دینے کی ترغیب دی، سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چار ہزار دینار پیش کیے، سیدنا عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ نے ایک سووسق (پیمانہ) کھجور جن کی قیمت چار ہزار درہم ہوتی تھی، پیش کیا۔ منافقین کہنے لگے: یہ سب نام ونمود کے لیے کیا جارہا ہے۔ ایک غریب صحابی سیدنا ابوعقیل رضی اللہ عنہ نے محنت مزدوری کر کے ایک صاع (پونے تین سیر) کھجور پیش کیا، منافقوں نے طعنہ دیا کہ یہ خواہ مخواہ شہیدوں میں شامل ہونا چاہتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ موجودہ دور میں بھی منکرین اولیاء کا یہی حال ہے، وہ بھی ان کے ہر عمل اور ہر حال پر عیب گیری کرتے رہتے ہیں۔

(26) ﴿اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ﴾ [سورة التوبة: 80]

ترجمة: آپ ان منافقین کے لیے بخشش طلب کریں یا نہ کریں۔ اگر ان کے لیے ستر (۷۰) بار بھی بخشش مانگیں، تب بھی اللہ انہیں معاف نہ کرے گا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے۔

تفسیر: منافقین جو واقعۃً کافر ہی تھے، ان کے لیے مغفرت کی دعا کرنی بالکل سود ہے ایسے ہی جیسا کہ کافروں کے لیے دعا کرنا بے کار ہے۔ اللہ تعالیٰ باغیوں کو معاف نہیں کرتے۔

واقعہ یہ تھا کہ عبداللہ بن ابی بن سلول مدینہ منورہ میں منافقوں کا رئیس تھا۔ جب یہ فوت ہوگیا تو اس کا بیٹا جو مخلص مسلمان صحابی تھے، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے اور اپنے باپ کی مغفرت کے لیے اور نماز جنازہ پڑھانے کے لیے درخواست کی۔ آپ ﷺ نے از راہ شفقت وکرم بیٹے کی گزارش قبول فرمائی اور اس کے کفن میں اپنی قمیص مبارک بھی دے دی اور میت کے منہ میں اپنا مقدس لعاب بھی لگادیا (تاکہ گستاخ زبان عذاب سے محفوظ ہوجائے)۔ پھر اس کی نماز جنازہ بھی پڑھ دی اور دعائے مغفرت بھی کی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس عمل میں آڑے آئے اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! یہ وہی خبیث ہی تو ہے جس نے فلاں فلاں وقت ایسا اور ایسا کہا تھا اور زندگی بھر نفاق کا علمبردار رہا ہے، اللہ نے آپ کو منافقین کے لیے مغفرت کی دعا کرنے سے منع فرمایا ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عمر رضی اللہ عنہ! مجھ کو استغفار کرنے سے منع نہیں کیا گیا بلکہ اختیار دیا گیا ہے کہ

کروں یا نہ کروں۔ اس کے بعد آپ اس جگہ سے ہٹنے بھی نہ پائے تھے کہ قرآن کی مذکورہ آیات نازل ہوئیں جس میں آپ کو منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے اور ان کے لیے مغفرت کی درخواست کرنے سے منع کر دیا گیا۔

اس واقعہ کے بعد آپ ﷺ نے پھر کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو پڑھنے کی اجازت تھی۔

سُلوك: اہل تحقیق علماء لکھتے ہیں کہ کفر و نفاق ایسی بری صفت ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے نبی معصوم کی سفارش بھی بے اثر ہو جاتی ہے۔

فقہاء نے آیت سے یہ مستنبط بھی کیا ہے کہ کافر کے لیے استغفار کرنا اور اس کے جنازہ میں شرکت کرنا درست نہیں۔

㉗ ﴿وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ﴾ [سورة التوبة: 81]

ترجمة: اور وہ منافق کہنے لگے کہ ایسی شدید گرمی میں گھروں سے نہ نکلو۔

تَفسِیر: غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے پر جو حیلے حوالے منافقین کر رہے تھے، ان میں ایک یہ پروپیگنڈہ بھی تھا کہ موسم شدید گرمی کا ہے، ان دنوں باہر نکلنا خاص طور پر دور دراز سفر (ملک شام) اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لینا ہے۔ لیکن یہ منافقین یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ دنیا کی گرمی سے بچ کر جس گرمی کی طرف جا رہے ہیں، وہ اس سے کہیں زیادہ شدید تر ہے (نارِ جہنم)۔ یہ تو وہی مثال تھی کہ دھوپ سے بھاگ کر آگ میں ٹھہرے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جو لوگ اصلاح نفس اور تربیت اخلاق کے لیے مجاہدے اور ریاضت کیا کرتے ہیں، انہیں خشک مولوی صاحبان یہ کہہ کر منع کرتے ہیں کہ میاں کیوں مصیبت میں پڑے ہو؟ دین آسان ہے، اپنی جان پر ظلم نہ کرو۔ اس طرح یہ لوگ بھی راہ سلوک سے روکتے ہیں۔

㉘ ﴿فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾ [سورة التوبة: 82]

ترجمة: سو تھوڑے دن ہنس لو اور پھر (آخرت میں) بہت دن روتے رہنا ہے، یہ ان کاموں کا بدلہ ہے جو وہ کرتے رہے ہیں۔

تَفسِیر: یہ عنوان کافروں سے متعلق ہے کہ وہ اپنے کفر و شرک اور فسق و فجور پر اس دنیا میں خوب مزہ کر لیں، ہنس لیں، بول لیں، مسلمانوں کا مذاق اڑا لیں، لیکن عنقریب عالم آخرت میں رونا ہی رونا ہے جس کی مدت ختم نہ ہونے والی ہے۔

فَلْيَضْحَكُوْا وَلْيَبْكُوْا الفاظ اگرچہ صیغۂ امر ہیں (یعنی ہنس لو اور رو لو) لیکن مراد خبر اور واقعہ ہے کہ آخرت میں انہیں رونا پڑے گا اور وہ روتے رہیں گے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض نادان مرید اپنے شیوخ سے یہ شکایت کرتے ہیں کہ اللہ کے

ذکر کے وقت ہمیں رونا نہیں آتا۔ (ہم بھی اور لوگوں کی طرح اللہ کی یاد میں رونا چاہتے ہیں)

ان کی یہ خواہش کم علمی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی یاد میں رونا اگرچہ محمود و پسندیدہ حالت ضرور ہے لیکن یہ حالت غیر اختیاری ہے اور غیر اختیاری امور واجب و ضروری نہیں ہوتے اور احکام تو صرف امور اختیاری میں ہوا کرتے ہیں، لہٰذا رونا نہ آئے تو کوئی نقصان نہیں، مقصود تو حاصل ہے (یعنی ذکر اللہ کرنا)۔ (اور جو قصد و ارادے سے رویا جائے، وہ تکلف اور تصنع ہے جس سے پرہیز کرنا چاہیے۔)

(۲۹) ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ﴾ [سورة التوبة: 84]

ترجمة: اور ان میں سے کوئی مرجائے، اس پر کبھی بھی نماز نہ پڑھیے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔

تفسیر: یہ منافقین کا حکم ہے کہ ان کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور نہ دعائے مغفرت کی جائے۔ یہ عہد نبوت کا خاص حکم تھا جب کہ نبی کریم ﷺ کو وحی الٰہی کے ذریعہ منافقین کی فہرست بتلادی گئی تھی۔ (چنانچہ آپ منافقین کی نماز جنازہ نہیں پڑھاتے تھے۔) آج کے دور میں یہ صورت ممکن نہیں ہے کیونکہ وحی کا سلسلہ بند ہوچکا ہے، اب کسی کے بارے میں قطعیت سے منافق کہنا صحیح نہیں اِلَّا یہ کہ کوئی اپنے منافق ہونے کا اعلان ہی کردے تو اور بات ہے۔ اب جو شخص کلمۂ توحید اور رسالت کا اقرار کرتا ہے، اس کو مسلمان ہی کہا جائے گا، اس کے کفن و دفن کا انتظام عام مسلمانوں کی طرح ہوگا اور دعائے مغفرت بھی ہوگی۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے فقہاء نے یہ اخذ کیا ہے کہ ہر مسلمان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی (خواہ وہ گنہگار کیوں نہ تھا) دوسرا مسئلہ یہ کہ مسلمان کو دفن کرتے وقت سب کو اہتماماً کھڑا ہونا چاہیے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا عمل مبارک تھا کہ میت کو دفن کرتے وقت آپ کھڑے ہوجاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ اپنے بھائی کے لیے مغفرت کی دعا کرو اور قبر میں ثابت قدمی کے لیے بھی کیونکہ یہ وقت فرشتوں کے سوال و جواب کا ہے۔ (ابوداؤد)

(۲۴۳) ﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ [سورة التوبة: 91]

ترجمة: کم طاقت لوگوں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ بیماروں پر اور نہ ان لوگوں پر جن کو خرچ کرنے میسر نہیں جب کہ یہ لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ اخلاص رکھتے ہیں، ان نیک لوگوں پر کسی قسم کا الزام نہیں ہے۔

تفسیر: جو لوگ واقعی معذور ہیں جیسے بوڑھے، اپاہج، بیمار وغیرہم، ان پر دین کے اجتماعی کام جہاد اور دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریاں نہیں ہوتیں۔ ایسے ہی وہ غریب مسلمان جو تندرست تو ہیں لیکن ان کے ہاں فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی گنجائش نہیں۔ یہ لوگ بھی معذور ہیں بشرطیکہ ان کے دل صاف ستھرے ہوں اور اللہ اور

رسول کے ساتھ ان کا تعلق واخلاص وابستہ رہا ہو۔ایسے مخلصین سے ازراہ بشریت کوتاہی ہوجائے تو اللہ انہیں معاف و درگزر کردے گا اور نہیں وہی اجر دے گا جو خرچ کرنے والوں کو ملا کرتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جو شخص کسی شرعی عذر کی بناء پر عمل کرنے سے قاصر ہوگیا مگر اس کی نیت یہ تھی کہ اگر مجھے قدرت حاصل ہوتی تو یہ عمل ضرور کرلیتا، ایسا شخص عمل نہ کرسکنے کے باوجود اس عمل کی برکتوں سے محروم نہیں رہتا۔

31 ﴿ اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجۡدَرُ اَلَّا يَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ ﴾

[سورة التوبة: 97]

ترجمة: دیہاتی منافقین کفر اور نفاق میں بہت ہی سخت ہیں اور ایسے ہی ہیں کہ ان احکام کا علم نہ رکھیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیے ہیں۔اور اللہ بڑا علم والا، بڑی حکمت والا ہے۔

تفسیر: آیت میں مدینہ منورہ کے اطراف واکناف والے دیہاتی منافقین کا ذکر ہے۔یہ لوگ اپنے کفر ونفاق میں شہری منافقین سے کچھ ہی آگے تھے۔یہ لوگ نسبتاً شہری لوگوں سے دور ہی رہے ہیں جن میں شہری تمدن وتہذیب زیادہ نہیں رہتی، اس لیے فطرتاً ان کے عادات واطوار میں تنگی اور جہالت زیادہ تھی اس لیے قرآن حکیم نے انہیں اشد کفراً ونفاقاً سے تعبیر کیا ہے (کفر ونفاق میں شدید تر)

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ صالحین کی صحبت سے دور رہنے میں خیر کے ساتھ مناسبت کم ہوجاتی ہے، اس لیے اہل طریقت نے صحبت صالحین کا بڑا اہتمام کیا ہے۔

32 ﴿ وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مَا يُنۡفِقُ مَغۡرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ﴾

[سورة التوبة: 98]

ترجمة: اور ان دیہاتیوں میں بعض ایسے بھی ہیں کہ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اس کو جرمانہ سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کے لیے زمانے کی گردشوں کا منتظر رہا کرتے ہیں۔

تفسیر: نفاق ایک ایسی بیماری ہے کہ انسانوں کو چین سے رہنے نہیں دیتی، وہ ہر وقت خیر اور اہل خیر کو دیکھ کر جلتا بھنتا رہتا ہے اور نیک لوگوں سے وحشت کھاتا ہے۔صداقت وامانت اسے بری لگتی ہیں، وہ شرماشرمی میں کچھ خرچ کرتا ہے تو اس کو اپنے لیے گراں اور جرمانہ سمجھتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: محققین نے لکھا ہے کہ مصارف شرعی کو جبر واکراہ خیال کرنا علامت نفاق ہے۔جو شخص اپنی دولت کا خود کو مالک خیال کرتا ہے، اس کو خرچ کرنا یقیناً گراں ہوگا اور جو کوئی اللہ کو مالک سمجھے گا اور خود کو صرف امین ومحافظ، اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے۔

33 ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ [سورة التوبة: 100]

ترجمة: اور جو مہاجرین اور انصار میں سے سابق ومقدم ہیں اور جتنے لوگوں نے بھی نیک کرداری میں ان کی پیروی کی ہے، ان سب سے اللہ راضی ہوا اور وہ بھی اللہ سے راضی ہوئے۔

تفسیر: مہاجرین ان مسلمانوں کو کہا جاتا ہے جو اپنا وطن مکۃ المکرمۃ چھوڑ کر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و پیروی کے لیے مدینہ منورہ آگئے۔

اور انصار مدینہ منورہ کے وہ مسلمان ہیں جنہوں نے مہاجرین مکہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دین اسلام کی ہر طرح خدمت اور نصرت کی۔

آیت مذکورہ میں ان سب حضرات کے ایمان واسلام واخلاص کی تصدیق کی جارہی ہے اور انہیں اللہ کی خوشنودی ورضامندی کی سند دی جارہی ہے کہ اللہ ان سب سے راضی اور خوش ہے اور یہ بھی اللہ سے راضی وخوش ہیں۔

ان کے ساتھ ان مسلمانوں کو بھی یہی سند دی جارہی ہے جنہوں نے مہاجرین وانصار کی پیروی کی اور ان کے نقش قدم میں چلے ہیں۔ ان سے مراد تابعین کرام ہیں جنہوں نے صحابۂ کرام کی تقلید و پیروی کی ہے۔

یہ سب لوگ راہ حق پر تھے اور اسی راہ پر انہوں نے وفات پائی۔

سُلوك: مذکورہ آیت سے اہل سنت کے محققین علماء نے یہ اخذ کیا ہے کہ اصحاب نبی امت کے مقتدیٰ ہیں اور امت کے تمام نیک لوگ ان کے تابع اور مقلد۔

آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سابق صحابی کو متاخر صحابی پر فضیلت ہے۔ یہ اس لیے بھی کہ پہلا شخص نیکی کا داعی ہوتا ہے اور دوسرا اس کا تابع اور مقلد۔ اور سابق، پہلے شخص کو دوہرا اجر ملتا ہے۔ (جصاص)

ملحوظہ: سند خوشنودی میں دو باتیں بیان کی گئیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ ان سے راضی وخوش ہوا، دوسرے یہ کہ یہ لوگ بھی اللہ سے راضی ہو گئے۔

عارفین نے لکھا ہے کہ بندوں کی رضامندی کے تین مقامات ہیں۔

اوّل 1: یہ کہ دل مانے یا نہ مانے، احکام شریعت کی اتباع کو لازم اور مقدم جاننا۔ یہ مبتدی صاحب تقویٰ کا مقام ہے۔

دوم 2: تقدیر الٰہی اور احکام الٰہی ایسے شخص کو محبوب و پسندیدہ ہو جائیں کہ خواہشات نفسانی کی طرف التفات ہی نہ ہو، یہ متوسط اہل تقویٰ کا مقام ہے۔

سوم 3: توحید اور معرفت الٰہی میں ایسا مشغول ہو جائے کہ کائنات کے سارے نظام میں اللہ تعالیٰ ہی کا

تصرف نظر آنے لگے، اسباب ووسائل کا حجاب ہی باقی نہ رہے، یہ مقام کاملین کا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مقام رضا سے برتر وافضل کوئی مقام نہیں (یعنی اللہ سے راضی ہو جانا)

34 ﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾ [سورة التوبة: 101]

ترجمة: اور کچھ تمہارے گرد وپیش والے دیہاتوں میں سے اور کچھ مدینہ والوں میں سے ایسے منافق ہیں جو نفاق میں اڑ گئے ہیں۔ آپ انہیں نہیں جانتے۔ ہم ہی انہیں جانتے ہیں۔

تفسير: یعنی بعض منافقین کا نفاق اس حد تک پہنچ چکا اور اس قدر پوشیدہ ہے کہ باوجود آپ کو ان سے ہر وقت سابقہ پڑنے کے، آپ کو بھی ان کے منافق ہونے کا علم نہیں، اللہ ہی ان کے نفاق پر مطلع ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مذکورہ آیت سے نبی کریم ﷺ کے عالم الغیب نہ ہونے کی صریح وضاحت ملتی ہے جبکہ اثبات کا دعویٰ ہمارے زمانے کے بعض عالم نما جاہلوں نے کیا ہے۔ معاذ اللہ۔

کشف وکرامت کے مدعیوں کو بھی آیت سے سبق لینا چاہیے، کشف بھی کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔

ملحوظه: ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے امام قتادہ تابعی رحمۃ اللہ علیہ (۶۱ھ تا ۱۱۶ھ) کا ایک طویل مقالہ نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ہمارے زمانے میں بعض لوگوں کی جسارتیں اتنی بڑھ گئیں ہیں کہ فلاں فلاں کے جنتی ہونے اور فلاں فلاں کے جہنمی ہونے کا حکم لگا دیتے ہیں حالانکہ غیب کی خبریں انبیاء کرام بھی نہیں دے سکتے۔

"الاّ انْ يَشاء الله"

مفسر ابن حیان غرناطی (۶۵۴ھ تا ۷۴۵ھ) نے امام قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا طویل قول نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ یہ حال اس زمانے کا ہے جو عہد صحابہ سے قریب تر تھا لیکن اب ہماری آٹھویں صدی ہجری میں بھی بہت سے سارے مدعیان تصوف کی زبانیں ایسے دعووں پر کھل گئی ہیں۔ یہ لوگ نہ کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نہ سنت رسول کی طرف مائل ہوتے ہیں، صرف دعوے ہی دعوے کرتے رہتے ہیں۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ یہ حال جب آٹھویں صدی ہجری کا تھا تو اب ہماری چودھویں صدی ہجری کا کیا حال بیان کیا جائے۔

بہر حال مذکورہ آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کے جنتی یا جہنمی ہونے کا قطعی حکم کوئی انسان نہیں لگا سکتا، یہ صرف علم خداوندی کا خاصہ ہے۔ (قرطبی)

35 ﴿وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا﴾ [سورة التوبة: 102]

ترجمة: اور کچھ دیگر لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا، انہوں نے ملے جلے عمل کئے تھے، کچھ

اچھے کچھ بُرے۔ توقع ہے کہ اللہ ان پر توجہ کرے۔ بے شک اللہ بڑی مغفرت والا، بڑی رحمت والا ہے۔

تَفسِیر: غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے والوں میں منافقین کے علاوہ کچھ مومنین صادقین بھی تھے جو محض اپنی سستی و کاہلی کی بناء پر پیچھے رہ گئے۔ مذکورہ آیت میں انہی مسلمانوں کا ذکر ہے، ان کی تعداد دس (۱۰) بیان کی جاتی ہے۔

ان میں بعض ایسے بھی تھے جنہیں شرکت نہ کرنے پر ایسی ندامت تھی کہ انہوں نے جب رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی واپسی کی خبر سنی تو اپنے آپ کو مسجد نبوی شریف کے ستونوں سے باندھ لیا۔ ان کی تعداد سات عدد تھی اور یہ عہد کرلیا کہ جب تک رسول اللہ ﷺ معاف فرما کر بنفس نفیس اپنے دست مبارک سے ہمیں نہ کھولیں گے، ہم اسی طرح بندھے رہیں گے۔

ان میں حضرت ابولبابہ بن منذر رضی اللہ عنہ کا نام نامی سرفہرست ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ حال دیکھا تو فرمایا: اللہ کی قسم جب تک اللہ تعالیٰ مجھ کو کھولنے کا حکم نہ دیں گے، میں ہرگز نہیں کھولوں گا۔

آخر اسی طرح بندھے رہے (نمازوں اور ضرورت بشری کے لیے یہ لوگ اپنے بند کھولتے پھر فراغت کے بعد باندھ لیتے تھے) پھر دیگر تین صحابیوں کی توبہ بھی قبول ہوئی اور مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ان کو کھولا۔ یہ وہ لوگ تھے جن میں گناہ کا ملکہ راسخ نہ تھا بلکہ نورِ استعداد پوری طرح باقی تھا، سستی و غفلت سے گناہ کر دیا تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ لوگ نفس لوامہ کے مرتبہ میں تھے جو کبھی نفس مطمئنہ کا پابند ہو کر نیک اعمال کرنے لگتا ہے اور کبھی اس سے بھاگنے لگتا ہے۔

ملحوظه: نفس کی تین قسمیں ہیں۔ نفس امارہ، نفس لوامہ، نفس مطمئنہ۔ تینوں کی تفسیر سلوک ۷۷۹ پر مطالعہ کیجیے۔

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ [سورة التوبة: 102]

ترجمة: توقع ہے کہ اللہ ان پر توجہ کرے۔ بے شک اللہ بڑی مغفرت والا، بڑی رحمت والا ہے۔

تَفسِیر: غزوۂ تبوک میں سستی و غفلت سے شرکت نہ کرنے والے مسلمانوں کی توبہ و استغفار کا ذکر ہے جن کی تعداد دس عدد بیان کی جاتی ہے۔ ان لوگوں نے سچے دل سے توبہ کی، اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔

آیت میں عَسیٰ کا لفظ آیا ہے جس کا ظاہری ترجمہ امید کہ، شاید کہ لکھا جاتا ہے لیکن جب یہ لفظ اللہ کے لیے آتا ہے تو شک و شبہ کے لیے نہیں ہوتا، یقین دلانے کے لیے ہوتا ہے۔ آیت مذکورہ میں یہی معنی ہیں۔

سُلوك: اہل تحقیق علماء نے آیت سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ گنہگار کو توبہ سے ناامیدی جائز نہیں ہے اور معافی کی امید اس وقت تک قائم ہے جب بندہ بدی کے ساتھ نیکی کی آمیزش بھی رکھتا ہے۔ (جصاص)

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ [سورة التوبة: 103]

ترجمۃ: آپ ان کے مال سے صدقہ لیجئے، اس کے ذریعہ آپ انہیں پاک وصاف کردیں گے اور ان کے لیے دعا کیجئے۔ بے شک آپ کی دعا ان کے حق میں باعث تسکین ہے۔

تفسیر: آیت میں انہی مسلمانوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی شریف کے ستونوں سے باندھ لیا تھا۔ جب ان کی توبہ کا اعلان ہوا تو قبولیت کی مسرت میں اپنا اپنا مال لے آئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ مال حاضر ہے، آپ جہاں مناسب خیال فرمائیں صدقہ کردیں، آپ ﷺ نے ان کا صدقہ مساکین پر تقسیم کردیا۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے متعدد مسائل اخذ کیے گئے ہیں۔

(1) توبہ کرنے سے گناہ معاف ہوگیا لیکن مال کا صدقہ کروا کر گناہ کی ظلمت و کدورت دور کردی گئی جو گناہ کرنے سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔

(2) انفاق مال سے مال کی خواہش کمزور ہوجاتی ہے اور مادۂ شہوت کی اصلاح ہوتی ہے۔

(3) آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ جس کو دیا جاتا ہے، اسی طرح وہ امام جس کو تقسیم کرنے کے لیے صدقہ پیش کیا جاتا ہے، ان دونوں کے لیے صدقہ دینے والے کو دعا دینا مستحب ہے، لہٰذا مسکین ومحتاج جس کو صدقہ دیا جارہا ہے، بدرجۂ اولیٰ دعا وشکریہ ادا کرنے پابند ہوں گے۔

(4) مشائخ صوفیاء نے اس میں مزید وسعت پیدا کرکے لکھا ہے کہ طعام ضیافت کے بعد صاحب خانہ (میزبان) کے حق میں دعائے خیر وبرکت کی جانی چاہیے۔

(5) فقہائے صوفیاء نے آیت سے یہ بھی اخذ کیا ہے کہ رسول کی دعا امت کے حق میں، امام کی دعا رعایا کے حق میں، مشائخ کی دعا مریدوں کے حق میں، علماء کی دعا شاگردوں کے حق میں، بڑوں کی دعا چھوٹوں کے حق میں، نیکوں کی دعا گنہگاروں کے حق میں، ماں باپ کی دعا اولاد کے حق میں مقبول ہوتی ہے۔

﴿وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ [سورة التوبة: 106]

ترجمۃ: اور کچھ دوسرے بھی لوگ ہیں، ان کا معاملہ اللہ کا حکم آنے تک ملتوی ہے، خواہ انہیں اللہ سزا دے یا خواہ ان کی توبہ قبول کرلے۔ اللہ بڑے علم والا، حکمت ہے۔

تفسیر: آیت میں اس چھوٹی سی جماعت کا ذکر ہے جنہوں نے غزوۂ تبوک میں سستی وتن آسانی کی وجہ سے

شرکت نہ کی تھی، ان کی توبہ پچاس دن بعد قبول ہوئی۔ وہ تین افراد تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ غزوہ تبوک (جو عہد نبوت کا خاتم الغزوات کہلاتا ہے) میں شرکت نہ کرنے والوں کی بنیادی طور پر تین جماعتیں تھیں۔

اول ①: تو وہ منافقین کی جماعت تھی جو از راہ شک ونفاق شرکت سے علیحدہ رہی۔

دوم ②: وہ مسلمان جو بوجہ سستی وغفلت شرکت سے محروم رہے۔

سوم ③: اس دوسری جماعت کے کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی شریف کے ستونوں سے باندھ لیا تھا (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) جن کی تعداد سات عدد بیان کی جاتی ہے۔ دوسرے وہ مسلمان جنہوں نے منافقین کی طرح عذر وحیلے وجھوٹی معذرت نہیں کی بلکہ جو حقیقت تھی صاف صاف بیان کردی۔ ان میں تین شخص تھے: کعب بن مالک رضی اللہ عنہ، ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ، مرارہ بن الربیع رضی اللہ عنہ ان تینوں نے اپنی لغزش کا اقرار کرلیا تھا۔ ان کا مسئلہ پچاس دن تک ایسے ہی معلق رکھا گیا۔

پھر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور ان کی توبہ قبول ہوگئی۔ (تفصیل کے لیے ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۲/۱ صفحہ ۶۳ دیکھئے)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ مرید کے معاملہ کو بعض اوقات خوف وامید کے درمیان معلق چھوڑ دینا قرین مصلحت ہوتا ہے، اس میں بہت سی مصلحتیں ہوتی ہیں۔

㊴ ﴿لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا ۚ لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِ﴾

[سورة التوبة: 108]

ترجمة: آپ اس مسجد میں کبھی نہ کھڑے ہوں۔ البتہ جس مسجد کی بنیاد تقویٰ پر روز اول سے رکھی گئی ہے، وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ (یعنی نماز پڑھیں)

تفسیر: غزوۂ تبوک میں جانے سے پہلے منافقین نے ایک مسجد تعمیر کرلی تھی تاکہ اس میں نمازوں کے بہانے جمع ہوکر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منصوبے طے کیے جائیں۔ اس فریب پر پردہ ڈالنے کے لیے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ آپ مسجد میں بطور افتتاح دو (۲) رکعت نماز برکت کے لیے پڑھ لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت فرصت نہیں، تبوک سے واپسی کے بعد دیکھا جائے گا۔

تبوک سے واپسی کی راہ میں آیات نازل ہوئیں جس میں ان منافقین کے برے ارادوں کی خبر دی گئی اور اس مسجد کا نام ''مسجد ضرار'' (ضرر ونقصان دینے والی مسجد) رکھا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو اس مسجد کو آگ لگادی اور یہاں کوڑا کرکٹ ڈلوادیا۔

اس مسجد کا ذکر مذکورہ آیت میں آیا ہے۔

دوسری مسجد جس میں نماز پڑھنے کا ذکر ہے، وہ مسجد قبا ہے جو تقویٰ وطہارت کی نیت سے تعمیر کی گئی ہے۔ یہ مسجد مسجد نبوی شریف سے تین چار میل پر واقع ہے۔ نبی کریم ﷺ کبھی پا پیادہ اور کبھی اونٹ پر سواری کر کے ہر ہفتہ نماز پڑھنے تشریف لایا کرتے تھے اور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ مسجد قبا میں دو رکعت نماز پڑھنا ایک مقبول عمرہ کا ثواب رکھتا ہے۔ عہد نبوت سے آج تک یہ سنت چلی آرہی ہے۔ روایات میں یہ بھی تصریح ہے کہ اپنے مقام سے نیا وضو کر کے مسجد قبا آنا چاہیے۔

سُلوك: فقہاء نے آیت مذکورہ سے یہ اخذ کیا ہے: ہر ایسی مسجد جس کی بنیاد گناہ اور مخالفت مسلمین پر قائم ہو، اس کو ڈھا دیا جائے۔ (جصاص)

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جو نیک کام حرام یا مکروہ بننے کا سبب ہو جائے، وہ نیک کام بھی حرام ہے۔ (کیونکہ اس میں نماز پڑھنا اس کی ترویج وترقی کا سبب ہوگا جو تخریب وتفریق بین المسلمین کے لیے بنائی گئی ہے۔)

مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسجد قبا جس کی بنیاد اخلاص وتقویٰ پر رکھی گئی تھی، اس کو دوام وبقاء نصیب ہوا جو ۱۴۱۶ھ آج تک قائم ہے، لہٰذا جس کام کی ابتداء اللہ کی رضاء وخوشنودی اور اخلاص نیت سے کی جاتی ہے، اس کو دوام و پائیداری ملتی ہے اور اس میں برکت ہوتی ہے۔ (قرطبی)

40 ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى﴾

[سورة التوبة: 113]

ترجمة: نبی اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، ان کے لیے جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں، اگرچہ وہ مشرک ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں (خاص طور پر) جب ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ مُردے جہنمی ہیں۔

تَفسِير: اسلام لانے کے بعد بعض صحابہ کو شدت سے احساس ہوا کہ ہم تو ایمان لا کر آخرت میں نجات پا گئے لیکن ہمارے ماں، باپ، بھائی، بہن جو حالت کفر میں فوت ہوئے ہیں، ان کے لیے کم از کم دعائے مغفرت کرنی چاہیے۔ اس عام تاثر پر مذکورہ آیت نازل ہوئی اور فوت شدہ مشرکین وکافرین کے لیے مغفرت کی دعا کرنے سے منع کر دیا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قطعی فیصلہ کرلیا ہے کہ مشرکین کی مغفرت کی دعا نہ کی جائے گی الا یہ کہ فوت ہونے والے کافر نے موت سے پہلے توبہ کر لی ہو اور اسلام قبول کرلیا ہو۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ شرک کس قدر بدترین گناہ ہے کہ سارے مسلمانوں کو حتیٰ کہ رسول اللہ

ﷺ تک کو منع کر دیا گیا کہ اپنے مشرک قرابت داروں کے لیے مغفرت کی دعا نہ کریں۔

رسول اللہ ﷺ کی قرابت سے بڑھ کر کس کی قرابت ہو سکتی ہے؟ تو پھر کسی اور نسبت، رشتے ناطے کا کیا مقام ہو گا جب کہ وہ ایمان اور عمل صالح سے خالی ہو؟

41 ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ﴾ [سورة التوبة: 114]

ترجمة: اور ابراہیم (علیہ السلام) کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا کرنا تو صرف اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے اپنے باپ کی مغفرت کا اللہ سے وعدہ کر لیا تھا۔ پھر جب ابراہیم (علیہ السلام) پر ظاہر ہو گیا کہ باپ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بے تعلق ہو گئے۔ بے شک ابراہیم علیہ السلام بڑے نرم دل بردبار تھے۔

تفسیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دعوت و تبلیغ اپنے باپ آزر سے شروع ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد باپ جو بت پرست بلکہ بت ساز تھا، ناراض ہو گیا اور دھمکی دینے لگا کہ اگر تم اپنی تبلیغ سے باز نہ آؤ تو تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس آخری لمحہ اپنے باپ کو سلام کیا اور یہ کہتے ہوئے گھر سے نکل گئے کہ میں آپ کی مغفرت کے لیے دعا کرتا رہوں گا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت اس میں امر کی دلیل ہے کہ شیخ کامل جس فعل سے اپنے مرید کو منع کرے اور پھر خود کسی ضرورت کے تحت وہی فعل کرنا پڑے تو چاہیے کہ مرید کے سامنے اسے کھول کر بیان کر دے تاکہ مرید اپنے شیخ کی تقلید میں مبتلا نہ ہو جائے۔

نیز یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ کسی کی زندگی میں اس کے لیے دعائے مغفرت کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے حق میں ہدایت طلب کی جارہی ہے۔

42 ﴿وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ﴾

[سورة التوبة: 118]

ترجمة: اور اللہ نے ان تینوں پر بھی توجہ فرمائی جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا یہاں تک کہ زمین اپنی کشادگی کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور وہ خود اپنی جانوں سے تنگ آ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ کے سوا اور کہیں پناہ نہیں۔ پھر اللہ نے ان پر توجہ فرمائی۔

تفسیر: ان تینوں سے مراد کعب بن مالک رضی اللہ عنہ، مرارہ بن الربیع رضی اللہ عنہ، ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان تینوں نے غزوۂ تبوک میں شرکت محض اپنی سستی و کاہلی کی وجہ سے نہیں کی تھی اور اپنے قصور کا اعتراف بھی کر لیا تھا اور رسول اللہ ﷺ سے معافی کی درخواست بھی کی تھی جس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے مسئلہ کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دیا تھا کہ اب اللہ ہی اس کا فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ ان تینوں کو اسی انتظار میں پچاس

دن گزارنے پڑے۔

اس عرصہ میں تمام مسلمانوں کو پابند کیا گیا کہ ان تینوں سے بات چیت، سلام کلام، لین دین بند کردیں۔ آخری دنوں میں اپنی اپنی بیویوں سے بھی علیحدہ ہوجانے کا حکم دے دیا گیا۔

اس صورت حال کو مذکورہ آیت میں بیان کیا جارہا ہے کہ ان تینوں پر زمین تنگ ہوگئی۔

سُلوك: آیت سے حکیم الامت رحمہ اللہ نے یہ اخذ کیا ہے کہ مرید پر حسب مصلحت تشدد جائز ہے۔

فقہاء نے استنباط کیا ہے کہ دینی مجرم سے ترک کلام وسلام درست ہے۔

⑬ ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ۝﴾ [سورة التوبة: 119]

ترجمة: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور صادقین کے ساتھ ہوجاؤ۔

تفسير: صادقین ایسے مسلمانوں کو کہا جاتا ہے جن کے ہر قول وعمل میں صداقت، راست بازی ہو۔ پھر ان کے کسی بھی عمل میں سوائے اللہ کی رضا و خوشنودی اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ گزشتہ آیت میں جن تین صحابی کی توبہ قبول ہوئی اور انہیں معاف کردیا گیا تھا، یہ صرف ان کی صدق بیانی کی وجہ سے تھا کیونکہ انہوں نے غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے کا کوئی بھی جھوٹا عذر پیش نہیں کیا، سچائی سے اپنی تقصیر کا اظہار کردیا۔

چنانچہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ خود کہتے ہیں کہ صرف سچ بولنے سے مجھ کو نجات ملی اس لیے میں نے عہد کرلیا ہے کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہ کہوں گا۔ اس عہد کے بعد مجھ کو سخت امتحانات بھی پیش آئے جس میں جھوٹ بولنا ضروری ہوگیا تھا مگر میں سچ کہنے سے کبھی نہ باز آیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے صالحین کی محبت کا اشارہ ملتا ہے (کیونکہ صالحین، صادقین ہی ہوا کرتے ہیں۔)

روح المعانی کے مفسر نے (مع الصادقین) میں معیت سے قرب وقرین بھی مراد لی ہے (یعنی نیکوں سے دوستی کریں)

⑭ ﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً﴾ [سورة التوبة: 122]

ترجمة: اور مؤمنوں کو نہ چاہیے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ یہ کیوں نہ ہو کہ ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کھڑا ہوا کرے تاکہ باقی لوگ دین کی سمجھ بوجھ (علم فقہ) حاصل کرتے رہیں تاکہ یہ اپنی قوم والوں کو جب وہ ان کے پاس آجائیں تو ڈراتے رہیں۔ عجب کیا ہے کہ وہ محتاط ہوجائیں۔

تفسير: غزوۂ تبوک کی صورت ایک خاص واقعہ تھا جو تفصیل کے ساتھ گذشتہ آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

مذکورہ آیت میں ایک مستقل ہدایت کی جارہی ہے کہ سارے مسلمان کسی بھی دینی مہم میں بیک وقت کوچ نہ

کریں الا یہ کہ جہاد فرض عین ہو جائے (جس کا حکم کتب فقہ میں دیکھ لیا جائے)۔ انتظام یہ رہنا چاہیے کہ آبادی کا ایک حصہ جہاد کے لیے باہر جائے، دوسرا حصہ ملک وملت کی ضروریات کے لیے شہر اور ملک ہی میں رہے۔ اسلامی حکومت میں ہر خدمت کے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لیے مستعد رہنا چاہیے۔

آیت میں یہی حقیقت بیان کی جارہی ہے کہ کسی بھی ایک دینی کام میں سارے مسلمانوں کو مشغول نہ ہونا چاہیے۔ خاص طور پر تحصیل علم کے لیے ایک قابل لحاظ تعداد شہر میں رہنی چاہیے تاکہ جہاد سے واپس آنے والے مسلمانوں کو دین واسلام کی نصیحت اور رہنمائی کی جاسکے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کسی بھی دینی مہم کا انتظام ایسا کرنا چاہیے کہ دوسری ضروریات جس میں تحصیل معاش (روزگار) بھی شامل ہے، خلل نہ ہونے پائے۔

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جس آبادی میں علماء حقانی کا وجود نہ رہے یا وہ موجود تو ہوں لیکن ہدایت خلق کے کام سے غافل ہوں تو ساری آبادی گناہ گار ہوگی۔ بدکاری کو روکنا اور نیک کرداری کو پھیلانا فرض کفایہ ہے۔ علماء حق اس کے خصوصی ذمہ دار ہیں اگرچہ تمام مسلمان حکم کے مخاطب ہیں۔

45 ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً﴾

[سورة التوبة: 123]

ترجمة: اے ایمان والو! ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس (قریب) ہیں اور ان کے بارے میں تمہارے اندر سختی ہونی چاہیے۔ اور جان لو کہ اللہ ہر پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

تفسیر: یعنی مسلمانوں کو ہمیشہ اپنی جگہ مضبوط اور مستعد رہنا چاہیے تاکہ دشمن کی ہمت اٹھ نہ سکے۔ آس پاس کے کافروں سے اسلامی ریاست کے قرب و جوار کی کافر بستیاں مراد ہیں، کیونکہ ان کا ضرر بہ نسبت دور کی بستیوں کے زیادہ احتمال رکھتا ہے۔ قرب و جوار میں مشرکین کے ہوتے ہوئے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کا رخ نہ کرنا چاہیے۔ قریبی دشمن کو چھوڑ کر بعید کے دشمن پر نظر رکھنا احتیاط کے خلاف بات ہے البتہ کوئی وقتی ضرورت ہو تو اور بات ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ سب سے پہلا مجاہدہ اپنے نفس سے کرنا چاہیے کیونکہ ایمان واسلام کا سب سے قریب دشمن یہی نفس امارہ ہے۔

(حدیث شریف سے بھی اس بات کی تائید ملتی ہے کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کے اپنے پہلو میں ہے)

ابن کثیر رحمہ اللہ نے مذکورہ آیت ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ سے یہ بات اخذ کی ہے کہ جن مسلمان سلاطین نے تقویٰ کی شرط پوری رکھی اور اپنی سلطنت میں اسلامی احکام جاری رکھے ان کے زمانے میں فتوحات بھی برابر ہوتی

رہیں اور جوں جوں وہ شروط تقوی سے ہٹتے رہے، فتح مندی بھی ان سے کنارہ کرتی رہی۔

46 ﴿اَوَ لَا یَرَوْنَ اَنَّهُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَ لَا هُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ۝﴾ [سورة التوبة: 126]

ترجمة: کیا یہ نہیں دیکھتے کہ یہ لوگ ہر سال ایک (1) بار یا دو (2) بار کسی نہ کسی آفت میں پھنستے ہی رہتے ہیں پھر بھی نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

تفسیر: یعنی یہ منافق اتنی بات بھی نہیں سمجھتے کہ ہر سال انہیں منافقت کی بناء پر آفتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کبھی ان کی سازشیں کھل گئیں اور انہیں اس کی سزا بھی مل گئی اور رسوائی ہوئی، کبھی ان کے حلیف مشرکین کو شکست ہوتی ہے تو ان کا سہارا ٹوٹ جاتا ہے، کبھی خوف و ہراس میں مبتلا ہوئے ہیں اور کبھی ان کا نفاق ظاہر ہو گیا مگر یہ ایسے باطل ہیں کہ نہ انہیں توبہ کی توفیق ہوتی ہے اور نہ نصیحت و عبرت قبول کرتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں بلاؤں و مصیبتوں کی حکمت معلوم ہوتی ہے کہ اس سے انسان کو عبرت و نصیحت لینی چاہیے۔ یہ غیبی تازیانے ہیں جو اللہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

47 ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝﴾ [سورة التوبة: 128]

ترجمة: بے شک تمہارے پاس ایک رسول آئے ہیں تمہاری جنس میں، جو چیز انہیں نقصان پہنچاتی ہے انہیں بہت گراں گزرتی ہے، تمہاری بھلائی کے حریص ہیں، ایمان والوں کے حق میں تو بڑے ہی شفیق و مہربان ہیں۔

تفسیر: آیت میں رسول اللہ کی صفات بیان کی گئی ہیں کہ آپ مخلص و خیر خواہ اور شفیق و مہربان ہیں۔ پھر یہ تو ترغیب بھی دی گئی ہے کہ ایسے نبی و رسول کی اتباع و پیروی میں خیر و فلاح ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ چونکہ شیخ، رسول کا نائب و تابع ہوتا ہے اس لیے ایسی صفات اور شفقت علی الخلق اس میں بھی ہونے ضروری ہیں۔ (ورنہ وہ تعلیم و تربیت کا اہل نہیں ہوگا۔)

سُوْرَةُ يُوْنُس

پارہ: 11

﴿دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [سورة يونس: 10]

ترجمة: جنت میں (اہل جنت کا) قول "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ" ہوگا اور ان کی ملاقات "سلام" ہوگی اور ان کا آخری کلام ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ہوگا۔

تفسیر: جنتی جنت کی نعمتوں اور وہاں اللہ کے فضل وکرم کو دیکھ کر سبحان اللہ سبحان اللہ پکاریں گے اور جب اللہ سے کچھ مانگنے کی خواہش ہوگی مثلاً کوئی خوبصورت پرندہ یا پھل پھول دیکھا اور اس کی رغبت ہوئی تو "سبحانَكَ اللّٰهُمَّ" کہیں گے۔ اتنا کہتے ہی جنت کے میزبان فرشتے وہ چیز فوراً حاضر کردیں گے۔

دنیا کی زندگی میں بھی بڑے آدمیوں کے ہاں یہ دستور ہے کہ اگر ان کا مہمان کسی چیز کو دیکھ کر اس کو پسند کرے تو کریم میزبان وہ چیز مہمان کو دے دیتا ہے۔

جنتی اپنے دوستوں کی ملاقات کے وقت سلام سلام کہیں گے پھر رخصت ہوتے وقت ان سب کا آخری کلام الحمد للہ رب العالمین ہوگا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض صوفیاء عارفین نے آیت ﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے یہ اخذ کیا ہے کہ اللہ کے چاہنے والوں کو جنت کی بے شمار نعمتوں میں بھی یاد الٰہی سے غفلت نہ ہوگی۔

﴿وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ﴾ [سورة يونس: 12]

ترجمة: اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے لیٹے بھی، بیٹھے بھی، کھڑے بھی۔ پھر ہم جب اس کی تکلیف اس سے ہٹا دیتے ہیں تو وہ اپنی سابقہ حالت پر آجاتا ہے گویا جو تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کے ہٹانے کے لیے اس نے ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔

تفسیر: ناشکرا انسان بھی شدت و تکلیف میں عام انسانوں کی طرح اللہ کو پکارتا ہے لیکن جب اس سے مصیبتیں دور ہوجاتی ہیں تو پھر غفلتوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ خدا کو یاد کرنا تو درکنار، اللہ سے بے پروا ہوجاتا ہے۔

سُلوك: اللہ کو پکارنا بھی عبادت ہے لیکن یہ پکارنا اگر ایمان واسلام کی حالت میں ہو تو ایسی دعا عبادت قرار پاتی

ہے اور اگر اضطرار و بے خودی میں پکارا جائے تو یہ پکار نہ عبادت ہے اور نہ اقرار عبادت بلکہ جانوروں کی طبعی پکار کی طرح ہوگی جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

ملحوظہ: روح المعانی کے مفسر نے لکھا ہے کہ مشرکین بھی مصیبت و آفت کے وقت اللہ کو پکارتے ہیں۔ (سورۃ یونس: 22) اگر چہ ان کی یہ پکار عبادت نہیں، لیکن ہمارے زمانے میں بعض مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ایسے وقت بزرگوں کو پکارتے ہیں۔ کوئی فلاں بزرگ کو پکارتا ہے، کوئی فلاں شیخ کی دہائی دینے لگتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نادان مسلمان مشرکوں سے بھی زیادہ قابل افسوس ہیں۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ ہمارے ملک ہندو پاک میں یا غوث، یا خواجہ، یا بندہ نواز، یا دستگیر، یا داتا، یا گنج بخش، یا علی، یا حسین کی صدائیں لگانے والے ذرا اپنے انجام پر بھی غور کر لیں۔

حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہا: میں پروردگار عالم کو کیونکر پہچانوں؟ دریافت فرمایا: تم کیا پیشہ کرتے ہو؟ کہا: سمندر میں کشتی چلاتا ہوں۔ فرمایا: تم اپنے سفر کا کوئی واقعہ بیان کرو۔ اس نے کہا: ایک مرتبہ میری کشتی عین سمندر میں ٹوٹ گئی۔ میں ایک تختہ پر بیٹھا جا رہا تھا، ہوائیں بھی تیز و تند تھیں بس نجات کی کوئی صورت نہ تھی۔

آپ نے دریافت کیا کہ اس وقت تمہارے قلب کی کیا حالت تھی؟ کہنے لگا: دل میں خشوع و شکستگی اور دل صرف اللہ ہی کی طرف لگا ہوا تھا اور کوئی خیال تک نہ آتا تھا۔ فرمایا: بس یہی تو پروردگار عالم ہے جو تمہارے ساتھ ہے۔ (تفسیر کبیر)

③ ﴿كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ [سورة يونس: 12]

ترجمة: اسی طرح فضول کاروں کو ان کے اعمال خوشنما کر دکھائے جاتے ہیں۔

تفسیر: آیت میں کافر انسان کی حالت میں بیان کی گئی ہے کہ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہر حالت میں اللہ کو پکارتا پھرتا ہے اور جب کوئی تکلیف دور ہوگئی تو پھر غفلتوں کا شکار ہو گیا اور یہ عمل اس کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔

اور مومن کی یہ حالت میں بیان کی گئی کہ راحت میں اور آرام میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور مصیبت و دکھ میں صبر کرتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ تو اپنے عیش و آرام میں اللہ کو یاد رکھ، اللہ تجھ کو تیری سختی و مصیبت میں یاد رکھے گا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عارفین نے ہمیشہ بڑی تضرع و زاری سے دعائیں مانگی ہیں کہ اے اللہ! ہم کو حق بات ہمیشہ حق ہی کی صورت میں اور باطل ہمیشہ باطل ہی کی شکل میں دکھا۔

آب خوش را صورت آتش مده

﴿قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾

[سورة يونس: 15]

ترجمة: اے نبی! آپ کہہ دیجئے: میں یہ نہیں کرسکتا کہ اس قرآن میں اپنی طرف سے ترمیم کردوں۔ میں تو بس اس کی پیروی کروں گا جو میرے پاس وحی سے پہنچتا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں یوم عظیم کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

تفسير: رسول اللہ ﷺ حامل شریعت ہیں، بانی شریعت نہیں۔ بانی شریعت تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات عالی ہے۔ دنیا میں جتنے بھی دین آئے ہیں، وہ سب اللہ ہی طرف سے آئے ہیں، نبی و رسول اس کے داعی و مبلغ ہوا کرتے ہیں۔ وہ سب اللہ کی مرضیات وحی کے ذریعہ بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود نبی و رسول کی زبان مبارک سے یہ اعلان کروایا ہے کہ اگر میں شریعت میں ترمیم وتبدیل کردوں تو یوم عظیم کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں۔

سُلوك: فقہاء نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ بدعت حرام ہے، دین میں نئی بات پیدا کرنے کا حق جب نبی معصوم تک کو حاصل نہ ہوسکا تو کسی غیر معصوم کو کب اس کا حوصلہ ہوسکتا ہے۔

پیر پرستی بلکہ پیرزادگی میں مبتلا حضرات غور کریں کہ معاذ اللہ نبی معصوم تک عذاب آخرت سے خوف زدہ ہورہے ہیں۔ ایسے حال میں کسی شیخ یا شیخ زادے کو عذاب سے مامون ومحفوظ سمجھنا کتنی بڑی جہالت ہوگی؟

﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾

[سورة يونس: 25]

ترجمة: اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ پر چلا دیتا ہے۔

تفسير: یعنی دنیا کی زائل وفانی زندگی پر حرص نہ کرو، دار السلام (جنت) کی طرف آؤ۔ اللہ تم کو سلامتی کے گھر کی طرف بلا رہا ہے اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی دکھلا رہا ہے۔ یہ وہی گھر ہے جہاں کے رہنے والے ہر قسم کے رنج وغم، دکھ درد، آفات وبلیات سے محفوظ ہیں، وہاں فرشتے انہیں دیکھ کر سلام کریں گے اور اللہ کی جانب سے بھی صبح وشام کا تحفہ ملا کرے گا۔

سُلوك: عارفین نے لکھا ہے کہ آیت میں مؤمنین کے لیے بڑی عزت وشان ہے کہ شہنشاہِ عالم انہیں خود دعوت دے رہا ہے اور منکرین وکافرین کے لیے سرزنش ہے۔ وہ ایسے عظیم میزبان کی دعوت ونعمت سے محروم جارہے ہیں۔ اور دنیا پرستوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے کہ وہ کیسی پست وحقیر چیزوں کے پھیر میں

پڑے ہوئے ہیں اور اہل اللہ کے لیے بشارت ہے کہ انہیں خلوت خاص کے اشارے ہیں۔

⑯ ﴿وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا﴾ [سورة يونس: 36]

ترجمة: ان میں اکثر لوگ تو صرف اپنے گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور یقیناً گمان تو حق کے بارے میں ذرا بھی مفید نہیں۔

تفسیر: آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ مشرکین کے پاس نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی مضبوط استدلال، یہ لوگ تو اندھیرے میں محض اٹکل کے تیر چلا رہے ہیں۔

سلوك: علامہ مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے آیت سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ توحید کے اثبات میں دلائل قائم کرنے کے بجائے ہم کو خود اہل شرک سے یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ الٹی سیدھی کوئی دلیل بھی ایک سے زائد خداؤں کے ثبوت میں پیش کریں۔ (یہ کیا بات ہے کہ صرف ہم ہی توحید کے دلائل پیش کرتے رہیں۔)

⑰ ﴿وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ لِي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ﴾ [سورة يونس: 41]

ترجمة: اور اگر آپ کو وہ لوگ جھٹلاتے رہیں تو کہہ دیجئے کہ میرا عمل میرے لیے اور تمہارا عمل تمہارے لیے ہے۔

تفسیر: توحید کے دلائل اور براہین سننے کے بعد کافر لوگ آپ کی تکذیب کر رہے ہیں تو آپ غم نہ کیجئے بلکہ صاف صاف کہہ دیجئے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ تم سمجھانے پر بھی نہیں مانتے تو پھر اب میرا اور تمہارا راستہ الگ الگ ہے۔ تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو اور میں اپنے عمل کا، ہر ایک کو اس کے عمل کا ثمرہ مل کر رہے گا۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اہل طریق اسی سنت پر عمل کرتے ہیں۔ جب دیکھتے ہیں کہ مخاطب ضد، ہٹ دھرمی سے کام لے رہا ہے، تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تو ﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ کہہ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

اس میں علماء ظاہر کو بھی تنبیہ ہے کہ ایسا طرز اختیار کرنے میں اپنی شکست یا کسرِ شان نہ سمجھنی چاہیے۔

⑱ ﴿لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ [سورة يونس: 49]

ترجمة: ہر امت کے لیے ایک معین وقت مقرر ہے۔ جب ان کا وہ وقت معین آجاتا ہے تو وہ لوگ نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔

تفسیر: نافرمان اور سرکش قوموں کے مٹنے اور برباد ہونے کا ایک وقت مقرر ہے جو علم الٰہی میں محفوظ ہے۔ عذاب الٰہی تو بڑی سخت اور پناہ مانگنے کی چیز ہے اس لیے اس میں جلدی مچانا تو کوئی معنی نہیں رکھتا، البتہ

فسق وگناہ کے اثرات سے غافل ہوجانا بڑی نادانی اور غفلت کی بات ہے۔

آیت میں یہی بات بیان کی جارہی ہے کہ ہر جماعت اور فرقہ کے ہاں اللہ کے احکام پہنچانے والے بھیجے گئے ہیں جن کو "رسول" کہا جاتا ہے تاکہ اللہ کی حجت پوری ہو۔ حجت پوری ہونے سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیا جاتا۔ اللہ کے ہاں یہ ظلم اور اندھیر نہیں ہے کہ پیشتر آگاہی کے بغیر فیصلہ سنا دیا جائے، قیامت میں بھی باقاعدہ پیشی ہوگی، فرد جرم لگائے جائیں گے، گواہ پیش ہوں گے، ہر قوم کے ساتھ ان کے پیغمبر ہوں گے، ان کے بیانات کے بعد انصاف کا فیصلہ ہوگا۔

سُلوك: عارفین نے یہاں آیت سے ایک اشارہ اخذ کیا ہے کہ گناہ کرنے کے بعد توبہ واستغفار میں ذرہ برابر بھی توقف نہ کرنا چاہیے۔ معلوم نہیں گناہ کا اثر کسی بھی وقت مرتب ہوجائے۔ لہٰذا توبہ واستغفار سے فوری تدارک کردینا چاہیے۔

⑨ ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ ۙ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾ [سورة يونس: 57]

ترجمة: اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نصیحت آچکی ہے اور شفاء بھی (ان بیماریوں کی) جو سینوں میں ہوتی ہیں اور ایمان والوں کے حق میں ہدایت ورحمت ہے۔

تفسیر: آیت میں قرآن حکیم کی چار صفات بیان کی گئی ہیں۔

① وہ نصیحت ہے۔

② دلوں کی بیماریوں کے لیے شفاء ہے۔

③ رضائے الٰہی کا راستہ بتلاتی ہے۔

④ اپنے ماننے والوں کو دنیا وآخرت میں رحمت کا مستحق بناتی ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ (المتوفی ۶۰۶ھ) نے قرآن حکیم کی چاروں صفات سے ① شریعت ② طریقت ③ حقیقت ④ نبوت وخلافت کی طرف اشارہ قرار دیا ہے یعنی قرآن حکیم کی یہ چار صفات نفس انسانی کے چار مراتب کی طرف اشارہ کررہی ہیں۔

مَوْعِظَةٌ: تہذیب ظاہر، یعنی معاصی اور اعمال بد سے بچانے والی کتاب (شریعت)۔

شِفَاءٌ: تہذیب باطن، یعنی برے اخلاق اور فاسد عقائد سے محفوظ رکھنے والی کتاب (طریقت)۔

هُدًى: تہذیب نفس، یعنی اعلیٰ اخلاق سے آراستہ کرنے والی کتاب (حقیقت)۔

رَحْمَةٌ: انوار باطن، یعنی قلب پر انوار الٰہیہ کا نزول کرنے والی کتاب (خلافت)۔

ملحوظہ: مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بدن کی طرح قلب میں بھی امراض ہوتے ہیں۔ جیسے شک ونفاق، بغض وحسد، کینہ وعناد، غرور وتکبر وغیرہ۔

⑩ ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا﴾

[سورة يونس: 59]

ترجمة: آپ کہیے کہ یہ تو بتاؤ کہ اللہ نے تمہارے لیے جو رزق نازل کیا تھا پھر تم نے اس میں سے کچھ چیزیں حرام اور کچھ حلال قرار دے لیں۔

تفسیر: مشرک جاہلی قوموں نے کھانے پینے کی چیزوں میں بڑی گڑبڑ مچا رکھی ہے۔ اس لیے قرآن حکیم نے اس سلسلے میں بار بار گرفت کی ہے اور صراحت کی ہے کہ حرام تو بس وہی چیزیں ہیں جنہیں شریعت الٰہی نے حرام قرار دیا ہے نہ کہ وہ چیزیں ہیں جس کو تم اور تمہارے بڑوں نے حرام ٹھہرا لیا ہے۔ یہی حال حلال چیزوں کا ہے۔

اسلامی شریعت کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ حلال وہی چیزیں ہیں جس کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے اور حرام وہی ہیں جن کو اللہ نے حرام کیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں ان غالی صوفیوں کی تردید ہے جو مباحات (جائز اشیاء) کو زہد وقناعت کے عنوان سے اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔

(البتہ علاج ومعالجہ کے طور پر کسی چیز کو ترک کر دینا اور بات ہے)

⑪ ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ [سورة يونس: 62]

ترجمة: یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

تفسیر: اولیاء اللہ کی تعریف اگلی آیت (۶۳) میں یہ بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور (اللہ کی نافرمانی اور گناہوں سے) ڈرتے رہے یعنی متقی اللہ کے ولی ہوا کرتے ہیں۔

تقویٰ کے مختلف درجات ہیں۔ جس درجہ کا ایمان وتقویٰ ہوگا اسی درجے میں ولایت (دوستی) کا حصہ ثابت ہوگا۔ ایک حسی مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ سو (۱۰۰) پچاس (۵۰) روپیئے بھی مال ہیں لیکن سو (۱۰۰) پچاس (۵۰) روپیئے والے کو مالدار نہیں کہا جاتا، بلکہ ایک قابل لحاظ مال والے کو مال دار کہا جاتا ہے۔

اسی طرح ایمان وتقویٰ کسی بھی درجہ میں ہوں، ایمان وتقویٰ تو ہیں لیکن ولی اور متقی ہر شخص کو نہیں کہا جاتا۔ ولی اور متقی اس شخص کو کہا جائے گا جس میں ایک خاص اور ممتاز درجے کا ایمان وتقویٰ ہو۔

احادیث شریفہ میں ولی اور متقی کی چند صفات وآثار بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً ان کو دیکھنے سے اللہ کی یاد تازہ

ہو، ان کی صحبت وملاقات میں دنیا کی رغبت کم ہو اور آخرت کی فکر پیدا ہو، ان کے قول وعمل میں اخلاص وصداقت ہو، ان کی زندگی میں حوادث دنیا کا غم اور آخرت کی مصیبتوں کا اندیشہ ہو وغیرہ۔

سُلوك: صوفیاء عارفین نے لکھا ہے کہ حزن (غم) ناکامی اور خواہشات کے پورا نہ ہونے پر پیدا ہوتا ہے اور اللہ کے دوستوں کی اپنی کوئی ذاتی (نفسانی) خواہش نہیں ہوتی جو پوری نہ ہونے پر انہیں غم ہو۔

اسی طرح خوف (اندیشہ) اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ کوئی مکروہ بات پیش نہ آئے، اللہ کے دوستوں کی زندگی میں اللہ کی نافرمانی یا معصیت نہیں ہوتی جس پر انہیں خوف واندیشہ پیدا ہو۔

اس لیے اولیاء اللہ کو دنیا وآخرت میں کوئی خوف واندیشہ نہیں ہوتا۔

⑫ ﴿وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾ [سورة يونس: 65]

ترجمة: اور آپ کو ان کافروں کی باتیں غم میں نہ ڈالیں۔ عزت (غلبہ) تمام تر اللہ ہی کے لیے ہے۔

تفسير: کافروں کے طعن وطنز اور اعتراضات پر رسول اللہ ﷺ کا مغموم ہونا ایک طبعی بات تھی، آیت میں آپ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ غم وفکر نہ کریں، عزت وقوت کا دینے والا صرف اللہ ہے، ساری عزتوں و رفعتوں کا وہ خالق ومالک ہے پھر آپ ﷺ کو کیا غم ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا: جس کسی میں جو کچھ بھی عزت ورفعت ہے، وہ اللہ جل علا کی عزت و کرامت کا سایہ ہے، کائنات میں کسی کے اندر اپنی ذاتی عزت نہیں ہے۔

یہ ایسے ہی ہے کہ جیسا کہ روشنی آفتاب کی صفت ہے اور زمین جو اپنی ذات میں روشنی سے خالی ہے، آفتاب کی ضیا پاشی سے منور ہوتی ہے، آفتاب ڈوب جائے تو تاریکی ہی تاریکی رہ جاتی ہے۔

علم تصوف میں اس کو ''مسئلہ مظہریت'' کہا جاتا ہے۔

⑬ ﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا﴾ [سورة يونس: 67]

ترجمة: وہ وہی تو اللہ ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ تم اس میں چین وسکون پاؤ اور دن کو دیکھنے بھالنے کا ذریعہ۔

تفسير: دن ورات نہ کوئی دیوی دیوتا ہیں، نہ نور وظلمت کوئی دو (۲) خدا یا دو (۲) خداؤں کے مظہر ہیں۔ وقت کے یہ دونوں حصے اللہ واحد کے اسی طرح مخلوق ہیں جس طرح اور سب مخلوقات ہیں، دن ورات انسانوں کی خدمت کے لیے بنائے گئے ہیں جیسا کہ زمین وآسمان۔

رات تو اس لیے کہ انسان اس میں راحت وآرام حاصل کرے اور دن بھر کی مشقت کے بعد سستی وکمزوری دور کرے اور دوسرے دن کے لیے تازہ دم ہو جائے۔

اور دن میں اپنی روزی فراہم کرے۔ (قرطبی)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صوفیاء عارفین نے اس آیت سے یہ اشارہ نکالا کہ بجائے ساری رات جاگنے اور عبادت کرنے کے کچھ دیر سونا بہتر ہے کیونکہ اس میں دن رات کی مصلحت الٰہی سے موافقت ہوتی ہے۔

⑭ ﴿لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ [سورة يونس: 98]

ترجمة: جب وہ لوگ (قوم یونس) ایمان لائے، ہم نے ان پر سے رسوائی کے عذاب کو دنیوی زندگی میں دور کر دیا اور ایک خاص وقت تک کے لیے خوش عیشی دے دی۔

تفسیر: سیدنا یونس علیہ السلام جن کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح کا ہے، شہر نینویٰ ملک عراق میں جہاں آج شہر موصل ہے، اس کے مقابل دریائے دجلہ کے بائیں کنارے پر واقع تھا۔

شہر کی آبادی ایک لاکھ سے زائد تھی۔ (القرآن) اس قوم کی دعوت و تبلیغ کے لیے سیدنا یونس علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا۔ یہ قوم شدید بت پرستی میں مبتلا تھی۔

سیدنا یونس علیہ السلام نے دعوت و تبلیغ کی صبر آزما جدوجہد کے بعد قوم پر آسمانی عذاب کے آثار دیکھ کر ہجرت کے ارادے سے شہر چھوڑ دیا اور سمندر کی راہ لی۔ (ان کے جانے کے بعد قوم مسلمان ہوگئی جنہیں عذاب الٰہی کا یقین ہوگیا تھا۔) اثنائے راہ سمندر میں انہیں ڈال دیا گیا پھر ایک بڑی مچھلی نے اپنا لقمہ بنالیا۔

واقعہ کی تفصیل ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۲ رصفحہ ۹۹ پر مطالعہ کیجئے جو اس واقعہ کی قرآنی وضاحت ہے۔

سُلوك: ''لَمَّا اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ'' حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا: ممکن ہے مرید پر اللہ کا کوئی ایسا فیضان شامل ہو جس کی خبر اس کے مرشد کو نہ ہو اگر چہ یہ فیضان شیخ ہی کی برکت ہو۔

جیسا کہ سیدنا یونس علیہ السلام کو اپنی امت کے ایمان لانے کی اطلاع نہ تھی، حالانکہ قوم کا ایمان لانا خود سیدنا یونس علیہ السلام ہی کی برکات سے تھا۔

⑮ ﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا﴾ [سورة يونس: 99]

ترجمة: اور اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو روئے زمین پر جتنے بھی لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔

تفسیر: آیت میں اللہ کے قانون قدرت کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ سارے انسانوں کا ایمان لانا کچھ مشکل بات نہیں ہے۔ مشیت خداوندی کا صرف ایک اشارہ کافی ہے۔ لیکن بے شمار دنیاوی و اخروی مصلحتوں اور حکمتوں کی وجہ سے اللہ نے اس عالم کو عالم ابتلاء ہی رکھا اور کسی کو بھی ایمان لانے پر مضطر و مجبور نہیں کیا۔ ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (روح المعانی، قرطبی)

سُلوك: اہل تحقیق علماء نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ دعوت وتبلیغ کے بعد نتائج وثمرات کا انتظار نہ کرنا چاہیے، اپنا کام جاری رکھنا ہی کافی ہے۔

(46) ﴿قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [سورة يونس: 101]

ترجمة: آپ کہہ دیجئے کہ تم دیکھو تو کیا کیا چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں۔

تَفسِیر: کائنات کی چیزوں پر غور وفکر کرنے سے اللہ کی توحید اور اس کی قدرت وصنعت کا دل پر گہرا اثر پڑتا ہے، ایمان ویقین میں تازگی اور روشنی پیدا ہوتی ہے لیکن کائنات کی ان چیزوں کو چشم بصیرت سے دیکھا جائے اور غور وفکر کے زاویوں پر توجہ کی جائے تو انسانی عقل وفکر یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ کائنات کا ایک خالق ضرور ہے اور یہ تکوینی نظام ایک مقتدا وصاحب اختیار ذات سے وابستہ ہے۔

عرب کا ایک بدو کہتا ہے:

اَلْبَعْرَةُ تَدُلُّ عَلَى الْبَعِيْر وَالْأَثَرُ يَدُلُّ عَلَى الْمَسِيْر
وَالسَّماءُ ذَاتُ الْأَبْرَاج وَالْأَرْضُ ذَاتُ الْفِجَاجَ
كَيْفَ لاَ يَدُ لاَنِ عَلَى اللَّطِيْفِ الْخَبِيْر؟

ترجمة: مینگنی پتہ دیتی ہے اونٹ کے گزرنے کا، قدم کے نشانات گزرنے والے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ برجوں والا آسمان اور یہ نشیب وفراز والی وسیع وعریض زمین خالق کائنات کی کیونکر نشاندہی نہ کریں گے؟

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوقات پر غور کرنا، خالق کی طرف فکر وتوجہ کرنے کے منافی نہیں۔ (دونوں فکر صحیح ہیں)

ملحوظه: بعض علماء نے مذکورہ آیت سے یہ بھی اخذ کیا ہے کہ زمین کی سیر وسیاحت بھی پسندیدہ عمل ہے۔ اس سے کائنات کی وسعت اور تدبیر عالم کے عجیب وغریب راز منکشف ہوتے ہیں۔

اور اللہ کی ذات وصفات اور اس کی حکمت وصنعت وقدرت کا عظیم انکشاف ہوتا ہے۔

﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ﴾ [سورة العنكبوت: 20]

سُوْرَۃُ هُوْدٍ

پَارَہ: 11

﴿وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ [سورة هود: 3]

ترجمۃ: اور تم اپنے پروردگار سے مغفرت چاہو پھر اس کی طرف رجوع کیے رہو، وہ تمہیں ایک مقررہ وقت تک خوش عیشی دے گا۔

تفسیر: سیدنا ہود علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کر رہے ہیں: اے قوم کے لوگو! تم اپنی پچھلی تقصیرات اللہ سے معاف کرواؤ اور آئندہ اللہ کی طرف دل سے رجوع کرو تو تم کو چین وسکون کی زندگی ملے گی اور ہر نیکو کار کو اس کی نیکی کا صلہ ضرور ملے گا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ تقویٰ وطہارت کی زندگی اختیار کرنے سے دنیا کا عیش گھٹ نہیں جاتا بلکہ پرسکون ومطمئن زندگی حاصل ہوتی ہے۔

2 ﴿يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾ [سورة هود: 5]

ترجمۃ: وہ جانتا ہے جو کچھ وہ لوگ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ بے شک وہ دلوں کی اندر والی باتوں سے خوب واقف ہے۔

تفسیر: کافر اور منافق لوگ اللہ کی صفت عالم الغیب کو بھولے رہتے ہیں ورنہ ان کی ہمتیں گناہ اور سازشیں کرنے کی ہرگز نہ ہوتی۔ اللہ کا کلام بار بار اس کا استحضار کرواتا ہے کہ کائنات کی کوئی حرکت وسکون اس سے پوشیدہ نہیں ہے، دلوں کے راز اور وسوسوں تک کو وہ جانتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صوفیاء عارفین نے کہا ہے کہ انسان اگر آیت مذکورہ کا مراقبہ جاری رکھے تو گناہ کرنے کی جرأت نہ ہوگی، تقویٰ کی اصل بنیاد یہی ہے۔

3 ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ [سورة هود: 6]

ترجمۃ: اور کوئی جاندار زمین پر ایسا نہیں کہ اللہ کے ذمہ اس کا رزق نہ ہو۔

تفسیر: ادنیٰ سے ادنیٰ، حقیر سے حقیر تر کیڑے مکوڑوں تک کی رزق رسانی وفراہمی اللہ نے اپنے ذمہ رکھی ہے، وہی اسباب فراہم کرتا ہے اور روزی دیتا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اسباب رزق سے غافل ہو کر بے فکر ہو جائے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اسباب

پر بھروسہ نہ کرے، اعتقاد اللہ ہی کی ذات سے وابستہ رکھے۔اسی کا نام توکل ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دنیاوی اسباب کو اگر اسی اعتقاد سے اختیار کیا جائے کہ اسباب کے بنانے والے بھی اللہ تعالیٰ ہیں تو یہ بات توکل کے خلاف نہیں۔

④ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ﴾

[سورة هود: 23]

ترجمة: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے اور اپنے رب کی طرف جھکے رہے، وہی لوگ اہل جنت ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے۔

تفسیر: اہل جنت (جنت والے) ہونا اور جنت میں داخل ہونا دونوں علیحدہ علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں۔آیت میں یہ مخفی حقیقت ظاہر کی جارہی ہے کہ ایمان اور عمل کے ساتھ اسی حالت پر قائم و دائم رہنا، اہل جنت کی علامت ہے یعنی ایسے مسلمان دنیا کی زندگی ہی میں اہل جنت کے اسم سے مشرف ہیں۔

باقی گنہگار مسلمانوں کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، چاہے انہیں عذاب دے یا معاف کر دے اور جنت میں پہنچا دے۔

سُلوك: آیت میں اہل جنت کے اوصاف کی یہ ترتیب بیان کی گئی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: پہلا درجہ ایمان (تصحیح عقائد) کا۔

عَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ: دوسرا درجہ عمل صالح (اصلاح اعمال) کا۔

اَخْبَتُوْا: تیسرا درجہ تزکیۂ نفس (اخلاقِ کاملہ) کا۔

ملحوظه: تصوف کی یہی حقیقت ہے۔صوفیاء کاملین کی بنیادی تعلیمات بھی یہی ہیں۔

⑤ ﴿اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝﴾ [سورة هود: 28]

ترجمة: کیا ہم اس نصیحت کو تمہارے سر چپکا دیں جب کہ تم اس سے نفرت کیے چلے جاؤ؟

تفسیر: آیت کا یہ ٹکڑا سیدنا نوح علیہ السلام کی تبلیغ کا وہ آخری جواب ہے جو انہوں نے اپنی قوم کو دیا تھا کہ میں اگرچہ بشر ہوں، آسمان کا فرشتہ نہیں جس کے سامنے خواہ مخواہ انسانوں کی گردنیں جھک جاتی ہوں، پھر بشر بھی ایسا نہیں جو دولت و اقتدار رکھتا ہو۔ میں تو اللہ کا رسول ہوں، اس نے تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔ میں تم سے اپنے کام کی اجرت نہیں مانگتا، میرا صلہ تو رب العالمین کے ہاں محفوظ ہے۔

میں تو صرف تمہاری خیر خواہی چاہتا ہوں، اس کے بعد بھی اگر تم انکار و عناد پر قائم رہو تو یہ تمہارا اپنا خسارہ ہے۔ میں اپنی نصیحت و خیر خواہی کو تمہارے سر چپکا نہیں سکتا جب کہ تم اس کو مسلسل ناپسند کر رہے ہو۔ ہم سب کو

ایک دن اللہ کے ہاں جمع ہونا ہے، وہاں ہر ایک اپنے کام انجام دیکھ لے گا۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے لکھا ہے کہ آیت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ منکر و ہٹ دھرم کو اہل اللہ سے فائدہ نہیں ہوسکتا جب تک وہ انکار پر قائم رہیں۔

⑯ ﴿قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝﴾ [سورة هود: 33]

ترجمة: نوح نے کہا: اس عذاب کو تو بس اللہ ہی تمہارے سامنے لائے گا اگر اس کا ارادہ ہوا اور تم اس کو روک نہیں سکتے۔

تفسیر: یہ جواب سیدنا نوح ﷺ کا ہے جب کہ ان کی قوم نے ان سے وہ عذاب نازل کرنے کا مطالبہ کیا تھا جس کا اندیشہ سیدنا نوح ﷺ ظاہر کر رہے تھے۔ جواب کا حاصل یہ تھا کہ میں وہ عذاب لانے والا کون ہوں، میرا کام تو صرف پیام پہنچا دینا ہے۔ البتہ اللہ چاہے تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ عذاب کو نازل کر دے جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے فرمایا کہ مخالفین و معاندین کے جواب میں ایسا ہی کہنا اہل حق کی شان ہے ورنہ اہل باطل کی زبانوں پر تو بڑے بڑے دعوے رہتے ہیں کہ جو میرا مخالف ہے، اس کا یہ حال ہو جائے گا، وہ حال ہو جائے گا، وہ تباہ و برباد ہو جائے گا، اس کی ذلت و رسوائی ہو گی وغیرہ وغیرہ۔

⑰ ﴿وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ﴾ [سورة هود: 31]

ترجمة: اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے ہاں اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔

تفسیر: آیت میں سیدنا نوح ﷺ اپنے مخاطبین کے ایک شبہ کو دور فرما رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ میں نہ اللہ کے خزانوں کا خزانچی ہوں کہ دولت و ثروت کسی کو بھی دے دوں۔

اور نہ کاہنوں کی طرح غیب دانی کا دعویٰ کرتا ہوں کہ تمہاری اگلی پچھلی باتوں کو ظاہر کر دوں۔

اور نہ میں کوئی فرشتہ ہوں جو تمہاری برادری سے علیحدہ جنس ہو، پھر تم میری خیر خواہی پر کیوں شبہ کر رہے ہو؟

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے فرمایا کہ صاحب ارشاد (شیخ و مرشد) کا صاحب تصرف یا صاحب کشف ہونا یا بشری ضروریات میں عام انسانوں سے ممتاز ہونا ہرگز ضروری نہیں البتہ اس کو صاحب علم و عمل ہونا ضروری ہے۔

⑱ ﴿وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ [سورة هود: 30]

ترجمة: اور میری قوم والو! میری کون حمایت کرے گا اللہ کے مقابلہ میں اگر میں ان (غریبوں) کو نکال دوں؟ کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟

تفسیر: قوم کے بڑوں کو جہاں مختلف اعتراضات تھے ان میں ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اے نوح علیہ السلام! تمہاری پیروی کرنے والے غریب غرباء بے حیثیت و بے علم لوگ ہیں۔ بھلا ہم ان کی صف میں کیونکر بیٹھ سکتے ہیں؟

اے نوح علیہ السلام! اگر تم ان کو اپنے سے دور کر دو تو ہم تمہاری بات سننے کے لیے غور کریں گے۔

سیدنا نوح علیہ السلام نے ان کو جو جواب دیا وہ مذکورہ آیت میں موجود ہے۔

سُلوك: صوفیاء عارفین نے کہا ہے کہ مسکینوں اور کم حیثیت والوں کو اپنی مجلس اور خصوصی التفات و توجہ سے دور نہ کرنا نبیوں کی سنت ہے۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی اخذ کیا ہے: جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اس سے اعراض نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس کی جانب اللہ کی بھی توجہ ہے۔

ملحوظہ: علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ پانچویں صدی ہجری میں مذکورہ آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ قوم نوح تو زمانہ جاہلیت کی پیداوار ہے۔ یہ لوگ تو صرف دنیا کے ظاہری و مادی پہلوؤں کو دیکھنے والے تھے، لیکن غضب تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے آج اس مرض "حُبِّ دنیا" میں مبتلا ہیں اور عزت و ذلت کا معیار اسی دولت دنیا کو بنائے ہوئے ہیں۔ (کشاف)

راقم الحروف کا احساس ہے کہ جب پانچویں چھٹی صدی ہجری میں مسلمانوں پر "حبّ دنیا" اس قدر غالب تھی تو آج پندرہویں صدی ہجری کا ذکر ہی کیا کیا جائے؟ اَللّٰھُمَّ اھدِنَا وَسَدِّدْنَا

﴿٩﴾ ﴿قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝﴾ [سورة هود: 38]

ترجمة: نوح علیہ السلام بولے: اگر تم ہم سے تمسخر (ٹھٹھا) کرتے ہو تو ہم بھی تم سے ٹھٹھا کریں گے جیسا کہ تم ٹھٹھا کرتے ہو۔

تفسیر: قوم کا مذاق اڑانا اس بات پر تھا کہ سیدنا نوح علیہ السلام نے قوم کو دھمکی دی تھی کہ عنقریب تم پر پانی کا عذاب آنے والا ہے اور یہ سارا عالم غرقاب ہو جائے گا۔

سیدنا نوح علیہ السلام اپنی اور مسلمانوں کی نجات کے لیے ایک طویل و عریض کشتی تیار کرنے لگے۔ اس تیاری پر قوم کے مسخروں نے ٹھٹھا کرنا شروع کر دیا کہ لو آج تک تو نبوت و رسالت کا دعویٰ کر رہے تھے، اب نجاری کا پیشہ شروع کر دیا۔ کہتے ہیں کہ یہ خشک زمین سمندر بن جائے گی جو سمندر سے سینکڑوں میل دور ہے، نوح اس زمین پر کشتی چلائیں گے۔ ہم سب تو ڈوب جائیں گے، نوح اور اس کے ساتھی نجات پا جائیں گے وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر سیدنا نوح علیہ السلام نے قوم کے اس مسخرہ پن کا جواب دیا۔

جس طرح آج ہم سے ٹھٹھا کر رہے ہو، بہت جلد ہم بھی تم پر ٹھٹھا کریں گے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔

(تفصیل "ہدایت کے چراغ" جلد ا رصفحہ ۶۰ پر مطالعہ کیجئے جو ما قبل تاریخ کی قرآنی تفصیل ہے۔)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ انتقام کے موقع پر انتقامی جواب دینا مکارم اخلاق کے خلاف نہیں۔

ملحوظہ: یہاں ایک شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ تمسخر کا جواب انداز تمسخر سے دینا شان پیغمبری کے مناسب نہیں۔ پھر سیدنا نوح علیہ السلام کو ایسا جواب دینے کی کیوں ہدایت کی گئی؟

الجواب: شبہ نہایت سطحی اور بے وزن ہے کیونکہ کسی بھی مقابلہ وقوت کے وقت مقابلہ وقوت کا استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ موقع ضبط وتحمل کا نہیں تھا، سکوت وصبر کا اور موقع ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں اس کے بکثرت نظائر موجود ہیں۔ مثلاً ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ برائی کا بدلہ اس جیسی برائی ہے، ﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۙ وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا ۚ﴾ انہوں نے ایک خفیہ تدبیر کی، ہم نے بھی ایک خفیہ تدبیر کی، ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ انہوں نے مکر کیا اور اللہ نے بھی مکر کیا۔ (روح المعانی)

⑩ ﴿قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ [سورة هود: 46]

ترجمة: اے نوح! یہ (تمہارا بیٹا) تمہارے گھر والوں میں شامل نہیں ہے، یہ ایک تباہ کار لڑکا ہے۔

تفسير: طوفان آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے سیدنا نوح علیہ السلام کو ان کے گھر والوں کی نجات کی اطلاع دے دی تھی لیکن جب بیٹا کنعان ڈوبنے لگا تو سیدنا نوح علیہ السلام نے اللہ کو پکارا اور مدد چاہی۔ الٰہی! یہ میرا بیٹا میرے گھر والوں میں شامل ہے، اس کو بچا لیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: اے نوح! یہ تمہارا بیٹا گھر والوں میں شامل نہیں ہے، یہ بد عمل بے دین آدمی ہے، لہٰذا اس کی نجات نہ طلب کرو، یہ ڈوبنے والوں میں شامل ہو چکا ہے۔

سُلوك: علماء محققین نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ شریعت اسلامی میں قرابت ایمانی کا لحاظ کیا گیا ہے، صرف قرابت نسبی کا نہیں۔ (تفسیر کبیر)

حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نسب کی بڑائی کے ساتھ اگر اصلاح وتقویٰ جمع نہ ہوں تو ایسا نسب کالعدم ہے۔

⑪ ﴿فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ [سورة هود: 46]

ترجمة: لہٰذا اے نوح علیہ السلام! تم مجھ سے ایسی چیز کی درخواست نہ کرو جس کی تمہیں خبر نہ ہو۔ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں۔

تفسير: طوفان کے وقت سیدنا نوح علیہ السلام نے بیٹے کی نجات کے لیے درخواست کر دی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت اور وضاحت کی کہ اے نوح علیہ السلام! تمہارے گھر والوں کی نجات کا وعدہ ﴿اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ﴾ [سورة هود: 40] کے ساتھ مقید تھا۔ (البتہ جن پر غرق ہونے کا فیصلہ جاری ہو چکا ہے)

اس استثناء میں تمہارا بیٹا بھی شامل تھا کیونکہ وہ نافرمان اور کافر تھا، ایسے مشتبہ حال لوگوں کے حق میں دعا کرنا

احتیاط کے خلاف تھا،تم نے اس پر غور نہ کیا۔

ان افراد میں سیدنا نوح علیہ السلام کا بیٹا ''یام'' جس کا لقب کنعان تھا اور کنعان کی ماں ''واعلہ'' دونوں کافر تھے، گھر والوں سے علیحدہ رہے اور غرق ہوگئے۔

سُلوك: اہل تحقیق علماء نے لکھا ہے کہ جب مشتبہ حال لوگوں کے حق میں نجات کی دعا کرنے کی ممانعت آچکی ہے تو جن لوگوں کا فساد عقیدہ ظاہر ہو چکا ہے ان کے حق میں تو اور زیادہ احتیاط ضروری ہے۔(روح المعانی)

حکیم الامت رحمہ اللہ نے اس استنباط پر یہ اضافہ کیا ہے کہ یہاں ہمارے زمانے کے مشائخ کی دعاؤں کا پول کھل جاتا ہے۔ان سے مقدمات کی کامیابی میں،عہدہ وملازمت کی ترقی میں جسم کی بھی دعا کروائی جائے، یہ لوگ بلالحاظ حلال وحرام دعا کردیتے ہیں۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

⑫ ﴿قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا﴾ [سورۃ ھود: 48]

ترجمة: ارشاد ہوا:اے نوح!اترو(زمین پر)ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں لے کر۔

تفسير: اللہ کی یہ ہدایت اس وقت کی ہے جب پانی کا طوفان پوری طرح ختم ہوگیا اور زمین رہنے بسنے کے قابل ہوگئی، سیدنا نوح علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ساتھ بخیر وسلامتی زمین پر آگئے۔

سُلوك: ''بِسَلٰمٍ مِّنَّا'' (ہماری سلامتی اور برکتیں لے کر) امام رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صوفیاء عارفین ہر نعمت کا مشاہدہ اسی حیثیت سے کرتے ہیں کہ وہ نعمت حق تعالیٰ کی جانب سے ہوا کرتی ہے۔

آیت میں لفظ مِنّا کا اضافہ سیدنا نوح علیہ السلام کے مرتبۂ عرفان وصدیقت کے لحاظ سے ہے۔

⑬ ﴿وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا﴾ [سورۃ ھود: 52]

ترجمة: اور اے میری قوم والو!تم اپنے رب سے گناہ معاف کراؤ پھر اس کی طرف متوجہ رہو، وہ تم پر خوب بارشیں برسائے گا اور تم کو قوت دے کر تمہاری قوت میں مزید اضافہ کرے گا۔

تفسير: یہ پیام سیدنا ہود علیہ السلام کا ہے جو انہوں نے اپنی پریشان وقحط زدہ قوم کو دیا تھا کہ ماضی کے گناہوں اور بغاوت کی معافی مانگو اور مستقبل میں اللہ کی طرف متوجہ رہو، تمہاری پریشانی وقحط سالی دور ہوجائے گی اور تمہارے مال ودولت میں اضافہ ہوگا۔

تاریخی روایات میں معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد پر ان کی مسلسل بغاوت وسرکشی کی وجہ سے بطور سزا تین سال قحط طاری رہا جس پر ساری قوم بلبلا اٹھی تھی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ طاعات وعبادت سے دنیاوی راحت وچین بھی ملتا ہے اگر چہ اصلی جزا تو آخرت ہی میں ملے گی۔

ملحوظہ: قوم عاد خلیج فارس کے کنارے کنارے ملک عراق کی سرحد تک آباد تھی۔ ان کا اصلی وطن یمن اور حضر موت کا علاقہ تھا۔ یہاں زمانۂ قدیم سے ایک قبر کے بارے میں عام شہرت ہے کہ یہ مرقد شریف سیدنا ہود علیہ السلام کا ہے۔ واللہ اعلم

⑭ ﴿وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ﴾ [سورة هود: 69]

ترجمة: اور بالیقین ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر آئے اور بولے: آپ پر سلام ہو۔ ابراہیم نے کہا: تم پر بھی سلام۔

تفسیر: یہ آنے والے فرشتے جن کی تعداد اسرائیلی روایت کے مطابق تین تھی، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ان کی آخری عمر میں صاحبزادہ اسحق کی خوشخبری دینے کے لیے آئے تھے۔ پہلے تو فرشتوں نے انہیں سلام کیا، سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بھی جواباً سلام کہا، پھر فرشتوں نے انہیں عنقریب اسحق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی۔

سُلوك: فقہاء مفسرین نے آیت سے یہ مسئلہ نکالا کہ سلام کرنا فرشتوں کا طریقہ ہے اور ہر نبی کی ملت میں یہی طریقہ جاری رہا ہے۔ (جصاص)

ملحوظہ: معلوم نہیں کس زمانے سے مسلمانوں میں سلام کے بجائے ہاتھ کا اشارہ، آداب، بندگی، تعلیمات، صباح الخیر (موجودہ عرب طریقہ) کے الفاظ رائج ہو گئے ہیں اور عام مسلمانوں نے السلام علیکم اسلامی طریقہ چھوڑ دیا ہے۔

﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

⑮ ﴿يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ﴾ [سورة هود: 98]

ترجمة: وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا پھر انہیں جہنم میں اتارے گا۔ وہ بڑی بُری جگہ ہے اترنے کی جہاں یہ اتارے جائیں گے۔

تفسیر: آیت میں فرعون کا کردار بیان کیا جا رہا ہے کہ جیسے وہ دنیا کی زندگی میں بدی اور بدکاری کا لیڈر تھا، آخرت میں بھی اس کی یہ لیڈری قائم رہے گی اور وہ اپنی ساری قوم کو لے کر جہنم میں داخل ہوگا۔

سُلوك: اہل تحقیق علماء نے لکھا ہے کہ دنیا کی زندگی میں جو کوئی مفسدوں اور بدکاروں کا پیشوا رہے گا، وہ آخرت میں بھی پیشوا ہوگا اور اپنے ماتحت لوگوں کو لے کر جہنم میں جائے گا۔

⑯ ﴿وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾ [سورة هود: 113]

ترجمة: اور ان لوگوں کی جانب نہ جھکو جو ظالم ہیں ورنہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ چھو جائے گی۔

تفسیر: رُکون کے معنی جھکنا، مائل ہونا، رغبت کرنا۔ آیت میں رُکون الی الکفار یعنی کافروں، غیر مسلموں کی طرف مائل ہونے اور جھکنے پر جہنم کی وعید سنائی جارہی ہے۔ اللہ اکبر! کفروفسق کس درجہ اللہ کی نظر میں غضب آلود ہے کہ کافروں کی جانب صرف میلان ورغبت کرنے پر یہ انجام بد بیان کیا جارہا ہے۔

رہا ان کے ساتھ دوستی وتعلقات، تعظیم وتکریم، مدح وثنا کرنا، خیر خواہی کرنا، اٹھنا بیٹھنا۔ اللہ کی نظر میں کس قدر شدید ہوگا، اس کا اندازہ صرف لفظ رُکون سے لگایا جاسکتا ہے۔

سُلوک: علماء محققین نے تصریح کی ہے کہ بلاضرورت شدید کفار کی وضع قطع اختیار کرنا، اسی طرح طاقت وقدرت کے باوجود ان پر نکیر نہ کرنا اور مداہنت (چشم پوشی) کرنا، سب کا سب اس ممانعت میں داخل ہے۔ (جصّاص)

17 ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ [سورة هود: 114]

ترجمة: بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹادیتی ہیں۔ یہ ایک نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے۔

تفسیر: یہ قرآن حکیم کا نادرالوجود قانون ہے جس کی نظیر دنیا کے کسی قانون میں تو کیا گزشتہ آسمانی صحیفوں میں بھی ملنا مشکل ہے، ارشاد ہے کہ نیکی تو اپنی ذات میں خود نیکی ہے لیکن اسلامی نیکی کا یہ خاص عمل بھی ہے کہ وہ بدی کو مٹادیتی ہے بلکہ برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کردیتی ہے۔ (القرآن)

سُلوک: حکیم الامت ؒ نے لکھا ہے کہ طاعت کے انوار سے گناہوں کی ظلمتیں دور ہوجاتی ہیں اور پھر طاعت کی استقامت سے معصیت کا مادہ کمزور پڑجاتا ہے۔ (روح المعانی)

18 ﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ [سورة هود: 120]

ترجمة: اور پیغمبروں کے واقعات میں سے ہم یہ سب واقعات آپ سے بیان کررہے ہیں جس سے ہم آپ کے قلب کو تقویت دیتے ہیں۔

تفسیر: سورۂ ہود کی آخری آیات میں یہ ایک آیت ہے۔ اس سے پہلی آیات میں بہت سارے انبیاء ورُسُل کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ختم سورت پر ان واقعات وقصص کی بعض حکمتوں کا ذکر کیا جارہا ہے کہ گزشتہ اقوام اور ان کے رسولوں کا تذکرہ سنا کر رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک کو تقویت وتسلی دی جارہی ہے اور امت مسلمہ کو بھی تحقیقی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے تذکیر ونصیحت وعبرت کا بڑا سامان فراہم ہوتا ہے مثلاً آدمی جب یہ سنتا ہے کہ قوم نوح فلاں فلاں جرائم کی پاداش میں ہلاک وغرقاب ہوگئی تو ایسے اعمال وکردار سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح ہر نبی کی قوم کا انجام بھی معلوم ہوتا ہے تو وہ غور وفکر کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ نافرمانی وبغاوت ہر دور میں عذاب ہی عذاب ثابت ہوئی ہے اور اللہ کی یہ قدیم سنت ہر دور میں دہرائی گئی ہے۔

اور جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ فلاں راستہ اختیار کرنے پر پچھلوں کو نجات و عزت ملی تو طبعاً اس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں قصص و واقعات کا اتنا تفصیلی تذکرہ ہے جو کسی بھی آسمانی کتاب میں موجود نہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دہلوی نے جملہ قرآنی مضامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں ایک حصہ انہی قرآنی واقعات کا ہے جس کو قرآنی زبان میں ''تذکیر بِاَیّامِ اللہ'' سے تعبیر کرتے ہیں (ماضی کے واقعات وقصص سے نصیحت کرنا)۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اللہ کے مقبول بندوں کا تذکرہ قلوب کی ایمانی تقویت کا ذریعہ ہے۔ اس لیے مشائخ اہل طریقت نے ہر دور میں اولیاء صالحین کی حکایات جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔

سُورَۃُ یُوسُف

پارہ: 12

﴿اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ۝۴﴾ [سورة يوسف: 4]

ترجمة: جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا: اے ابا جان! میں نے گیارہ ستارے اور سورج و چاند کو (خواب میں) دیکھا کہ وہ سب مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں۔

تفسیر: سیدنا یوسف علیہ السلام کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔

یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (علیہم السلام)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شریف سلسلہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

کریم بن کریم بن کریم بن کریم۔ (حدیث) (الکریم بمعنی الشریف)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا دورِ حیات ۱۹۸۵ء تا ۲۱۶۰ء قبل مسیح

سیدنا اسحٰق علیہ السلام کا دورِ حیات ۱۸۸۰ء تا ۲۰۶۰ء قبل مسیح

سیدنا یعقوب علیہ السلام کا دورِ حیات تا ۱۸۵۰ء تا ۲۰۰۰ء قبل مسیح

سیدنا یوسف علیہ السلام کا دورِ حیات ۱۸۰۰ء تا ۱۹۱۰ء قبل مسیح

سیدنا یوسف علیہ السلام کا مولد و مسکن ارضِ فلسطین میں وادیٔ حبرون تھا جس کو آج کل ''الخلیل'' کہا جاتا ہے جو یرو شلم سے اٹھارہ میل جنوب مغرب میں واقع ہے۔ آپ کی والدہ کا اسم مبارک سیدہ راحیل تھا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کا یہ خواب جس کا ذکر مذکورہ آیت میں ہے، بچپن کا واقعہ ہے۔

عمر کی واضح تصریح مل نہ سکی تاہم قرآنِ حکیم نے جس اہمیت اور وضاحت کے ساتھ اس خواب کو بیان کیا ہے اور سیدنا یعقوب علیہ السلام جس اہتمام سے اس کی تعبیر بیان کر رہے ہیں، اس سے یہ مسئلہ ہو جاتا ہے کہ خواب ایسا کوئی ناقابلِ التفات واقعہ نہیں جیسا کہ آج کی روشن خیالی میں سمجھا جاتا ہے۔

خواب کی حقیقت سمجھنے کے لیے ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۱/صفحہ ۳۵۵ مطالعہ کیجیے جو قرآن وحدیث کی واضح تشریح ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کا گیارہ ستاروں اور چاند و سورج کو سجدہ کرتا دیکھنا خواب کی حالت میں تھا اور خواب میں ہر وہ چیز جو تصور و تخیل میں آسکتی ہے، جسم و شکل کے ساتھ واقعہ بن کر سامنے آجاتی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ مرید کو چاہیے کہ اپنے احوال اور واردات قلبی چاہے وہ بیداری میں محسوس کرے یا خواب میں، اپنے شیخ پر واضح کر دینا چاہیے۔

② ﴿قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَیَكِیْدُوْا لَكَ كَیْدًا﴾ [سورة یوسف: 5]

ترجمة: باپ نے کہا: اے بیٹے! اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا ورنہ وہ تمہاری ایذاء کے لیے کوئی چال نہ چل دیں۔

تفسیر: سیدنا یعقوب علیہ السلام جو اولوالعزم نبی و رسول اور صاحب علم و فضل ہیں، خواب کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ یہ خواب عام خوابوں کی طرح نہیں ہے لہٰذا اس کو کسی سے بیان نہ کرنا چاہیے تاہم کسی طرح سیدنا یوسف علیہ السلام کے سوتیلے بھائیوں کو اس خواب کا علم ہو گیا اور سیدنا یعقوب علیہ السلام کا جو اندیشہ تھا، وہ پورا ہوا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ مرید کو اپنا خصوصی حال یا وارد قلبی اپنے شیخ کے علاوہ اور کسی سے بیان نہ کرنا چاہیے ورنہ اس میں ضرر کا احتمال ہے۔

فقہاء کرام نے آیت سے یہ مسئلہ بھی اخذ کیا ہے کہ جس کسی سے حسد یا کینہ کا اندیشہ ہو، اس سے اپنی نعمتوں کا اخفاء کرنا چاہیے جو خود کو حاصل ہیں۔

③ ﴿اِذْ قَالُوْا لَیُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِیْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ﴾ [سورة یوسف: 8]

ترجمة: (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب سوتیلے بھائیوں نے کہا: یوسف اور ان کا (حقیقی) بھائی (بنیامین) ہمارے باپ کو ہم سے کہیں زیادہ عزیز ہے جب کہ ہم خود ایک پوری جماعت ہیں۔

تفسیر: یہ ایک فطری بات ہے کہ ماں باپ کو اپنی اولاد میں سب کے ساتھ یکساں محبت و تعلق نہیں رہتا، کسی بچے سے زیادہ اور کسی سے کم تعلق ہونا بچوں کے عادات و اطوار پر موقوف ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام بچپن ہی سے سلیم الطبع، شریف النفس، مطیع و فرمانبردار تھے۔ علاوہ ازیں سب بچوں میں جن کی تعداد بارہ عدد بیان کی جاتی ہے۔ چھوٹے تھے اور شکل و صورت میں ممتاز ترین۔

خواب کا یہ واقعہ بچپن کا تھا۔ اس کی عظیم تعبیر سیدنا یعقوب علیہ السلام پر منکشف ہو چکی تھی۔ ان اسباب کے تحت سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے باپ کے محبوب و چہیتے بیٹے ہو چکے تھے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے واقعہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ شیخ کو جائز ہے کہ اپنے کسی مرید کے ساتھ دوسرے مریدوں کی بہ نسبت زیادہ شفقت و عنایت کا معاملہ کرے جب کہ اس میں رشد و ہدایت کے آثار زیادہ ہوں۔

④ ﴿اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِ ۝﴾ [سورة یوسف: 8]

ترجمۃ: بے شک ہمارے والد تو بالکل بہک گئے ہیں۔

تفسیر: دس بیٹوں نے اپنے باپ سیدنا یعقوب علیہ السلام پر یہ الزام تراشا کہ ابا جان یوسف کی محبت میں حد سے زیادہ بہک گئے ہیں لہٰذا یوسف کا قصہ ختم کر دینا بہتر ہے۔ چنانچہ قتل کرنے کی سازش میں پڑ گئے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بعض اوقات مریدوں کو بھی اپنے شیخ پر خطائے اجتہادی کا ایسا گمان ہوتا ہے جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو اپنے باپ سیدنا یعقوب علیہ السلام پر ہوا۔

⑮ ﴿اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ﴾ [سورة يوسف: 12]

ترجمۃ: اے ابا جان! یوسف کو کل ہمارے ساتھ بھیج دیجئے کہ وہ خوب کھائے پیئے اور کھیل کود کرے۔

تفسیر: کہا جاتا ہے کہ ان بھائیوں کا کھیل کود، دوڑنا اور تیر اندازی تھی۔ بہر حال باپ کو دھوکہ دے کر سیدنا یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ جنگل لے گئے اور وہ کارروائی پوری کر لی جو انہوں نے طے کیا تھا، سیدنا یوسف علیہ السلام کو ایک تاریک کنویں میں اتار دیا اور روتے پیٹتے گھر آئے۔

سُلوك: فقہاء نے یہاں یہ مسئلہ مستنبط کیا کہ سیر و تفریح جائز کھیل ہے بشرطیکہ اس میں کوئی گناہ شامل نہ ہو اور ملاعبت زوج کا جواز تو حدیث شریف میں موجود ہے۔

قَالَ لِجَابِرِ بن عبداللہ ﷺ فَهَلاَّ بِكْراً تُلاَعِبُهَا وَتُلاَعِبُكَ. (تفسیر کبیر)

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی اخذ کیا ہے کہ مرید کا کبھی تفریحات قولیہ و فعلیہ میں شرکت کرنا کچھ حرج نہیں کیونکہ اس سے نشاط قلبی حاصل ہوتی ہے جو علم و عمل میں معین و مددگار ہو گی۔

⑯ ﴿قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ﴾ [سورة يوسف: 23]

ترجمۃ: یوسف نے کہا: اللہ کی پناہ۔ وہ تو میرا مربی ہے، اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے۔

تفسیر: آیت میں اس واقعہ کا تذکرہ ہے جس میں عزیز مصر کی بیوی زلیخا نے سیدنا یوسف علیہ السلام سے اپنی مطلب برآری کا تقاضہ کیا تھا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس کی فرمائش حرامکاری کا مذکورہ جواب دیا: اللہ کی پناہ! کیا ایسا ممکن بھی ہے؟ عزیز مصر تو میرا محسن و خیر خواہ ہے، بھلا میں اس کی بیوی میں خیانت کا مرتکب بنوں؟ مجھ سے تو یہ ممکن ہی نہیں۔

سُلوك: اہل علم نے لکھا ہے کہ گناہ و معصیت سے پناہ طلب کرنا نبیوں کی سنت ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام نے زلیخا کی مطلب برآری کا پہلا جواب معاذ اللہ سے دیا۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ محسن و خیر خواہ اگرچہ کافر ہی کیوں نہ ہو، تب بھی اس کی رعایت کرنی چاہیے اور اہل طریق اس بارے میں کچھ آگے ہی ہیں۔

﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ [سورة يوسف: 24]

ترجمة: اور اس عورت کے دل میں تو یوسف کا خیال جم ہی رہا تھا اور انہیں بھی اس کا خیال ہو چلا تھا اگر اپنے رب کی دلیل کو انھوں نے دیکھا نہ ہوتا۔

تفسیر: سیدنا یوسف علیہ السلام کے نادر المثال حسن و جمال پر عزیز مصر کی بیوی زلیخا فریفتہ ہو چکی تھی۔ آخر اس نے بے تابی و اضطرابی میں اپنی مطلب برآری کا تقاضہ شروع کر دیا۔

اور اس عمل کے لیے اس نے محل کے دروازے بند کر کے ایسی حسین و جمیل تدابیر اختیار کیں جس سے ٹکرا کر بڑے بڑے زاہدوں کا تقویٰ بھی پاش پاش ہو جائے۔ (تفصیل کے لیے "ہدایت کے چراغ" جلد ۱ صفحہ ۳۰۸ مطالعہ کیجئے) اس نازک و تقویٰ شکن صورت حال کو مذکورہ آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

زلیخا نے تو ارادہ کر لیا تھا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کو بھی خیال ہو چلا لیکن نبوت کی تقدیس آڑے آ گئی اور وہ محل سے باہر ہو گئے۔

آیت میں دونوں کے ارادے کو لفظ ھم سے تعبیر کیا گیا ہے، ھم کے عربی میں دو معنی آتے ہیں۔ ① ارادہ ② خیال۔ زلیخا نے تو پختہ ارادہ کر ہی لیا تھا اور اس کے سارے اسباب بھی جیسا کہ آیت (۲۳) میں تصریح موجود ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کا ھم صرف خیال اور وسوسے کے درجے میں تھا۔ چنانچہ آپ فعل اور ارادۂ فعل دونوں سے بچ گئے، وساوس کی تفصیل سلوک (۱۹۷) پر مطالعہ کیجئے۔

جوان تندرست مرد کا حسین و جمیل عورت کی خلوت خاص میں یکجا ہو جانا خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ پیش قدمی اور شوق دعوت صرف عورت ہی کی طرف سے ہو رہی ہو تو دل میں کچھ خیال آ جانا عیب یا جرم نہیں ہے بلکہ مرد کے صحیح و تندرست ہونے کی دلیل ہے۔ یقیناً پیغمبر اخلاقی خطاؤں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے احساسات بھی مردہ ہوتے ہوں، سخت گرمیوں میں روزے کی حالت میں ٹھنڈے پانی کی طرف خیال چلا جانا نہ گناہ ہے، نہ عیب و نقص کی بات ہے۔

سُلوك: صوفیاء عارفین نے کہا ہے کہ "وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ" (اس نے دروازے بند کر لیے) میں اشارہ ہے اس طرف کہ جو کوئی حرام سے بھاگنے کی ہمت کرتا ہے، اس کے لیے نجات کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

چنانچہ سیدنا یوسف علیہ السلام آگے آگے بھاگ کر بچنا چاہتے تھے اور وہ عورت دوڑ کر پکڑنا چاہتی تھی۔ دروازے کھلتے چلے گئے، سیدنا یوسف علیہ السلام باہر ہو گئے۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اسی نکتہ کو اس طرح لکھتے ہیں:

نیست رخنہ گرچہ در عالم پدید۔ ہمچو یوسف خیرہ سر باید دوید۔

ترجمة: اس عالم میں نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرح بے ساختہ بھاگنا چاہیے۔

8 ﴿قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾

[سورة يوسف: 25]

ترجمة: (اپنے شوہر سے) بولی: کیا سزا ہوگی اس شخص کی جو آپ کی بیوی سے بدکاری کا ارادہ کرے بجز اس کے کہ اس کو قید کر دیا جائے یا کوئی دردناک سزا دی جائے۔

تفسیر: زلیخا نے جب یہ دیکھا کہ راز فاش ہو رہا ہے تو غضبناک حالت میں اپنی مظلومیت کی داستان گھڑنے لگی اور سیدنا یوسف علیہ السلام پر دست درازی کی تہمت لگا دی۔ شاید اس لیے دعوت کے مکر کو عظیم کہا گیا۔

سُلوك: صوفیاء عارفین نے لکھا ہے کہ شیطان کا آخری حربہ ''غضب'' میں مبتلا کر دینا ہوتا ہے، پھر وہ سب کچھ عمل کروالیتا ہے جو اس کی خواہش ہوا کرتی ہے۔ لیکن اللہ کے نیک بندے اس کے اس حربے سے متاثر نہیں ہوتے، ایسے موقعوں پر تحمل سے کام لیتے ہیں اور گناہ سے دور ہو جاتے ہیں۔

9 ﴿قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ﴾ [سورة يوسف: 33]

ترجمة: یوسف نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! قید خانہ مجھ کو گوارہ ہے بہ مقابلہ اس کام کے جس کی طرف مجھے یہ عورتیں بلا رہی ہیں اور اگر آپ ان کے مکر و فریب کو مجھ سے دفع نہ کریں تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں میں شامل ہو جاؤں گا۔

تفسیر: عزیز مصر کی بیوی نے اپنے جرم کو چھپانے کے لیے سیدنا یوسف علیہ السلام پر دست درازی کا الزام عائد کیا اور اپنے شوہر نامدار کو مشورہ دیا کہ یوسف علیہ السلام کو جیل میں ڈال دیا جائے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام نے بارگاہ قدوس میں التجا کی: پروردگار! مجھ کو جیل کی سختیاں گوارہ ہیں اس شاہی گھرانے کی خوش عیشی سے جس میں عیش و عشرت کی فراوانی ہے، اس طرح میں گناہ سے محفوظ ہو جاؤں گا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انبیاء کرام میں نظریں فاعل حقیقی و مؤثر اصلی کی طرف جاتی ہیں، گناہوں سے حفاظت اللہ کی توفیق سمجھتے ہیں، اپنی عصمت و پاکدامنی پر نظر نہیں کرتے۔

محققین علماء نے لکھا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو ''اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ'' کا عظیم لقب جیل خانے ہی میں حاصل تھا۔ آیت میں اسی مقام صدیقیت کا ذکر ہے۔ جوان و حسین امیر زادی، وزیر سلطنت کی بانوئے محترم، ناز و اداؤں سے لبریز جسم، خلوت و یکجائی میں بے قابو ہو کر دروازہ بند کر لے۔ پھر معشوق نہیں، عاشق بن کر پیچھا کرے تو وہ کون سا ذریعہ ہے جو کسی بھی انسان کو گناہ سے باز رکھے؟

یہ صدیقیت ہی کی شان تھی جو فضل الٰہی سے سیدنا یوسف علیہ السلام کو نصیب تھی۔

آپ کی پکار قبول ہوئی اور ثابت قدمی کو ذرا بھی لغزش نہ ہو سکی۔

فصلواتُ ربیّ و سلامه علیه

⑩ ﴿فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ﴾ [سورة يوسف: 31]

ترجمة: پھر جب عورتوں نے یوسف کو دیکھا تو حیران رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور کہنے لگیں: خدا کی پناہ۔ یہ شخص انسان نہیں، کوئی معزز فرشتہ ہے۔

تفسیر: زلیخا کی محبت وعشق کے چرچے عام ہو گئے تھے۔ ملک کی امیر زادیاں، وزیر زادیاں طعن وتشنیع کرنے لگیں کہ گری بھی تو کس پر؟ اپنے خادم غلام پر اور وہ بھی ہم وطن وہم نسب نہیں، پردیسی واجنبی، نہایت ذلت کی بات ہے۔

اس بدنامی وناکامی کو دور کرنے کے لیے زلیخا نے شہر کی امیر زادیوں کو دعوت طعام دی اور سیدنا یوسف علیہ السلام کو ان کے روبرو پیش کیا، پھر کیا تھا؟ یہ حسینان عالم جو خود ہی سب کو دعوت نظارہ دینے کی عادی تھیں، خود آپ تماشائی بن گئیں، سیدنا یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال میں ایسی بیخود ہو گئیں کہ پلک جھپکنا تک بار گراں ہو گیا اور ہاتھ کی چھریاں جو پھل کاٹنے کے لیے ہاتھوں میں تھیں، پھلوں کے بجائے انگلیوں پر چل گئیں۔

سُلوك: روح المعانی کے مفسر نے ابن عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ حسینان مصر کا یہ حال ''مشاہدۂ مخلوق'' (سیدنا یوسف علیہ السلام) سے ایسا بے قابو ہو گیا۔ اسی پر قیاس کیا جائے کہ ''مشاہدۂ خالق'' کا کیسا کچھ اثر ہو گا؟ پھر لکھتے ہیں کہ اگر ایسے شخص سے کوئی بات خلاف واقعہ سرزد ہو جائے تو اس پر اعتراض نہ کرنا چاہیے۔

⑪ ﴿قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا﴾

[سورة يوسف: 37]

ترجمة: یوسف نے کہا: جو کھانا تم دونوں (قیدیوں) کے لیے آتا ہے، وہ ابھی آنے نہ پائے گا کہ میں اس کی حقیقت تم دونوں سے بیان کر دوں گا قبل اس کے کہ کھانا تم دونوں کے پاس آئے (کہ وہ کس قسم کا اور کیسا ہے؟) یہ علم میرے رب نے مجھے سکھایا ہے۔

تفسیر: سیدنا یوسف علیہ السلام کو زلیخا کے مکر وفریب سے جیل خانہ پہنچا دیا گیا تھا، انہی دنوں بادشاہ ریان بن الولید کے دو ② خاص خادم بھی جیل خانے پہنچائے گئے تھے جن پر بادشاہ کو زہر دینے کا الزام تھا۔ ان دونوں نے جیل خانے میں سیدنا یوسف علیہ السلام سے اپنے ایک خواب کی تعبیر دریافت کی تھی، سیدنا یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بیان کر دی اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ میں کوئی کاہن یا منجم نہیں ہوں بلکہ علم الٰہی سے سرفراز ہوں، خوابوں کا علم اور اس کی تعبیرات سے واقف ہوں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی عالم دین اپنے علمی کمالات وفضائل اس نیت سے بیان کرے کہ لوگ اس سے نفع اٹھائیں اور اس پر اعتماد کریں تو اپنی ایسی خوبیوں کو بیان کردینا جائز ہے۔ (جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے ظاہر کردیا تھا) اور جن بزرگوں نے اپنے کمالات کا اظہار کردیا ہے، ان کا یہی منشاء تھا (قرآن حکیم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: ﴿وَ اَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ ۝﴾)

⑫ ﴿وَ قَالَ لِلَّذِیۡ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنۡهُمَا اذۡكُرۡنِیۡ عِنۡدَ رَبِّكَ﴾ [سورة يوسف: 42]

ترجمة: اور ان دونوں قیدیوں میں جس شخص کے متعلق رہائی کا یقین تھا، اس سے یوسف نے کہا کہ میرا بھی ذکر اپنے آقا سے کردینا۔

تفسیر: سیدنا یوسف علیہ السلام کو دونوں قیدیوں میں جس شخص کے بارے میں یقین تھا کہ اس کو بادشاہ معاف کردے گا، جب وہ قید خانے سے نکلنے لگا تو فرمایا کہ اپنے بادشاہ کی خدمت میں میرا تذکرہ کردینا کہ ایک بے گناہ عرصۂ دراز سے قید خانے میں پڑا ہوا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ مصائب وآلام سے نجات پانے کے لیے کسی سے مدد طلب کرنا ممنوع نہیں، خصوصاً ایسے شخص سے جس پر احسان کیا ہو، نیز ایسی مدد طلب کرنا توکل کے خلاف بھی نہیں۔

⑬ ﴿فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوۡلُ قَالَ ارۡجِعۡ اِلٰی رَبِّكَ فَسۡـَٔلۡهُ مَا بَالُ النِّسۡوَةِ الّٰتِیۡ قَطَّعۡنَ اَیۡدِیَهُنَّ﴾ [سورة يوسف: 50]

ترجمة: پھر قاصد جب یوسف کے پاس آیا تو یوسف نے کہا: اپنے آقا کے ہاں واپس جا اور اس سے دریافت کر کہ ان عورتوں کا کیا واقعہ ہے جنہوں نے دعوت کے وقت اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے:

تفسیر: سیدنا یوسف علیہ السلام کا یہ ارشاد اس وقت کا ہے جب کہ آپ نے بادشاہ کے خواب کی تعبیر بیان کردی تھی، بادشاہ نے متاثر ہوکر آپ کو جیل خانے سے اپنے دربار میں طلب کیا تاکہ ملاقات کرے۔

بادشاہ کی یہ گزارش لے کر جب قاصد آپ کے ہاں آیا تو آپ نے مذکورہ مطالبہ پیش کردیا کہ میری رہائی سے پہلے اس واقعہ کی صفائی کردی جائے جس کے سبب مجھ کو جیل بھیج دیا گیا تھا۔

یہ مطالبہ اس لیے تھا کہ باہر آنے سے پہلے بے گناہی ثابت ہوجائے اور باعزت رہائی ہو۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بادشاہ نے مصری لیڈیوں کو طلب کیا جس میں زلیخا بھی شامل تھی۔ بحث مباحثہ کے بعد سب نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی وطہارت کی شہادت دی اور زلیخا پر جھوٹ وتہمت کا الزام لگایا۔ زلیخا نے جب یہ منظر دیکھا کہ چھوٹی بڑی ہر لیڈی اس کے خلاف شہادت دے رہی ہے تو صاف لفظوں میں اپنے جرم کا اقرار

کرلیا۔قصور سرتاسر میرا ہی ہے، دامن یوسفی ہر عیب و داغ سے پاک ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ مقتدا اور صاحب علم آدمی پر اگر الزامات اور تہمتیں ہوں تو پہلے ان کی صفائی کر دینا چاہیے تاکہ ان کی دعوت وتبلیغ کے اثرات پر غلط اثر نہ پڑے۔حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ کسی کی چالاکی دیر تک چلنے نہیں پاتی، آخر اصلیت ظاہر ہو رہی جاتی ہے۔

ملحوظه: نبی کریم ﷺ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر وتحمل کی اس طرح تعریف کی ہے۔

((لَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ مَالَبِثَ يُوْسُفُ لاَ جَبْتُ الدَّاعِيْ.)) (بخاری و مسلم)

اگر میں اتنی مدت قید میں رہتا جتنا کہ یوسف علیہ السلام رہے ہیں تو بلانے والے کے ساتھ فوری نکل جاتا۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس ارشاد میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے صبر وتحمل کی تعریف کی گئی ہے اور نبی کریم ﷺ نے خود اپنی بندگی وعبودیت کا اظہار کیا ہے۔

⑭ ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ﴾

[سورة يوسف: 53]

ترجمة: اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا۔ بے شک نفس تو برائی کا تقاضہ کرتا ہے سوائے اس نفس کے جس پر میرا رب رحم کر دے۔

تفسیر: انسانی نفس کی طبیعت میں برائی کا تقاضہ غالب رہا کرتا ہے۔اس لیے عام طبیعت برائی کی طرف فوری متوجہ ہو جاتی ہے۔سیدنا یوسف علیہ السلام سے جو عفت پاک دامنی کا مظاہرہ ہوا، ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ یہ فخر و ناز کا انداز ہے، سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس کی حقیقت بیان کر دی کہ یہ صرف اللہ کی رحمت وعنایت کا نتیجہ ہے جو کسی برائی سے روک دے ورنہ انسانی نفس کا تقاضہ تو برائی کی ترغیب دینا ہے۔

انبیاء کرام کو انسانی نفس کے علاوہ نفس پیغمبری بھی عطا ہوتا ہے جو نفس کی عام آلائش اور کمزوریوں سے پاک ہوا کرتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مذکورہ آیت میں انبیاء کرام کے مرتبۂ تواضع کا اظہار ہوتا ہے، وہ اپنی خوبی کے کسی بھی حصے کو اپنی جانب منسوب نہیں کرتے بلکہ اس کو فضل الٰہی قرار دیتے ہیں۔

صوفیاء عارفین نے یہ کیفیت یہاں ہی سے حاصل کی ہے۔

⑮ ﴿قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴾ [سورة يوسف: 55]

ترجمة: یوسف نے کہا: (اے بادشاہ!) مجھ کو ملکی خزانوں پر مامور کر دیجیے۔ میں امانت و دیانت رکھتا ہوں، علم بھی رکھتا ہوں۔

تفسیر: وحی الٰہی کی اطلاع پر ملک مصر میں شدید خوفناک قحط پڑنے والا تھا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ ملک کے معاشی استحکام کے لیے مالیات کا محکمہ میرے حوالہ کر دیا جائے تا کہ عوام کو قحط سالی کے مضر اثرات سے محفوظ رکھا جا سکے۔

شعبۂ مالیات میں امانت و دیانت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے میں امین اور دیانت دار ہوں اور چونکہ معاشی انتظام کے لیے علم وفہم بھی ضروری ہیں، اس لیے میں ان دونوں نعمتوں سے بھی سرفراز ہوں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ حکومت و منصب حاصل کرنے کے لیے درخواست کرنا جب کہ مخلوق خدا کا اس میں نفع ہو اور اپنا کوئی دینی ضرر بھی نہ ہو تو جائز ہے۔

ملحوظہ: حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص از خود عہدہ و منصب طلب کرے تو اس کا بار اسی کے کندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے (یعنی اس کام میں اللہ کی تائید و توفیق اس کو حاصل نہیں ہوتی)۔

مذکورہ آیت اور حدیث کے ظاہری تضاد کا اہل علم نے یہ جواب دیا کہ یہ اس صورت میں ہے جب عہدہ و منصب اپنی ذات کے لیے یا جاہ و عزت طلبی کے لیے حاصل کیا جائے۔ ایسا طلب کرنا جائز نہیں، اس میں اللہ کی تائید و توفیق نہیں ہوتی۔

⑯ ﴿ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴾ [سورة يوسف: 59]

ترجمة: کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ میں پورا پورا ناپ کر دیتا ہوں اور سب سے زیادہ مہمان نوازی کرتا ہوں۔

تفسير: ملک میں جب قحط سالی کا دور دورہ شروع ہوا تو اس کا اثر کنعان سیدنا یعقوب علیہ السلام کے وطن ملک شام تک بھی پہنچا اور یہ شہرت عام ہو گئی کہ ملک مصر میں غلہ تقسیم ہو رہا ہے۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام کے دس (۱۰) بیٹے بھی غلہ حاصل کرنے مصر آئے، انہیں فی کس ایک اونٹ بھر غلہ ملا، لیکن گیارہویں (۱۱) بھائی بنیامین کا غلہ نہ مل سکا کیونکہ وہ اس سفر میں بھائیوں کے ساتھ شریک نہ تھے، بھائیوں کی درخواست پر کہا گیا کہ جب تک وہ خود نہ آئے اس کا حصہ نہیں مل سکتا۔

اس طرح سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے حقیقی بھائی بنیامین سے ملنا چاہتے تھے اس لیے وہ عنوان اختیار کیا جو آیت میں موجود ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ (میں بہترین میزبان ہوں) سے معلوم ہوا کہ اپنی خوش معاملگی اور کریمانہ اخلاق کا اظہار کرنا تواضع کے خلاف نہیں ہے لیکن شرط تو یہی رہے گی اس میں اپنی شان مقصود نہ ہو۔

⑰ ﴿وَتَوَلّٰی عَنۡهُمۡ وَقَالَ یٰۤاَسَفٰی عَلٰی یُوۡسُفَ وَابۡیَضَّتۡ عَیۡنٰهُ مِنَ الۡحُزۡنِ﴾

[سورة يوسف: 84]

ترجمة: پھر یعقوب نے (اپنے بیٹوں سے) منہ پھیر لیا اور کہنے لگے: ہائے یوسف! اور غم سے روتے روتے ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور وہ گھٹ گھٹ کر رہتے تھے۔

تفسیر: پیغمبر اپنے جذبات و احساسات کے لحاظ سے بھی بشر ہوتے ہیں، مافوق البشر نہیں ہوتے۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام بیٹے یوسف (علیہ السلام) کی جدائی میں اشک بار رہنے لگے اور زبان سے غم و رنج کے الفاظ بھی نکل جاتے تھے۔ اس کے باوجود کہا کرتے تھے کہ میری شکایت تم سے نہیں، اللہ سے وابستہ ہے، اپنا دکھ و غم اسی سے عرض کرتا ہوں۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ طبعی محبت (بیوی بچوں کی محبت) محبت حق کے منافی نہیں، دونوں محبت قلب مومن میں جمع ہو سکتی ہیں البتہ عارفین و کاملین کو طبعی محبت رضائے الٰہی سے غافل نہیں کرتی۔

علاوہ ازیں اشک فشانی کمالات نبوت کے ذرا بھی خلاف نہیں تو پھر اولیاء اللہ کا گریہ و بکا اور اشک بہانا کوئی نقص کی بات نہیں ہے۔

⑱ ﴿قَالَ اِنَّمَاۤ اَشۡکُوۡا بَثِّیۡ وَحُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ [سورة يوسف: 86]

ترجمة: یعقوب علیہ السلام نے کہا: میں تو اپنے رنج و غم کی شکایت بس اللہ ہی سے کر رہا ہوں۔

تفسیر: سیدنا یعقوب علیہ السلام کا غم و اندوہ فراق یوسفی میں تھا۔ دیگر بیٹے اپنے باپ کو بار بار یہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ آپ تو بس یوسف ہی کی یاد میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیں گے۔ اس پر سیدنا یعقوب علیہ السلام فرماتے: تم کو اس سے کیا سروکار؟ میں جو کچھ بھی شکوہ شکایت کر رہا ہوں، اپنے رب سے کر رہا ہوں اور مجھے تو اسی سے مانگنا بھی ہے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع ہونا اور اسی سے اپنا دکھ درد بیان کرنا صبر جمیل کے خلاف نہیں بلکہ یہی صبر جمیل ہے کہ ہر تکلیف اللہ ہی سے عرض کی جائے۔

البتہ اپنے دکھ درد و حاجات کو اللہ سے چھوڑ کر مخلوقات سے کہنا سننا صبر جمیل کے خلاف ہے۔

⑲ ﴿فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلَیۡهِ قَالُوۡا یٰۤاَیُّهَا الۡعَزِیۡزُ مَسَّنَا وَاَهۡلَنَا الضُّرُّ﴾ [سورة يوسف: 88]

ترجمة: پھر جب وہ سب بھائی عزیز مصر کے پاس پہنچے تو بولے: اے عزیز (بادشاہ)! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو بڑی تکلیف پہنچ رہی ہے (ہمیں پھر غلہ عنایت کیجئے۔)

تفسیر: برادران یوسف کا یہ تیسرا سفر تھا۔ اس سفر میں ایک تو غلہ کی شدید ضرورت تھی جو مصر ہی میں (سیدنا

یوسف علیہ السلام) کے ہاں پوری ہوسکتی تھی۔ دوسری بات یہ کہ دوسرے سفر میں بنیامین کو مصر میں روک لیا گیا تھا، ان کی بازیابی کے لیے سفر کرنا بھی ضروری تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ حاجت برآری کے لیے برادران یوسف کا مذکورہ عنوان جائز ہے، اس عنوان میں اللہ تعالیٰ کی شکایت کا پہلو پیدا نہیں ہوتا۔

(لہٰذا ضرورت پر ہم بھی ایسا عنوان اختیار کر سکتے ہیں مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ)

⑳ ﴿وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ﴾

[سورة يوسف: 94]

ترجمة: اور جب قافلہ چلا تو ان کے باپ (یعقوب علیہ السلام) نے کہنا شروع کیا کہ اگر تم مجھ کو بڑھاپے میں بہکی بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو میں ایک بات کہوں گا کہ مجھ کو یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔

تفسير: یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کا اکرام واحترام کر کے اپنے والدین کو کنعان سے مصر لے آنے کا مشورہ دیا تھا اور چلتے وقت اپنی قمیص بھی بھائیوں کے حوالہ کی کہ اس کو میرے باپ سیدنا یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دو، اس عمل سے ان کی بینائی لوٹ آجائے گی۔ بھائیوں کا قافلہ جونہی مصر سے روانہ ہوا، سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے گھر میں کہنا شروع کر دیا کہ مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے، گھر والوں نے پھر طعنہ دیا کہ بخدا! تم بس اسی پرانے وہم میں پڑے ہو کہ بس یوسف آجائے گا، یوسف آجائے گا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ چونکہ یوسف علیہ السلام سے ملاقات کا خدائی وعدہ قریب آچکا تھا، یہ خوشبو سینکڑوں میل کے فاصلہ سے سیدنا یعقوب علیہ السلام کو محسوس ہونے لگی لیکن یوسف علیہ السلام کنویں میں گھر کے قریب تھے، اس وقت یہ خوشبو محسوس نہ ہوئی (یہی معاملہ اولیاء اللہ کے مکاشفات کا ہے۔ کبھی قریبی شے کے ادراک سے لاعلم رہتے ہیں اور بعض دفعہ سینکڑوں میل کی خبر دیتے ہیں۔)

ملحوظه: شیخ سعدی رحمہ اللہ نے اس حقیقت کو اپنی کتاب گلستان میں اس طرح بیان کیا ہے:

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند — کہ اے روشن گہر پیر خرد مند

زمصرش بوئے پیراہن شنیدی — چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی

بگفتا حال مابرق جہاں نست — دمے پیدا و دیگر دم نہانست

گہے برطارم اعلیٰ نشینم — گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

اگر درویش برحالے بماند — تہی دست ہر دو عالم بر فشاندے

ترجمۃ: کسی شخص نے سیدنا یعقوب علیہ السلام سے پوچھا: اے روشن دل عقل مند بزرگ! ملک مصر سے اپنے صاحبزادے کی خوشبو محسوس کی لیکن جب وہ اپنے گھر کے قریب کنویں میں پڑے ہوئے تھے اس وقت اپنے صاحبزادے کو محسوس نہ کیا، آخر یہ کیا راز ہے؟

فرمایا کہ ہمارے احوال اس چمکتی برق کی طرح ہیں جو ایک وقت ظاہر ہوتی ہے اور دوسرے لمحہ پوشیدہ، کبھی ہم بلندترین منزل پر ہوتے ہیں اور کبھی اپنے پیر کے نیچے کا علم نہیں رکھتے۔

اللہ والے اگر یکساں حالت پر قائم رہیں تو دنیا کے اسباب درہم برہم ہوجائیں گے اور نظام دنیا بگڑ جائے گا۔

(یَا حَنْظَلَۃُ رضی اللہ عنہ سَاعَۃً فَسَاعَۃً.) (حدیث)

پیراہن یوسفی کو جب باپ کے چہرے پر ڈال دیا گیا، آنکھوں کی ضائع شدہ بینائی فوری لوٹ آئی، سیدنا یعقوب علیہ السلام نے بچوں سے کہا: کیا میں نے کہا نہ تھا کہ مجھ کو یوسف کی خوشبو آرہی ہے اور کیا میں نے یہ نہ کہا تھا کہ یوسف کو تلاش کرو، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، وہ ہم سب کو یکجا کردے گا، دیکھ لو وہی صورت پیش آئی۔

پیراہن یوسفی کی یہ تاثیر کرامت یا معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ عصائے موسیٰ میں جادو کے کرتبوں کو نگل جانے اور فنا کردینے کی تاثیر تھی۔

اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض لطیف و مسحور کن خوشبو یا شدت خوشی و مسرت کے اثر سے سماعت یا بصیرت کا تیز ہوجانا یا لوٹ آنا کوئی خلاف عقل یا خلاف فطرت بات نہیں ہے۔

موجودہ تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ جیسا کہ کسی حادثہ یا مصیبت سے عقل و ہوش گم ہوجاتے ہیں، اسی طرح ضائع شدہ صحت و توانائی بھی لوٹ آتی ہے۔

خود راقم الحروف نے اپنے دو حادثات میں اس کا تجربہ پایا ہے۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ

﴿21﴾ ﴿اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۝﴾

[سورة یوسف: 101]

ترجمۃ: اے اللہ! تو ہی دنیا و آخرت میں میرا کارساز ہے۔ مجھے دنیا سے اپنا فرمانبردار اٹھا اور نیکوں میں مجھ کو شامل فرما۔

تفسیر: سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے ماں باپ اور بھائیوں کی ملاقات پر اللہ کا شکر ادا کررہے ہیں اور آخرت کی صلاح و فلاح اور نیک بندوں میں شامل ہونے کی دعا کررہے ہیں۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ تَوَفَّنِیْ مُسْلِماً سے دو ﴿2﴾ مسئلے ثابت ہوتے ہیں۔

پہلا مسئلہ یہ کہ انبیاء کرام جو گناہ کے ہر اندیشہ سے محفوظ ہیں، کفر سے پناہ طلب کر رہے ہیں۔(معلوم ہوا کہ مسلمان کو کسی بھی حالت میں بے خوف نہ ہونا چاہیے)

دوسرا مسئلہ یہ کہ لِقَآءُ رَبّ کی خواہش میں موت کی تمنا کرنا جائز ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ دنیا کی مکروہات اور فانی لذات سے دل برداشتہ ہو کر میں نے دعائے یوسفی ﴿تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ﴾ کا دائمی ورد مقرر کرلیا ہے۔

ملحوظہ: جس حدیث میں موت کی تمنا کرنے سے منع کیا گیا ہے، اس سے مراد مصیبت یا تکلیف میں گھبرا کر موت کی تمنا کرنا مراد ہے۔لیکن اللہ کی ملاقات یا جنت کے شوق میں موت کی تمنا کرنا جائز ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں شہادت کی تمنا خود اسلام کی تعلیمات ہیں۔

کنواری سیدہ مریم علیہا السلام بچے کی غیر فطری ولادت پر بدنامی کے اندیشہ سے موت کی تمنا کرنے لگیں، ﴿یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا﴾ [سورة مريم: 23] حدیث شریف میں ہے کہ دجال کے فتنوں سے گھبرا کر ایک شخص کسی کی قبر پر گذرے گا تو کہے گا: یٰلَیْتَنِیْ مَکَانَكَ کاش میں تیری جگہ ہوتا۔

نیز حدیث میں ہے: «یَكْرَهُ الْمُؤْمِنُ الْمَوْتَ وَالْمَوْتُ خَیْرٌ لِّلْمُؤْمِنِ مِنَ الْفِتَنِ» (مسند احمد)

مومن موت سے گھبراتا ہے حالانکہ مومن کے لیے موت فتنوں سے بہتر ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی موت کے وقت فرما رہے تھے: «اَللّٰهُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰى» اے اللہ! مجھے اپنے پاس بلالے۔

غرض یہ ہے کہ موت کی تمنا کرنا ہر حال میں منع نہیں۔ جنت یا شوقِ آخرت یا لقاءِ رب کے لیے موت کی تمنا کرنا درست ہے، البتہ جیسا کہ لکھا گیا دنیا کی مصیبتوں و پریشانیوں سے گھبرا کر موت کی تمنا کرنا منع ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے علم کامل پایا، دولت کامل پائی تو اب شوق ہوا اپنے باپ دادا کے مراتب کا، گویا اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ سے یہ غرض تھی کہ میرا مرتبہ سیدنا یعقوب، سیدنا اسحٰق، سیدنا ابراہیم علیہم السلام کے مراتب سے ملادے۔

22 ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ﴾ [سورة يوسف: 108]

ترجمة: آپ کہہ دیجئے: یہ میرا راستہ ہے۔ میں لوگوں کو اللہ کی توحید کی طرف اس طرح بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں، میں اور میری پیروی کرنے والے۔

تفسیر: قصہ کے اختتام پر سیدنا یوسف علیہ السلام کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا جارہا ہے کہ میں بے دلیل بات نہیں

کہہ رہا ہوں، پوری بصیرت کے ساتھ انسانوں کو اللہ کی یکتائی اور اس کے معبود حقیقی ہونے کی دعوت دے رہا ہوں، میں شرک اور شرک کرنے والوں سے دور ہوں۔ میرے راستے کا حاصل یہ ہے کہ اللہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک و دخیل نہیں، میں اللہ کا پیغمبر و رسول ہوں، میری بات مانو اور اس کی پیروی کرو، اسی میں ہماری اور تمہاری نجات و کامیابی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ روح المعانی کے مفسر علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ داعی الی اللہ کو طریق (صراط مستقیم) کا ماہر اور اللہ کی ذات و صفات کا عارف ہونا ضروری ہے۔

سُورَةُ الرَّعْدِ

پَارَہ: 13

① ﴿وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ﴾ [سورة الرعد: 4]

ترجمة: اور زمین میں مختلف کھیت ہیں ایک دوسرے سے متصل اور باغ ہیں انگور کے اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں ہیں ایک کی جڑ دوسروں سے ملی ہوئی اور بعض بن ملی ہوئی، ان کو پانی بھی ایک ہی طرح کا دیا جاتا ہے۔ اور ہم ایک پھل کو دوسرے پھل پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان امور میں سمجھداروں کے لیے توحید کی نشانیاں ہیں۔

تفسیر: آیت میں زمین کی خصوصیات بیان کی جارہی ہیں کہ پوری زمین کے حصے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، سب حصے ایک ہی قسم کے پانی سے سیراب کیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود اس قدر مختلف پھل پھول پیدا ہوتے ہیں کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ شکل وصورت، رنگ ومزہ، چھوٹے بڑے پر مخلوق کے لحاظ سے مختلف غذائیں ایک ہی زمین، سے ایک پانی سے، ایک ہی روشنی وہوا سے پیدا ہورہے ہیں، زمین کی صرف ایک ساخت ہے، اس میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے سینکڑوں نشانیاں ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ ایک ہی شیخ کے مریدین مختلف اوصاف کے حامل ہوا کرتے ہیں یہ قلوب کی مختلف صلاحیتوں کا ثمرہ ہے (تربیت کرنے والا ایک ہوتا ہے)۔

② ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ [سورة الرعد: 11]

ترجمة: بے شک اللہ کسی قوم کی (اچھی) حالت بدل نہیں دیتا جب تک وہ لوگ خود میں تبدیلی نہیں کر لیتے۔

تفسیر: آیت میں اللہ تعالیٰ اپنا قانونِ تکوینی بیان کر رہے ہیں کہ وہ کسی قوم پر ظلم وزیادتی نہیں کرتے، وہ تو سراپا عدل و انصاف ہیں لیکن جب کوئی قوم مسلسل نافرمانیوں میں مبتلا ہوجاتی ہے تو پھر اس کا قانون عام ان کی اچھی حالت کو بری حالت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ تبدیلی دراصل قوم کی بداعمالیوں ہی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اللہ کا یہ فیصلہ ہر خاص وعام کے لیے ہوا کرتا ہے، ہر شخص خود اپنی اصلاح کی فکر کرے۔ دوسروں کی فکر میں خود کو بھول جانا سب کی تباہی کا باعث ہوجاتا ہے۔

③ ﴿لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ﴾ [سورة الرعد: 14]

ترجمة: سچا پکارنا اللہ ہی کے لیے خاص ہے اور اللہ کے سوا جن جن کو یہ لوگ پکار رہے ہیں، وہ ان کی درخواست کو

اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہوتا ہے تاکہ پانی اس کے منہ تک آجائے اور وہ پانی اس کے منہ تک ازخود آنے والا نہیں۔

تفسیر: یعنی دعا و پکار صرف اللہ ہی کے حضور میں ہو سکتی ہے، سننے اور قبول کرنے کی قوت صرف اللہ ہی کے پاس ہے، اس کے علاوہ کسی اور سے دعا مانگنا حماقت اور بے عقلی کی بات ہے۔

اللہ کو چھوڑ کر کسی بھی ذات سے دعا کرنا ایسا ہے جیسا کہ پیاسا انسان پانی کے آگے اپنے دونوں ہاتھ دراز کرے اور خوشامد کرے کہ وہ پانی ازخود اڑ کر اس کے منہ میں آجائے۔ اگر وہ ساری زندگی بھی اس طرح مانگتا رہے تو ایک قطرہ بھی اس کے منہ میں نہیں آئے گا۔

اسی طرح اللہ کے سوا کسی انسان، ولی، جن، فرشتہ، دیوی دیوتا سے مانگنا دریا سے پانی طلب کرنے کے برابر ہے۔ یہی حال کافروں کی دعاؤں کا ہے کہ وہ سب رائیگاں جا رہی ہیں۔

سُلوك: غیر اللہ سے استغاثہ و فریاد کرنا بے سود ہے خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ۔

ملحوظہ: یہ شبہ کہ کافروں کی دعائیں بھی قبول ہوتی ہیں پھر یہ کہنا کہ ان کی ساری دعائیں بے سود ہیں۔ اس کا جواب علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے: کافروں کی دعاؤں کا ضائع ہونا آخرت کے لحاظ سے ہے کہ آخرت میں انہیں کوئی نعمت و راحت نصیب نہ ہوگی۔

رہی دنیا کی نعمتیں ہوا، پانی، آگ، صحت و دولت، حکومت و اقتدار وغیرہ یہ بلا کسی تفریق مسلم غیر مسلم کو دی جاتی ہیں حتیٰ کہ حیوانات تک کو پوری پوری ملتی ہیں۔

④ ﴿إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنقُضُونَ الْمِيثَاقَ ۝﴾

[سورة الرعد: 19 تا 20]

ترجمة: بس نصیحت کو فہم والے قبول کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ سے جو کچھ انہوں نے عہد کیا تھا، اس کو پورا کرتے ہیں اور عہد کو توڑتے نہیں۔

تفسیر: اولوالباب، الباب، لُبّ کی جمع ہے۔ لُبّ کے معنی خالص عقل اور صحیح عقل ہیں یعنی ایسی عقل جس میں کھوٹ یا نقص نہ ہو۔ اس کا اردو ترجمہ عقل کامل کیا جا سکتا ہے۔ ایسی عقل ہر سچائی اور اچھائی کو قبول کر لیتی ہے۔ اسلام و ایمان کو وہی عقلیں قبول کر لیتی ہیں جو خالص اور کامل ہوں، ٹیڑھی و ترچھی عقلیں تو جانوروں کو بھی نصیب ہیں۔

سُلوك: فقہاء نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جو عقلیں آخرت کو قبول کر لیتی ہیں، وہی کامل و خالص عقلیں ہیں

اگر چہ ایسا شخص دنیاوی امور سے کم واقف ہو۔

﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ [سورة الرعد: 28]

ترجمۃ: خوب سمجھ لو! اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے۔

تفسیر: ذکر اللہ سے اللہ اور رسول کی اطاعت مراد ہے۔ اسی ذکر اللہ میں ذکر لسانی (زبان سے اللہ کو یاد کرنا) بھی شامل ہے۔ ذکر الٰہی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتا جس کی وجہ سے انتشار و تشویش کا موقع نہیں ملتا، اسی یکسوئی و یک طرفی کی وجہ سے قلب کو اطمینان نصیب ہوتا ہے اور زندگی پرسکون اور راحت افزاء ہو جاتی ہے۔

ذکر الٰہی کے آثار میں ایک اثر یہ بھی ہے کہ اس سے اللہ کی خشیت نصیب ہوتی ہے جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ اور گناہوں سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

سلوك: تفسیر روح المعانی کے مفسر نے اطمینان کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ ذکر الٰہی سے قلب میں نور پیدا ہوتا ہے جس سے پریشانی و وحشت دور ہو جاتی ہے۔ جہاں روشنی ہوگی وہاں سے تاریکی از خود دور ہو جائے گی۔

﴿ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ﴾ [سورة الرعد: 38]

ترجمۃ: اور ہم نے اے نبی! آپ سے پہلے سے رسول بھیجے ہیں اور ہم نے انہیں بیویاں اور بچے بھی دیئے ہیں۔

تفسیر: بیوی بچوں کو دنیا کا جھنجھال سمجھنا جیسا کہ جاہلی مذاہب میں خیال کیا جاتا ہے، اسلام اس نظریہ کا سراسر مخالف ہے۔ دنیا میں رہ کر دنیا سے علیحدہ اور بے زار ہونے کا یہ مطلب ہوا کہ آپ کو یہ دنیا پسند نہیں ہے تو پھر اس زمین پر دوسری دنیا اور کون سی ہے جہاں آپ اطمینان کا سانس لیں گے؟

زمین کے اندر یا پہاڑوں میں چلے جائیں تو یہ بھی دنیا ہی کا حصہ ہیں تو پھر ایسا خیال جہالت یا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ اسلام نے دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیا ہے، اسی دنیا سے آخرت کی دائمی، ابدی زندگی حاصل ہوتی ہے لہٰذا دنیا نہ جھنجھال ہے، نہ مصیبت و عذاب۔

بیوی بچے آخرت کی دعوت دینے والے مقدس انسانوں (رسولوں) کو بھی ملے ہیں اور اسی میں انہوں نے اپنی زندگی بسر بھی کی ہے۔

سلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ کاملین عارفین کو دنیا کے تعلقات اور مال و دولت نقصان دہ نہیں ہوتے اور نہ کثرت مال و اولاد ولایت کے منافی ہیں۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے اخذ کیا ہے کہ مذکورہ آیت میں بڑی عبرت و بصیرت کا سبق ہمارے زمانے کے مجرد، تارک الدنیا مشائخ و اہل خانقاہ کے لیے ہے جنہوں نے شادی بیاہ، لین دین، بال بچوں کو کمالات

ولایت اور روحانیت کے خلاف سمجھا ہے۔

⑦ ﴿وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [سورة الرعد: 38]

ترجمة: اور کسی رسول کے بس میں نہیں کہ ایک آیت بھی اللہ کے حکم کے بغیر لائے۔

تفسیر: عربی زبان میں آیت کے دو② معنی آتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآنی آیت یا حکم، دوسرے یہ کہ معجزہ یا نشانی۔

مذکورہ آیت میں اٰیة سے دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ یعنی کوئی رسول اپنی مرضی سے نہ کوئی آسمانی حکم لا سکتا ہے اور نہ کوئی معجزہ یا نشانی پیش کر سکتا ہے۔

آسمان سے جو بھی حکم یا معجزہ ہوتا ہے، وہ اللہ کی مرضی اور ارادے سے نازل ہوتا ہے، اس میں رسول یا نبی کے ارادے اور اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسولوں سے خوارق یا معجزات کا طلب کرنا درست نہیں تو پھر اولیاء اللہ کے بارے میں کرامات کا طلب کرنا کیونکر درست ہوگا؟ جب معجزات کا رسولوں کو اختیار نہیں تو اولیاء اللہ کا کیونکر اختیار ہوگا؟

سُوْرَةُ اِبْرَاهِيْمَ

پارہ: 13

(1) ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ﴾ [سورۃ ابراہیم: 4]

ترجمۃ: اور ہم نے تمام رسولوں کو ان ہی کی قوم کی زبان میں رسول بنا کر بھیجا تا کہ وہ ان لوگوں پر احکامات کھول کر بیان کریں۔

تفسیر: طبعی طور پر ہر رسول کے پہلے مخاطب ان کے اپنے قومی لوگ ہوتے ہیں۔ اس لیے اسی قومی زبان میں وحی بھیجی جاتی ہے تا کہ احکامات الٰہیہ کے سمجھنے سمجھانے میں سہولت رہے۔ نبی کریم ﷺ کو جس قوم میں مبعوث کیا گیا، اس کی قومی زبان عربی تھی۔ اس لیے آپ کے اولین مخاطب اہل عرب تھے اور قرآن حکیم بھی عربی زبان میں نازل ہوا۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے استنباط کیا کہ شیخ کے خلفاء وہی ہوا کرتے ہیں جن کو اس سے خصوصی مناسبت ہو اور یہی خلفاء بھی اس کے اول مخاطب ہوتے ہیں۔

(2) ﴿ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ﴾ [سورۃ ابراہیم: 5]

ترجمۃ: (اے موسیٰ!) اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آؤ اور انہیں زمانے کے وقعات یاد دلاؤ۔

تفسیر: یہ ہدایت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی کہ غفلت و معصیت سے نکال کر طاعت و عبادت کی ترغیب دی جائے اور انہیں عبرت خیزی کے لیے گزشتہ اقوام کے واقعات سنائے جائیں جنہیں بغاوت و سرکشی کی پاداش میں سیاہ دن دیکھنے پڑے تھے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اگرچہ ظلمت سے روشنی کی طرف لانا اللہ کا فعل ہے لیکن اس عمل کو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی جانب منسوب کیا گیا۔

اس میں اشارہ ہے اس بات کا کہ مرید کی تکمیل میں شیخ کا عظیم دخل ہوا کرتا ہے۔

(3) ﴿ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۧ ﴾ [سورۃ ابراہیم: 6]

ترجمۃ: اور اس معاملہ میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑا امتحان تھا۔

تفسیر: فرعون اور فرعونیوں کے ظلم و ستم سے بنی اسرائیل (قوم موسیٰ) ایک عظیم آزمائش میں مبتلا تھی۔ پھر اللہ نے ان پر کرم فرمایا اور فرعون و آل فرعون کو غرق دریا کر دیا، اس طرح بنی اسرائیل پر اللہ کا بڑا فضل ہوا۔

بلآء کے عربی معنی آزمائش کے ہیں۔ یہ آزمائش چاہے مصیبت میں ہو یا راحت میں، دونوں میں انسان

کے صبر وشکر کی آزمائش ہوتی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے مومن کے لیے مصیبت وتکلیف بھی تربیت نفس کے لیے ہوا کرتی ہے۔

﴿وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ [سورة الأعراف: 128]

ترجمة: اور ہم ان کو خوشحالیوں (صحت ودولت) اور بدحالیوں (بیماری وتنگدستی) سے آزماتے رہے تاکہ کفر و شرک سے باز آجائیں۔

۞ ﴿جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ﴾ [سورة ابراہیم: 9]

ترجمة: ان کے پیغمبران کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے مگر ان لوگوں نے اپنے ہاتھ ان کے منہ پر رکھ دیئے اور کہا کہ تم جو دعوت توحید لے کر آئے ہو، ہم نے اس کا انکار کر دیا ہے۔

تَفسِیر: آیت میں ان قوموں کی شدت عناد و جہالت کا ذکر ہے جو اپنے مخلص پیغمبروں کی بات تو کیا تسلیم کرتے، انہیں بولنے کی بھی اجازت نہ دی اور ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

منہ پر ہاتھ رکھنے کا ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ بولنے اور کلام کرنے کی اجازت نہ دی جائے یا پھر حقیقتاً منہ پر ہاتھ رکھ دینا تاکہ کلام ہی نہ کر سکیں۔ دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ کفر اور انکار کے علاوہ سوء ادب بھی ایک مستقل گستاخی و جرم ہے کہ کسی خیر خواہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا جائے، اہل طریق سوء ادبی کی سخت ممانعت کرتے ہیں۔

۞ ﴿وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ﴾ [سورة ابراہیم: 22]

ترجمة: اور میرا تم پر کچھ زور تو تھا نہیں البتہ میں نے تمہیں بلایا اور تم نے میرا کہا مان لیا۔ لہٰذا تم مجھ پر ملامت نہ کرو، ملامت اپنے آپ پر کرلو۔

تَفسِیر: اسلام میں یہ عقیدہ بالکل واضح ہے کہ شیطان ابلیس کو کسی انسان کے گمراہ کرنے کی طاقت نہیں دی گئی۔ انسان گمراہ ہوتا ہے تو اپنے عمل و ارادے سے یا ہدایت یافتہ ہوتا ہے تو اپنے عمل و ارادے سے، شیطان ابلیس کو صرف ترغیبات دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ وہ رنگ برنگ ترغیبات دے کر گناہ کے قریب کر دیتا ہے وبس۔

آیت میں ابلیس کی زبان سے اسی حقیقت کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ یہ جو بے تکلف کہہ دیتے ہیں کہ کیا کروں کم بخت شیطان نے گناہ کروا ہی دیا ورنہ میرا ارادہ ہرگز ایسا نہ تھا (ایسا کہنا خود فریبی) ہے۔ آیت سے معلوم ہوا کہ

شیطان ابلیس کا سوائے وسوسہ اندازی اور کوئی زور نہیں۔

6 ﴿وَّ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۭ۟﴾ [سورة ابراهيم: 35]

ترجمۃ: اور مجھ کو اور میری اولاد کو دور رکھیئے کہ ہم بت پرستی کریں۔

تفسیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا تعمیر کعبہ کے بعد کی ہے۔ جب بیت اللہ آباد ہو گیا، آپ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے حضور رب میں دعا کر رہے ہیں کہ اب بیت اللہ تعمیر ہو گیا ہے، پھر اس میں کبھی بھی بت پرستی نہ ہو۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ دعا کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام بھی شیطان اور شیطانی وسوسوں سے بے خوف نہیں ہیں۔ جہاں وہ اپنی اولاد کے لیے شیطان سے پناہ طلب کر رہے ہیں، وہاں پہلے خود اپنی ذات کے لیے بھی پناہ طلبی کرتے ہیں، اس کے بعد پھر ان لوگوں کا کیا ذکر ہے جو ہر وقت نفس و شیطان کے پھندوں میں پھنسے رہتے ہیں۔ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ کسی کو بھی اپنے حال و کمال پر ناز نہ کرنا چاہیے۔

7 ﴿رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾

[سورة ابراهيم: 37]

ترجمۃ: اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد کو آپ کے محترم گھر کے قریب ایک بے آب و دانہ وادی میں آباد کر دیا ہے تا کہ اے رب! وہ نمازوں کو قائم کریں۔

تفسیر: کعبۂ معظم اس وقت منہدم حالت میں تھا تاہم اس کی جگہ معروف اور سب کی نگاہوں میں محترم و متبرک تھی۔ اس دعا کے وقت اس کا محل وقوع ویران ریگستانی علاقہ تھا، دور دور تک پانی اور انسانی آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ وحی الٰہی کی ہدایت پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے اس قدیم گھر آباد کرنے کے لیے اپنی بیوی سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور شیر خوار بچے سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کو یہاں چھوڑ دیا اور خود منصب رسالت کی تکمیل کے لیے اپنے ملک عراق واپس چلے گئے۔ یہ سب وحی الٰہی کی ہدایات پر تھا۔

سُلوك: بعض متشدد صوفیوں نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اس عمل سے استدلال کیا کہ اپنے بیوی بچوں کو عبادت و ریاضت کے لیے اللہ پر توکل کر کے ایسی جگہ رکھنا جہاں کھانے پینے کا ساز و سامان نہ ہو، جائز ہے۔ لیکن یہ استدلال سراسر غلط و باطل ہے کیونکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے وحی الٰہی کی ہدایت پر یہ عمل کیا تھا، اپنی طرف سے نہیں لہٰذا اس کی نقل کرنا صحیح نہیں۔

8 ﴿فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝﴾ [سورة ابراهيم: 37]

ترجمۃ: سو کچھ لوگوں کے قلوب ان کی جانب مائل کر دیجئے اور انہیں کھانے کے لیے پھل دیجئے تاکہ یہ شکر گزار رہیں۔

تفسیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیوی بچے کو خانہ کعبہ کے قریب آباد کر کے مذکورہ دعا کی اور اپنے منصب رسالت کی ادائیگی کے لیے ملک عراق واپس ہو گئے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اپنے اہل وعیال کے لیے مال وجاہ کا طلب کرنا برا نہیں (بلکہ سنت ابراہیمی ہوگی اگر کوئی اپنی اولاد کے لیے مال ودولت اور عزت وآبرو کی دعا کرے)۔

سُورَةُ الحِجر

پَارَہ: 13

(1) ﴿ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۞﴾ [سورة الحجر: 3]

ترجمة: آپ ان کو اپنے حال پر رہنے دیں کہ وہ کھالیں اور چین اڑالیں اور انہیں خیالی منصوبے غفلت میں ڈالے رکھیں، انہیں عنقریب حقیقت معلوم ہوجائے گی۔

تَفسیر: یعنی جب ان کافروں کو نصیحت کارگر نہیں تو آپ اس غم میں نہ پڑیں، ایسا کیوں ہورہا ہے؟ آپ اپنی دعوت وتبلیغ جاری رکھیں۔ البتہ انہیں جانوروں کی طرح کھانے پینے کے لیے چھوڑ دیں تاکہ یہ خوب دل بھر عیش کرلیں اور اپنے مستقبل کے لیے لمبے چوڑے منصوبے بنالینے دیں پھر موت کا صرف ایک جھٹکا ان کی زندگی کے سارے عیش ولذت کو خواب وخیال بنادے گا۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مذکورہ آیت میں ایسے شخص کی مذمت ہے جس کو اپنی زندگی کی بڑی فکر شکم پری اور شہوت رانی رہا کرتی ہے۔ (روح المعانی)

(2) ﴿وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۞﴾ [سورة الحجر: 6]

ترجمة: اور ان کافروں نے کہا: اے وہ شخص جس پر قرآن نازل کیا گیا! تم مجنون ہو۔

تَفسیر: آیت میں قرآن حکیم کو ذکر کہا گیا کیونکہ یہ سراپا ذکر ونصیحت ہے۔ (روح المعانی)

مکۃ المکرمۃ کے کافر ومشرک نبی کریم ﷺ کو مجنون ودیوانہ کہنے لگے، ان کا یہ کہنا جہاں توہین وذلت کے طور پر تھا، وہاں یہ بھی حقیقت تھی کہ آپ کو اپنے منصب رسالت کی ادائیگی میں جو بے پناہ انہماک وشغف تھا، اس خیر میں ان کم عقلوں کو جنون ودیوانگی نظر آئی۔

واقعہ بھی یہی ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے: اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ کمال کی بات تو یہی ہے کہ دشمن بھی تعریف کریں۔

کافروں کے اعتراض میں نبی کریم ﷺ کے منصب رسالت کی ادائیگی اور اس میں ہمہ تن مشغول ہونے کی شہادت نکل رہی ہے۔ فللّٰه الحمد

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں اشارہ یہ بھی نکلتا ہے کہ جو شخص اولیاء اللہ کے اسرار وحقائق کو سمجھتا نہ ہو، اس کو ان کے علوم ومعارف پر اعتراض نہ کرنا چاہیے۔

نادان لوگ بزرگوں کے بعض احوال وواقعات پر یہ طنز کرتے ہیں کہ کثرتِ ریاضت ومجاہدات کی وجہ سے

ان کے دماغ میں خشکی پیدا ہوگئی ہے اور یہ ایسی اور ویسی باتیں کرتے ہیں۔

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

(۳۱) ﴿لَوْ مَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [سورة الحجر: 7]

ترجمة: اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لاتے۔

تفسیر: مشرکین کے بے ہودہ اعتراضات میں ایک یہ بھی تھا کہ جب تم نبی و رسول ہو تو اپنی صداقت کے لیے فرشتوں سے ہماری ملاقات کرادو۔

قرآن حکیم نے اس کا یہ جواب دیا کہ فرشتے تو نافرمان قوموں پر عذاب ہی لے کر اُترتے ہیں تو پھر ایسی صورت میں تم خود اپنی ہلاکت کی دعوت دے رہے ہو، کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جس شخص کی صداقت و حقانیت ثابت ہو چکی ہو اس سے معجزات و کرامات کا طلب کرنا ضد و عناد کے سوا اور کچھ نہیں۔

(۳۲) ﴿وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ﴾ [سورة الحجر: 14]

ترجمة: اور اگر ان کے لیے ہم کوئی دروازہ آسمان میں کھول دیں پھر یہ دن بھر اس میں چڑھتے رہیں تب بھی وہ کہہ دیں گے کہ ہماری آنکھوں پر نظر بندی کر دی گئی ہے۔

تفسیر: کافروں کے ضد و عناد کی یہ انتہائی کیفیت ہے کہ نبی اگر اپنی صداقت کے لیے آسمان کا دروازہ کھلوا دیں اور یہ لوگ اس کے ذریعہ آسمان میں داخل بھی ہو جائیں تب بھی ان کا عناد و جہل اطاعت و پیروی کے لیے آمادہ نہ ہوگا، پھر آخری وقت کہہ دیں گے کہ ہم پر نظر بندی یا جادو کر دیا گیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جو لوگ اولیاء اللہ کے منکر ہیں، وہ بھی تقریباً ایسی ہی کیفیت میں مبتلا ہیں، اولیاء اللہ کی صداقت و کرامت کو شعبدہ بازی یا نظر بندی کہہ دیتے ہیں۔

نعوذ باللہ ان نکون من الجاھلین

(۳۳) ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾

[سورة الحجر: 21]

ترجمة: اور جو چیز بھی ہمارے یہاں ہے اس کے (خزانوں کے) خزانے ہیں اور ہم اسے ایک خاص مقدار کے مطابق زمین پر اتارا کرتے ہیں۔

تفسیر: اللہ کے ہاں کسی چیز کی بھی کمی نہیں اور نہ خرچ کرنے سے اس میں کمی واقع ہوتی ہے۔ ہر ہر نعمت کے خزائن ہی خزائن ہیں البتہ اس کا نازل کرنا اللہ کی حکمت و مصلحت کے مطابق ہوا کرتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ اسباب کی فراہمی میں مخلوقات سے صرف نظر کرنی چاہیے (اور ساری نظر خالق اسباب پر رکھنی چاہیے)۔

⑥ ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝﴾ [سورة الحجر: 29]

ترجمة: پھر جب میں اس (آدم) کو پورا بنا دوں اور اس میں اپنی کچھ روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔

تفسير: سیدنا آدم علیہ السلام کی تخلیق کا یہ تذکرہ ہے جس کی تفصیل قرآن حکیم میں جابجا آئی ہے۔آیت میں فرشتوں کو خطاب ہے کہ جب آدم کے جسم میں روح پھونک دی جائے گی، اس وقت کامل انسان بن جائیں گے۔ ایسے وقت فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ آدم علیہ السلام کے آگے تعظیماً جھک جاؤ۔ چنانچہ تمام فرشتے سجدہ میں گر پڑے۔

آیت میں ﴿نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ کے الفاظ ہیں یعنی آدم کے اندر اپنی روح ڈال دوں گا۔ اللہ کی روح سے اس کا حکم مراد ہے یا مخلوقات میں روح بھی ایک مستقل مخلوق ہے جو آدم کے جسم میں ڈال دی گئی۔ جس سے آدم علیہ السلام چلنے پھرنے، دیکھنے سننے، بولنے کے قابل ہو گئے۔

روح کے بارے میں اکثر اہل تحقیق نے کہا ہے کہ وہ ایک لطیف جسم ہے جو انسانی جسم سے وابستہ ہے تاہم روح کی اللہ نے اپنی ذات کی طرف اضافت کی ہے۔ رُوْحِيْ (اپنی روح) یہ عنوان انسان کی شرافت ومنزلت ظاہر کرنے کے لیے کیا گیا ہے یعنی وہ "خاص" ہے۔

سُلوك: اہل سلوک علماء نے ﴿نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسی نفخ روح کا شاید یہ نتیجہ تھا کہ انسان میں خلافت الٰہی کی استعداد پیدا ہوئی اور وہ زمین پر اللہ کا خلیفہ بن گیا۔

⑦ ﴿نَبِّئْ عِبَادِيْۤ اَنِّيْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۝﴾

[سورة الحجر: 49 تا 50]

ترجمة: میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں یقیناً بڑی مغفرت والا، رحمت والا ہوں۔ اور یہ بھی کہ میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے۔

تفسير: اوپر کی آیات میں متقین اور مجرمین کا الگ الگ انجام بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہر دو کو خبردار کیا گیا کہ اللہ کی صفت رحمت جہاں بے حد وحساب ہے، اسی طرح اس کی صفت غضب بھی بڑی شدید ہے۔ بندوں کو چاہیے کہ اللہ کی صفات رحمت سے مایوس نہ ہوں، اسی طرح اس کی صفت غضب سے بھی بے خوف نہ ہونا چاہیے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت کے مضمون سے تربیت واصلاح کرنے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔

مرید کی تربیت خوف اور رجاء (خوف و امید) دونوں سے کرنی چاہیے۔ کیونکہ صرف رجاء کی تعلیم سے تعطل یعنی بے عملی پیدا ہوتی ہے اور صرف خوف کی تعلیم سے مایوسی پیدا ہوجاتی ہے (اس یک طرفہ تعلیم سے تربیت ناقص ہوگی)۔

⑧ ﴿وَلَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ﴾ [سورة الحجر: 65]

ترجمة: اور تم میں کوئی بھی پلٹ کر نہ دیکھے۔

تفسیر: قوم لوط پر جب عذاب آنے کا وقت قریب آیا، اللہ تعالیٰ نے سیدنا لوط علیہ السلام کو ہدایت کی کہ مسلمانوں کو لے کر شہر سے باہر ہو جائیں اور قوم کو یہ بھی تنبیہ کر دیں کہ چلتے وقت پلٹ کر بھی نہ دیکھیں۔ چنانچہ صبح ہونے سے پہلے ظالموں پر ایسا عذاب ٹوٹ پڑا جو گزشتہ کسی قوم کو پیش نہ آیا ہو۔

پورے شہر کو ہواؤں کے دوش پر اٹھوا کر آسمان کی بلندی سے اوندھا پٹک دیا گیا ﴿فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا﴾ تفصیل کے لیے ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۱ رصفحہ ۲۶۲ مطالعہ کیجئے جو اس رسوا کن حادثے کی قرآنی وضاحت ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ غضب الٰہی کے آثار کو تفریحاً دیکھنا بھی برا ہے، اسی ضمن میں آثار کفر و شرک کا بھی یہی حکم ہوگا۔ (یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک کے سفر میں صحابہ کرام کو ہدایت دی تھی کہ درمیان راہ عذاب شدہ بستیوں پر جب تمہارا گزر ہو تو تیزی سے باہر نکل جاؤ، کہیں تمہیں بھی وہ مصیبت نہ لگ جائے جو انہیں پیش آئی تھی)۔

⑨ ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ۝﴾ [سورة الحجر: 75]

ترجمة: بے شک اس واقعہ میں کئی ایک نشانیاں ہیں اہل فراست کے لیے۔

تفسیر: قوم لوط کی بربادی کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد بطور نصیحت و عبرت مذکورہ بات کہی گئی ہے۔ وسم اور توسّم کے معنی دانائی و فراست اور فہم خاص کے ہیں۔ ''متوسمین'' ایسی عقل والوں کو کہا جاتا ہے جو بعض ظاہری علامات و قرآن دیکھ کر اپنی فراست سے کسی پوشیدہ بات کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی بھی واقعہ و حادثہ پر یونہی نہیں گزر جاتے ہیں بلکہ وہ واقعہ و حادثہ کے علل و اسباب پر غور کرتے ہیں اور پھر اس سے عبرت و نصیحت اخذ کر لیتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے: «اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ» (حدیث) (مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے) پھر آپ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔ بعض روایات میں بَتَوْفِيْقِ اللهِ کا اضافہ ہے یعنی وہ اللہ کی عطا کردہ توفیق سے دیکھتا ہے۔

بہرحال آیت کا یہ مطلب ہے کہ غور وفکر کرنے کے لیے قوم لوط کے قصے میں بہت ساری نشانیاں ہیں۔ یہ بستیاں عرب سے ملک شام جانے والے راستے پر اردن کے علاقہ میں موجود تھیں جس کے آثار آج بھی پائے جاتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے لکھا ہے کہ مذکورہ بالا آیت کشف حقائق کی اصل ہے کہ مومن کامل کو کبھی کبھی پوشیدہ حقائق کا علم ہوجاتا ہے (جس کو عام زبان میں کشف والہام کہا جاتا ہے)

⑩ ﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعۡنَا بِهِۦٓ أَزۡوَٰجٗا مِّنۡهُمۡ ﴾ [سورة الحجر: 88]

ترجمة: اپنی آنکھ اٹھا کر بھی ان چیزوں کو نہ دیکھئے جو ہم نے مختلف کافروں کو برتنے کے لیے دی ہیں۔

تفسیر: یعنی مشرکین، یہود ونصاریٰ اور دوسرے دشمنانِ خدا اور سول کو دنیا کی چندروزہ زندگی کا جو سامان دیا گیا ہے، اس کی طرف آپ نظر بھی نہ کریں کہ ان غافلوں کو یہ سامانِ زندگی کیوں دیا گیا ہے جس سے ان کی بغاوت وسرکشی میں مزید اضافہ ہورہا ہے۔ اگر یہ دولت وراحت ملتی تو یہ لوگ اچھی راہ میں خرچ کرتے، ایسا خیال ہرگز نہ کیا جائے۔

اللہ نے مسلمانوں کو قرآن عظیم جیسی عظیم نعمت عطا کی ہے، وہ دنیا کی ہر نعمت سے اعلیٰ وارفع نعمت ہے۔ روایات میں ہے کہ جس کو اللہ نے قرآن کی نعمت بخشی پھر اس نے کسی اور نعمت کو دیکھ کر حسرت کی تو اس نے قرآن عظیم کی قدر نہ جانی۔ (ترجمہ شیخ الہند سورۃ الحجر:۸۸)

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے لکھا ہے کہ آیت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے اغیار کی طرف نظر کرنا غیرت ایمانی کے خلاف ہے۔

⑪ ﴿ وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدۡرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ﴾ [سورة الحجر: 97]

ترجمة: اور واقعی ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ جو (آپ کے بارے میں) باتیں کررہے ہیں، اس سے آپ تنگ دل ہوجاتے ہیں سو آپ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہیے اور نماز پڑھنے والوں میں رہیے۔

تفسیر: بعض مشرکین جہاں آپ کا مذاق اڑایا کرتے تبھی وہاں قرآن حکیم کا بھی مذاق اڑایا کرتے تھے۔ جب کسی سورت کا نام سنتے تو ہنس کر آپس میں کہا کرتے: ''بقرۃ'' تو میں لے لوں گا، ''مائدۃ'' تجھ کو دے دوں گا اور ''عنکبوت'' محمد کے حوالہ کردوں گا۔ بعض اس کو شاعری کہتا اور دوسرا قصہ کہانی کہہ دیا کرتا تھا۔ نبی کریم ﷺ کو ان باتوں سے سخت تکلیف ہوا کرتی تھی اور آپ کا سینہ مبارک تنگ ہونے لگتا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی اور ان کی بے ہودہ باتوں پر توجہ نہ کرنے اور اللہ کی تسبیح وتحمید اور نمازوں میں مشغول رہنے کی ہدایت فرمائی۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے آیت سے یہ استنباط کیا کہ رنج وغم کا علاج توجہ الی اللہ اور ذکر الٰہی میں مشغول

ہوجاتا ہے، خود نبی کریم ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب آپ کو کوئی بات تشویش میں ڈال دیتی تو آپ نماز پڑھ کر سکون حاصل کرتے۔

⑫ ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝﴾ [سورة الحجر: 99]

ترجمة: اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں یہاں تک کے آپ کے پاس یقینی بات آجائے۔

تفسیر: یقینی بات سے مراد موت ہے یعنی اللہ کی عبادت پر قائم رہیئے یہاں تک کہ اسی حالت پر موت آجائے۔ عربی لغت کے بڑے بڑے عالموں نے یقین کے معنی موت ہی لکھا ہے۔ یہ اس لیے بھی کہ موت ایک اٹل اور غیر مشکوک یقینی بات ہے۔ لسان العرب، روح المعانی، ابن کثیر نے اسی معنی پر علماء لغت کا اتفاق نقل کیا ہے۔

خود قرآن حکیم کی ایک دوسری آیت میں یقین کے معنی موت ہی کے آئے ہیں۔

﴿وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ۝﴾ [سورة المدثر]

جہنم میں کافر چلّائیں گے دنیا کی زندگی میں ہم آخرت کے اس دن کا انکار کرتے رہے حتیٰ کہ ہمیں اسی حالت پر یقین (موت) آگئی۔

ایک حدیث میں سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ صحابی کی وفات پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا۔

(اَمَّا هُوَ فَقَدْ جاءَهُ الْيَقِيْنُ وَاِنِّیْ لَاَرْجُوْلَهُ الْخَيْرَ.)(صحیح بخاری)

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی موت کی خبر آچکی ہے۔ یہاں یقین کے معنی آپ نے موت ہی کے لئے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں ان جاہل صوفیوں کا رد ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سلوک میں کوئی مرتبہ ایسا بھی آتا ہے جس میں ولی کو احکام شریعت معاف ہوجاتے ہیں۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ایسا اعتقاد رکھنا کفر اور بے دینی و جہالت ہے۔ (بلکہ حماقت بھی، ان نادانوں نے یقین کے معنی اردو کا یقین (یقینی کیفیت سمجھا ہے).

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ولا حول ولا قوة الا باللہ

سُورَةُ النَّحْلِ

پَارَہ: 14

(1) ﴿وَ لَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ﴾ [سورة النحل: 6]

ترجمة: اور تمہارے لیے ان چوپاؤں (جانوروں) میں رونق بھی ہے جب کہ تم شام کے وقت گھر لاتے ہو اور صبح کے وقت (چرنے) چھوڑ دیتے ہو۔

تفسیر: مطلب یہ کہ جانوروں میں کوئی شان الوہیت نہیں ہے جیسا کہ بعض قدیم قوموں نے جانوروں میں تقدیس سمجھی ہے۔ حالانکہ یہ سب اللہ کی پیدا کردہ عاجز و بے بس مخلوق ہیں، انسانوں ہی کے نفع اور خدمت کے لیے پیدا کی گئیں۔ کوئی جانور ہل چلانے کے لئے، کوئی سواری کے لئے، کوئی بار برداری کے لئے، کسی کوئی جانور کی کھال سے جوتے، بکس اور دوسرے ضروری سامان، خیمے، ڈیرے، پوستین وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں انسانوں کے نفع اور خدمت کے لیے ہیں نہ کہ الٹے انسان کے مخدوم و دیوتا بننے کے قابل جیسا کہ ہندوستان کی مشرک قوموں نے سمجھا ہے۔

سُلوك: اہل تحقیق علماء نے لکھا ہے کہ زینت و جمال کا قصد کرنا جب کہ اس میں فخر وتکبر نہ ہو، جائز ہے البتہ مبتدی کو جس کی ابھی پوری تربیت نفس نہ ہوئی ہو، شان وشوکت اختیار کرنے سے پرہیز کرنا بہتر ہے۔

(2) ﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ﴾ [سورة النحل: 30]

ترجمة: جن لوگوں نے نیک کام کیے ان کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کی بھلائی اس سے کہیں بہتر ہے۔

تفسیر: دنیا کی اس بھلائی سے دنیا کی نعمتیں مراد ہیں۔ مثلاً مال و دولت، نیک نامی، فارغ البالی، اطمینان قلب و سکون وغیرہ نیک زندگی اختیار کرنے سے اس دنیا میں حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ آخرت کا اجرو ثواب اور وہاں کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ برتر و اعلیٰ ہیں۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض اہل طریق علماء نے لکھا ہے کہ دنیا کے حسنہ سے فتح باب مکاشفات، مشاہدات والطاف الٰہیہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حسنہ سے حیات طیبہ بھی مراد ہوسکتی ہے جس کا ذکر سورۃ النحل کی آیت ۹۷ میں آیا ہے، ایسی زندگی جس میں غم وفکر ہی نہ ہو۔

(3) ﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ ۙ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾

[سورة النحل: 32]

ترجمة: وہ متقین جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں۔اس حال میں کہ وہ پاک روحیں ہوتی ہیں،فرشتے کہتے جاتے ہیں: سلام علیکم،تم جنت میں داخل ہوجاؤ اپنے اعمال کے سبب سے جوتم کیا کرتے تھے۔

تفسیر: دنیا کی زندگی میں جن لوگوں نے آخر وقت تک تقویٰ اختیار کر رکھا تھا،وفات کے وقت روح لے جانے والے فرشتے آتے ہی پہلے انہیں سلام کریں گے اور خوشخبری دیں گے کہ تمہیں من چاہی زندگی ملنے والی ہے جہاں تمہاری ہر تمنا و ہر خواہش پوری ہوگی۔اس کے علاوہ یہ کہہ کر ان متقین کو اور زیادہ مسرور کیا جائے گا کہ یہ سب انعام واکرام تمہاری زندگی کے حسن عمل کا ثمرہ ہے جس کو تم نے اختیار کیا تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے: فرشتے دنیا کی زندگی میں نبیوں کے علاوہ دیگر انسانوں سے بھی کلام کرتے ہیں۔

اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طاعات کے بعض ثمرات دنیا میں بھی ملتے ہیں جیسا کہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو وقت تسلی و بشارت حاصل ہوتی ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا﴾ [سورة النحل: 41]

ترجمة: اور جن لوگوں نے اللہ کے واسطے ہجرت کی بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہو چکا تھا،ہم ان کو دنیا میں بھی بہت اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا صلہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

تفسیر: ہجرت (یعنی دین اسلام کی خاطر) اپنے وطن،دوستوں،عزیزوں،رشتہ داروں اور سب کو چھوڑنا ہر نفس پر بھاری ہی گزرتا ہے لیکن صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت پر یہ سب کچھ بخوشی قبول کر لیا اور ایک نہیں دو ② مرتبہ ہجرت کی ہیں۔

سُلوك: امام رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ شریعت میں وہی ہجرت قابل تعریف ہے جو دین الٰہی کی خاطر ہو ورنہ کسی بھی ضرورت کے تحت وطن چھوڑ دینا ہجرت نہیں،انتقال مکانی سمجھا جائے گا۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ گناہوں کو ترک کردینے والے کو بھی مہاجر کہا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں تارک منہیات کو مہاجر کہا گیا ہے۔

﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ [سورة النحل: 53]

ترجمة: اور تمہارے یہاں جو کچھ بھی نعمت ہے،وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے پھر جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی اللہ سے فریاد کرتے ہو۔

تفسیر: یہاں اس حقیقت کو دوہرایا جارہا ہے کہ جس قسم کی بھی نعمت انسان کو حاصل ہوتی ہے،اس کا سرچشمہ ذات الٰہی ہے اور انسان کو خود اس کا احساس ہے کہ ہر چیز اللہ ہی کی طرف سے آتی ہے۔چنانچہ جب

اس پر نعمت کے بجائے کوئی مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے تو وہ بے ساختہ اللہ ہی کو پکارنے لگتا ہے اور پھر جب اچھے دن آجاتے ہیں تو بھول بھال کر گزشتہ غفلتوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت سے ایک مسئلہ تصوف کی اصل نکلتی ہے جس کو 'مسئلہ مظہریت'' کہا جاتا ہے یعنی اگر چہ بعض نعمتیں اسباب ومخلوقات سے ملتی ہیں تاہم ساری نعمتوں کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کر کے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ نعمتوں کے سارے اسباب ووسائط اللہ ہی کے مظاہر ہیں۔

ملحوظه: فخر المفسرین امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ آیت کے تحت لکھا ہے کہ آج مؤرخہ یکم محرم ۲۰۲ھ ہجری کو صبح کے وقت جب میں اس آیت کی تفسیر لکھ رہا تھا، شہر میں اچانک ایک شدید زلزلہ آیا اور لوگ جہاں کہیں جس حالت میں تھے، دعا وآہ وزاری میں مشغول ہو گئے۔ لیکن جب زلزلہ ختم ہو گیا تو کچھ دیر بعد اس کو بھول بھال کر سابقہ غفلتوں میں پڑ گئے اور اپنے کاروبار حسب معمول جاری کر دیے۔

﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

⑥ ﴿وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِیْمٌ ﴾ [سورة النحل: 58]

ترجمة: اور جب ان مشرکین میں سے کسی کو بیٹی (پیدا ہونے) کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کا چہرہ مارے غم کے سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ (دل میں) گھٹتا ہی رہتا ہے۔

تفسير: اولاد کشی کی بدرسم زمانۂ قدیم میں مشترک اقوام میں بکثرت جاری رہی ہے۔ ملک عرب میں بھی اس کا رواج پڑ گیا تھا۔ اس ظالمانہ عمل کے مختلف اسباب رہے ہیں۔ عام طور پر دو محرکات مشترک ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ خاندان میں لڑکی کا وجود باعث عار سمجھا جاتا تھا کہ یہ جوان ہو کر غیروں کے گھر چلی جاتی ہے۔ دوسری وجہ لڑکی کی پرورش میں خرچ وغیرہ کا اندیشہ سنگدل باپ کو آمادۂ قتل کر دیتا تھا جیسا کہ موجودہ زمانے میں یورپ کی جدید تہذیب ''برتھ کنٹرول'' اس دختر کشی کا نقش اول ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اللہ کی کسی بھی نعمت کو معمولی یا حقیر سمجھنا عقل وفہم کی بدترین سوجھ بوجھ ہے۔

⑦ ﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [سورة النحل: 74]

ترجمة: سو تم اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو۔ بے شک اللہ ہی علم رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے۔

تفسير: زمانۂ قدیم میں مشرکین کا یہ عام اعتراض رہا ہے بلکہ آج بھی ان کی ذریت اس کو بار بار دوہرائے جا رہی ہے اور عجیب بات ہے کہ بعض نادان مسلمان بھی اس چکر میں پڑ گئے ہیں۔

وہ یہ کہ دنیا کے بادشاہوں اور بڑے لوگوں کی خدمت میں براہ راست کون عرض ومعروض کر سکتا ہے؟ نائبوں، وزیروں، عرضی گزاروں، درمیانی سفارشوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ بغیر ان واسطے وسیلوں کے رسائی ممکن

نہیں ہوتی تو پھر جو سب سلاطین کا سلطان اور شہنشاہ اعظم ہے (یعنی اللہ تعالیٰ) اس سے براہ راست اور بلا واسطہ تعلق پیدا کرنا کیونکر ممکن ہے؟ اس لیے ہم دیوی دیوتاؤں، مورت مورتیوں، نیک و خدا رسیدہ بندوں اور غیبی طاقتوں کو اس لیے وسیلہ بناتے ہیں کہ وہ ہماری حاجات کو حضور رب میں پیش کریں اور وہاں سے ہمارے مقاصد منظور کروالیں۔ اس کے باوجود ہم ان واسطے وسیلوں کو خدا یا شریک خدا نہیں سمجھتے، اللہ رب العالمین کے بارے میں ان نادانوں کا یہ خیال، طفلانہ خیال سے کم نہیں ہے۔

ان نادانوں نے اللہ رب العالمین کے معاملات کو دنیا کے بادشاہوں اور امیروں کے معاملات پر قیاس کیا ہے کہ جیسے بادشاہوں کے دربار میں بغیر واسطہ وسیلہ رسائی ممکن نہیں، ایسے ہی اللہ کے دربار میں بھی بغیر واسطہ رسائی ممکن نہیں ہے، لہٰذا دعاؤں میں غیبی روحوں کا واسطہ وسیلہ ضروری ہے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

ایسا سمجھنا دراصل ایک تجارتی فریب و دھوکہ ہے جو روایتی مشائخ نے کم علم مسلمانوں کو دیا ہے، یقیناً دنیا کے بادشاہوں کے پاس پہنچنے کے لیے واسطہ وسیلہ چاہیے کیونکہ یہ لوگ خود بندے ہیں، بندگی کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے احکام جاری کرنے یا کسی مدد کرنے کے لیے واسطے وسیلوں کی ضرورت ہے حتیٰ کہ یہ خود اپنی ضروریات کے لیے اپنے وزیروں، نائبوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ بغیر ان کے ان بادشاہوں کا اپنا ذاتی کام بھی پورا نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے یہاں واسطہ وسیلہ ضروری ہے۔ لیکن اللہ رب العالمین جو غنی مطلق، حاکم مطلق، قادر مطلق ہے، اس کو کسی وسیلہ کی کیا ضرورت ہے۔ وہ نہ کسی کا محتاج ہے اور نہ کسی مدد کی اس کو ضرورت ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے خود بارہا ارشاد فرمایا ہے: مجھ سے مانگو، میں تم کو دوں گا۔ جو لوگ مجھ سے مانگنے میں منہ موڑتے ہیں، وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ [سورة البقرة]

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو ذات رگ جان سے بھی قریب ہے، اس کو چھوڑ کر وفات یافتہ بندوں، غیبی روحوں اور واسطے وسیلوں کے چکر میں پکڑنا اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے سے کم نہیں ہے۔

مذکورہ آیت میں اسی مشرکانہ خیال پر کاری ضرب لگائی گئی ہے کہ اللہ بے نیاز و غنی کے لیے ایسی بودی مثالیں نہ دو، اس کو کسی واسطے وسیلے کی ضرورت نہیں۔

اللہ کو پکارنا خود بڑا وسیلہ ہے۔ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں اپنی رائے و قیاس سے کلام کرنا درست نہیں، اللہ کی ساری صفات توقیفی ہیں۔ (قیاس و گمان سے ماوراء)

﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾ [سورة النحل: 96]

ترجمة: جو کچھ تمہارے پاس ہے، ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے، باقی رہنے والا ہے۔

تفسیر: دنیا کا ساز وسامان پہلے تو ہے ہی کتنا، اور جتنا بھی ہے وہ آناً فاناً ختم بھی ہوجاتا ہے، دنیا کی بڑی بڑی قومیں، سلطنتیں، بادشاہوں کے کرّ وفر، تخت وتاج، خزائن وجواہر کے ذخیرے، چمک دمک آخر کہاں ہیں؟

اب نہ خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی

آخرت کا اجر وصلہ پہلے تو بے حد وحساب ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ دائم ولازوال بھی ہے۔ موجودہ دنیا کا سب سے بڑا المیہ آخرت فراموشی ہے جس نے انسان کو حقیقی وابدی زندگی سے یکسر غافل کردیا ہے۔ جو عقیدہ اساسی حیثیت رکھتا ہے، وہی خواب وخیال سمجھ لیا گیا ہے۔ والی اللہ المشتکیٰ۔

سلوک: حکیم الامت ؒ نے لکھا ہے کہ آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دی جانی چاہیے۔ (ترجیح کا یہ مطلب ہے کہ جب کسی معاملہ میں دنیا وآخرت میں ٹکراؤ ہوجائے کہ دنیا اختیار کرنے پر آخرت کا تقاضا فوت ہوجاتا ہو یا متاثر ہوجاتا ہو تو ایسے وقت دنیا کے معاملہ کو ترک کر کے آخرت کا تقاضہ پورا کردینا چاہیے، اسی کو ترجیح آخرت کہا جاتا ہے۔)

⑨ ﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَٰنٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴾ [سورۃ النحل: 99]

ترجمة: یقیناً شیطان کا قابو ان لوگوں پر ہرگز نہیں ہوتا جو اہل ایمان ہیں اور اللہ پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔

تفسیر: شیطان کو ہرگز یہ قوت حاصل نہیں کہ کسی صاحب ایمان سے بجبر واکراہ گناہ کرادے، جب تک کہ وہ خود شیطان کا دوست نہ بن جائے یا اس کے وسوسوں کو اپنے دل میں جگہ نہ دے دے، ایسی صورت میں شیطان کا غلبہ ہوجاتا ہے۔

سلوک: حکیم الامت ؒ نے ایک حدیث نبوی نقل کی ہے کہ مومن جب شیطان پر غالب آنا چاہے تو شیطان اس کے مقابلے میں ایک چیونٹی سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوتا ہے۔ (حدیث)

پھر لکھا ہے کہ اس کا مشاہدہ جب جی چاہے کرلیا جائے۔ اللہ اکبر

حکیم الامت ؒ کے اس دعویٰ پر سورۂ بنی اسرائیل کی آیات نمبر ۶۱ تا ۶۵ مطالعہ کی جائیں۔

⑩ ﴿وَلَٰكِن مَّن شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللَّهِ﴾ [سورۃ النحل: 106]

ترجمة: لیکن جس کا سینہ کفر سے مطمئن ہوجائے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہوگا۔

تفسیر: مذکورہ عبارت ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے۔ اس آیت کو آیت اکراہ کہا جاتا ہے (یعنی جبر وزیادتی کا حکم بیان کرنے والی آیت)

پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: جو کوئی ایمان لانے کے بعد کفر کرے مگر اس صورت میں کہ اس پر زبردستی کی

جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو (تو کوئی حرج نہیں) لیکن جس کا سینہ کفر سے مطمئن ہو تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہوگا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کو زبردستی اس حالت پر تیار کرلیا جائے کہ وہ کفر و شرک کا اقرار کرلے اور اسلام و ایمان کا انکار کردے تو ایسے شخص کو زبان سے کلمۂ کفر کہہ دینے کی اجازت ہے، ایسا کہنے پر وہ نہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے اور نہ اس پر کوئی گناہ ہوگا، البتہ یہ ضروری ہے کہ دل سے اس کفر و شرک کو برا سمجھے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ کسی بھی وسوسہ میں چونکہ دل کا ارادہ شامل نہیں ہوتا، وسوسہ آنے پر کوئی گناہ نہیں (البتہ وسوسہ لانا اور اس میں مشغول ہوجانا برا ہے)۔

⑪ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ﴾ [سورة النحل: 107]

ترجمة: یہ سب اس سبب سے ہوا کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا تھا۔

تفسیر: یعنی ایمان لانے کے بعد جو اسلام سے پھر جائے اور اس کا یہ پھر جانا مال و دولت، عزت و جاہ و دیگر ذاتی اغراض کے تحت تھا تو ایسے لوگوں پر دنیا و آخرت میں اللہ کا غضب اور دردناک عذاب ہے۔

آیت میں ﴿اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾ لفظ ہے جس کے معنی و مفہوم میں عزم و ارادہ شامل ہوا کرتا ہے، لہٰذا مطلب یہ ہوگا کہ ان لوگوں نے عمداً و شعوراً دنیا کو آخرت پر ترجیح و اہمیت دی اور آخرت کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ دنیا کی وہ محبت بری ہے جو دنیا کو آخرت پر ترجیح و فضیلت دے دے۔ رہی وہ محبت جو طبعی و فطری ہے، وہ محبت بری نہیں، تقاضۂ بشریت کے مطابق ہے۔ (ترجیح یا فضیلت دینے کا یہ مطلب ہوا کرتا ہے کہ جب کسی معاملہ میں دنیا اور آخرت کا ٹکراؤ ہوجائے اور دنیا اختیار کرنے سے آخرت کا نقصان و خسارہ ہوجاتا ہو تو ایسے وقت دنیا کا تقاضہ ترک کر کے آخرت کو محفوظ کرلینا چاہیے، ایسے اختیار کو ترجیح آخرت کہا جاتا ہے۔ ﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

⑫ ﴿فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ﴾ [سورة النحل: 112]

ترجمة: سو ان لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کی بے قدری کی۔

تفسیر: پوری آیت کا یہ ترجمہ ہے: اور اللہ ایک بستی والوں کی مثال بیان کرتا ہے کہ وہ امن و اطمینان میں رہا کرتے تھے، ان کے کھانے پینے کا سامان ہر جانب سے بکثرت آیا کرتا تھا لیکن ان لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی، اس پر اللہ نے بھوک و پیاس اور خوف کا عذاب ان پر مسلط کردیا۔ (یعنی بستی پر قحط سالی اور خوف و اندیشہ کا ماحول پیدا کردیا) یہ سب کچھ ان کے برے کرتوتوں کا انجام تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں ان زاہدان خشک کی مذمت ہے جو اللہ کی نعمتوں کو حقیر و بے

پرواہ کئے ہوئے ہیں اوراپنے آپ کوتارک لذات سمجھ بیٹھے ہیں اوراللہ کا یہ ارشادنہیں سنتے ﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ جوبھی نعمت تم کونصیب ہے ﴿فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ﴾ اللہ نے جودیاہے، اس میں سے کھاؤ، پیو۔ وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

⑬ ﴿وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۚ وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ [سورة النحل: 126]

ترجمة: اگرتم بدلہ لیناچاہوتوانہیں اتناہی دکھ پہنچاؤ جتنادکھ انہوں نےتم کوپہنچایاہے۔اوراگرصبرکروتویہ صبرکرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھاہے۔

تفسیر: دعوت وتبلیغ کی راہ ہویااورکوئی موقعہ ہواگرتم کوتکلیف پہنچائی گئی ہےاورپھرتم کوانتقام لینے کی قدرت و طاقت حاصل ہوگئی توایسے وقت برابرکابدلہ لیاجاسکتاہےلیکن معاملہ درگزرکرکے صبرکیاجائے تویہ صورت بہتر ہی بہترہے۔شریعت اسلامی میں فطری وطبعی تقاضوں کاپاس ولحاظ رکھاگیاہے،انتقام لینے کاوقت بہت نازک ہواکرتاہے۔مظلوم جب قدرت پالیتاہےتوجوش انتقام میں عموماً آگے بڑھ جاتا ہے،اس طرح خودظالموں کی صفوں میں شامل ہوجاتاہے۔قرآن حکیم نےاس اشتعال کےوقت اپنے جذبات کوقابومیں رکھنےکی بارہاتاکیدکی ہےاورانتقام کوحدودمیں رکھنےکاخاص حکم دیاہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نےلکھاہےکہ شریعت نےعام فطرت بشری کالحاظ کرکےانتقام لیناجائزقراردیا ہے۔اس تقاضہ کوسلوک کی اصطلاح میں ''مقام رخصت'' کہاجاتاہے۔(یعنی اجازت)

لیکن ایسےوقت صبرکرکےعفوودرگزرکرنا''مقام عزیمت'' کہلاتاہے۔(یعنی بلندظرفی،حوصلہ مندی)

فقہاءکرام نےآیت سےیہ اخذکیاہےکہ قصاص لینےسےبڑھ کرمعاف ودرگزرکرناافضل ہے۔(جصّاص)

⑭ ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ [سورة النحل: 127]

ترجمة: اورآپ صبرکردیتےرہیےاورآپ کاصبرکرناتوبس اللہ ہی کی توفیق سےہے۔

تفسیر: کسی بھی زیادتی کومعاف ودرگزرکرنااونچےظرف کی علامت ہے۔طاقت وقدرت نہ ہونےپرتوآدمی درگزرکردیتاہے،یہ کوئی خوبی یاکمال کی بات نہیں۔ایساکرنےپرانسان خودمجبورہےلیکن قدرت و طاقت ہونےکےباوجودچشم پوشی کرلینااونچےلوگوں کاکام ہواکرتاہے۔

سارےانبیاءکرام کی یہ مشترکہ سیرت رہی ہےکہ انہوں نےذاتی اغراض کےلیےکبھی انتقام نہیں لیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نےلکھاہےکہ توفیق الٰہی کےبغیرکوئی شخص نہ صبرکرسکتاہےاورنہ کوئی طاعت،آیت میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

ملحوظہ: قرآن حکیم میں ستر (70) سے زائد مقامات پر صبر کی تعلیم کا تذکرہ ملتا ہے اور اس کی فضیلت کا اعلان آیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے صبر کو نصف ایمان قرار دیا ہے۔ (حدیث)

صبر کے لفظی معنی تنگی اور ناگواری کی حالت میں اپنے آپ کو روکے رکھنے کے ہیں۔ اور شریعت اسلامی میں اس کی تعریف کی گئی کہ نفس کو عقل پر غالب نہ آنے دیا جائے اور شریعت کے خلاف عمل نہ کیا جائے۔

صوفیاء کرام نے صبر کی کئی اقسام لکھی ہیں:

1. اگر بطن و شرم گاہ کی ناجائز خواہشات کے مقابلہ میں صبر کیا جائے تو اس کا نام "عفت" قرار پاتا ہے۔
2. اگر دولت و ثروت کی فراوانی میں صبر کیا جائے یعنی بخل و تکبر سے پرہیز کیا جائے تو اس کا نام "ضبط نفس" ہوتا ہے۔
3. اگر میدان جنگ اور اسی قسم کے خطرناک حالات پر صبر کیا جائے تو اس کا نام "شجاعت" ہوگا۔
4. اگر غیظ و غضب کے مواقع پر صبر کیا جائے تو اس کا نام "حلم" ہے۔
5. اگر حوادث زمانہ پر صبر کیا جائے تو اس کا نام "وسعت صدر" (کشادہ دلی، حوصلہ مندی) ہوگا۔
6. اگر دوسروں کے پوشیدہ عیوب پر صبر کیا جائے یعنی ان کو ظاہر نہ کیا جائے تو اس کا نام "شرافت" قرار پاتا ہے۔
7. اگر بقدر ضرورت معیشت پر صبر کیا جائے (یعنی جو مل جائے اس پر راضی رہنا اور افسوس نہ کرنا) اس کو "قناعت" کہا جاتا ہے۔
8. اگر لذائذ اور عیش پسندی کے مقابلے میں صبر ہو تو اس کا نام "زہد" ہوگا۔
9. اگر گناہ و معصیت و نافرمانی پر صبر کیا جائے (یعنی احتیاط کی جائے) تو اس کا نام "تقویٰ" ہوگا۔
10. اگر مصیبتوں پر صبر کیا جائے تو اس کا نام "صبر" ہی ہے۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

(ہدایت کے چراغ جلد ا رصفحہ ۳۵۴)

15. ﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝﴾ [سورة النحل: 128]

ترجمة: بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کیے رہتے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ جو حسن سلوک کرتے ہیں۔

تفسیر: اللہ کی معیت تو ہر مخلوق کے ساتھ ہے، کوئی مخلوق اس کے علم و نظر سے غائب نہیں لیکن تقویٰ اختیار کرنے والوں اور حسن سلوک کرنے والوں کے ساتھ اس کی معیت کا اعلان دراصل اللہ کی خصوصی تائید و

نصرت کا اعلان ہے۔ یہ آیت اس بارے میں ان لوگوں کے لیے ایک عظیم سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ محققین عارفین نے مذکورہ آیت سے فن سلوک کا خلاصہ یہی دو اخلاق بیان کیے ہیں۔ ایک تقویٰ، دوسرے مخلوق الٰہی کے ساتھ حسن سلوک وشفقت۔

بعض صوفیاء نے اس بات کو اس طرح ادا کیا ہے: حق تعالیٰ کے ساتھ ''معاملۂ صدق'' اور خلق کے ساتھ ''معاملۂ خُلق'' یہی دو ② باتیں طریقت کی معراج ہے۔

(قَالَ بَعضُ المَشَائِخَ كَمَالُ الطَّرِيْقِ صِدْقٌ مَعَ الحَقِ وَخُلُقٌ مَعَ الخَلْقِ.)

(تفسیر کبیر)

سُورَةُ الإسْرَاءِ

پَارَہ: 15

(1) ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی﴾

[سورة بنی اسرائیل: 1]

ترجمة: وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندے محمد کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک لے گیا جس کے اطراف ہم نے برکتیں نازل کی ہیں۔

تفسیر: یعنی اللہ کی ذات پاک ہمارے وہم وخیال سے پاک ومنزہ ہے کہ وہ اپنے رسول و نبی کو رات کے مختصر حصے میں مکۃ المکرمۃ سے بیت المقدس ملک شام تک کیونکر لے گیا اور پھر آسمانوں کی سیر کروائی اور صبح ہونے سے پہلے مسجد الحرام، مکۃ المکرمۃ لے آیا۔

یہ عجیب وغریب بات ہماری عقلیں ناممکن ومحال سمجھتی ہیں لیکن اللہ کی قدرت ومشیّت میں یہ کوئی ادنیٰ مشکل کام نہ تھا، کیوں کہ وہ ہر چیز پر قادر اور غالب ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ بات اخذ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو "اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ" صفت عبد سے موسوم کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ عبودیت اوصاف رسالت میں اشرف ترین وصف ہے۔ علاوہ ازیں اس میں تنبیہ بھی ہے کہ آپ کے حق میں کوئی غلو نہ کیا جائے (باوجود سبع سمٰوات سے بلند ہونے کے آپ "عبد" ہی سے موسوم کیے گئے، رب یا شریک رب نہیں)۔

ملحوظه: قرآن حکیم میں تمام انبیاء کرام کا عبداللہ ورسولہ کی صفت سے تعارف کروایا گیا ہے اور خود نبی کریم ﷺ کی تصدیق میں عبداللہ کو رسول اللہ پر مقدم کیا گیا ہے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

ایک موقع پر آپ ﷺ نے ایک صحابی کو جو کسی عیسائی سے الجھ رہے تھے، یہ کہہ کر خاموش کیا: مجھ کو اس طرح عیسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو، میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔

عبدیت کاملہ انسانیت کی آخری معراج ہوا کرتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ عبدیت کاملہ، معرفت کاملہ کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ کو کمالِ معرفت بھی حاصل تھی۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت ﴿لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ طیّ الارض (سرعت سیر) کا امکان ثابت کیا ہے (کہ آناً فاناً منزل مقصود تک پہنچ جانا جیسا کہ بعض اکابر صوفیاء سے منقول ہے)

﴿وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ﴾ [سورة بنی اسرائیل: 7]

ترجمۃ: اور تاکہ تمہاری عبادت گاہوں میں گھس پڑیں جیسا کہ اس میں (اگلے لوگ) پہلی بار گھس آئے تھے۔

تفسیر: آیت میں قوم موسیٰ (بنی اسرائیل) کے ان دو حادثات کا ذکر ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے چار سو سال بعد شہر بابل کے مشہور زمانہ ظالم بادشاہ بخت نصر مجوسی (المتوفی ۵۶۱ھ قبل مسیح) نے ملک شام پر حملہ کر کے بیت المقدس کو تباہ و تاراج کیا تھا اور ہزاروں یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا، سینکڑوں مرد و خواتین کو قیدی بنا کر اور بیت المقدس کے زر و جواہرات، سونا چاندی، سینکڑوں گاڑیوں میں بھی بھر بھر کر اپنے شہر بابل لے گیا۔

دوسرا حادثہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھا لیے جانے کے چالیس سال بعد پیش آیا تھا۔ روم کے بادشاہ قیصر نے بیت المقدس پر حملہ کیا اور شہر اور مسجد الاقصیٰ کو تباہ کیا اور شہر اور اہل شہر کی وہی گت بنائی جو سات سو سال پہلے بابل کے ظالم بادشاہ بخت نصر نے کی تھی، وہ بھی ہزاروں مرد و خواتین کو قیدی بنا کر اپنے ملک روم لے آیا اور بیت المقدس کے قیمتی ذخائر کو ہزاروں گاڑیوں پر لاد کر روم میں اپنے کنیسۃ الذہب میں دفن کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قیمتی ذخیرے، ہیرے جواہرات، سونا چاندی جو سینکڑوں من وزنی تھا، آج تک اسی کنیسہ میں مدفون ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ قیامت کے قریب جب امام مہدی آئیں گے تو وہ اس ذخیرے کو نکال کر پھر بیت المقدس میں جمع کر دیں گے۔ (حدیث بطولہ رواہ القرطبی فی تفسیرہ)

حکیم الامت رحمہ اللہ نے تفسیر بیان القرآن میں لکھا ہے کہ یہ دو (۲) حادثے جن کا ذکر مذکورہ آیت میں آیا ہے، دو شریعتوں کی مخالفت کرنے پر پیش آئے ہیں۔ پہلا حادثہ شریعت موسوی کی مخالفت کرنے پر اور دوسرا شریعت کی مخالفت پر۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے مذکورہ آیت سے یہ استنباط کیا کہ شرور و فتن میں تکوینی (دنیاوی) طور پر مصلحتیں ہوا کرتی ہیں۔ (سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۱ بھی اس حقیقت کو بیان کرتی ہے)

﴿وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ﴾ [سورة بنی اسرائیل: 11]

ترجمۃ: اور انسان برائی کی درخواست بھی (اسی تقاضہ سے) کرتا ہے جس طرح بھلائی کی درخواست کرتا ہے اور انسان بہت جلد باز ہے۔

تفسیر: یعنی اپنے انجام پر غور نہیں کرتا۔ جن چیزوں کا لازمی نتیجہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہونا ہے، ان کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ بس لذات اور لطف ہی مطلوب ہوتے ہیں، حلال و حرام کا ذرا بھی خیال نہیں کرتا، جدھر قدم اٹھا چل پڑا، منہ کھولا بس بولنے لگا۔

انسان کی یہ جلد بازی خود اس کو نقصان پہنچانے والی ہوا کرتی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے میں استعجال نہ کرنا چاہیے (یعنی یہ نہ کہے کہ بار ہا دعا کی، قبول نہ ہوئی) اسی طرح بعض مدعیان تصوف مسلمانوں پر بددعا کر دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کی دعا قبول ہوگئی، گویا خدائی ان کے قبضہ میں ہے۔

لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ

﴿وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا﴾ [سورة بنی اسرائیل: 16]

ترجمة: اور جب ہم ارادہ کر لیتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کر دیں تو اس بستی کے خوشحال لوگوں کو حکم (اختیار) دیتے ہیں پھر وہ لوگ وہاں شرارت مچاتے ہیں تو ان پر حجت پوری ہو جاتی ہے، اس بستی کو تباہ و غارت کر دیتے ہیں۔

تَفسِیر: آیت میں کسی قوم کو ہلاک کرنے کا الٰہی ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ صرف جرائم و نافرمانی پر کسی بھی قوم کو ہلاک نہیں کیا جاتا بلکہ انہیں پہلے فہمائش کی جاتی ہے اور رسول یا ان کے نائبوں کے ذریعہ اطاعت و فرمانبرداری کے احکام پہنچائے جاتے ہیں۔ خصوصاً قوم کے امراء و رہنماؤں کو جن کی بات قوم میں مانی اور سنی جاتی ہے، آگاہ کیا جاتا ہے لیکن جب امراء و خوشحال لوگ خدائی احکام اور اس کے پیغام کو رد کر دیتے ہیں اور غفلت و بھول میں پڑ جاتے ہیں تب تو ساری قوم بھی بے خبر ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت ان لوگوں پر اللہ کی حجت (مہلت) پوری ہو جاتی ہے اور انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ قدیم زمانے کی قوموں میں اللہ کا یہی قانون نافذ تھا۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اسی طرح جب کسی نافرمان مرید کا قلب خراب ہو جاتا ہے تو اس پر نفس و شیطان کے لشکر مسلط ہو جاتے ہیں پھر وہ مرید لذات و شہوات کی اتباع کر کے برباد ہو جاتا ہے۔

﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴾

[سورة بنی اسرائیل: 20]

ترجمة: ہم ہر ایک کی امداد کرتے ہیں ان میں سے بھی اور ان میں سے بھی آپ کے رب کی بخشش سے۔ اور آپ کے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں ہے۔

تَفسِیر: آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا عام قانون بیان کیا ہے کہ نیک و بد، مؤمن و کافر ہر ایک کو اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ غیب سے مدد دیتے رہتے ہیں، اللہ کی عام عطا سب پر برابر ہے۔ آگ پانی، ہوا، روشنی، رات

دن، سردی گرمی وغیرہ سے جہاں نیک وفرمانبردار انسان مستفید ہوں گے۔اس تقسیم پر اللہ نے کوئی بندش نہیں لگائی ہے۔البتہ آخرت کی لازوال نعمتیں صرف اور صرف اہل ایمان ہی کو ملیں گی۔

سُلوك: حکیم الامت ؒ نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ اگر کسی پر دنیاوی نعمتوں کی فروانی ہو تو یہ حالت اللہ کے یہاں اس انسان کے مقبول ومحبوب ہونے کی علامت نہیں ہے۔

بعض مدعیان طریقت نہایت فخر سے کہتے ہیں کہ جو شخص ہمارے سلسلے میں آجاتا ہے تو اس کو مال وعہدہ کی ترقی ہوجاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سراسر دھوکہ اور زعم ہے، اللہ کے ہاں مقبولیت کی علامت ایمان اور اعمال صالحہ کی کثرت ہے۔

حکیم الامت ؒ نے آیت سے یہ بھی اخذ کیا ہے کہ بعض بزرگوں کی یہی عادت رہی ہے کہ وہ نفع رسانی میں اہل ایمان کی تخصیص نہیں کرتے، بلا لحاظ مذہب وملت خیر خواہی کرتے رہتے ہیں، ان کی یہ فراخ دلی اخلاق الٰہیہ سے مستفاد ہے۔

⑮ ﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ [سورة بنی اسرائيل: 24]

ترجمة: اور یہ کہتے رہنا: اے میرے رب! ان (والدین) پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھ کو بچپن میں پالا ہے۔

تفسیر: ماں باپ کی خدمت کرتے رہنا شریعت اسلامی کا ایک اہم فریضہ ہے، تہذیب فرنگی کی طرح نہیں کہ جب لڑکا بالغ ہوجائے تو اپنی بیوی کے ساتھ اپنا الگ گھر بار کرلے اور بوڑھے وضرورت مند ماں باپ کو بیت المعذورین میں داخل کردے اور خود عیش کرتا پھرے۔

دنیا کی بعض مہذب قومیں ایسی بھی گزری ہیں جن کے یہاں دستور تھا کہ جب والدین بوڑھے ہوکر معذور ہوجائیں اور قوم پر بوجھ سا بن جائیں تو ان کی سعادت مند اولاد انہیں دور دراز علاقہ کے کسی سنسان جنگل میں چھوڑ آتی تھی کہ وہیں پڑے پڑے مرجائیں یا جنگل کے کسی درندے کی غذا بن جائیں، عید یا کسی خوشی کے موقع پر ان کی خبر لے لیا کرتے تھے۔

﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾

سُلوك: حکیم الامت ؒ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اپنے شیخ واستاذ کے لیے بھی دعا کرنا مستحب ہے (جیسا کہ شیخ اپنے مرید کے لیے دعا کرتا ہے)

⑯ ﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ [سورة بنی اسرائيل: 29]

ترجمة: اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لے اور نہ اس کو بالکل ہی کھول دے ورنہ تو ملامت زدہ تہی دست

ہو کر بیٹھ جائے گا۔

تفسیر: بے تحاشا خرچ کرنے کا لازمی نتیجہ رنج وافسوس ہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسلام نے خرچ کے بارے میں اعتدال واقتصاد اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ نہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کیا جائے اور نہ بالکل ہی کنجوسی اختیار کی جائے۔ محل وموقع اور ضرورت پر خرچ کرنا اعتدال کی حد میں آجاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جس نے میانہ روی اختیار کی، وہ کبھی محتاج نہ ہوا۔ (موضح القرآن)

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں اشارہ ہے کہ مشائخ کو اپنے مریدوں کے ساتھ کس طرح رہنا چاہیے یعنی حقائق ومعارف ظاہر کرنے میں بخل نہ کرنا چاہیے اور نہ ایسے اسرار بیان کرنے چاہئیں جن کے وہ متحمل نہ ہوں۔

⑧ ﴿فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ﴾ [سورة بنی اسرائيل: 33]

ترجمة: سو ہم نے اس مقتول کے وارث کو اختیار دیا ہے، لہٰذا اس کے قتل کے بارے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔

تفسیر: شریعت اسلامی میں کسی مسلمان کا قتل تین اسباب کے تحت جائز ہوتا ہے۔

① یہ کہ وہ کسی کو قتل کردے (بلا وجہ) ② یا اپنا دین اسلام بدل کر دوسرا دین اختیار کرلے۔ ③ یا شادی شدہ انسان زنا کرے۔ (بخاری ومسلم)

ان اسباب کے علاوہ کسی نے کسی کو بے گناہ قتل کردیا تو شریعت اسلامی نے مقتول کے وارثوں کو اختیار دیا ہے کہ وہ حکومت سے رجوع کرکے خون کا بدلہ لیں، لیکن بدلہ لیتے وقت حد سے تجاوز نہ کریں۔ مثلاً قاتل کی جگہ غیر قاتل کو سزا دلوادیں یا قاتل کے ساتھ دوسرے بے گناہوں کو بھی شامل کرلیں یا قاتل کے ناک، آنکھ، کان، ہاتھ پیر کٹوادیں یہ سب حد سے تجاوز کرنے کی مثالیں ہیں۔ بس خون کا بدلہ خون لے لیں یا مال طے کرلیں یا معاف کردیں۔

شریعت اسلامی کی اس معتدل ومتوازن تعلیم سے دور جدید کی مہذب فرنگی حکومتیں خالی ہیں۔ ان کا یہ عمل ہے کہ ایک آدمی یا چند آدمی مارے گئے ہوں تو اس کے معاوضہ میں پوری پوری آبادیوں کو آگ لگا کر پھونک دیا جاتا ہے یا بم کے گولے برسا کر ہلاک کردیا جاتا ہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں ضبط نفس کی تعلیم ہے جب کہ اس کو قدرت بھی ہو۔ (علم تصوف میں اس پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے)

⑨ ﴿وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [سورة بنی اسرائيل: 53]

ترجمة: اور آپ میرے بندوں سے کہہ دیں کہ ایسی بات کیا کریں جو بہتر ہو۔

تفسیر: مخالفوں کی ضد وہٹ دھرمی وگستاخی سے تنگ دل ہو کر عام طور پر سختی اور زیادتی اختیار کی جاتی ہے،

مسلمانوں کو نصیحت کی جارہی ہے کہ ایسے وقت دل آزاری واشتعال انگیزی کا پہلو اختیار نہ کیا جائے کیونکہ اس طرز سے بجائے فائدہ کے نقصان زیادہ ہی ہوتا ہے جب کہ مقصود فائدہ پہنچانا ہی تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت میں اس بات کی تعلیم ہے کہ بحث ومناظرہ، افہام وتفہیم میں نرمی واخلاق اختیار کیا جائے۔ (اور یہ تحمل وضبط نفس کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے)

⑩ ﴿وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا﴾ [سورة بنی اسرائیل: 74]

ترجمة: اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم رکھا نہ ہوتا تو آپ ان کی طرف کچھ مائل ہونے لگتے۔

تفسیر: آیت کا پس منظر یہ ہے کہ قبیلہ بنوثقیف کے چند سرداروں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ اگر آپ اسلام کے فلاں فلاں احکام میں ہمارے لیے تخفیف کر دیں تو ہم ابھی اسلام قبول کر لیتے ہیں اور آپ کی تائید ونصرت میں پوری طرح شریک ہو جائیں گے۔

آپ کو ان کے ایمان لانے کی طمع سے دل میں کچھ ایسا وسوسہ پیدا ہو ہی چلا تھا کہ ان کی بات مان لی جائے، اسی وقت وحی نازل ہوئی اور ان کے مطالبہ کے خلاف فیصلہ جاری ہوا۔ آپ نے ان کے مطالبات کو رد فرما دیا۔

آیت میں لفظ رکون آیا ہے یعنی جھکاؤ، قلیل توجہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس خفیف سے میلان سے بھی آپ ﷺ کو بچالیا اور اسلام کی بالادستی کو قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اپنے نبی کے لیے عتاب نہیں بلکہ اظہار محبوبیت ہے یعنی رسول اللہ ﷺ اللہ کے ایسے محبوب بندے ہیں کہ رکون قلیل سے بھی آپ کو بچالیا گیا۔

سُلوك: آیت سے معلوم ہوتا ہے رسول اللہ ﷺ میں تقویٰ کی فطری قوت کس قدر مضبوط اور ناقابل تزلزل تھی۔ (ﷺ)

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ وساوس کے دفعیہ کے لیے خود نبی کی قوت قدسیہ کافی نہیں تو دوسروں کو اپنے تقویٰ وطہارت وتقدس پر ناز کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ (ڈرتے رہنا چاہیے)

⑪ ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [سورة بنی اسرائیل: 82]

ترجمة: اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے حق میں شفاء ورحمت ہیں۔

تفسیر: یعنی جس طرح حق آنے پر باطل مغلوب ہو جاتا ہے، اسی طرح قرآن کی آیات جو بتدریج نازل ہوتی ہیں، روحانی بیماریاں دور ہوتی رہتی ہیں، دلوں سے باطل عقائد، برے اخلاق، شکوک وشبہات دور ہوتے ہیں پھر اس صفائی کے بعد اچھے اخلاق اور نیک اعمال جاری ہونے لگتے ہیں۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت سے علم تصوف کی دو اہم اصطلاح کی تائید ہوتی ہے۔

تخلیه، تحلیه۔لفظ شِفَاءٌ سے تخلیہ اور لفظ رَحْمَۃٌ سے تحْلیہ کی طرف اشارہ نکلتا ہے۔

تخلیہ: باطل عقائداور برے اعمال و برے اخلاق سے نجات کا نام ہے جس کو آیت میں شفاء کہا گیا ہے۔

تحلیہ: اچھے اعمال اور تقویٰ وطہارت کا نام ہے جس کو آیت میں رحمۃ کہا گیا ہے۔(روح المعانی)

اس طرح قرآن حکیم کی آیات انسانوں کو باطل عقائداور برے اعمال سے بچا کر اچھے عقائداور نیک اعمال و نیک اخلاق کی تعلیم دیتی ہیں۔

⑫ ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ [سورة بنى اسرائيل: 85]

ترجمة: اورآپ سے یہ لوگ روح کی بابت پوچھتے ہیں۔آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کا امر ہے اور تم لوگوں کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

تَفسِیر: روح کے بارے میں سوال کرنے والے مدینہ منورہ کے چند یہودی تھے۔انہوں نے نبی کریم ﷺ کا امتحان لینے کے لیے یہ سوال کیا تھا،حقیقت یہ ہے کہ جن باتوں کے دریافت کرنے کی انہیں ضرورت تھی،اس کو تو ان لوگوں نے پس پشت ڈال دیا،غیر ضروری باتیں دریافت کیا کرتے تھے،محض تفریح مقصود ہوا کرتی تھی۔بہر حال ان کے سوال پر وحی نازل ہوئی اور انہیں یہ جواب دیا گیا کہ روح بھی دیگر مخلوقات کی طرح ایک لطیف مخلوق ہے۔(جب وہ بدن میں داخل ہوتی ہے تو انسان چلنے پھرنے بولنے دیکھنے لگتا ہے اور جب وہ نکل جاتی ہے تو یہی چلتا پھرتا جسم مردہ ہو جاتا ہے)

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ اسرار غیر ضروریہ کی طلب وجستجو مذموم ہے۔(جیسا کہ بعض کم علم سلسلوں میں اس کا چرچا رہا ہے)

ملحوظه: روح کی حقیقت کو اس سے زیادہ نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ بیان کیا جا سکتا ہے۔یہ اس لیے بھی کہ روح عالم غیب کی چیز ہے جس کا عالم دنیا میں ادراک نہیں کیا جا سکتا۔

تاہم اس بارے میں متقدمین علماء نے تفصیلی کلام کیا ہے اور اس سلسلے میں کتابیں بھی لکھی گئیں ہیں۔چونکہ یہ مسئلہ اہل علم سے متعلق ہے،اہل علم ہی کے لیے خلاصۂ کلام کے طور پر اس کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

اہل علم کے اس میں دو ② فریق ہیں:

ایک ① فریق کہتا ہے کہ روح امور رب میں سے ایک امر ہے جو غیر محسوس اور عقل وادارک سے بالاتر ہے، اس کی حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہے،اس کی حقیقت سوائے اللہ علیم وخبیر کے کسی کو معلوم نہیں۔

حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور صوفیاء میں جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں یہ قول نقل کر کے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ اس اخفاء میں یہ راز ہے کہ

بندوں کو اپنا عجز وقصور ظاہر ہو جائے کہ جب وہ اپنی حقیقت کے ادراک سے عاجز و قاصر ہیں تو اللہ جل شانہ کی حقیقت کو کہاں معلوم کر سکتے ہیں۔

دوسرا② فریق کہتا ہے کہ اگرچہ روح کی پوری حقیقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے مگر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی نصوص سے اتنا ضرور چلتا ہے کہ روح ایک جسم لطیف ہے جو بدن میں اس طرح سرایت کیے ہوئے ہے جس طرح کچی لکڑی میں پانی، گلاب کی پتیوں میں عرق گلاب، زیتون کے پھلوں میں روغن زیتون، یا جیسے آگ کوئلے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

یہ تفصیل اس لیے کرنی پڑی کہ آیات اور حدیث میں روح کے لیے توفّی، قبض، خروج، دخول، اخراج، اخذ، تناول، امساک، ارسال، رجوع وغیرہ جیسے الفاظ بکثرت استعمال کیے گئے ہیں۔

اور یہ تمام صفات بدن اور جسم کی ہیں، لہٰذا روح کا بدن وجسم ہونا ثابت ہوتا ہے خواہ لطیف وخفیف سہی۔ اس کے علاوہ عالم برزخ میں روح کا چلنا پھرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا بھی منقول ہے۔ یہ بھی جسم وبدن ہی کی صفات ہیں۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ تحقیق کتاب اللہ وسنت رسول اللہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔
(شرح العقیدہ: جلد ۲ رصفحہ ۲۶)

دوسرا② مسئلہ: حدیث روح کے بارے میں ہے کہ کیا روح بھی دیگر مخلوقات کی طرح حادث اور فانی ہے؟

اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے باجماع انبیاء ومرسلین، صحابہ وتابعین، علماء ربانیین کا عقیدہ ہے کہ روح حادث ومخلوق ہے جیسے دیگر مخلوقات ہیں، یہ بھی مخلوق وفانی ہے، البتہ وقت حدوث میں اختلاف ہے۔ آیا روح جسم سے پہلے پیدا کی گئی ہے یا جسم کے ساتھ روح بھی پیدا ہوتی ہے؟ صحیح قول یہی ہے کہ ارواح، اجسام سے پہلے پیدا کی گئیں ہیں لیکن مدت معلوم نہیں کہ کتنی مدت پہلے پیدا کی گئی ہیں۔

دار قطنی کی ایک روایت میں آیا ہے کہ ارواح، اجسام سے دو② ہزار سال پہلے پیدا کی گئیں مگر اس روایت کی سند میں کلام کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم (شرح العقیدہ جلد ۲ رصفحہ ۴۲)

تیسرا③ مسئلہ: روح کے ساتھ نفس کا بھی ذکر ملتا ہے۔ نفس مطمئنہ اور روح کے الفاظ بھی ایک دوسرے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا روح اور نفس دونوں علیحدہ علیحدہ حقیقت ہیں یا دونوں کا مصداق اور مسمّیٰ ایک ہی ہے، صرف صفات کے مختلف ہونے کی بناء پر دو② نام ہو گئے؟

پہلا① قول جمہور علماء کا ہے کہ نفس اور روح ذاتی طور پر متغائر ہیں، دونوں کا مصداق ومسمّیٰ جدا جدا ہے۔

دوسرا② قول بعض اہل علم کا ہے کہ دونوں ایک ہی حقیقت کے نام ہیں، صفات کے تغایر سے دو② نام ہو گئے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے ''کتاب الروح'' میں اسی دوسرے قول کو اختیار کیا ہے۔ واللہ اعلم

چوتھا ④ مسئلہ: روح کی موت کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ کیا روح مرتی ہے یا دائمی و باقی ہے؟

علماء راسخین کی ایک بڑی جماعت کہتی ہے کہ روح بھی مرتی ہے اور موت کا مزہ چکھتی ہے۔ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾، ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾، ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾، ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾

علماء کی ایک دوسری جماعت کہتی ہے کہ اروح پر موت طاری نہیں ہوتی بلکہ وہ دوام و بقاء کے لیے پیدا کی گئی ہیں (جیسے جنت و جہنم اور ان کے نعماء و عذاب وغیرہ) البتہ جسم و بدن مرتا ہے۔

محققین کا فیصلہ ہے کہ روح مرتی ہے مگر موت کے وہ معنی نہیں کہ روح معدوم و فنا ہو جائے بلکہ موت سے مراد یہ ہے کہ روح جسم سے مفارقت اختیار کر لیتی ہے، بس اسی کا نام موت ہے۔

تمام اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ اجسام کے مرنے کے بعد ارواح باقی رہتی ہیں، کوئی ثواب میں، کوئی عذاب میں، یہاں تک کہ جب قیامت قائم ہو گی تو ارواح کو ابدان کی طرف لوٹا دیا جائے گا اور اسی پر جنت و جہنم کے فیصلے ہوں گے۔

جسم اور روح کا مناظرہ:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ قیامت کے دن ایک موقع پر روح اور جسم کا جھگڑا ہوگا۔ روح جسم سے کہے گی: دنیا میں جو کچھ بھی گناہ کیا تھا تو نے کیا۔ جسم روح کو جواب دے گا: میں نے جو کچھ بھی کیا تھا وہ تیرے حکم اور ترغیب پر کیا ہے۔ اگر تو نہ ہوتی تو میں ذرا سی حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا، میں تو صرف گوشت کا ایک لوتھڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے گا کہ تم دونوں کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی لنگڑا ہے مگر بینا ہے، آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ دوسرا شخص نابینا ہے مگر تندرست چلنے پھرنے پر قادر ہے۔ یہ دونوں دوست ایک باغ میں گئے، باغ کے پھل پھول دیکھ کر لنگڑے بینا نے اپنے نابینا تندرست دوست سے کہا: بھائی! میں اس باغ میں قسم قسم کے پھل پھول دیکھ رہا ہوں مگر لنگڑا ہونے کی وجہ سے پھلوں تک پہنچ نہیں سکتا۔ آخر میں کس طرح پھل حاصل کروں؟

نابینا تندرست دوست نے کہا: کیا مشکل ہے۔ تو مجھ پر سوار ہو جا اور قریب ہو کر پھل توڑ لے۔ چنانچہ وہ لنگڑا دوست اپنے نابینا دوست پر سوار ہو کر درختوں کے قریب آیا اور دل بھر کر پھل توڑ لیے۔

یہ مثال بیان کر کے اس فرشتے نے جسم اور روح سے کہا: بتاؤ ان میں کس نے حد سے تجاوز کیا اور چوری کا مرتکب ہوا؟ جسم اور روح دونوں نے کہا: اس عمل میں دونوں مجرم و قصوروار ہیں۔

فرشتے نے جسم اور روح سے کہا: پھر تو تم نے خود اپنے اوپر فیصلہ کر لیا ہے کہ کون مجرم ہے یعنی جسم روح کے لیے بمنزلہ سواری ہے (اخرجہ ابن مندہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما واخرجہ الدارقطنی عن انس رضی اللہ عنہ)

ایک روایت میں مزید اضافہ بھی ہے کہ جسم روح سے یہ کہے گا: میں تو کھجور کے تنے کی طرح ایک لکڑی تھا، نہ

ہاتھ ہلاسکتا تھا نہ پیر۔ روح کہے گی: میں تو ایک ہوا کی طرح تھی۔ اے جسم! اگر تو نہ ہوتا تو میں کچھ نہ کرسکتی تھی۔

(ماخوذ تفسیر فتح الغفور، مولانا محمد ادریس صاحب شیخ التفسیر)

(دارالعلوم دیوبند و جامعہ اشرفیہ لاہور، پاکستان)

⑬ ﴿وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ﴾ [سورة بنی اسرائیل: 86]

ترجمة: اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر ہم نے آپ پر وحی بھیجی ہے، سب سلب کرلیں۔

تفسیر: جن کافروں نے آپ پر الزام لگایا تھا کہ یہ قرآن آپ خود اپنے دل سے گھڑ لیتے ہیں پھر عوام میں مشہور کردیتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے، اس بے ہودہ بکواس کی مذکورہ آیت میں تردید کی جارہی ہے کہ اگر یہ ایسا ہی ہوتا تو اللہ جب چاہے اس کو اپنے رسول کے دل سے غائب کردیتا اور رسول کی رسالت بھی خطرے میں پڑجاتی لیکن اللہ نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ رحمت آپ پر برابر قائم رہی۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ لکھتے ہیں کہ اسی طرح اہل نسبت کو سلب نسبت سے ڈرتے رہنا چاہیے، کیونکہ مخلوقات میں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ باعظمت اور کون ہے؟ جب آپ سے یہ خطاب ہے تو دوسرا کس شمار میں؟

⑭ ﴿وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا ۙ﴾ [سورة بنی اسرائیل: 90]

ترجمة: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تم پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین میں چشمہ جاری نہ کردو۔ یا خود آپ کے لیے ایک باغ کھجوروں کا اور انگوروں کا پیدا نہ ہوجائے پھر اس کے درمیان میں جگہ جگہ نہریں جاری کردیں۔ یا تم ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرادو جیسا کہ تم دعویٰ رکھتے ہو یا تم اللہ اور فرشتوں ہی کو ہمارے سامنے لا کھڑا کردو۔ یا پھر تمہارے لیے کوئی گھر ہی سونے کا ہو یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور پھر ہم تمہارے آسمان پر چڑھ جانے پر بھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ تم وہاں سے ہمارے لیے ایک مکتوب نہ اتار لاؤ جسے ہم پڑھ لیں۔ اے نبی! آپ ﷺ کہہ دیں کہ پاک ہے اللہ (ہر ضعف و عیب سے) میں بجز ایک آدمی (اور) رسول کے اور کیا ہوں؟

تفسیر: رنگ برنگ کے یہ مطالبات کرنے والے مکۃ المکرمۃ کے مشرکین تھے۔ اردو کی کہاوت ہے: کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ قرآنی اعجاز و بلاغت، اخلاق نبوت، نبی کی ذاتی سیرت کو چھوڑ کر ایسے واہیات مطالبات کرنا خود اپنی شکست نہیں تو اور کیا ہے۔

نبیوں کی تاریخ میں یہ کوئی انوکھا مطالبہ نہیں تھا۔ زمانہ قدیم میں ہر دور کے مشرکین اپنے زمانے کے رسولوں، داعیان حق سے کچھ اسی قسم کے مطالبات کرتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسا مطالبہ خود مشرکانہ مذاق کے عین مطابق

بھی ہے اور آج بھی ان کی بقیہ ذریت اپنے وقت کے داعیان حق سے برابر ایسی من چاہی فرمائشات کرتی رہی ہیں۔ گویا ان روشن خیالوں کے یہاں نبوت کا کام انجام دینے والے نعوذ باللہ اعلیٰ درجے کے بازیگر یا شعبدہ باز ہیں۔ نعوذُ باللہ العظیم اللّٰھم اھدنا وسددنا

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ کسی بھی اہل حق سے خوارق (کرامات) کا طلب کرنا برا مطالبہ ہے۔ علاوہ ازیں مشرکین کے اس واہی تباہی مطالبہ پر نبی کریم ﷺ کا جواب ﴿هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ (میں تو کچھ نہیں مگر آدمی ہوں، پیغمبر ہوں) دلالت کرتا ہے کہ مقبولین بارگاہ کو یہ قدرت نہیں کہ جو کچھ بھی ان سے درخواست کی جائے اس کو وہ پورا کر دیں۔

⑮ ﴿قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا۝﴾ [سورة بنی اسرائیل: 95]

ترجمة: ان مشرکین سے آپ کہہ دیں کہ اگر زمین پر فرشتے چلتے بستے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے کسی فرشتے کو بطور رسول اتار دیتے۔

تفسیر: مشرکین کے ان کے بے ہودہ مطالبات میں ایک یہ بھی تھا کہ نبی و رسول کو فرشتہ ہونا چاہیے جب کہ آپ خود اپنے آپ کو بشر کہہ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب مذکورہ آیت میں دیا کہ اگر زمین کی آبادی فرشتوں کی ہوتی، ان کا رسول بھی فرشتہ ہوتا اور فرشتے ہی کو رسول بنا کر نازل ہوتے۔ ہر جنس اپنی جنس کی ہدایت و رہنمائی قبول کرتی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ معلم اور متعلم میں طبعی مناسبت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلوک میں شیخ و مرید میں مناسبت و موافقت مزاج کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ (مناسبت کے بغیر افادہ و استفادہ ممکن نہیں ہوتا)

⑯ ﴿قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ﴾

[سورة بنی اسرائیل: 100]

ترجمة: آپ کہہ دیں: اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو ضرور تم اس کے خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ہاتھ روک لیتے، انسان ہے ہی بڑا تنگ دل۔

تفسیر: انسان کے بخل و تنگ دلی کا ذکر ہے کہ اگر انسان رب العالمین کی رحمتوں کے ذخیروں کا مالک ہوتا اور اس کی تقسیم اس کے اختیار تمیز میں ہوتی تو ان نعمتوں کی تقسیم میں اسے ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا کہ یہ کہیں ختم نہ ہو جائیں، کیونکہ انسان حرص و بخل کا پتلا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت ؒ نے لکھا ہے کہ آیت سے یہ اشارہ بھی اس شخص کی مذمت کا نکلتا ہے جو طریق ہدایت کو طالبین سے چھپاتے ہیں اور طریق کی کیفیت اپنے مشائخ کے بعض اوراد و وظائف کو قرار دیتے ہیں۔

⑰ ﴿وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا۝﴾ [سورة بنی اسرائیل: 102]

ترجمة: اور میں خیال کرتا ہوں اے فرعون! تیری کم بختی کے دن آ گئے ہیں۔

تفسیر: آیت میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان گفت و شنید کا تذکرہ ہے۔

فرعون نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ سن کر یہ فقرہ کسا تھا: اے موسیٰ! اب تو تم سحر زدہ معلوم ہو رہے ہو۔ اس پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے فرعون! اب تو تیری کم بختی کے دن قریب آ گئے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت ؒ نے لکھا ہے کہ ترکی بہ ترکی جواب دینا اخلاق کے خلاف نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اس وقت چشم پوشی میں مصلحت نہ ہو۔ (ورنہ چشم پوشی اختیار کر لی جائے)

⑱ ﴿وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَ یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا۩﴾ [سورة بنی اسرائیل: 109]

ترجمة: اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے اور یہ قرآن ان کا خشوع اور بڑھا دیتا ہے۔

تفسیر: اللہ کے نیک بندوں کی حالت بیان کی جا رہی ہے کہ جب وہ قرآن پڑھتے یا تلاوت سنتے ہیں تو ان پر کلام الٰہی کی عظمت و ہیبت سے گریہ طاری ہو جاتا ہے اور وہ رونے لگتے ہیں۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک دن فجر کی نماز میں سورۂ یوسف پڑھ رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے ﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ (سورة یوسف) تو شدت گریہ سے سسکیاں لینے لگے یہاں تک کہ آخری صفوں تک آواز سنی گئی۔ (جصاص)

سُلوك: خوف خدا سے گریہ طاری ہونا اطاعت و اخلاص کی علامت ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ نماز میں خوف خدا سے رونے پر نماز فاسد نہیں ہوتی۔ (جصّاص)

سُوۡرَۃُ الۡکَہۡفِ

پارۃ: 16

(1) ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا﴾ [سورة الكهف: 1]

ترجمة: تمام خوبیاں اسی اللہ کے لیے ثابت ہیں جس نے اپنے خاص بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی۔

تفسیر: عبدہ سے مراد سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یہاں بھی آپ کو عبدہ سے یاد کیا گیا جیسا کہ معراج والی آیت میں یہی وصف ''اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ''عبدہ ذکر کیا گیا ہے۔

مطلب یہ کہ اعلیٰ سے اعلیٰ حمد وثناء صرف اسی ذات الٰہی کے لیے سزاوار ہے جس نے اپنے بندۂ خاص پر اعلیٰ واکمل کتاب نازل کی، اس طرح زمین والوں کو سب سے بڑی نعمت سے مشرف کیا اور اس کتاب میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔ عبارت نہایت سلیس، عام فہم، اسلوب بیان نہایت موثر وشگفتہ، تعلیم معتدل جو ہر زمانے اور ہر طبیعت کے مناسب، کسی قسم کی افراط وتفریط کا اس میں شائبہ نہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان کے لیے مقام عبدیت سے بلند اور کوئی مقام نہیں۔ (سلوک ۳۵۹ پھر پڑھیے)

(2) ﴿اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَی الۡاَرۡضِ زِیۡنَۃً لَّہَا لِنَبۡلُوَہُمۡ اَیُّہُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا﴾ [سورة الكهف: 7]

ترجمة: اس زمین پر جو کچھ بھی ہے، ہم نے اس کو اس زمین کے لیے باعث رونق بنایا تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے۔

تفسیر: اس زمین پر زینت وآسائش کی جتنی بھی چیزیں ہیں، وہ نہ بے کار ہیں اور نہ حرام ہیں۔ ان کا غلط استعمال حرام ہے اور صحیح استعمال حلال وجائز ہے۔ صحیح استعمال وہی ہے جو شریعت اسلامی کے مطابق ہو۔ ان خوشنما چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے باعث آزمائش بنایا ہے کہ کون اس کی رونق پر دوڑتا ہے اور کون اس کو چھوڑ کر آخرت کی طرف دوڑتا ہے، یہی حسن عمل ہے۔

سُلوك: ابن عطا اسکندری رحمہ اللہ نے کہا ہے: حسن عمل یہ ہے کہ دنیا کی اس آسائش سے بے التفاتی کی جائے۔

(3) ﴿فَضَرَبۡنَا عَلٰۤی اٰذَانِہِمۡ فِی الۡکَہۡفِ سِنِیۡنَ عَدَدًا﴾ [سورة الكهف: 11]

ترجمة: سو ہم نے غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک نیند کا پردہ ڈالے رکھا۔

تفسیر: آیت میں اصحاب کہف کا تذکرہ ہے۔ یہ چند نوجوان توحید پرست تھے۔ رومی بادشاہ دقیانوس المتوفی ۵۱ ہ قبل مسیح کی شرک پرستی سے بیزار ہو کر قریب کی پہاڑی کے غار میں پناہ لی۔ اس غار میں ان پر ایک غیر طبعی بلکہ خارقِ عادت نیند مسلط ہوگئی اور وہ مسلسل تین سو نو سال سوتے رہے، پھر بیدار ہو کر اپنے شہر آئے۔ (تفصیل ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۲ رصفحہ ۲۵۰ پر دیکھئے)

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ سے صوفیاء کی مشہور اصطلاح ''فنا و استغراق'' کا اثبات کیا ہے۔
(جو اکابر صوفیاء میں معروف ہے۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی فرماتے ہیں:
''گفت قدوسی فقیری در فنا و در بقا، خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی''
(تفصیل اکابرین سے دریافت کر لی جائے۔)

④ ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا﴾ [سورة الكهف: 12]

ترجمة: پھر ہم نے انہیں نیند سے اٹھایا تاکہ معلوم کر لیں کہ ان دو جماعتوں میں کون سی جماعت اس حالت میں رہنے کی مدت سے زیادہ صحیح واقف ہے۔

تفسیر: ان نوجوانوں کی بیداری کا یہ واقعہ ایمان بالآخرت سے متعلق ہے۔ اس وقت ان کی پوری قوم میں انکار آخرت کا عقیدہ عام تھا، اللہ تعالیٰ نے بعث بعد الموت کے عقیدے کو اسی مادی دنیا میں ممکن بلکہ یقینی حقیقت کے ساتھ عیاناً و مشاہدۃً ظاہر فرمایا تاکہ قیامت تک حجت قائم ہو جائے جیسا کہ معجزات کا مقصد ہوا کرتا ہے۔ ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ﴾ الآیۃ
آیت میں جن دو ② جماعتوں کا ذکر ہے اس سے اصحاب کہف اور قوم کے افراد مراد ہیں۔ (بحر)

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے صوفیاء کرام کی ان دو اصطلاح کا ثبوت پیش کیا ہے۔
① جلوت کے بعد خلوت ② صحو بعد السکر

ملحوظه: جلوت بعد خلوت کا یہ مطلب ہے کہ مشغول بالحق سے فارغ ہونے کے بعد مشغول بالخلق ہو جانا اور صحو بعد السکر کا یہ مطلب ہے کہ یادِ الٰہی کی غشی و بےخودی کے بعد عام حالت کا لوٹ آنا۔
صحو انسان کی عام طبعی حالت کو کہا جاتا ہے اور سکر غشی و بےخودی کا نام ہے۔

⑤ ﴿وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ﴾ [سورة الكهف: 16]

ترجمة: اور جب تم ان لوگوں سے الگ ہو گئے ہو اور ان معبودوں سے بھی جو اللہ کے سوا پوجے جا رہے ہیں تو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو، تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے لیے اس کام میں

کامیابی کا سامان بھی مہیا کرے گا۔

تَفسِیر: یہ ان نوجوانوں کا باہمی مشورہ تھا جو شرک وکفر سے بچنے کے لیے اپنا شہر چھوڑ کر غار میں پناہ لینے کی گفتگو کر رہے تھے کہ ہماری یہ ہجرت ہم پر اللہ کی رحمت کو قریب کر دے گی اور ہم نجات پا جائیں گے۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے لکھا ہے کہ بعض عارفین نے کہا ہے کہ غیر اللہ سے عُزلَة (علیحدگی) وصل حق کا سبب ہوا کرتی ہے بلکہ بغیر عُزلَة کے وصل نہیں ہوتا۔ (وصل وفصل کی تعریف سلوک ۳۶ میں دیکھ لی جائے)

﴿وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ﴾ [سورة الكهف: 17]

ترجمة: اور اے مخاطب! تو دیکھے گا جب دھوپ نکلتی ہے تو وہ داہنی جانب کو بچی بچی رہتی ہے اور جب وہ چھپتی ہے تو بائیں جانب ہٹی ہٹی رہتی ہے (یعنی اس وقت بھی دھوپ کے غار کے دروازے پر نہیں پڑتی تاکہ دھوپ سے انہیں تکلیف نہ پہنچے اور وہ محفوظ اور آرام سے رہیں) اور وہ لوگ غار کے کشادہ حصے میں مقیم ہیں۔

تَفسِیر: اصحاب کہف جس غار میں پناہ لیے تھے، وہ ایسا محفوظ خطہ ہے جہاں نہ جگہ کی تنگی ہے اور نہ ہوا اور روشنی کی بندش اور نہ دھوپ کی تمازت پہنچتی ہے۔ نہایت معتدل ماحول میں آرام کر رہے ہیں، نیند کی حالت میں ان کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ اگر کوئی دیکھے تو یہی سمجھے گا کہ یہ لوگ بیدار ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں پر ہیبت وجلال کی کیفیت رکھی ہے تاکہ کوئی انہیں دیکھ نہ سکے اور یہ تماشہ گاہ نہ بن جائیں۔ ان کے ساتھ ایک کتا بھی لگ گیا تھا، وہ بھی غار کے دروازے پر اسی کیفیت کے ساتھ بیٹھا ہے جو کیفیت اصحابِ کہف پر طاری ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب محدث ﷫ لکھتے ہیں: اگرچہ کتا رکھنا برا ہے لیکن لاکھ بروں میں ایک بھلا بھی ہے۔ (موضح القرآن)

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے غار کی مذکورہ کیفیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اہل خلوت صوفیاء کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی خلوت کے لیے ایسی ہی جگہ تجویز کرتے ہیں جس میں روشنی کم ہو اور اس کے باوجود بھی مراقبہ کے وقت اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں تاکہ دل کو یکسوئی حاصل ہو۔

﴿وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ﴾ [سورة الكهف: 18]

ترجمة: اور اے مخاطب! تو ان کو بیدار خیال کرتا ہے حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔

تَفسِیر: اصحاب کہف پر جو اعجازی نیند طاری کر دی گئی ہے، وہ ایسی ہے کہ ان کے نورانی چہروں کی رونق وتازگی دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بیدار ہیں اور دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ گہری نیند میں ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے لکھا ہے کہ یہ مثال ہے ان لوگوں کی جن کے جسم تو مخلوق کے ساتھ مشغول ہیں اور

قلب حق تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

ملحوظہ: اصحاب کہف کا کتا کسی طرح ان کے ساتھ لگ گیا تھا اور پھر اللہ کی مرضی سے ان کے ساتھ غار نشین بھی ہو گیا۔

مشہور صوفی ابوبکر وراق ﷫ کہتے ہیں کہ نیک لوگوں کی مجالست و مجاورت بھی کیسی پر تاثیر ہوتی ہے کہ جانور بھی انسانوں کی صف میں شامل ہو گیا۔

دس⑩ جانوروں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جنت میں داخل کر دیے جائیں گے۔

① براق النبی ﷺ (معراج کی سواری)

② ہدہد پرندہ۔

③ سیدنا سلیمان علیہ السلام کے لشکر جرار کی خبر دینے والی چیونٹی۔

④ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا وہ بچھڑا جس کو انہوں نے مہمان فرشتوں کی ضیافت کے لیے ذبح کیا تھا۔

⑤ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا وہ دنبہ جو سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کے بدلہ میں ذبح ہو گیا۔

⑥ وہ گائے جس کا قصہ سورۂ بقرۃ میں آیا ہے۔

⑦ اصحاب کہف کا کتا۔

⑧ سیدنا عزیر علیہ السلام کا خچر۔

⑨ سیدنا صالح علیہ السلام کی وہ اونٹنی جو بطور معجزہ پہاڑ سے برآمد ہوئی تھی۔

⑩ سیدنا یونس علیہ السلام کی وہ مچھلی جس نے آپ کو اپنا لقمہ بنا لیا تھا۔

حاشیہ الصاوی، سورۃ النمل (جلالین)

⑧ ﴿لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾ [سورۃ الکھف: 18]

ترجمۃ: اے مخاطب! اگر تو ان کو جھانک کر دیکھتا تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑا ہوتا اور تجھ پر ان کی دہشت سما جاتی۔

تفسیر: اصحاب کہف کی حفاظت کے لیے جہاں مختلف ذرائع ہیں، ان میں ایک ہیبت وجلال کی کیفیت بھی شامل ہے کہ ان کے جسموں پر رعب وجلال کی کیفیت طاری کر دی گئی ہے تاکہ لوگ انہیں تماشہ گاہ نہ بنا لیں۔ کہا جاتا تھا کہ اس غار کے قریب سے گزرنے والوں پر بھی غیبی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور لوگ تیزی سے بھاگ پڑتے تھے، دیکھنا یا چھونا تو در کنار۔

یہ اللہ کی (آیات) نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس طرح ان کے جسم محفوظ کر دیے گئے ہیں اور وہ

نوجوان آج بھی گہری نیند سو رہے ہیں، قیامت کا حادثہ ہی انہیں بیدار کرے گا۔ واللہ اعلم۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اہل اللہ کو جو شان ہیبت نصیب رہتی ہے، وہ اسی قسم کی ہوا کرتی ہے۔ (ظالم و جابر بادشاہ بھی اہل اللہ سے مرعوب رہے ہیں۔)

⑨ ﴿فَابْعَثُوٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ﴾ [سورة الكهف: 19]

ترجمة: سو ہم میں سے کسی ایک کو یہ روپیہ دے کر شہر کی جانب بھیجو، سو وہ تحقیق کرے کہ کون سا کھانا پاکیزہ ہے پھر اس میں سے کچھ کھانا اپنے واسطے لے آئے اور اس معاملہ میں خوش تدبیری سے کام لے اور کسی کو اپنی خبر نہ ہونے دے۔

تفسیر: اصحاب کہف نے بیدار ہونے کے بعد بھوک و پیاس محسوس کی۔ جیب میں چند سکّے تھے، اپنے ایک ساتھی کو شہر سے کھانا خریدنے کے لیے روانہ کیا اور خصوصیت سے یہ ہدایت کی کہ حلال و پاکیزہ کھانا لے آنا۔

کیونکہ اس شہر میں حرام و ناپاک غذائیں بھی فروخت ہوا کرتی تھیں، علاوہ ازیں یہ بھی ہدایت کی کہ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ کسی کو ہماری خبر نہ لگے ورنہ ہم گرفتار کر لیے جائیں گے۔

لیکن دوکان پر تین سو سالہ پرانے سکوں نے ان کا راز فاش کر دیا۔ (تفصیل کے لیے "ہدایت کے چراغ" جلد ۲ رصفحہ ۲۵۰ دیکھئے)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ سالکین کی شان یہی ہے کہ وہ مخلوق سے سوال نہ کریں۔ (جیسا کہ اصحاب کہف نے اپنے داموں سے طعام خریدنا پسند کیا، کسی سے سوال نہیں کیا)

آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل توحید کو ہمیشہ حلال و حرام غذاؤں میں تفریق کرنے کا اہتمام رہا ہے۔ بھوک و پیاس اور ضرورت کے وقت بھی حلال غذاؤں کی تلاش رہی ہے۔

وَلْيَتَلَطَّفْ (خوش تدبیری اختیار کی جائے) آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی بھی معاملہ میں نرمی اور اخلاق برتنا چاہیے۔

⑩ ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾

[سورة الكهف: 23 تا 24]

ترجمہ: آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ اس کو میں کل کر دوں گا مگر اللہ کے چاہنے کو شامل کر دیجئے۔ (یعنی ان شاء اللہ کہہ لیا کیجئے)

تفسیر: آیت کا پس منظر یہ ہے کہ ایک دفعہ چند یہودیوں نے آپ سے تین سوال بطور امتحان پوچھے تھے۔

پہلی ① بات تو یہ ہے کہ روح کیا چیز ہے؟ دوسری ② بات اصحاب کہف کا کیا قصہ ہے؟ تیسری ③ بات یہ

کہ ذوالقرنین کون شخص تھا اور اس کا کیا واقعہ ہے؟

نبی کریم ﷺ نے وحی الٰہی کی توقع پر وعدہ کرلیا کہ ان تینوں سوالوں کا جواب کل دے دیں گے۔

لیکن پندرہ دن تک وحی نہ آئی، آپ ﷺ طبعاً پریشان سے ہوگئے، اس کے بعد وحی الٰہی سے ان تینوں سوال کا جواب ملا اور یہ بھی ہدایت ملی کہ اپنے کسی بھی کام میں ارادۂ الٰہی کو شامل کرلیا کریں یعنی ان شاء اللہ کہہ دیا کریں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے علم تصوف سے دو (2) مسئلے اخذ کئے ہیں جو صوفیاء کرام میں معروف ہیں:

① تفرید ② تجرید

ملحوظہ: تفرید کا یہ مطلب ہے کہ سالک کا دنیاوی اغراض کو ترک کردینا۔

اور تجرید کا یہ مطلب ہے کہ کسی بھی چیز کی نسبت کو اپنی طرف نہ کرنا۔ (دونوں حالتوں کو صرف اللہ ہی کی جانب پھیر دینا)

⑪ ﴿وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝﴾ [سورة الكهف: 25]

ترجمة: اور وہ نوجوان اپنے غار میں تین سو سال ٹھہرے رہے اور نو سال اور رہے۔ (جملہ ۳۰۹ سال)

تَفسِیر: اصحاب کہف اس غار میں جس میں انہوں نے پناہ لی تھی، تین سو نو سال مقیم رہے ہیں اور وہ اس پوری مدت میں سوتے ہی رہے۔ غار میں ان کی مدت قیام کا صحیح فیصلہ قرآن حکیم نے بیان کردیا ہے ورنہ تاریخی اور اسرائیلی روایات میں بہت کچھ اختلافات ہیں۔

سُلوك: آیت سے فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ ظالموں سے فرار اختیار کرنا جائز ہے بلکہ سنت انبیاء بھی ہے۔ اسی لیے ہر زمانے میں اولیاء اللہ نے ظالموں اور مفسدوں سے علیحدگی اختیار کی ہے۔

ملحوظہ: اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں قرآنی آیات سے کوئی قطعی تعداد معلوم نہیں ہوتی ہے۔ خود قرآن حکیم نے پانچ یا سات کی تعداد کے بارے میں یہ فیصلہ دیا:

﴿وَمَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ [سورة الكهف: 22]

تعداد کا صحیح علم بہت کم لوگوں کو ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ ان قلیل لوگوں میں میں بھی شامل ہوں کہ اصحاب کہف کی تعداد سات عدد تھی۔ (حاشیہ بیان القرآن)

جس ظالم بادشاہ کے شر سے بچنے کے لیے ان نوجوانوں نے راہ فرار اختیار کی تھی، اس کا نام دقیانوس تھا۔ شرک و بت پرستی اس کا مذہب تھا اور اس کی اشاعت میں وہ ہر وقت سرگرم عمل رہا کرتا تھا۔ اور جب اصحاب کہف تین سو نو سال بعد بیدار ہوکر اپنے شہر آئے تھے، اس وقت شہر بدل چکا تھا اور نیک اور توحید پرست بادشاہ کی حکمرانی

تھی جس کا نام بیدوسیس تھا، یہ مذہباً دین مسیح کا پابند تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر حقانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جس ظالم بادشاہ کے خوف سے فرار ہو کر اصحاب کہف نے غار میں پناہ لی تھی، اس کا زمانہ ۲۵۰ء تھا پھر اس غار میں تین سو سال (شمسی) یہ لوگ سوتے رہے تو مجموعہ ۵۵۰ء ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ کی ولادت شریفہ ۵۷۰ء میں ہوئی، اس طرح آپ ﷺ کی ولادت شریفہ سے صرف بیس (20) سال پہلے یہ نوجوان بیدار ہو کر غار سے نکلے تھے۔

(تفسیر بیان القرآن)

شمسی اور قمری سال کے ایام میں عام طور پر سو (۱۰۰) سال شمسی پر تین سال قمری کا اضافہ ہوا کرتا ہے۔ اس طرح تین سو سال شمسی کے تین سو نو سال قمری ہوں گے، قرآن حکیم نے یہی تعداد بیان کی ہے۔ (تفصیل "معارف القرآن"، مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ جلد ۵، سورۂ کہف دیکھئے)

(12) ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ﴾ [سورة الكهف: 28]

ترجمة: اور آپ اپنے کو مقید رکھا کیجئے ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے پروردگار کو پکارتے رہتے ہیں صبح و شام صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے۔

تفسیر: يُرِيْدُوْنَ وَجْهَه کے ایک عام معنی تو یہی ہیں کہ اللہ کی رضا و خوشنودی چاہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے دیدار الٰہی چاہتے ہیں لکھا ہے۔ یعنی وہ دیدار الٰہی حاصل کرنے کے شوق میں نہایت اخلاص کے ساتھ عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ مثلاً ذکر کرتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں، نمازوں روزوں کی کثرت رکھتے ہیں وغیرہ۔

ایسے لوگ اگرچہ معزز اور مالدار نہیں جیسے صحابہ کرام ہیں۔ اس وقت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، صہیب رومی رضی اللہ عنہ، بلال حبشی رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہم ایسے مومنین صادقین کے بارے میں نبی کریم ﷺ کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ ان کو اپنی صحبت و مجالست سے مستفید کرتے رہیں، کسی کے کہنے سننے پر ان کو اپنی مجلس سے دور نہ کیجئے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت میں حکم ہے کہ فقراء مومنین کے ساتھ مجالست باقی رکھی جائے۔

(13) ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا﴾

[سورة الكهف: 60]

ترجمة: وہ وقت یاد کرو جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا کہ میں اس سفر میں برابر چلتا رہوں گا یہاں تک کہ اس موقع پر پہنچ جاؤں جہاں دو (2) دریا آپس میں ملے ہیں یا یونہی زمانہ دراز تک چلتا رہوں گا۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے اس طویل سفر کی یہ وجہ تھی کہ ایک بار انہوں نے اپنی قوم میں وعظ فرمایا تھا۔ ایک شخص

نے پوچھا: اس وقت انسانوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟

(غالباً وعظ کے علوم ومعارف سے متاثر ہو کر سوال کیا ہو) سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "میں۔"

اگرچہ یہ بات سو فیصد حق تھی کیونکہ ہر نبی اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم ہوا کرتا ہے تاہم جواب ظاہری طور پر شان وفخر کا عنوان تھا، اللہ تعالیٰ نے احتیاط فی الکلام کی تعلیم کے لیے مجمع البحرین تک جانے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا کہ وہاں ہمارا ایک بندہ ہے جو تم سے بھی زیادہ علم رکھتا ہے، اس کی خدمت میں پہنچو۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام اس خاص بندے کی تلاش میں چل پڑے اور ملاقات کی۔

(تفصیل "ہدایت کے چراغ" جلد ا رصفحہ ۵۴۰ پر مطالعہ کیجئے)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ شیخ کامل کی تلاش میں ممکنہ کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس کے لیے دور دراز سفر کی ضرورت پیش آئے۔

علاوہ ازیں تحصیل علم کے لیے تعب ومشقت برداشت کرنے کی فضیلت ثابت ہوئی ہے۔

تفسیر کبیر کے مفسر نے آیت کے ضمن میں لکھا: اگر کوئی شخص ایک مسئلہ کی تحقیق کے لیے مشرق سے مغرب تک سفر کرے، اس کو اس کی اجازت ہوگی۔

⑯ ﴿فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا﴾ [سورة الكهف: 61]

ترجمة: پھر جب وہ دونوں (سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور ان کے شاگرد) دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی کو بھول گئے، سو سرنگ بنائی ہوئی دریا میں اپنی راہ پکڑی۔

تَفسِیر: درمیان سفر ایک مقام پر دریا کے کنارے آرام کرنے کی غرض سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سو گئے تھے۔ ناشتہ کے لیے ایک مچھلی توشہ دان میں تھی، وہ اچانک ناشتہ دان سے نکل کر دریا میں سرنگ بناتی ہوئی چلی گئی یعنی داخل ہونے کا راستہ دریا کی تہہ تک نالی کی طرح بن گیا۔

دراصل یہی مقام اس خاص بندے کی ملاقات کا تھا جس کے لیے سفر کیا جا رہا تھا اور مچھلی کا نکل جانا اس مقام کی علامت تھی لیکن اس کا ذکر کرنا شاگرد کو یاد نہ آیا اور موسیٰ علیہ السلام بیدار ہو کر وہاں سے آگے چل پڑے۔ بہت دور جانے کے بعد تھکن وبھوک پیاس لگی تو توشہ یاد آیا، مچھلی تو نکل چکی تھی۔ شاگرد کو قصہ یاد آیا اور اس نے معذرت کے ساتھ ذکر کر دیا۔ پھر دونوں وہاں سے اپنے نشان قدیم پر لوٹے اور اس مقام پر اس خاص بندے کو پایا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مشائخ صوفیاء نے آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مریدوں یا شاگردوں سے کام لینا اور انہیں اپنا رفیق سفر بنانا سنت انبیاء میں شامل ہے۔

نیز سفر میں زادِ راہ (توشہ وغیرہ) رکھنا توکل کے خلاف نہیں (جیسا کہ بعض کم علم صوفیاء خیال کرتے ہیں۔)

علاوہ ازیں بھوک پیاس اور اپنی تکلیف وتھکن کا اظہار کرنا جائز ہے بلکہ کمال توکل کے بھی خلاف نہیں۔ آیت میں بڑا سبق ہے ان خوش عقیدہ مریدوں ومعتقدوں کے لیے جو بزرگوں کی جانب بھوک پیاس، دکھ درد یا بشری ضرورتوں کا انتساب کرنا بے ادبی خیال کرتے ہیں۔

⑮ ﴿وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ﴾ [سورة الكهف: 63]

ترجمة: اور مجھ کو تو شیطان ہی نے بھلا دیا کہ میں اس کا ذکر کروں۔

تفسیر: جیسا کہ اوپر لکھا گیا، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندے (خضر علیہ السلام) سے ملاقات کے لیے مجمع البحرین (دو دریاؤں کے سنگم) پر جانے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ وہ اور ان کے رفیق سفر (یوشع بن نون) چلتے رہے مگر اس مقام سے بھی آگے نکل گئے جہاں اس خاص بندے سے ملاقات کرنی تھی۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سفر سے کہہ رکھا تھا کہ توشہ دان کی مچھلی جس جگہ غائب ہو جائے، مجھے اس کی خبر کرنا۔ چنانچہ درمیان سفر ایک مقام پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام سو گئے تھے، وہاں توشہ دان کی بھنی مچھلی اچانک زندہ ہوئی اور دریا میں چلی گئی۔ اگرچہ یہ واقعہ عجیب وغریب تھا لیکن یوشع بن نون علیہ السلام اس کا ذکر کرنا بھول گئے، (کثرت سے معجزات دیکھنے والوں کو یادداشت کی زیادہ اہمیت نہیں رہتی) سیدنا موسیٰ علیہ السلام بیدار ہونے کے بعد آگے چلنے لگے۔ جب تھک گئے اور بھوک پیاس محسوس ہوئی تو یوشع علیہ السلام سے کہا: آج بہت زیادہ تھکن ہوگئی ہے اور بھوک بھی شدت کی ہے، ہمارا ناشتہ تو لاؤ۔ اس وقت یوشع بن نون علیہ السلام کو مچھلی کا واقعہ یاد آیا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے معذرت کی: یہ میری بھول تھی، شیطان نے بھلا دیا کہ میں آپ سے اس کا ذکر کروں۔

حقیقت یہ تھی کہ وہی مقام مجمع البحرین کا تھا جہاں حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہونی تھی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ وسوسہ یا بھول شیطانی اثر سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا پیش آنا ولایت بلکہ نبوت کے بھی منافی نہیں۔

آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر بری بات کی نسبت شیطان کی طرف کی جانی چاہیے۔

⑯ ﴿فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝﴾

[سورة الكهف: 65]

ترجمة: سو (وہاں پہنچ کر دونوں نے) ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جس کو ہم نے اپنی خاص رحمت کی تھی اور اس کو اپنے پاس کا ایک علم سکھایا تھا۔

تفسیر: عَبْداً مِّنْ عِبَادِنَا سے سیدنا خضر علیہ السلام مراد ہیں۔ (بخاری) ان کے نبی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اہل علم کی دو ② رائے ہیں، البتہ ان کی ولی اور بندۂ خاص ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

سیدنا خضر علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے جو خاص علم دیا گیا تھا، وہ بلا کتاب و بلا استاذ تھا اور یہ علم زمان اور مکان کا علم یعنی اسرار کونیہ (کا علم تھا) اسرار الٰہیہ (شریعت) کا علم نہ تھا جس میں اللہ کی مرضی و نامرضی معلوم کی جاتی ہے۔ (تفسیر کبیر)

سُلوك: صوفیاء کرام کے حلقہ میں علم لدُنی کا تذکرہ معروف ہے، حکیم الامت لکھتے ہیں کہ مذکورہ آیت میں اس جانب اشارہ ملتا ہے۔ اس علم کو علم باطن بھی کہا جاتا ہے۔

ملحوظه: اہل تحقیق علماء لکھتے ہیں کہ جس علم پر قرب الٰہی مرتب ہوتا ہے، وہ اسرارِ الٰہیہ (علم شریعت) ہے جس میں مرضیات و نامرضیات الٰہی کا علم رہتا ہے۔

اور جو علم اسرار کونیہ (زمان و مکان) سے متعلق ہے، اس کو قرب الٰہی سے تعلق نہیں۔ ایسا علم مسلم و غیر مسلم سب کو میسر ہوتا ہے (جیسا کہ موجودہ تحقیقاتی علوم اہل یورپ و امریکہ کو حاصل ہیں)

⑰ ﴿قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾ [سورة الكهف: 66]

ترجمة: موسیٰ نے اس بندے سے کہا: کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ جو علم آپ کو سکھایا گیا ہے، اس میں سے آپ کچھ مجھ کو بھی سکھا دیں؟

تفسیر: ہدایت ربّانی کے مطابق سیدنا موسیٰ علیہ السلام مجمع البحرین پہنچے (خلیج عقبہ اور خلیج سوویز کا سنگم) وہاں وہ خاص بندہ ملا جس کا نام حدیث بخاری میں خضر (علیہ السلام) بیان کیا گیا ہے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام جب کہ آپ خود اولوالعزم نبی و رسول ہیں، ایک بزرگ سے درخواست کرتے ہیں کہ جناب کی اجازت ہو تو چند دن رفاقت میں گزاروں۔ تاکہ آپ کے خصوصی علم سے استفادہ کرسکوں؟

(تفصیل کے لیے ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۱ / ۵۴۰ مطالعہ کیجئے)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ اپنی گفتگو میں کس قدر تواضع اور ادب احترام کی رعایتیں جمع کی ہیں۔ (مریدوں کے لیے درس عظیم ہے)

⑱ ﴿قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا﴾ [سورة الكهف: 69]

ترجمة: موسیٰ نے کہا: ان شاء اللہ آپ مجھ کو صبر و ضبط کرنے والا پائیں گے اور میں آپ کے حکم کے خلاف کچھ نہ کروں گا۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے جب تک حضرت خضر علیہ السلام کی رفاقت چاہی تو حضرت خضر علیہ السلام نے یہ کہہ کر معذرت کردی کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر و ضبط نہ کرسکیں گے، لامحالہ مفارقت ہوجائے گی۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے یہ تیقن دیا کہ ان شاء اللہ میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا اور نہ آپ کی اجازت کے بغیر کوئی

بات کروں گا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ مرید کے لیے پہلی چیز یہ ضروری ہے کہ وہ شیخ کے احکام کی اطاعت کرے اور اعتراض و مخالفت کی عادت اختیار نہ کرے اور اپنی طرف سے تواضع و انکساری برتے۔ (کبیر)

⑲ ﴿قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّى أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا﴾

[سورة الكهف: 70]

ترجمة: خضر علیہ السلام نے کہا کہ اچھا اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہوں تو اتنا خیال رہے کہ مجھ سے کسی بھی بات کی نسبت پوچھ گچھ نہ کرنا جب تک کہ میں ہی خود ذکر نہ کردوں۔

تفسیر: رفاقت کی یہ شرط تھی جس کو سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے قبول کرلیا اور ساتھ ہو گئے۔ حضرت خضر علیہ السلام کی خدمت میں کتنے دن رہے، قرآن و حدیث اس مدت سے ساکت ہیں۔ قرآن حکیم نے جس بات کو مجمل رکھا ہم کو بھی اس کی نقل کرنی چاہیے، بلاوجہ تحقیق و تدقیق میں پڑنا وقت کا ضیاع ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا کہ شیخ کو بیعت کے وقت اپنے مرید سے مناسب شرطیں لگانے کا حق حاصل ہے۔

ملحوظہ: تعلیم و تربیت کے طور طریقے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ جن کی رو رعایت سے علم و اخلاق حاصل ہوتے ہیں۔ کتابی علم حاصل کرنے کے لیے طالب علم کو تحقیق و تدقیق، بحث و مباحثہ کرنا ضروری ہوتا ہے، صرف اطاعت و سماعت کافی نہیں، چوں وچرا (کیوں اور کیوں نہیں) کرنا پڑتا ہے۔ تب ہی اس پر علم کے گوشے منکشف ہوتے ہیں، اس کے برخلاف مرید کی تعلیم و تربیت کی نوعیت اس سے مختلف ہوا کرتی ہے، بیعت ہو جانے کے بعد مرید کو صرف سماعت و اطاعت کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ بس شیخ کی ہدایات سنے اور عمل کرتا رہے، چوں وچرا کی اجازت نہیں گویا بیعت صرف عمل کا نام ہے۔

مریدے کہ چوں وچرا می کند و شاگردے کہ چوں وچرا نمی کند۔

ہر دو را چرا گاہ باید فرستاد۔

''جو مرید کہ چوں وچرا کرتا ہے اور جو شاگرد کہ چوں وچرا نہیں کرتا، یہ ہر دو ② جانور ہیں انہیں جنگل میں چھوڑ دینا چاہیے۔''

مطلب یہ کہ مرید کا کام صرف اطاعت کرنا ہے اور شاگرد کا کام سوال و جواب، بحث و مباحثہ کرنا ہے تب ہی دونوں کو اپنا مقصد حاصل ہوتا ہے۔

⑳ ﴿قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا﴾ [سورة الكهف: 71]

ترجمة: موسیٰ نے کہا: کیا آپ نے (اس کشتی میں) اس لیے سوراخ کر دیا تا کہ اس میں سوار لوگوں کو غرق کر دیں؟ یقیناً آپ نے بڑی بھاری (خطرہ کی) بات کر دی۔

تفسیر: حضرت خضر علیہ السلام کی رفاقت میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام دریا کے کنارے کنارے یوں ہی چل رہے تھے، راہ میں کوئی ایسا مقام بھی آ گیا جہاں دریا میں سفر کرنے کی ضرورت تھی۔

حضرت خضر علیہ السلام ایک تیار کشتی پر سوار ہو گئے اور بحری سفر شروع کیا، اثناء راہ اچانک بلا کسی سبب کشتی کا ایک تختہ اکھاڑنا شروع کیا، اس پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے برداشت نہ ہو سکا۔ فوری ٹوک دیا کہ حضرت! یہ کیا حرکت ہے؟ کیا سب کو ڈبو دینا چاہتے ہو؟

سلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ سے دو ② باتیں اخذ کی ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ اکابر سے کبھی ایسے امور صادر ہو سکتے ہیں جن کی ظاہری شکل وصورت خلاف شریعت معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں وہ خلاف شریعت نہیں ہوتے۔

دوسری بات یہ کہ اولیاء اللہ میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے کشف والہام سے تکوینات (امور دنیا) میں تصرف کر دیتے ہیں، صوفیاء کی اصطلاح میں ایسے اولیاء کو قطب التکوین یا صاحب خدمت بزرگ کہا جاتا ہے۔

ملحوظہ: صوفیاء کرام لکھتے ہیں کہ قطب التکوین (صاحب خدمت) کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اپنے قطب ہونے کا علم ہو اور وہ اپنی ہمت باطنی سے اصلاح معاشرہ، خدمت خلق اور دفع بلیات کی خدمت انجام دیتا ہو۔ (شریعت وطریقت: ۳۴۰)

㉑ ﴿قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ﴾ [سورة الكهف: 76]

ترجمة: موسیٰ نے کہا: (اب تو جانے دیجئے) اگر میں اس کے بعد آپ سے کسی امر کے متعلق کچھ پوچھوں تو مجھ کو (حسب وعدہ) اپنے ساتھ نہ رکھیے، بے شک آپ میری طرف سے عذر (انتہا) کو پہنچ چکے ہیں۔

تفسیر: جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے عہد لیا تھا کہ سفر کی اس رفاقت میں مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا لیکن سیدنا موسیٰ علیہ السلام اس اقرار پر قائم نہ رہ سکے، دو ② مرتبہ سوال کر بیٹھے۔ پہلی مرتبہ کشتی میں سوراخ کرتے وقت اور دوسری مرتبہ معصوم بچے کو قتل کر دینے کے بعد۔

مذکورہ آیت میں اپنی عذر خواہی کے بعد وعدہ فرما رہے ہیں کہ آپ نے بہت کچھ درگزر کیا ہے۔ اگر اب میں آپ سے اور کوئی سوال کروں تو آپ مجھ کو اپنی رفاقت سے علیحدہ کر دیجئے۔

(لیکن سیدنا موسیٰ علیہ السلام اس قول وقرار پر بھی قائم نہ رہ سکے، تیسرا ③ سوال کر ہی دیا جس کی تفصیل آیت ۷۷

میں موجود ہے۔ بہر حال سیدنا موسیٰ علیہ السلام ہر منکر پر نکیر کرتے رہے)۔

سُلوك: بعض کم علم صوفیوں کو اس قصہ سے یہ دھوکہ لگا ہے کہ پیر صاحب اگر کوئی کام خلاف شرع کریں تو مریدوں کو انکار نہ کرنا چاہیے بلکہ خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس مغالطہ کا یہ جواب لکھا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ خصوصی وانفرادی حیثیت کا ہے جس سے کوئی عام حکم ثابت نہیں ہوتا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام وحی الٰہی کی ہدایت پر اس خاص بندے کی خدمت میں برائے استفادہ گئے تھے۔ انہیں وہ سب کچھ برداشت کرنا تھا جو راہ سفر میں پیش آیا حتی کہ کلام کرنا ممنوع تھا لہٰذا انہیں سکوت اختیار کرنا ضروری تھا ورنہ حکم الٰہی کے خلاف ہوتا۔ رہا شیخ صاحب و پیر صاحب پر اعتراض نہ کرنا جب کہ ان سے خلاف شرع بات ہو جائے، ان کے بارے میں کون سی وحی نازل ہوئی ہے جس کی وجہ سے انہیں ٹوکا نہ جائے؟ سیدنا موسیٰ علیہ السلام تو وحی الٰہی کے پابند ہو چکے تھے کہ اعتراض نہ کریں گے۔ لہٰذا کم علم صوفیوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ پیر صاحب کو ٹوکا نہ جائے۔

㉒ ﴿فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۣاسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا﴾

[سورة الكهف: 77]

ترجمة: پھر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب ان دونوں کا ایک گاؤں والوں پر گزر ہوا تو گاؤں والوں سے کھانا طلب کیا (کہ ہم مسافر ہیں) سو ان لوگوں نے ان کی مہمانی سے انکار کر دیا۔

تَفسِیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے سفر کا یہ آخری تذکرہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ چلتے چلتے ایک بستی پر گزر ہوا، تو شہ دان خالی تھا، بھوک پیاس نے بے قرار کر دیا تو بستی والوں سے کھانا طلب کیا۔ ان قدر ناشناس بستی والوں نے انکار کر دیا۔ زمانۂ قدیم میں مسافروں کی خدمت وراحت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا بلکہ زمانۂ قدیم کی تہذیب وتمدن میں مسافروں کی خدمت کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں مسافروں کو بھی یہ حق حاصل تھا کہ وہ بستی والوں سے کھانا پانی طلب کریں، اس زمانے میں قدم قدم پر نہ ہوٹلوں کا رواج تھا، نہ دوکانوں اور نہ مہمان سراؤں کا، گاؤں والے خود اس خدمت کو خوش دلی سے انجام دیا کرتے تھے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے واقعہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ فوری ضرورت کے لیے سوال کرنا جائز ہے۔

تفسیر ماجدی کے مفسر نے لکھا ہے کہ آیت سے اشارۃً یہ بات بھی نکل آئی کہ میزبانی اور مہمانی کا یہی جذبہ صحیح ہے جو قدیم تہذیب میں رائج تھا۔ (شریعت اسلامی نے بھی یہی تعلیم دی ہے)

㉓ ﴿قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا۝﴾ [سورة الكهف: 77]

ترجمۃ: موسیٰ نے کہا: جناب! اگر آپ چاہتے تو اس کام پر اجرت ہی لے لیتے؟

تفسیر: بستی والوں کے انکار مہمانی پر بستی سے نکلتے وقت حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بوسیدہ گھر کی دیوار کو درست کر دیا اور آگے نکل گئے۔ روایات میں یہ تصریح بھی ملتی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے دیوار پر صرف اپنا ہاتھ پھیر دیا تھا، وہ مضبوط اور سیدھی ہوگئی۔ (بخاری، کتاب التفسیر)

اس موقع پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے پھر لقمہ دیا: حضرت! اس قدر ناشناس بستی والوں پر آپ نے یہ کیا احسان کر دیا؟ کم از کم اجرت ہی لے لیتے تاکہ کھانے پینے کا انتظام ہو جاتا۔

سُلوک: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا کہ کسبِ معیشت اور اس کے اسباب کا اختیار کرنا بزرگی اور تقویٰ کے خلاف نہیں ہے۔

نیز آیت سے کرامات اولیاء کا ثبوت ملتا ہے۔ (حضرت خضر علیہ السلام بہر حال ولی اللہ تو ضرور تھے)

24 ﴿قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ﴾ [سورۃ الکہف: 78]

ترجمۃ: خضر علیہ السلام بولے: بس (بس) یہ وقت میری اور آپ کی جدائی کا ہے۔

تفسیر: حضرت خضر علیہ السلام نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اپنی رفاقت میں رہنے کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ میرے کسی بھی کام پر آپ نہ اعتراض کریں گے اور نہ دریافت کریں گے۔

لیکن سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے اثنائے سفر ایک بار نہیں، جملہ تین بار وہ عہد پورا نہ ہو سکا اور اعتراض کرتے ہی گئے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جب اپنے کسی مرید سے بار بار خلاف ونزاع ظاہر ہونے لگے اور شیخ کو اس مرید سے مناسبت وموافقت کی امید باقی نہ رہے، ایسے مرید کو جدا کر دینا درست ہے۔

25 ﴿سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا﴾ [سورۃ الکہف: 78]

ترجمۃ: خضر علیہ السلام نے کہا: اب میں ان باتوں کی حقیقت پر آپ کو مطلع کیے دیتا ہوں جن کے بارے میں آپ ضبط نہ کر سکے۔

تفسیر: جن باتوں کی مخالفت پر حضرت خضر علیہ السلام کی رفاقت ختم ہوگئی، وہ تین واقعات تھے:

1. صحیح وسالم کشتی میں سوراخ کرنا۔
2. معصوم وکمسن لڑکے کو بلاوجہ قتل کرنا۔
3. نادہندہ قوم کی گرتی دیوار کو درست کرنا۔

جن کی حقیقت سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام واقف نہ تھے، حضرت خضر علیہ السلام نے ان کی حقیقت بیان کر دی جو نہ صرف جائز تھی بلکہ ضروری تھی۔ (تفصیل کے لیے ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۱، صفحہ ۵۴۰)

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس واقعہ سے بعض صوفیوں کو دھوکہ لگا کہ علم باطن، علم شریعت سے افضل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ شبہ کم علمی بلکہ بے علمی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کو جو علم اَسرارِ کونیہ کا حاصل تھا، وہ انقلابات عالم سے متعلق تھا جس میں قربِ الٰہی یا رضائے الٰہی کو دخل نہیں۔ (سلوک ۳۹۲ پھر ایک بار پڑھ لیا جائے۔)

البتہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو جو علم اَسرارِ الٰہیہ کا حاصل تھا، وہ قربِ الٰہی اور رضائے الٰہی سے متعلق تھا جو یقیناً ہر ہر علم سے افضل و برتر ہے، لہٰذا حضرت خضر علیہ السلام کے علم باطن کا یہ حصہ علم شریعت سے افضل نہ ہوا۔ اس وضاحت کے بعد حضرت خضر علیہ السلام، سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے افضل بھی نہ ہوئے۔

﴿وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا﴾

[سورة الكهف: 80]

ترجمة: اور جو لڑکا تھا، سو اس کے ماں باپ صاحب ایمان تھے، سو ہم کو معلوم ہوا کہ وہ ان دونوں پر بھی سرکشی و کفر کا اثر ڈال دے گا۔

تفسیر: حضرت خضر علیہ السلام نے کمسن لڑکے کے قتل کی یہ وجہ بیان کی کہ وہ بالغ ہو کر کفر و بغاوت کا علمبردار ہوتا اور اپنے مسلمان ماں باپ کو بھی لے ڈوبتا اور وہ اس کی محبت میں کافر ہو جاتے لیکن اللہ کو اس کے ماں باپ کا ایمان پر قائم رہنا منظور تھا، اس لیے آنے والی رکاوٹ کو دور کر دیا گیا اور حضرت خضر علیہ السلام کو ہدایت کی گئی کہ اس بچے کو قتل کر دیا جائے۔

سُلوک: فقہاء نے آیت سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت میں غفلت برتنے پر ماں باپ کو بھی اولاد کے گناہوں کا حصہ ملتا ہے۔ (جیسا کہ نیک اولاد کی نیکیوں کا حصہ بھی ملتا ہے)

﴿وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا﴾ [سورة الكهف: 82]

ترجمة: اور ان دو یتیم بچوں کا باپ مرد صالح تھا۔

تفسیر: حضرت خضر علیہ السلام نے جس گرتی دیوار کو درست کر دیا، وہ دراصل ایک مرد مومن کا مکان تھا جس نے اپنی وفات سے پہلے اپنے دو چھوٹے بچوں کے لیے ایک خزانہ دیوار کے نیچے دفن کر دیا تھا تاکہ جب یہ بڑے ہو کر اپنے مکان کی درستگی کریں گے تو وہ خزانہ انہیں ہاتھ آ جائے گا ورنہ دیوار گر جانے پر خاندان کے لوگ لوٹ مار کر لیتے، اس طرح ایک نیک باپ نے اپنی اولاد کی خیر خواہی کے لیے اس طرح محفوظ انتظام کر دیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ علماء نے آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ والدین کی صالحیت (نیکی پسند فطرت) اولاد کو فائدہ پہنچاتی ہے بشرطیکہ اولاد خود بھی صالح ہو۔ (ابن کثیر، تفسیر کبیر، جصاص)

﴿وَ مَا فَعَلۡتُہٗ عَنۡ اَمۡرِیۡ﴾ [سورۃ الکھف: 82]

ترجمة: اور یہ کام میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا ہے۔

تفسیر: حضرت خضر علیہ السلام کے تینوں واقعات جن پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام صبر نہ سکے اور اعتراض کرتے رہے، الہامات الٰہی کے ماتحت تھے، اس میں ان کی رائے کا کوئی دخل نہ تھا۔ (کشاف)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے معلوم ہوا کہ بڑے سے بڑا صاحب باطن بھی ظاہر شریعت کے خلاف نہیں کرسکتا جب تک کہ الہام صریح نہ رکھتا ہو۔ لیکن الہام صریح بھی ختم نبوت کے بعد قطعی و یقینی نہیں رہا۔

مشائخ صوفیاء نے لکھا ہے کہ جس طرح انبیاء کرام امور نبوت میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتے، اسی طرح اولیاء اہل خدمت بھی مدارج خدمت میں حکم شرعی کے پابند رہتے ہیں۔ (سلوک ۲۹۶ دیکھئے)

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے جس علم کی تحصیل کے لیے اتنا بڑا سفر اختیار کیا اور مشقت برداشت کی اور پھر ہر وقت نادم ہوئے اور معذرت چاہی، نرم و گرم گفتگو سنی، اس کے باوجود اپنے منصب (نبوت) کی ادائیگی میں غفلت نہیں برتی، ہر بار امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اہل تحقیق علماء کا اتفاق ہے کہ کوئی شکل، کوئی عمل اپنے روحانی آثار اور نورانی لطائف کے لحاظ سے کتنا ہی مزکّٰی، مصفّٰی، مجلّٰی ہو، اگر شریعت ظاہری کے خلاف ہوگا ہرگز جائز و حلال نہیں ہوگا۔ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ

حکیم الامت رحمہ اللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ مغیبات (غیب کی باتیں) پر مطلع ہوجانا مقاصدِ دین میں شامل نہیں ہے، کیونکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام جو اولوالعزم نبی اور صاحب کتاب رسول ہیں، ایسے مغیبات پر مطلع نہ تھے اس کے باوجود وہ حضرت خضر علیہ السلام سے افضل و اکمل تسلیم کیے جاتے ہیں۔

سُورَةُ مَرْيَمَ

پَارَہ: 16

① ﴿إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ③﴾ [سورة مريم: 1]

ترجمة: (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب پکارا اس نے اپنے پروردگار کو چھپی آواز سے۔

تفسير: آیت میں سیدنا زکریا علیہ السلام کی دعا کا تذکرہ ہے۔ انہوں نے رات کی تاریکی اور تنہائی میں پست آواز کے ساتھ اپنے رب کو پکارا: الٰہی: میں بوڑھا ہو چکا ہوں، جسم بوسیدہ، ہڈیاں کمزور، سر پر بالوں کی سفیدی چھا گئی ہے، بیوی بانجھ ہے، ساری عمر بے اولاد رہا، اولاد کے ظاہری اسباب بھی نہیں ہیں، اب عمر کے اس آخری وقت پیرانہ سالی میں کیسے گمان کروں کہ آپ میری دعا کو رد کر دیں گے۔ آپ اپنی قدرت و رحمت خاص سے اولاد عطا فرمایئے جو دینی خدمات کو سنبھالے اور آپ کی مقدس امانت دعوت و رسالت کا بوجھ اٹھا سکے جو میرے بعد آلِ یعقوب کی دینی و علمی میراث کا نگہبان و مبلغ ہو، اس وقت میرے خاندان میں میرے منصب کا کوئی اہل نہیں ہے۔

سُلوك: فقہاء نے آیت سے استدلال کیا کہ دعا میں اخفا (چپکے چپکے دعا کرنا) افضل ہے۔ اسی طرح دعا میں الحاح و زاری کرنا مستحب ہے یعنی دعا میں اپنی طلب، بے چینی، بے قراری و بے بسی کا اظہار کرنا چاہیے۔ (دعا کی مقبولیت کا یہ خاص عنوان ہے)

حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مذکورہ آیت سے تین مسئلے ثابت ہوتے ہیں:

① پہلا مسئلہ: اولاد کا طلب کرنا زہد و تقویٰ کے خلاف نہیں۔

② دوسرا مسئلہ: اللہ تعالیٰ سے کسی ایسی چیز کا طلب کرنا جو ظاہری اسباب سے دور ہو چکی ہو، ادب کے خلاف نہیں۔

③ تیسرا مسئلہ: سیدنا زکریا علیہ السلام کی دعا سے ذکر خفی کا ثبوت ملتا ہے (جو تصوف میں جاری و ساری ہے۔)

ملحوظه: سیدنا زکریا علیہ السلام اور سیدہ مریم بنت عمران کے دونوں قصوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسا کہ سوال و درخواست کرنے سے دیتے ہیں۔ (جیسا کہ سیدنا زکریا علیہ السلام کو بڑھاپے کی زندگی میں سیدنا یحیٰ علیہ السلام عطا کیے گئے)

اور کبھی بلا سوال و درخواست بھی دیتے ہیں جیسا کہ سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کو بلا طلب و درخواست سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ملے۔ مزید اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہر شخص کے ساتھ جدا جدا ہوا کرتا ہے۔

② ﴿وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ⑫﴾ [سورة مريم: 12]

اور ہم نے ان کو لڑکپن ہی میں حکم دے دیا تھا۔

آیت میں سیدنا یحییٰ کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں لڑکپن ہی میں ''حکم'' کی نعمت سے سرفراز فرما دیا تھا۔ قرآن حکیم میں ''حکم'' کے مختلف معنی آئے ہیں: نبوت، حکمت و دانائی، شریعت، فہم و عمل۔

ابن العربی مالکی نے لکھا ہے کہ حکم کے یہاں تینوں معنی مراد ہو سکتے ہیں: وحی، نبوت، معرفت و عمل۔

اکثر اہل علم تحقیق ہے کہ سیدنا یحییٰ کو بچپن ہی میں نبوت دے دی گئی تھی۔ صغر سنی میں نزول وحی اور مکاشفۂ ملائکہ ممکن ہیں۔ (احکام القرآن، جصاص)

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ [سورة مريم: 17]

پھر ہم نے مریم کے پاس اپنے خاص فرشتے کو بھیجا جو ان کے سامنے کامل انسان بن کر ظاہر ہوا۔

سیدہ مریم کی عمر تیرہ (13) یا پندرہ (15) سال کی تھی۔ انہیں پہلا حیض آیا تو وہ شرم کے مارے ایک علیحدہ مقام پر چلی گئیں جو بیت المقدس سے مشرقی جانب تھا، اس وقت ان کے خلوت کدہ میں اچانک جبرئیل امین کامل انسانی شکل میں نمودار ہوئے جیسا کہ فرشتوں کی عادت ہے، وہ عموماً خوش منظر صورتوں میں آیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے سیدہ مریم کے گریبان میں پھونک ماری جس کے اثر سے وہ حاملہ ہو گئیں۔

حکیم الامت نے آیت سے ''مسئلۂ تمثل'' ثابت کیا ہے۔

صوفیاء کرام میں تمثل کا مسئلہ عام ہے۔ تمثل کہتے ہیں کہ اپنی حقیقت کو باقی رکھتے ہوئے کسی دوسری شکل میں ظاہر ہونا، اس دوسری شکل کو ''صورت مثالی'' بھی کہا جاتا ہے۔ تمثل میں حقیقت زائل نہیں ہوتی، صرف صورت بدل جاتی ہے۔ جبرئیل امین اپنی حقیقت کے لحاظ سے فرشتہ ہی تھے لیکن انسانی شکل میں سیدہ مریم کے یہاں آئے۔ ملکی صورت، بشری صورت میں تبدیل ہو گئی۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ [سورة مريم: 22]

پھر ان کے پیٹ میں لڑکا رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے اپنے گھر سے کسی دور مقام پر چلی گئیں۔ پھر ولادت کی تکلیف انہیں ایک کھجور کے درخت کی طرف لے آئی (اور وہاں ولادت ہو گئی)

سیدنا عیسیٰ کی ولادت عام قانون فطرت سے مختلف رہی ہے۔ یہاں ولادت کا معروف و طبعی طریقہ نہ تھا، صرف باذن الٰہی و حکم الٰہی سیدنا عیسیٰ بطن مادر سیدہ مریم سے ظاہر ہو گئے۔ یہ عمل اللہ تعالیٰ کا قانون فطرت (سنت اللہ) نہیں تھا بلکہ قانون قدرت (قدرۃ اللہ) سے تعلق رکھتا ہے۔ قدرت اللہ کے قید و بند اسباب سے خالی ہوا کرتی ہے، اس پر اسباب و ذرائع لاگو نہیں ہوتے۔

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ یہ حالت حمل، مدت حمل، کیفیت ولادت وغیرہ کی تفصیلات سے قرآن حکیم ساکت ہے کیونکہ یہ معاملہ قدرت الٰہی سے متعلق تھا، كُنْ فَيَكُوْنُ کے تحت ہوگیا۔

تفسیر جلالین کے مفسر نے آیت ولادت کے تحت لکھا ہے: وَالْحَمْلُ وَالتَّصْوِيْرُ الوِلَادَةُ فِيْ سَاعَةٍ (جلالین، سورۂ مریم: ۲۳)

سیدہ مریم ﷤ کا حاملہ ہونا اور پیٹ میں بچہ کا شکل اختیار کرنا اور ولادت ہونا صرف ایک گھڑی کا وقت تھا۔

کتاب تفسیر، تنویر المقباس میں سیدنا ابن عباس ﷠ سے بھی یہی قول مروی ہے: ﴿وَ يُقَالُ يَوْمٌ وَاحِدٌ﴾ (سورۃ مریم: ۲۳) یہ ساری کاروائی صرف ایک دن میں ہوگئی اور یہی بات مجموعہ آیات میں غور کرنے سے مستفاد ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

جدید مفسرین نے اس مسئلہ پر اپنا اظہار خیال نہیں کیا ہے تاہم راقم الحروف کو ایک غیر شعوری خلش تھی جو کتب تفاسیر کے مطالعہ وتتبع سے دور ہوگئی۔ فللّٰه الحمد والمنّة

⑭ ﴿فَأَجَآءَهَا الْمَخَاضُ إِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا﴾ [سورة مريم: 23]

ترجمة: سو مریم کو دردزہ (ولادت کی تکلیف) کھجور کے ایک درخت کی طرف لے آئی۔ وہ بولیں: کاش میں اس سے پہلے مرگئی ہوتی اور نیست ونابود ہوجاتی (کہ کسی کو میں یاد بھی نہ آتی)

تفسیر: سیدنا عیسیٰ ﷤ کی ولادت کے وقت سیدہ مریم ﷤ کو جو دردزہ آیا، وہ ایسا شدید تھا کہ بے ساختہ مذکورہ کلمات ان کی زبان سے نکل گئے۔

سلوك: حکیم الامت ﷫ نے لکھا ہے کہ غم دنیا سے موت کی تمنا کرنا اگرچہ برا ہے لیکن سیدہ مریم ﷤ کا تمنا کرنا غلبۂ حال سے تعلق رکھتا ہے جو گناہ نہیں۔

ملحوظه: صوفیاء کرام میں غلبۂ حال کی اصطلاح عام ہے۔ غلبۂ حال اس غیر اختیاری کیفیت حال وقال کو کہا جاتا ہے جو بے قصد وارادہ انسانی جوارح سے ظاہر ہوجائے۔ چونکہ اس میں نیت وارادہ شامل نہیں رہتا، اس لیے اس حالت پر کوئی شرعی حکم نافذ نہیں ہوتا، انسان معذور سمجھا جاتا ہے۔ صحابہ کی زندگیوں میں بھی ایسے حالات پیش آئے ہیں جس کی تاویل غلبۂ حال ہی سے کی گئی ہے۔

⑮ ﴿فَقُوْلِيْٓ إِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ۚ﴾ [سورة مريم: 26]

ترجمة: (اگر تم آدمیوں میں سے کسی کو بھی اعتراض کرتا دیکھو) تو کہہ دینا کہ میں نے اللہ کے واسطے روزے کی نذر مان رکھی ہے لہٰذا آج کسی سے بھی بات نہ کروں گا۔

تفسیر: گزشتہ ملتوں میں چپ روزہ رائج رہا ہے کہ سوائے ذکر اللہ کے اور کوئی کلام نہ کیا جاتا تھا، سیدہ مریم ﷤

بے باپ کے بچے کی ولادت پر خود تو حیران و پریشان تھیں پھر دوسری فکر یہ کہ قوم کو کیا جواب دیا جائے، کنواری و اَن بیاہی حالت میں یہ بچہ کس طرح پیدا ہوا؟ اگر اپنی پاکی وصفائی میں باعصمت و باعفت ہونا بیان کروں تو سوالات کا غیر محدود سلسلہ شروع ہو جائے گا کہاں تک عہدہ برآ ہوں؟

اس پیچیدہ حالت میں اسی فرشتے نے سیدہ مریم ؑ کو ہدایت دی کہ تم قوم کے سوال و جواب میں نہ پڑنا بلکہ یہ کہہ دینا کہ میں نے آج روزے کی نذر مانی ہے، کسی سے بات نہیں کروں گی۔

چنانچہ غیبی تائید اس طرح ظاہر ہوئی کہ نومولود بچے نے ماں کی گود میں اپنی اور اپنی ماں کی پاکی وصفائی میں ایسا واضح کلام کیا کہ پوری قوم دم بخود رہ گئی۔[سورة مريم: ۳۰ تا ۳۳]

سُلوك: اہل علم نے لکھا ہے کہ اگر کہیں ضدی اور جاہل انسانوں سے سابقہ پڑے تو سکوت اختیار کر کے رخصت ہو جانا چاہیے، اللہ کی غیبی تائید ہی اس کا علاج کر دیتی ہے۔

ملحوظه: امام فخر الدین رازی ؒ نے خود اپنا ذاتی تجربہ نقل کیا ہے کہ جب کبھی مجھ کو کسی شریر انسان نے خواہ مخواہ پریشان کیا اور میں نے اس کی طرف توجہ نہ کی بلکہ اپنا معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کچھ نہ کچھ ایسے لوگ کھڑے کر دیے جو پوری طرح اس شر کے دفعیہ پر لگ گئے۔ (تفسیر کبیر، المؤمن آیت:۲۸)

⑯ ﴿قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴾ [سورة مريم: 30]

ترجمة: وہ بچہ (خود ہی) بول اٹھا: میں اللہ کا خاص بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب (انجیل) دی ہے اور مجھ کو نبی بنایا ہے۔ اور مجھ کو برکت والا بنایا میں جہاں کہیں بھی رہوں۔

تَفسِیر: قرآن حکیم کا ایک خاص عنوان یہ بھی ہے کہ وہ مستقبل کے واقعات کو جب کہ اس کا پیش آنا قطعی و یقینی ہوا کرتا ہے، ماضی کے الفاظ سے ادا کرتا ہے۔ قرآن حکیم کا یہ عنوان بکثرت مقامات پر ملتا ہے۔

﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ﴾، ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى﴾، ﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ وغیرہ۔

سیدنا عیسیٰ ؑ نے گود میں جو کلام کیا، اس کا عنوان بھی ایسا ہی ہے۔ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھ کو نبی بنایا ہے اور میرا وجود ہر جگہ برکت ہی برکت کیا ہے اور مجھے نماز و زکوٰۃ کا تاحیات حکم دیا ہے اور اپنی والدہ کا فرمانبردار بنایا ہے اور مجھے ظالم و بدبخت نہیں کیا۔ (اور یہ سب کلام زمانہ شیر خوارگی کا ہے)

سُلوك: فقہاء نے لکھا ہے کہ انسان کا اپنی زبان سے اپنے کمالات اور خوبیوں کا ذکر کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس اظہار سے اپنا تعارف مقصود ہو، فخر و ناز کی نیت نہ ہو۔ (جصّاص)

⑰ ﴿اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴾

[سورة مريم: 42]

ترجمۃ: (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا تھا: اے ابا جان! آپ ایسی چیزوں کی عبادت کیوں کرتے ہو جو نہ کچھ سنتے ہوں اور نہ کچھ دیکھتے ہوں اور نہ آپ کے کچھ کام آتے ہوں۔ ابا جان! میرے پاس وہ علم آچکا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، سو آپ میری پیروی کیجئے، میں آپ کو سیدھی راہ بتا دوں گا۔ ابا جان! آپ شیطان کی پرستش نہ کیجئے۔ شیطان تو اللہ رحمن کا نافرمان ہے۔ ابا جان! میں اندیشہ کرتا ہوں کہ آپ پر اللہ رحمن کی طرف سے کوئی عذاب نہ ٹوٹ پڑے تو پھر آپ شیطان کے ساتھی ہو جائیں گے۔

تفسیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے نبوت کی سرفرازی کے بعد سب سے پہلے اپنے گھر والوں کو خاص طور پر اپنے بت پرست بلکہ بت فروش باپ آزر پر توجہ فرمائی اور انہیں توحید کی دعوت دی۔

قدیم ملک عراق کا شرک بدترین قسم کا شرک تھا۔ حکومت اور عوام کا مذہب دیوی دیوتاؤں سے وابستہ تھا، جدید تحقیقات کی روشنی میں اب تک پانچ ہزار سے زائد دیوی، دیوتاؤں کے نام قدیم کتبات میں ملے ہیں جو آثار قدیمہ کی کھدائی سے حاصل ہوئے ہیں۔ (تفسیر ماجدی)

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعوت و تبلیغ میں جن اخلاق و آداب کا لحاظ رکھا ہے، وہ ہر داعی و مبلغ کے لیے عظیم درس ہیں۔

⑧ ﴿قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ﴾ [سورة مريم: 47]

ترجمۃ: ابراہیم نے کہا: میرا سلام لو، اب میں اپنے رب سے تمہاری معافی کی دعا کرتا رہوں گا۔

تفسیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی خیر اندیشی اور خیر خواہی باپ آزر کو پسند نہ آئی، غضب ناک ہو کر سنگسار کرنے کی دھمکی دی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے باپ کو آخری سلام کیا اور یہ کہتے گھر سے رخصت ہوئے کہ میں آپ کی ہدایت و مغفرت کے لیے دعا کرتا رہوں گا۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ کافر و مشرک کے لیے ہدایت کی دعا کرنی جائز ہے۔

⑨ ﴿وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا﴾ [سورة مريم: 58]

ترجمۃ: اور یہ سب ان لوگوں میں تھے جن کو ہم نے ہدایت دی اور پسند کر لیا تھا۔

تفسیر: مذکورہ آیت میں تذکرہ ہے ان تمام نبیوں کا جو شروع سورت سے یہاں تک بیان کیے گئے ہیں۔ یعنی سیدنا زکریا علیہ السلام سے سیدنا ادریس علیہ السلام تک یہ سارے حضرات ہدایت یافتہ اور پسندیدہ شخصیات ہیں، انہی کی اتباع و تقلید میں اخروی نجات رکھی گئی ہے۔

ملحوظہ: سیدنا ادریس علیہ السلام قابیل کے فرزند اکبر یعنی سیدنا آدم علیہ السلام کے پوتے ہوتے ہیں۔ اسرائیلی روایات کے

مطابق ان کا زمانہ ۴۱۰ تا ۲۸۴ قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے، عمر شریف (۳۶۵) سال بیان کی جاتی ہے۔ توریت وانجیل میں ان کے آسمان پر اٹھا لیے جانے کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن قرآن وحدیث میں واضح طور پر ان کے رفع جسمانی کا ذکر نہیں ملتا جیسا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔

قرآن حکیم کی جس آیت سے ان کے رفع جسمانی پر استدلال کیا جاتا ہے: ﴿وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ [سورة مريم: 57] اس رفعت سے معنوی رفعت یعنی بلند و بالا مقام، عزت واکرام کا مقام مراد ہے جو نبیوں کو دیا جاتا ہے اور جو حدیث اس بارے میں نقل کی جاتی ہے، وہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔

(کشاف، ابن کثیر، روح المعانی، تفسیر کبیر، بیضاوی)

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اگر روایت صحیح بھی ہو تب بھی آیت کی تفسیر اس پر موقوف نہیں۔ (بیان القرآن)

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے مذکورہ ٹکڑے سے "جذب وسلوک" کا اثبات کیا ہے جو علم تصوف میں کثرت سے بولا اور لکھا جاتا ہے۔

(سلوک اس ہدایت نصیبی کا نام ہے جو شریعت کی ہدایات ورہنمائی سے حاصل کیا جاتا ہے اور جذب اجتباء کا نام ہے (یعنی انتخاب) کہ اللہ تعالیٰ براہ راست ہدایت وکامرانی کا فیصلہ کر دیں جیسا کہ انبیاء کرام کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے۔ انہیں راست ہدایت وکامیابی دے دی جاتی ہے)

آیت میں انبیاء کرام کے دو قسم کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔

ایک ① یہ کہ وہ سب مقبولین اور صاحب کمال ہوا کرتے ہیں۔ دوسرے ② یہ کہ باخشوع وخضوع اور باکمال بندے ہوا کرتے ہیں۔

⑩ ﴿اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا﴾ [سورة مريم: 58]

ترجمة: جب ان کے آگے اللہ رحمن کی آیات پڑھی جاتی تھیں تو سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے زمین پر گر جاتے تھے۔ پھر ان کے بعد چند ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور نفسانی خواہشات کی پیروی کی سو یہ لوگ عنقریب بربادی سے دوچار ہوں گے۔

تفسير: اوپر کی آیات میں مسلسل کئی ایک انبیاء وصدیقین کا تذکرہ آیا ہے جنہوں نے اللہ کی بندگی اور اس کی نیازمندی میں اپنی ساری زندگی ختم کی ہیں اور اس کے نام وکلام پر شدت خشیت میں رو پڑے ہیں۔

ملحوظه: حدیث شریف میں آیا ہے قرآن کی تلاوت کرو اور روؤ۔ اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت بنالو۔

(موضح القرآن)

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ تلاوت قرآن اور ذکر اللہ کے وقت رونا اللہ

والوں کا طریقہ رہا ہے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم (آیت سجدہ) پڑھ کر سجدہ کیا اور فرمایا: هٰذَا السُّجُوْدُ فَأَيْنَ الْبُكِيُّ؟ (یہ تو سجدہ ہوا آگے بُکاء کہاں ہے) مطلب یہ کہ تلاوت پر رونا بھی چاہیے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک دفعہ نماز پڑھا رہے تھے۔ایسا شدید گریہ طاری ہوا کہ آخری صفوں میں اس کی آواز پہنچی۔

⊙ فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ [سورۃ مریم: 65]

ترجمہ: سو آپ اللہ کی عبادت کریں اور اس پر قائم بھی رہیں۔

تفسیر: یعنی اللہ کی عبادت اور اس کی دعوت وتبلیغ پر آپ مضبوطی سے قائم رہیں، مخالفوں کی مخالفت کا کوئی اندیشہ نہ کریں۔ یہ تو ختم ہونے والے ہیں، آپ کا نام اور کام باقی رہنے والا ہے۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اس میں طریق سلوک کے مجاہدات کی جانب اشارہ ملتا ہے اور اس پر صبر وثبات کی تلقین بھی معلوم ہوتی ہے۔ (طریق کے مجاہدات وہی ہیں جن کی شریعت نے اجازت دی ہے۔)

⊙ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا [سورۃ مریم: 75]

ترجمہ: آپ کہہ دیں کہ جو لوگ گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں، اللہ رحمن انہیں خوب ڈھیل دیتا جاتا؟۔

تفسیر: آیت میں اللہ تعالیٰ کی ایک قدیم سنت کا ذکر ہے جو غافلوں، مجرموں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے یعنی جو لوگ دنیا کی زندگی میں غفلت ومعصیت شعاری کی عادت میں پڑے ہوئے ہیں، ان پر اللہ کی جانب سے خوشحالی، فارغ البالی، شان وشوکت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اس خوش عیشی پر مغرور نہ ہونا چاہیے، ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے ایسے متکبروں کے ساتھ یہی معاملہ جاری رکھا ہے، یہ دراصل اس بھیانک گرفت کی ڈھیل ہے جو انہیں ہلاکت خیزی سے دوچار کر دیتی ہے۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ لطیف نکتہ اخذ کیا ہے کہ جب اہل باطل پر نعمتوں کا نزول اور اس کا بقاء بھی جاری رہتا ہے تو گمراہ اہل طریقت کو اپنی خوش احوالی ومرفع الحالی پر مطمئن نہ ہونا چاہیے۔ (بہت سے روایتی ومصنوعی پیروں کی زندگی مرفع الحال رہی ہے اور اس حالت کو ان لوگوں نے اپنی مقبولیت عند اللہ کا نتیجہ سمجھا ہے)

ایک عارف کہتا ہے:

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے　　حاصل خواجہ بجز پندار نیست

⊙ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا

[سورة مريم: 96]

ترجمة: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے، اللہ رحمٰن ان کے لیے محبت پیدا کر دے گا۔

تفسیر: مطلب یہ کہ ایسے باعمل ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ اپنی محبت عطا کرتے ہیں۔ یہ محبت تین طریقوں سے ہوسکتی ہے۔

① اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی محبت ان کے قلوب میں پیدا کر دیتے ہیں۔

② دوم یہ کہ یا اللہ خود ان سے محبت کرتے ہیں۔

③ سوم یہ کہ یا مخلوق کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دیتے ہیں۔

احادیث میں یہ مضمون بکثرت آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو پسند فرما لیتے ہیں تو جبرئیل امین کو آگاہ کرتے ہیں کہ میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں، تم بھی محبت کرو۔ پھر جبرئیل امین ساتوں آسمانوں میں اس کا اعلان کرتے ہیں کہ اللہ اور اس کا فرشتہ جبرئیل امین فلاں بندے سے محبت کرتے ہیں لہٰذا تم سب اس سے محبت کرو۔ چنانچہ ہر آسمان کے فرشتے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر آسمانوں کی یہ محبت زمین پر نازل کی جاتی ہے (تو زمین والے بھی سب محبت کرنے لگتے ہیں)

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے مذکورہ آیت مریم ۹۶ بطور شہادت تلاوت فرمائی۔ (روح المعانی)

آیت کی ایک تفسیر یہ بھی دی گئی کہ وُدًّا کے معنی "محبوب" یعنی اللہ تعالیٰ ایسے ایمان والوں کے لیے ایسی چیزیں مہیا کر دیتے ہیں جن کو وہ لوگ پسند کرتے ہوں۔ (کبیر عن ابی مسلم)

مزید ایک تفسیر یہ بھی کی گئی کہ اللہ تعالیٰ ان کے قلوب میں اپنی محبت یعنی طاعت کی لذت و حلاوت پیدا کر دیتے ہیں۔ (روح المعانی)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اولیاء اللہ کی یہ محبت زمینی مخلوق کے قلوب میں ڈال دی جاتی ہے۔ اس سے وہ قلوب مراد ہیں جن میں اللہ کی محبت موجود نہ ہو ورنہ جو دل اللہ کی محبت سے خالی ہوتے ہیں، ان میں مؤمنین صالحین کے خلاف بغض و عناد ہی بھرا رہتا ہے جیسا کہ اہل شرک و کفر کے قلوب ہوا کرتے ہیں۔

ملحوظہ: بعض غیر مسلموں نے بھی اہل اللہ سے محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے جس سے ایک عام آدمی کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان کے قلوب میں بھی اللہ والوں کی محبت ہے۔

لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ ان کی یہ محبت، صورت محبت ہے، حقیقی محبت نہیں، صرف اپنے نفع کی خاطر محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

❀❀❀

سُوْرَةُ طٰهٰ

پارہ: 16

① ﴿مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى﴾ [سورة طٰه: 2]

ترجمة: طٰہٰ۔ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نہیں نازل نہیں کیا کہ آپ تکلیف اٹھائیں۔

تفسیر: آیت میں رسول اللہ ﷺ سے راست خطاب ہے کہ آپ پر قرآن کا نزول اس لیے نہیں ہوا کہ آپ تعب و مشقت میں پڑ جائیں۔آپ اپنا کام جاری رکھیں، کسی کو بھی ہدایت دینا اللہ کا کام ہے۔آپ کے تعب ومشقت اٹھانے کی دو صورتیں تھیں۔

ایک ① یہ کہ کافروں کے مسلسل انکار و بغاوت پر آپ غم زدہ ہو جاتے تھے۔دوسرے ② یہ کہ رات میں نفلی نمازوں میں تلاوت کی کثرت کیا کرتے تھے جس سے ساری ساری رات نمازوں اور تلاوت میں گزر جاتی تھی۔

مذکور آیت میں دونوں حالتوں کی اصلاح کی جارہی ہے کہ آپ غم زدہ ہوں اور نہ راتوں میں تلاوت کی کثرت سے تعب ومشقت میں پڑیں، اعتدال ملحوظ رکھیں۔آپ کا کام تذکیر و تبلیغ ہے۔جسے ماننا ہوگا وہ مانے گا اور جو نہ مانے، آپ اس کی فکر نہ کریں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں تعدیل مجاہدہ کی تعلیم ہے (یعنی دعوت وتبلیغ ہو یا طاعت و عبادت، اعتدال کی کی کیفیت رکھنی چاہیے اور اس کی علامت یہ ہے کہ جسمانی یا روحانی طور پر کوئی تعب ومشقت پیدا نہ ہو۔)

ملحوظہ: بعض روایات میں مذکور ہے کہ نزول قرآن کے ابتدائی زمانے میں نبی کریم ﷺ راتوں کے وقت نماز میں کھڑے ہو کر بہت زیادہ قرآن پڑھا کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کے پاؤں مبارک متورم ہو جایا کرتے، خاندان کے بعض کافر عزیز و قریبی آپ کی یہ محنت و ریاضت دیکھ کر کہتے تھے کہ قرآن کیا نازل ہوا، بیچارہ محمد ﷺ سخت تکلیف ومصیبت میں پڑ گیا۔

اس نادان خیر خواہی کا جواب مذکورہ آیت میں دیا گیا کہ قرآن کریم اس لیے اتارا گیا ہے کہ جن کے دل میں نرم ہوں اور اللہ کا خوف رکھتے ہوں، ایسے لوگ قرآن سے نصیحت و ہدایت حاصل کریں، قرآن کریم ایسے لوگوں کے لیے نور، ہدایت، رحمت و نعمت ہے۔

② ﴿اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا﴾ [سورة طٰه: 10]

ترجمة: (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب موسیٰ نے آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا: تم یہیں ٹھہرے رہو،

میں نے آگ دیکھی ہے۔ کیا عجب اس میں سے کوئی شعلہ لے آؤں یا آگ (کی روشنی) سے آگے کا راستہ پاؤں۔

تفسیر: آیت میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا شہر مدین سے مصر واپس ہونے کا تذکرہ ہے۔ شہر مدین میں سیدنا شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی سے نکاح ہو گیا تھا۔ دس ⑩ سال وہاں مقیم رہنے کے بعد اپنے وطن مصر واپس ہو رہے تھے، بیوی صاحبہ ساتھ تھیں، رات اندھیری، سردی شباب پر تھی، ساتھ بکریوں کا گلہ بھی تھا۔ اس حالت میں راستہ بھول گئے، بکریاں بھی منتشر ہو گئیں اور بیوی صاحبہ کو جو حاملہ تھیں، دردزہ شروع ہوا۔ اندھیری رات میں سخت پریشان ہو گئے، سردی سے تاپنے کے لیے آگ موجود نہ تھی۔ ان مصائب میں دور سے ایک آگ نظر آئی (حقیقت میں وہ آگ نہ تھی بلکہ اللہ کا نور تھا)۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے ظاہری آگ سمجھ کر بیوی صاحبہ سے کہا: تم یہیں ٹھہرے رہو، میں آگ کا کوئی انگارہ لیتا آؤں۔ جب وہاں پہنچے تو عجیب و غریب منظر دیکھا۔ ایک درخت پر زور و شور سے آگ لگ رہی ہے اور آگ جس قدر بھی بھڑکتی ہے، درخت اسی قدر سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگتا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام جونہی آگ کے قریب جاتے تو آگ دور ہو جاتی اور جب اس سے دور ہوتے تو آگ قریب ہونے لگتی۔ اس حیرت و دہشت میں درخت سے آواز آئی: اے موسیٰ! میں رب العالمین ہوں۔ ڈرو نہیں! تمہیں نبوت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ بعض دفعہ صاحب کشف کو خود اپنے کشف کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نور الٰہی محسوس نہ ہوا اور اس کو انہوں نے دنیاوی آگ سمجھا۔

ملحوظہ: امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں ایک روایت نقل کی ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے جب اس آگ میں ندائے غیبی ''یا موسیٰ'' سنا تو کئی بار لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ پکارا (میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں) اور عرض کی: یارب! میں آپ کی آواز سن رہا ہوں اور آہٹ محسوس کر رہا ہوں مگر یہ نہیں دیکھ پا رہا ہوں کہ آپ کہاں ہیں۔ آواز آئی: میں تیرے اوپر ہوں، تیرے ساتھ ہوں، تیرے آگے ہوں، تیرے پیچھے ہوں اور تیری جان سے قریب تر ہوں۔ (مسند احمد)

شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام ندائے غیبی ہر جانب سے اور اپنے بدن کے رواں رواں سے سن رہے تھے (لیکن کوئی شخصیت نظر نہیں آ رہی تھی)۔ (موضح القرآن)

⑫ ﴿إِنِّيٓ أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۖ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝﴾ [سورۃ طٰہٰ: 12]

ترجمۃ: میں تمہارا رب ہوں سو تم یہاں اپنی جوتیاں اتار دو۔ بے شک تم ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو۔

تفسیر: جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کو لے کر شہر مدین سے اپنے وطن ملک مصر آ رہے

تھے، رات کی تاریکی میں راستہ بھول کر دوسری سمت نکل گئے آگے۔ دور کچھ روشنی نظر آئی، آگ سمجھ کر لینے گئے۔ جب اس مقام پر پہنچے تو ندا آئی: موسیٰ! اپنی جوتیں اتار دو۔ اس میدان کا نام طویٰ تھا۔ چونکہ یہاں اللہ کی تجلیات نازل ہو رہی تھیں، مقام مقدس ہو گیا، ادب و احترام کا تقاضہ تھا کہ جوتے اتار دیے جائیں۔ (ابن کثیر)

سُلوك: حکیم الامت ﷫ لکھتے ہیں کہ مقامات مقدسہ کا ادب واحترام مذکورہ آیت سے ثابت ہوتا ہے۔

ملحوظہ: تقدس وتبرک کا معیار کہ کون سی چیز اور کون سی جگہ مقدس ومتبرک ہے، انسانی عقل وفہم سے متعلق نہیں کہ ہم جس کو مقدس سمجھیں، وہ مقدس ہو جائے بلکہ اس کا حقیقی معیار کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہیں کہ شریعت اسلامی جس مقام یا جس چیز کو مقدس قرار دے، وہ مقدس ومتبرک سمجھی جائے گی۔

وَمَا بَعْدَ ذٰلِكَ اِلاَّ الضَّلاَل

③ ﴿قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى﴾ [سورة طٰه: 21]

ترجمة: اللہ نے فرمایا: اے موسیٰ! اسے پکڑ لو اور ڈرو نہیں، ہم اسے ابھی اس کی پہلی صورت پر کیے دیتے ہیں۔

تفسیر: وادیٔ طویٰ میں نبوت سے سرفراز کیے جانے کے بعد سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دو② معجزے ① ید بیضاء ② عصائے موسیٰ دیے گئے اور ہدایت کی گئی کہ اپنا عصاء (لاٹھی) زمین پر ڈال دو۔ چنانچہ ڈالتے ہی وہ پھرتیلا سانپ بن گیا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام مارے خوف کے پیٹھ پھیر کر بھاگے، اللہ نے پھر آواز دی: گھبراؤ نہیں، اس کو پکڑ لو۔ پکڑنا ہی تھا کہ وہ عصاء اپنی اصل شکل پر آ گیا۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ لکھتے ہیں کہ غیر طبعی چیزوں سے ڈر جانا فطری بات ہے۔ انسانی کمال تو کیا نبوت کے بھی خلاف نہیں (اگر موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے ہوں تو کوئی عیب کی بات نہیں)۔

ملحوظہ: بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ جو حادثہ مخلوق کی جانب سے پیش آئے، اس سے خوف نہ کرنا کمال وہمت کی بات ہے (یعنی جرأت وشجاعت کی بات ہے) جیسا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام آتش نمرود سے قطعی نہیں ڈرے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

اور جو حادثہ اللہ کی طرف سے (یعنی بغیر اسباب ظاہری) ہو اس میں ڈرنا ہی کمال وادب کی بات ہے کیونکہ ایسا ڈرنا حقیقتاً اللہ ہی سے ڈرنا ہوا جیسے ہوا تیز ہونے کے وقت نبی کریم ﷺ گھبرا جاتے تھے کہ کہیں یہ عذاب الٰہی نہ بن جائے۔ اس قسم کی مثالیں کتب حدیث میں موجود ہیں۔

④ ﴿وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝﴾ [سورة طٰه: 29 تا 32]

ترجمة: اور میرے لیے میرے خاندان میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے۔ یعنی ہارون کو جو میرے بھائی ہیں۔ ان کے ذریعہ میری قوت کو مستحکم کر دیجئے۔ اور ان کو میرے کام تبلیغ میں شریک کر دیجئے۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز کر دیئے جانے کے بعد فرعون اور اہل فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا گیا اور یہ بھی ہدایت کی گئی کہ اس کو نرمی اور خیر خواہی سے توحید کی دعوت دیں، یہ نہایت سرکش و باغی ہو چکا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تائید و تقویت کے لیے اللہ تعالیٰ سے اپنے بڑے بھائی سیدنا ہارون علیہ السلام کی خدمات بھی طلب کیں کہ ان کو بھی میرے ساتھ چلنے کی اجازت دیجئے۔ چنانچہ اجازت مل گئی۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کاملین بھی ظاہری اسباب اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ (یہ عمل نہ بزرگی کے خلاف ہے نہ توکل کے خلاف) اسباب اختیار کرنے میں ان حضرات کا مقصود دین اور استعانت فی الدین ہی ہوا کرتا ہے۔

⑤ ﴿اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى﴾ [سورة طٰهٰ: 38]

ترجمة: جب ہم نے تمہاری ماں کو وہ بات الہام کی جو الہام کیے جانے کے قابل تھی۔

تفسیر: الہام اس خفیہ پیام کو کہا جاتا ہے جو بغیر واسطہ دلوں میں آ جائے، یہی کلام و پیام اگر اللہ اور اس کے فرشتوں کی جانب سے نیک و صالحین کے قلوب میں آ جائے تو اس کو الہام خداوندی کہا جاتا ہے۔ اور اگر نفس و شیاطین کی جانب سے ہو تو وہ ''وساوس و خیالات'' ہیں (اہل علم سے مراجعت کی جائے)۔

فرعون کی شیطانی تحریک ''قتل اولاد'' سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی ماں کے قلب میں الہام کیا کہ بچے کو ایک صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا جائے، چنانچہ ام موسیٰ نے ایسا ہی کیا۔

(تفصیل کے لیے ''ہدایت کے چراغ'' جلد اول، صفحہ ۴۰۵ دیکھئے)

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے استدلال کیا کہ نبیوں کے علاوہ نیک و صالحین کو بھی اللہ کی جانب سے الہام ہو سکتا ہے۔ (سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی نہ تھیں، ولیہ و صدیقہ تھیں)

⑥ ﴿وَ قَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ﴾ [سورة طٰهٰ: 40]

ترجمة: اور تم نے اے موسیٰ! (غلطی سے) ایک شخص کو جان سے مار ڈالا پھر ہم نے تم کو اس غم سے نجات دی۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا یہ اقدام قصداً و ارادۃً نہ تھا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک کمزور مسلمان کو ایک فرعونی زد و کوب کر رہا تھا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اس ظالم فرعونی کو ایک مکا رسید کیا، وہ ایسا کمزور و بودہ ثابت ہوا کہ وہیں دم توڑ دیا۔ (تفصیل سورۂ قصص میں دیکھی جائے)

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ کاملین سے بھی لغزش ہو سکتی ہے لیکن ان کی یہ لغزش

چونکہ نفسانی یا ہیجانی نہیں ہوتی، اس لیے قابل مواخذہ بھی نہیں۔ اس کے باوجود یہ حضرات توبہ واستغفار کیا کرتے ہیں۔ ان حضرات کی لغزش اوروں کی لغزش سے مختلف ہوا کرتی ہے۔

﴿وَ اَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ﴾ [سورة طٰهٰ: 39]

ترجمة: اور میں نے تمہارے اوپر اپنی طرف سے ایک (خاص) محبت کا اثر ڈال دیا تھا۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کے ایک خاص احسان کا ذکر ہے کہ جب یہ پیدا ہوئے تو اللہ نے ان کے جسم پر اپنی صفات میں سے ایک صفت ''صفت محبت'' ڈال دی۔ اس کا ظاہری اثر یہ ہوا کہ بچے کو جو بھی دیکھتا، فریفتہ ہو جاتا۔ علاوہ ازیں بڑی حسین وجمیل شکل وصورت بھی تھی حتیٰ کہ بچوں کے قاتل فرعون اور اہل فرعون بھی متاثر ہو گئے اور انہوں نے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے علم تصوف کا وہ مسئلہ ثابت کیا ہے جو صوفیاء میں ''مسئلۂ مظہریت'' کے نام سے معروف ہے۔ مذکورہ آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

مظہریت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے حد وحساب صفات میں ایک صفت ''صفت محبت'' بھی ہے کہ وہ ''اَلْوَدُوْد'' محبت کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی اس صفت کی کیفیت کو اپنے کسی بندے کی شکل وصورت پر پیدا کر دیتے ہیں تو وہ بندہ محبوب خلائق ہو جاتا ہے۔ انسان ہی نہیں حیوانات بھی اس بندے سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کو مسئلۂ مظہریت کہا جاتا ہے کہ یہ بندہ اللہ کی صفت محبت کا مظہر ونمونہ ہے۔ یہ صرف ایک صفت حال کا نہیں، اللہ کی دیگر صفات کی بھی یہی شان ہے کہ جب وہ کسی بندے پر ڈال دی جاتی ہیں تو بندے میں وہ شان پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس خاص انعام واکرام کے باوجود بندہ، بندہ ہی ہے۔ نہ اللہ کی ذات میں شریک ہوا، نہ اس کی صفات میں شریک ہوا۔

محققین صوفیاء کہتے ہیں:

وَالْعَبْدُ عَبْدٌ اِنْ تَرَقّٰی وَالرَّبُّ رَبٌّ اِنْ تَنَزَّلْ

بندہ، بندہ ہی ہے اگرچہ عروج کرے اور اللہ، اللہ ہی ہے اگرچہ نزول کرے

﴿اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰیٰتِیْ وَ لَا تَنِیَا فِیْ ذِكْرِیْ﴾ [سورة طٰهٰ: 42]

ترجمة: تم اور تمہارے بھائی میری نشانیوں کے ساتھ جاؤ اور میری یاد میں سُستی نہ کرنا۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو یہ ہدایت نبوت ملنے کے بعد دی جا رہی ہے کہ تم اور تمہارے بھائی ہارون علیہ السلام دونوں فرعون کے پاس جائیں اور میرے عطا کردہ معجزات (ید بیضا، عصا) سے کام لیں۔ اور یاد رکھنا

کہ اس کارِ عظیم کی ادائیگی (دعوت توحید) میں ذکر الٰہی سے غفلت نہ برتنا۔ دعوت وتبلیغ کے کام ہوں یا تدریس وتالیف کے کام ہوں، خود کو ذکر الٰہی سے معمور رکھنا خیر و برکت کا ذریعہ ہو جاتا ہے اور اس کا نفع متعدی ہوتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ لکھتے ہیں کہ اس ہدایت میں اہل علم کے اس قول کی تائید ہے کہ معلم کو خود بھی ذاکر ہونا چاہیے تاکہ شاگردوں کو تعلیم وارشاد کی برکتیں نصیب ہوں۔

⑨ ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝﴾ [سورة طٰهٰ: 44]

ترجمة: پھر اس (فرعون) سے بات چیت نرم کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا عذاب الٰہی سے ڈر جائے۔

تفسیر: آیت میں دعوت وتبلیغ کا مرکزی نکتہ بیان کیا جارہا ہے کہ اس کام میں بہر صورت حسن اخلاق وحکمت و دانائی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

سیدنا موسیٰ وہارون ﷦ کو نصیحت کی جارہی ہے کہ فرعون اور آل فرعون کو اسی اصول کے تحت دعوت دی جائے۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے لکھا ہے کہ آیت کے اندر اخلاق کا بہت بڑا درس ہے کہ باوجود فرعون کی بغاوت و سرکشی جس کا ذکر اوپر کی آیات میں آچکا ہے، سیدنا موسیٰ ﷷ جیسے برگزیدہ نبی و رسول کو حکم دیا جارہا ہے کہ فرعون سے لطف وعنایت کے ساتھ پیش آنا۔

حکیم الامت ﷫ نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ وصف اہل طریق میں کثرت سے رائج ہے۔

⑩ ﴿قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ۝﴾ [سورة طٰهٰ: 46]

ترجمة: ارشاد ہوا کہ تم اندیشہ نہ کرو کیونکہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، سب سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ وہارون ﷦ کو فرعون کے دربار میں جانے سے پہلے یہ تسلی دی جارہی ہے کہ اس متکبر سے تم کوئی اندیشہ نہ کرنا، میں تمہارے ساتھ ہوں، بلاخوف واندیشہ اپنا پیام پہنچا دینا۔

تفسیر ماجدی کے مفسر لکھتے ہیں کہ کسی کانسٹیبل سے وائسرائے جنرل یہ کہہ دیں کہ فلاں ڈاکو سے مقابلہ کرنے میں تم اندیشہ نہ کرو، ہم خود مع اپنی ساری قوت کے تمہارے ساتھ ہیں تو وہ کیسا باغ باغ ہو جائے گا اور اسے کیسا زبردست سہارا ہاتھ آجائے گا۔ پھر یہاں تو بندے کو اللہ کا سہارا ہاتھ آرہا ہے، تسکین وتقویت قلب کی اس سے بڑی کوئی اور صورت بھی ہوسکتی ہے؟

حکیم الامت ﷫ لکھتے ہیں کہ مذکورہ آیت کی دو تفسیریں ہیں۔ آیت یہ ہے:

﴿اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى﴾

(بے شک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، دیکھتا ہوں اور سنتا ہوں)

پہلی تفسیر تو یہ کہ ﴿اَسْمَعُ وَ اَرٰی اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ﴾ کی تفسیر قرار دی جائے۔ مطلب یہ ہوگا کہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں اور سن رہا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری صفت سمع و بصر (دیکھنا اور سننا) تم دونوں کے ساتھ ہیں۔ (قرب صفاتی)

دوسری تفسیر یہ کہ دونوں جملوں کو مستقل قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں اور دیکھ رہا ہوں اور سن بھی رہا ہوں یعنی میری ذات تم دونوں کے ساتھ ہے۔ (قرب ذاتی)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ پہلی تفسیر مراد لی جائے تو اس سے "قرب صفاتی" کا ثبوت ہوگا اور دوسری تفسیر مراد لی جائے تو اس سے "قرب ذاتی" کا ثبوت ہوگا۔

دَلِیْلُهُمَا قَوْلُه تَعَالٰی ﴿اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۚ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ﴾

ملحوظہ: قربِ ذاتی اور قربِ صفاتی علم تصوف کی معروف اصطلاح ہیں، تفصیل کے لیے اہل علم سے مراجعت کی جائے۔

⑪ ﴿قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا یٰمُوْسٰی ۝﴾ [سورۃ طٰہٰ: 49]

ترجمۃ: کہنے لگا: اے موسیٰ! پھر یہ تو بتاؤ کہ تم دونوں کا رب کون ہے؟ موسیٰ نے کہا کہ ہمارا (اور سب کا) رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی مناسبت بناوٹ عطا فرمائی پھر رہنمائی کی۔

تفسیر: ہدایت ربانی کے مطابق جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اہل فرعون کو دعوت توحید دی تو کہنے لگا: اے موسیٰ! تم کس خدا کی دعوت دے رہے ہو؟ خدا تو میں خود ہوں، مصر میں فرعون سب سے بڑا دیوتا (سورج دیوتا کا اوتار) سمجھا جاتا تھا اور خدائی اختیارات کا حامل بھی۔ عوام نے انہی تصورات کے تحت اس کا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ وہ اب تک خود اپنی ذات کو سب کو بڑا دیوتا، اوتار سننے کا عادی ہو چکا تھا۔ اب جونہی بات سنی تو حیرت سے پوچھتا ہے کہ اچھا بتاؤ تمہارا رب کون ہے؟

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ارے تو اس کو نہیں جانتا۔ وہ تو وہ ذات ہے جس نے ساری مخلوقات کو وجود عطا کیا اور جو کام جس سے لینا چاہا، اسی کے مطابق اس کے اعضاء و جوارح بھی پیدا کیے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے جواب سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ اللہ کی ذاتی معرفت بیان کرنا محال ہے البتہ تعریف بالصفات وَالْاَفْعَال بیان کی جاسکتی ہے۔

(چنانچہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سوال پر اللہ کا تعارف اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ تو وہ ذات ہے جس نے ساری مخلوق کو پیدا کیا اور پھر ہر ایک کو اس کے مناسب اسی کام میں لگا دیا، دراصل یہی اللہ کا صفاتی تعارف ہے۔

⑫ ﴿وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ۝﴾ [سورۃ طٰہٰ: 53]

ترجمة: اورآسمان سے پانی اتارا، پھرہم نے اس کے ذریعہ مختلف قسم کے طرح طرح کے نباتات پیدا کیے۔

تفسیر: مذکورہ آیات میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا صفاتی تعارف کروارہے ہیں کہ اس نے انسانوں کے لیے زمین کوفرش بنایا جس پرتم سب آرام واستراحت کرتے ہو۔ پھرزمین میں راستے بنائے جس پرتم چلتے پھرتے ہواورآسمان سے بارش نازل کی، پھرہم نے اس پانی سے نباتات (پھل، پھول، غذائیں) پیدا کیے۔

﴿فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا﴾ پھرہم نے طرح طرح کے نباتات پیدا کیے۔ اس جملہ میں خطاب، غائب سے حاضر کی طرف کردیا گیا (ہم نے پیدا کیا)

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے اس عنوان سے یہ عقیدہ ثابت کیا کہ ہر شئی کے مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہیں، اس لیے یہاں ''اس نے پیدا کیا'' کے بجائے ''ہم نے پیدا کیا'' خطاب حاضر کا اختیار کیا۔

البتہ ﴿فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ﴾ (یعنی ہم نے یہ سب پانی سے پیدا کیا) پانی کے ذکر سے اسباب کا ثبوت بھی نکل رہا ہے یعنی فاعل حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں البتہ اسباب کا اختیار کرنا بھی جائز ہے۔

﴿قَالَ لَهُمۡ مُّوۡسٰى وَيۡلَكُمۡ لَا تَفۡتَرُوۡا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا﴾ [سورة طٰهٰ: 61]

ترجمة: موسیٰ نے ان جادوگروں سے کہا: ارے کم بختی مارو! اللہ پر جھوٹ نہ بولو ورنہ وہ تم کو عذاب سے نیست و نابود کردے گا۔ اور جو جھوٹ باندھتا ہے ناکام ہی رہتا ہے۔

تفسیر: جادوگرحق کا مقابلہ جھوٹ (جادو) سے کرنا چاہتے تھے۔ ان کو تنبیہ دی گئی کہ دیکھو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو کیونکہ جھوٹ (باطل) سے حق کا مقابلہ کرنے والے ہمیشہ ہی ناکام رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر کوئی آسمانی عذاب ٹوٹ پڑے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور آل فرعون سے ترش لہجہ اختیار نہیں کیا بلکہ نرمی اور خیرخواہی سے گفتگو کی اور ساحروں سے ترش لہجہ اختیار کیا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا یہ اسلوب ''حفظ مراتب'' کا درس دیتا ہے کہ ہر شخص سے اس کے ذوق ومزاج ومرتبہ کے مطابق کلام کیا جائے۔

﴿فَاَوۡجَسَ فِىۡ نَفۡسِهٖ خِيۡفَةً مُّوۡسٰى ۝﴾ [سورة طٰهٰ: 67]

ترجمة: سوموسیٰ کے دل میں تھوڑا سا خوف ہوا۔

تفسیر: جادوگروں نے مقابلہ میں اپنی رسّیاں و لاٹھیاں زمین پر ڈال دیں تو وہ یکایک سانپ بن کر دوڑنے لگے، سیدنا موسیٰ علیہ السلام اس غیر متوقع وخوفناک منظر سے کچھ خوف زدہ ہوگئے پھر یہ خوف جاتا رہا جب آپ کا عصا پھرتیلا سانپ بن کر جادوگروں کے کرتب کو نگلنا شروع کردیا۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے اس واقعہ سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت ثابت کی کہ ابتداءً خوف زدہ ہونا اس

بات کی علامت ہے کہ آپ مدّعی کمال نہ تھے کیونکہ مدّعی خوف زدہ نہیں ہوتا، اس کو ایک زعم و پندار ہوا کرتا ہے اور وہ اس نشہ میں اپنی شکست کا تصور نہیں کرتا۔

(ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ باکمال آدمی اپنے آپ کو باکمال نہیں سمجھتا۔)

⑮ ﴿قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ﴾ [سورة طٰهٰ: 72]

ترجمۃ: جادوگروں نے فرعون کو صاف جواب دے دیا کہ ہم تجھ کو کبھی ترجیح نہ دیں گے بہ مقابلہ ان دلائل کے جو ہم کو ملے ہیں اور بہ مقابلہ اس ذات کے جس نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ لہٰذا تجھ کو جو کرنا ہو، کر لے۔

تَفسِیر: جادوگروں نے جب اپنے کرتبوں کو فنا ہوتے دیکھا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا عصاء سانپ بن کر میدان کے ہزاروں اژدہاؤں کو نگل رہا ہے تو ان کی فطرت نے یقین کر لیا کہ موسیٰ کا عمل سحر نہیں ہے، خدائی طاقت ہے جو موسیٰ کے ہاتھوں جاری ہو رہی ہے، بس سب سجدہ میں گر پڑے اور کلمۂ توحید کا اقرار کر لیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے اس واقعہ سے ایک لطیف بات کا استخراج کیا ہے کہ جب فطرت مسخ نہ ہو اور استعداد درست ہو تو مبتدی یکدم منتہی کے مقام پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

(ساحروں کا سجدہ میں گر جانا ان کے کامل الایمان ہونے کی علامت ہے۔ طٰہٰ: ۷۳)

⑯ ﴿قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۙ اَلَّا تَتَّبِعَنِ﴾ [سورة طٰهٰ: 92 تا 93]

ترجمۃ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے ہارون علیہ السلام! تمہیں کون سا امر مانع ہوا اس سے کہ میرے پاس چلے آتے جب تم نے دیکھ لیا تھا کہ یہ لوگ بھٹک گئے ہیں؟

تَفسِیر: یہ بات اس واقعہ سے متعلق ہے جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام توریت لینے کے لیے کوہِ طور پر چلے گئے تھے اور چلتے وقت قوم میں اپنے بھائی سیدنا ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب و خلیفہ مقرر کیا تھا۔ اس اثناء قوم کے ایک ہوشیار شخص سامری نے گوسالہ پرستی (گائے کی پوجا) پر ساری قوم کو ڈال دیا، سیدنا ہارون علیہ السلام سے اس کا انسداد نہ ہو سکا اور وہ بے بس ہو گئے۔ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کتاب تورات لے کر قوم میں آئے تو قوم کا یہ برا حال دیکھ کر سیدنا ہارون علیہ السلام پر برس پڑے اور کہا کہ اگر تم سے اس کا انسداد نہ ہو سکتا تھا تو اپنے ساتھیوں کو لے کر میرے پاس کوہِ طور پر آ جاتے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ جب اشرار کی تعلیم و تربیت سے مایوسی ہو جائے تو ان سے مفارقت کر لینی چاہیے۔

⑰ ﴿قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ﴾ [سورة طٰهٰ: 96]

ترجمۃ: سامری نے کہا: مجھ کو ایسی چیز نظر آئی جو دوسروں کو نظر نہ آئی تھی پھر میں نے اس فرستادہ کے نقش قدم

سے ایک مٹھی بھر خاک اٹھالی اور وہ مٹی اس قالب میں ڈال دی اور میرے جی کو یہی بات پسند آئی۔

(یعنی مجھ کو ایسا ہی سوجھا)

تفسیر: تفسیر روح المعانی میں روایات نقل کی گئیں ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ سونے چاندی کے وہ زیورات جو بنی اسرائیل (قوم موسیٰ) نے ہجرت کرنے سے پہلے مصریوں سے عاریۃً مانگ لیے تھے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے چالیس دن کوہ طور پر قیام کے زمانے میں سامری نے ان سب زیورات کا ایک مجسمہ بنایا اور وہ مشت خاک جو اس نے جبرئیل امین کی سواری کے نقش قدم سے اٹھایا تھا، اس بچھڑے کے پیٹ میں ڈالدی، بچھڑے میں حرکت سی پیدا ہوئی ور وہ بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ یہ کرشمہ دکھا کر قوم سے کہا: موسیٰ تو خدا سے ملنے طور پر گئے ہیں لیکن خدا ہمارے پاس ہے۔ پھر کیا تھا بےوقوف قوم بچھڑے کی پوجا کرنے لگی۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور سے واپس آئے اور سامری کا تعاقب کیا تو اس نے مذکورہ تفصیل سنائی اور یہ بھی کہا کہ ترکیب میری اپنی خانہ زاد ہے، سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے لعنت کی اور فرمایا کہ اب تو زندگی بھر لوگوں سے کہتا پھرے گا کہ مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے، نہ میرے قریب آئے۔

چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ وہ زندگی بھر باؤلے کتے کی طرح بچا بچا پھرتا تھا، جو کوئی اس کے قریب ہوتا یا یہ خود کسی کے قریب ہوتا تو تیز بخار میں مبتلا ہو جاتا، آخر اسی ذلت ورسوائی میں فوت ہوا۔

سُلوك: اہل تحقیق صوفیاء لکھتے ہیں کہ کشف وتصرف پر ناز کرنا خطرناک ثابت ہوا ہے۔

ملحوظہ: علامہ مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ہندوستان (بھارت) میں چُھوت چھات کی جو رسم چل پڑی ہے عجب نہیں اس کی اصل بھی سامری کی ''لامساس'' (مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے) سے نکلتی ہو۔

(تفسیر ماجدی)

شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سونا تھا کافروں کا مال لیا ہوا، فریب سے اس میں مٹی پڑی برکت کی، حق وباطل مل کر ایک کرشمہ بن گیا کہ جاندار کی طرح روح اور آواز اس میں ہوگئی۔

آگے لکھتے ہیں کہ ایسی چیزوں سے بہت بچنا چاہیے، اس سے بت پرستی بڑھتی ہے۔ (موضح القرآن)

﴿وَ لَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ [سورة طٰهٰ: 115]

ترجمة: اور اس سے (بہت زمانہ) پہلے ہم نے آدم کو ایک حکم دیا تھا سو ان سے غفلت ہوگئی اور ہم نے ان میں (حکم توڑنے کا) عزم نہ پایا۔

تفسیر: اللہ کا یہ حکم جنت کے ایک خاص درخت کے قریب نہ جانے کا تھا، سیدنا آدم علیہ السلام ایک عرصہ تک تو پابند رہے پھر حکم بھول گئے اور درخت کا دانہ کھالیا۔

عزم پختہ ارادے کو کہا جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، قرآن حکیم کی یہ آیت بیان کرتی ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام کے اس حکم توڑنے میں ان کا عزم وارادہ شامل نہ تھا۔

ایک غفلت ولغزش تھی جو طبعی طور پر ہر انسان میں پائی جاتی ہے اس لیے اس کو گناہ نہیں کہا جاتا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طبعی ضعف اور کمال میں منافات نہیں۔ (یعنی ممکن ہے کہ ایک شخص باکمال ہو اور اس میں کمزوری و بھول بھی ہو)

⑲ ﴿فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى﴾ [سورة طٰہٰ: 120]

ترجمة: پھر آدم علیہ السلام کو شیطان نے بہکایا، کہنے لگا: اے آدم! کیا میں تم کو ہمیشگی (کی خاصیت) کا درخت بتلاؤں اور ایسی بادشاہی جس میں کبھی کمزوری نہ آئے؟

تفسیر: شیطان کا دم فریب یہی تھا کہ اس نے سیدنا آدم علیہ السلام سے قسم کھا کر کہا: میں تمہارا خیر خواہ ہوں، میں آپ کو جنت کے ایک خاص درخت کا پتہ دیتا ہوں جس کے پھل پھول میں یہ تاثیر ہے کہ اس کے چکھنے سے آپ غیر فانی ہو جائیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ جنت میں مقیم رہیں گے۔

جنت میں قیام کا حریص سیدنا آدم علیہ السلام سے زیادہ اور کون ہوگا جب کہ وہ عرصۂ دراز تک جنت کی خوش عیشی سے مستفید رہے ہیں، دشمن کے فریب میں آگئے اور درخت کا دانہ کھالیا۔

(تفصیل کے لیے "ہدایت کے چراغ" جلد ا/صفحہ ۳۰ دیکھئے جو اس حادثہ کی قرآنی تفصیل ہے)

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ سے علم تصوف کا ایک لطیف مسئلہ بیان کیا ہے کہ ثمرات غیر مقصودہ کی طلب سالک کو مضر ہو جاتی ہے۔

(شیطان نے سیدنا آدم علیہ السلام کو جنت کا خلود اور اس کی ملکیت جس کی تحصیل کا علم نہیں دیا گیا تھا، ترغیب دی۔ ظاہر ہے یہ غیر مقصود ثمرات تھے جس کی طلب میں سیدنا آدم علیہ السلام تجاوز کر بیٹھے۔ نتیجہ یہی ظاہر ہوا کہ جنت جیسی آرام گاہ سے زمین پر آنا پڑا، غیر مقصود ثمرات کی طلب میں نقصان ہی ہوا۔)

⑳ ﴿ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى﴾ [سورة طٰہٰ: 122]

ترجمة: پھر ان کے رب نے انہیں مقبول بنالیا اور ان پر توجہ کی اور راہ ہدایت دکھادی۔

تفسیر: سیدنا آدم علیہ السلام کی لغزش پر انہیں زمین پر اتار دیا گیا۔ سیدنا آدم علیہ السلام نے توبہ کی، اللہ نے انہیں اپنا مقبول بندہ بنالیا اور صراطِ مستقیم کی رہنمائی کی جس پر وہ تاحیات قائم رہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے الفاظ سے تصوف کی دو اصطلاح کا اثبات کیا ہے جو علم تصوف میں لکھی

اور پڑھی جاتی ہیں:

(1) جذب اور (2) سلوک۔

سیدنا آدم علیہ السلام کی توبہ پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اِجْتَبٰهُ (مقبول کرلیا، چن لیا، پسند کرلیا) اس کیفیت کو علم تصوف میں جذب کہا جاتا ہے۔

وَهَدٰى (رہنمائی کی، صراطِ مستقیم نصیب کی) اسی کیفیت کو سلوک کہا جاتا ہے۔

الغرض اجتباء کا مل جذب اور ہدایت کا حاصل سلوک قرار پاتا ہے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جذب، سلوک سے افضل ہے کیونکہ جذب اللہ تعالیٰ کا عمل ہے اور سلوک بندے کا۔ (سلوک ۱۴۶ مطالعہ کیجئے)

(21) ﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾ [سورة طٰهٰ: 124]

ترجمة: اور جس نے میرے ذکر سے منہ پھیرا تو اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا۔

تَفسِير: ذِكْرِىْ سے مراد یاد، نصیحت، قرآن لیے گئے ہیں لیکن سب کا حاصل ایک ہی ہے یعنی جو کوئی اللہ کی یاد و عبادت سے دور ہوگیا، اس کی دنیاوی زندگی غیر مطمئن، پریشان اور بے لطف ہوگئی۔ یہ تو اس کی دنیا کا انجام ہے۔ حشر کے دن ایسا آدمی ابتداءً اندھا اٹھے گا اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے مسئلہ قبض کا اثبات کیا ہے جو سالک کو کبھی گناہ یا غفلت یا کسی اور وجہ سے قلب میں تنگی پیدا ہو جاتی ہے جس کا ظاہری اثر عبادات کا ذوق وشوق، لطف وچین گم ہو جاتا ہے اور وہ اپنی اسلامی زندگی کو تلخ اور بے لطف محسوس کرنے لگتا ہے۔ (سلوک ۱۳۱ اور ۱۰۷ مطالعہ کیجئے)

(22) ﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ﴾ [سورة طٰهٰ: 131]

ترجمة: اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے جن کو ہم نے کافروں کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لیے دے رکھا ہے کہ وہ محض دنیاوی زندگی کی رونق ہیں اور آپ کے رب کی عطا کہیں بہتر اور دیرپا ہے۔

تَفسِير: دنیا میں قسم قسم کے کافروں مثلاً یہود، نصاریٰ، مشرک، بت پرست، مجوسی، بدھ مت انسانوں کو جو عیش و عشرت کا سامان دیا گیا ہے، ان کی جانب آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے۔ یہ چیزیں دیکھنے کے بھی قابل نہیں ہیں، ان کا یہ عیش چندہ روزہ بہار ہے جس کے ذریعہ ان کا امتحان لیا جارہا ہے کہ کون احسان مانتا ہے اور کون سرکشی کرتا ہے۔ بس وہ چند روزہ بہار آنکھ بند ہونے کی مدت ہے پھر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

اے نبی! ہم نے جو دولت ایمان و اسلام اور قرآن کی دی ہیں، وہ دنیا کی عارضی وفانی نعمتوں سے کہیں زیادہ

بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صوفیاء کرام میں ایک خصوصی عمل ہے جس کو وہ اپنی زبان میں ''نظر بر قدم'' کہا کرتے ہیں، مذکورہ آیت میں اس کی تائید ہوتی ہے۔

(یعنی جو چیزیں اللہ کی یادوفکر سے غافل کردیتی ہیں، ان سے آنکھیں بند کر لینی چاہیے، اس جانب توجہ نہ دیں)

ملحوظہ: دنیا کی ان زخرفات، رونقوں اور آسائشوں کو مذکورہ آیت میں ''زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' کہا گیا ہے ''زَهْرَةٌ'' کے معنی تازگی وشادابی ہیں۔

دنیا کے اس تعارف میں یہ نکتہ ملحوظ ہے کہ یہ ساری چیزیں صرف تازگی وشادابی ہیں جو اپنے اپنے وقت پر مرجھا جائیں گی۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلاَّ مَتَاعُ الْغُرُوْرِ

سُوْرَةُ الْأَنْبِيَاءِ

پارہ: 17

(1) ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ [سورة الأنبياء: 1]

ترجمۃ: قریب آ گا لوگوں سے ان کے حساب کا وقت اور وہ غفلت ہی میں پڑے ہیں اعراض کیے ہوئے۔

تفسیر: حساب کا وقت سے مراد قیامت کا دن ہے کہ وہ انسان کے لیے ہر دن قریب تر ہوتی جا رہی ہے، انسان کے لیے دو قیامت ہیں۔ پہلی قیامت تو خود اس کی موت ہے۔ جب وہ آ گئی، اس پر قیامت قائم ہوگئی۔ دوسری قیامت کائنات کی ہے جس میں زمین و آسمان، چاند سورج، ستارے بکھر جائیں گے۔

لیکن انسان کی غفلت کا یہ حال ہے کہ اس کی فکر تو کیا کرتا، اس حادثہ کا بھی یقین نہیں رہا ہے، غفلت میں پڑا ہے۔ آج یورپ و یورپ زدہ مشرق کی ساری آبادی کا یہی حال ہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ غفلت سے مراد انکار و بغاوت ہے جو آخرت سے منھ موڑے ہوئے ہیں۔ مطلق غفلت مراد نہیں جس سے کوئی بھی خالی نہیں۔

(2) ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ ﴾ [سورة الأنبياء: 7]

ترجمۃ: اور ہم نے (اے نبی!) آپ سے قبل مردوں ہی کو (نبی بنا کر) بھیجا ہے جن پر ہم وحی نازل کرتے رہے ہیں۔

تفسیر: سلسلۂ نبوت ہمیشہ مردوں میں رہا ہے، کوئی عورت نبی نہیں رہی۔ نیز ہر ملک و قوم سے مردوں کا انتخاب کیا گیا ہے، فرشتہ یا کسی فوق البشر ہستی کو نبی نہیں بنایا گیا ہے۔

"رِجَالًا" رَجُلٌ (مرد) کی جمع ہے۔ یہاں بشر نہیں کہا گیا جس میں عورت بھی شامل ہو جاتی۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نبوت جیسے مردوں میں جاری رہی ہے، ایسے ہی اہل طریق نے خلافت بھی صرف مردوں کو دی ہے۔

(3) ﴿ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ﴾ [سورة الأنبياء: 8]

ترجمۃ: اور ہم نے ان رسولوں کے ایسے جسم نہیں بنائے جو کھانا کھاتے ہوں اور نہ وہ ایسے تھے کہ ہمیشہ زندہ رہیں۔

تفسیر: نبی و رسول بشری ضرورتوں سے بے نیاز نہیں ہوا کرتے ہیں، انہیں عام انسانوں کی طرح بھوک و پیاس، دکھ درد، خوف و غم سب کچھ ہوا کرتا تھا۔ وہ جس طرح بشری ضرورتوں کے ساتھ دنیا میں آئے، سلامتی و ہدایت کے ساتھ موت کا بھی ذائقہ چکھے ہیں، اللہ نے انہیں انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے

لیے مبعوث کیا تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ کھانا وغیرہ نہ کھانا کمالات وفضائل میں شامل نہیں ہے جیسا کہ عام لوگ بلکہ بعض خاص لوگ بھی ایسا خیال کرتے ہیں (کہ حضرت پہلے تو کھاتے ہی نہیں ہیں اور اگر کھاتے بھی ہیں تو برائے نام یا بطورسنت چکھ لیتے ہیں) وَلاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ اِلاَّ بِاللّٰهِ

④ ﴿وَ لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ﴾ [سورة الأنبياء: 17]

ترجمة: (کائنات کی پیدائش میں) اگر ہم کو اپنا مشغلہ ہی بنانا منظور ہوتا تو ہم اپنے پاس کی خاص کی خاص چیزوں کو مشغلہ بنالیتے۔

تفسیر: بعض مشرک قوموں کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ یہ کائنات اور اس کی رنگارنگی محض ''ایشور کی لیلا'' ہے (خدا کی تماشہ گاہ)۔ اس کائنات سے خدا کا مقصود صرف تماشہ دیکھنا اور دکھانا ہے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

آیت میں اس طفل خیالی کی تردید کی جارہی ہے کہ اگر کائنات اللہ کی لیلا ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس مردود وفانی جہاں کو اپنا تماشہ گاہ کیوں بناتا، اللہ کے یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ ترچیزیں ہیں، انہی کو اپنا مشغلہ بنالیا ہوتا؟

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی تخلیق خود مخلوق کے نفع ومصلحت کے لیے کی گئی ہے۔

من یہ کردم امر تا سودے کنم
بلکہ تا بربندگاں جودے کنم

⑤ ﴿وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝﴾ [سورة الأنبياء: 28]

ترجمة: اور وہ سب فرشتے اللہ کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں۔

تَفسیر: قدیم زمانے میں جہاں زمین وآسمان، شجر وحجر کی پوجا ہوئی ہے، بعض قوموں نے فرشتوں کی بھی پوجا کی ہے اور بھارت میں دیوتا پرستی کے نام سے جو شرک چلا ہوا ہے، وہ حقیقۃً یہی ملائکہ پرستی ہے۔ آیت میں اسی ملائکہ پرستی کی تردید کی جارہی ہے کہ فرشتے تو اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، اللہ کے حکم کی ذرّہ برابر بھی نافرمانی نہیں کرتے اور انہیں جو بھی حکم دیا جاتا ہے، اسے بجالاتے ہیں۔ وہ کسی کو نجات تو کیا دیتے، کسی کی سفارش بھی نہیں کرسکتے، وہ ہر وقت ہیبت الٰہی سے لرزاں وترساں رہا کرتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت کے لفظ خَشْيَتِهٖ (اللہ کی ہیبت) سے یہ اخذ کیا ہے کہ وہ خوف افضل ہے جو عظمت الٰہی سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ عذاب الٰہی کے اندیشے سے (اگرچہ یہ بھی خوف الٰہی ضرور

ہے) لیکن بندگانِ خاص کا خوف عظمت الٰہی سے متعلق ہوا کرتا ہے۔

⑥ ﴿وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾ [سورة الأنبياء: 35]

ترجمة: اور ہم تم کو بری بھلی حالتوں سے آزمایا کرتے ہیں اچھی طرح۔

تفسير: مذکورہ آیت اور اوپر کی آیات میں انسانوں کے لیے تین قانون بیان کیے گئے ہیں۔

① ہر ذی حیات کے لیے موت لازمی ہے خواہ جلد یا طویل مدت کے بعد۔

② انسان جب تک زندہ رہے گا اس کا امتحان اچھی و بری حالتوں میں برابر ہوتا رہے گا کہ کن کن حالات میں وہ ایمان پر قائم رہتا ہے اور کن کن حالات میں کفر و معصیت کی طرف جھک پڑتا ہے۔

③ ہر انسان کو اللہ کے حضور پہنچ کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔

آیت میں شر و خیر سے مخالف طبع حالات جیسے مرض و افلاس وغیرہ اور موافق طبع حالات جیسے صحت و خوشحالی مراد ہیں کہ کون ان حالات سے دو چار ہو کر سختی پر صبر اور نعمتوں پر شکر ادا کرتے ہیں اور کون مایوس ہو کر اللہ سے بدظن ہو جاتے ہیں اور طاعت و عبادت چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے مذکورہ آیت سے قبض کا مسئلہ ثابت کیا ہے کہ قبض میں حکمتیں اور اسرار ہوتے ہیں اور اسی حکمت سے اہل طریق تسلی لیا کرتے ہیں (یعنی قبض کو برا نہیں سمجھتے)

⑦ ﴿وَإِذَا رَآكَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِن يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا﴾ [سورة الأنبياء: 36]

ترجمة: اور یہ کافر لوگ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ سے بس مذاق کرنے لگتے ہیں۔

تفسير: کافروں کی اخلاقی پستی کا نقشہ بیان کی جا رہا ہے۔ آج بھی کتنے بے نصیب ایسے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کا مذاق اڑانا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ اسلام کو سنجیدگی سے دیکھنے سننے یا قریب ہونے کا ارادہ تک نہیں کرتے، بس مذاق ہی مذاق اڑانا مقصود رہتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ بھی اخذ کیا ہے کہ اہل اللہ (اور صالحین) کی بے قدری بھی اسی بد اخلاقی میں آجاتی ہے۔ نعوذ بالله العظيم

⑧ ﴿خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ [سورة الأنبياء: 37]

ترجمة: انسان کی خلقت ہی عجلت (کے خمیر) سے ہوئی ہے۔

تفسير: جیسے انسان کا جسم عناصر اربعہ سے مرکب ہوا ہے، اس میں عجلت و جلد بازی کی کیفیت بھی رکھی گئی ہے جس کا ظاہری اثر یہ نکلا کہ انسان ہر معاملہ میں عجلت پسند واقع ہوا ہے۔

قدیم زمانے کی اقوام نے اپنے نبیوں سے قیامت، عذاب، ہلاکت، قہر وانتقام کا مطالبہ کیا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو یہ دھمکیاں پوری کر دو، انتظار کس بات کا ہے؟ یہی عجلت پسندی ان کی ہلاکت کا باعث ہوئی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے: طریق تصوف میں سالک کو جو تشویشات پیش آتی ہیں، وہ اسی عجلت پسندی کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ (چندے صبر کن باقی بخند)

⑨ ﴿الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ۝﴾ [سورة الأنبياء: 49]

ترجمة: متقین اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے رہتے ہیں اور وہ قیامت سے بھی ڈرتے رہتے ہیں۔

تفسیر: آیت میں اہل تقویٰ کے دو② وصف بیان کیے گئے ہیں:

اوّل خشیتِ رب۔ دوم یوم الحشر سے خوف زدہ۔

سُلوك: اہل علم لکھتے ہیں کہ آخرت میں نجات وکامیابی کا یہی راز ہے کہ دنیا کی زندگی میں ان دوصفوں کو اختیار کیا جائے۔

⑩ ﴿اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝﴾ [سورة الأنبياء: 50]

ترجمة: (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: یہ مورتیاں کیا چیز ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو؟

تفسیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد اپنے بت تراش وبت فروش باپ آزر اور بت پرست قوم سے کہا: یہ مورتیاں کیا حقیقت رکھتی ہیں جن پر تم تکیہ کیے بیٹھے ہو؟ یہ جب خود اپنے نفع و نقصان کی مالک نہیں تو تم کو کیا دیں گی؟ ان میں حیات بھی تو نہیں، بے جان وبے حرکت ہیں۔

سُلوك: مولنا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ نے مذکورہ آیت سے تصور شیخ کے ناجائز ہونے کا استدلال کیا ہے جو تصوف میں رائج ہے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جو تصور شیخ غالی صوفیوں میں رائج ہے، وہ تو بلاشبہ ناجائز ہے۔ (تصور شیخ کی حقیقت اہل علم سے معلوم کرلی جائے)

⑪ ﴿قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝﴾ [سورة الأنبياء: 53]

ترجمة: وہ بولے: ہم نے تو اپنے باپ داداؤں کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔

تفسیر: جاہلی مذاہب کا ہمیشہ یہی سہارا رہا کہ آباؤ اجداد کی نقل وتقلید کو حجت ودلیل قرار دیا ہے اور اصلی وقدیم دین اسی کو سمجھا ہے، زمانہ قدیم کا یہ ناسور آج بھی جاہلی قوموں میں جاری وساری ہے۔ لیکن افسوس اس کا ہے کہ ان جیسے جراثیم بعض مسلمانوں میں بھی پھیل گئے ہیں، وہ قدیم آبائی رسم ورواج کو دانتوں سے

مضبوط پکڑے ہوئے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں ردّ ہے ان جاہل مریدوں کا جو بزرگوں کی تقلید واتباع میں غلو کرتے ہیں اور دلیل صریح مل جانے بعد بھی انہی کو حجت ودلیل بنائے بیٹھے ہیں۔

⑫ ﴿قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَٰذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِن كَانُوا يَنطِقُونَ ﴾ [سورة الأنبياء: 63]

ترجمة: ابراہیم علیہ السلام نے کہا: نہیں بلکہ ان کے بڑے نے کی ہے سو ان ہی سے پوچھو اگر یہ بولتے ہوں۔

تفسیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ کلام اس واقعہ سے متعلق ہے جب کہ قوم اپنے کسی میلے ٹھیلے میں شرکت کرنے باہر چلی گئی تھی، سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور قوم کے مرکزی بت خانے میں گھس کر سارے بتوں کا حشر کر دیا اور پھر بڑے بت کے گلے میں ہتھوڑا چھوڑ آئے۔

واپسی پر قوم نے جب یہ منظر دیکھا تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا: یہ حرکت کس نے کی ہے؟ آیت میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا جواب مذکور ہے لیکن نہایت لطیف انداز میں جس کے مفہوم میں دو معنیٰ ملحوظ ہیں، ایسے ذو معنیٰ کلام کو عربی زبان میں توریہ کہا جاتا ہے۔ کہنے والا مخفی معنیٰ مراد لیتا ہے لیکن سننے والا اس کے ظاہری معنیٰ سمجھتا ہے۔ (کلام سے دونوں مفہوم نکلتے ہیں)

ملحوظہ: توریہ علم بلاغت کی ایک قسم ہے جو ادیبوں وشاعروں کے کلام میں کثرت سے استعمال کی جاتی ہے اور یہ کلام کا ایک حسن ہے جو عنوان میں ندرت وخوبی پیدا کرتا ہے۔

کلام عرب کے علاوہ ہر زبان میں اس کا رواج ہے اور ایسا کلام فصیح وبلیغ شمار کیا جاتا ہے۔ ایسے کلام سے بات کرنے والا عجیب وغریب فوائد حاصل کر لیتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کسی دینی مصلحت کے تحت بعض بزرگوں سے جو کلام بطور توریہ منقول ہے، اس کی اصل یہی آیت ہے۔

⑬ ﴿قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴾ [سورة الأنبياء: 69]

ترجمة: ہم نے حکم دیا: اے آگ! تو ٹھنڈی اور سلامتی ہوجا ابراہیم پر۔

تفسیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی پر نمرود اور آل نمرود نے آپ کو آگ میں جلا دینے کا فیصلہ کر لیا اور دہکتی آگ میں ڈال بھی دیا۔

اللہ نے نار کو حکم دیا کہ تو ٹھنڈی ہوجا۔ آگ سلامتی بن گئی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام آگ ٹھنڈی ہونے کے بعد صحیح وسالم باہر آ گئے۔ جن کے نصیب میں ایمان تھا، وہ تو ایمان لائے اور جو کفر پر قائم تھے، وہ کافر ہی رہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امت کے بعض بزرگوں کے بارے میں منقول ہے کہ ان پر بھی آگ

نے کچھ اثر نہیں کیا، ایسے واقعات اسی قصہ کی نظیر ہیں۔

⑭ ﴿وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ﴾ [سورة الأنبياء: 71]

ترجمة: اور ہم نے ابراہیم اور لوط علیہما السلام کو ایسی سرزمین کی طرف بھیج کر بچایا جس کو ہم نے دنیا جہاں والوں کے لیے بابرکت بنایا ہے۔

تفسير: اس سرزمین سے مراد ملک شام ہے جو دینی و دنیوی برکتوں اور رحمتوں کی سرزمین ہے اور جوارض الانبیاء ارض المحشر ،ارض المقدس کے القاب سے معزز ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو نار نمرودی سے نجات ملنے کے بعد ملک شام کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم ملا، آپ اور آپ کے بھتیجے سیدنا لوط علیہ السلام ہجرت کر گئے، اس طرح ظالموں کے ظلم سے نجات پائی۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ فریق مخالف کے ملک کو چھوڑ کر ہجرت کر جانا توکل کے خلاف نہیں بلکہ سنت انبیاء کے موافق ہے۔

⑮ ﴿فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا﴾ [سورة الأنبياء: 79]

ترجمة: سو ہم نے فیصلہ کی سمجھ بوجھ سلیمان کو دی اور علم و حکمت تو ہم نے ہر ایک (داؤد و سلیمان) کو دیا تھا۔

تفسير: آیت کا تعلق اس مشہور مقدمہ سے متعلق ہے جو عدالت داؤدی میں قوم کے ایک شخص نے پیش کیا تھا، سیدنا داؤد علیہ السلام نے فیصلہ دے دیا لیکن صاحبزادے سیدنا سلیمان علیہ السلام نے جو ابھی کمسن تھے، اس سے بہتر فیصلہ کی رائے دی جو قبول ہوگئی۔ (تفصیل 'ہدایت کے چراغ'' جلد ۲ رصفحہ ۲۷ دیکھئے)

سلوك: عارفین نے یہاں یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ رائے کی مضبوطی اور نظر و فکر کی قوت محض فضل ربانی ہے، فقہاء کرام نے اس واقعہ سے چند مسئلے مستنبط کیے ہیں:

① اظہارِ حق میں شرم و ادب نہ کرنا چاہیے ورنہ سید سلیمان علیہ السلام اپنے والد بزرگوار کی رائے کے خلاف نہ کہتے۔

② اظہار حق کبھی بہ مصلحت واجب ہوتا ہے اور کبھی مستحب۔

③ ایک قاضی کا فیصلہ دوسرے قاضی کے فیصلے کو منسوخ کر سکتا ہے۔

④ مجتہد کو چاہیے کہ اپنے فیصلہ سے رجوع کر لے جب کہ دوسرا فیصلہ زیادہ بہتر معلوم ہو۔

⑯ ﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ﴾ [سورة الأنبياء: 80]

ترجمة: اور ہم نے داؤد کو زرہ بنانے کی صنعت تمہارے نفع کے لیے سکھا دی تھی تاکہ وہ تم کو تمہاری لڑائیوں میں حفاظت کرے تو کیا تم شکر ادا کرو گے؟

تَفسِیر: سیدنا داوٗد علیہ السلام کو جو عظیم الشان معجزات دیئے گئے، ان میں زرہ سازی (جنگی اسلحہ سازی) کی صنعت بھی تھی، لوہا اور فولاد آپ کے ہاتھوں میں مسخر کر دیا گیا تھا۔ جب فولاد ہاتھ میں لیتے تو وہ موم کی طرح نرم و گداز ہو جاتا تھا پھر آپ اس سے طرح طرح کے جنگی آہنی لباس، ہتھیار اور حفاظت کے آلات بنالیا کرتے تھے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے دو② مسئلے ثابت ہوتے ہیں:

① دستکاری سے معاش حاصل کرنا (حدیث میں ہے۔ حلال ترین روزی اپنے ہاتھ کی کمائی ہے)

② اسباب کا اختیار کرنا (توکل کے خلاف نہیں)

⑰ ﴿وَ مِنَ الشَّیٰطِیۡنِ مَنۡ یَّغُوۡصُوۡنَ لَہٗ وَ یَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِکَ﴾ [سورة الأنبياء: 82]

ترجمۃ: شیاطین میں کچھ ایسے بھی تھے جو سلیمان کے لیے سمندر میں غوطے لگاتے اور اس کے علاوہ اور کام بھی انجام دیا کرتے تھے۔

تَفسِیر: سیدنا سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں جیسے انسان و جانور تھے، ایسے ہی چرند پرند، جنات و شیاطین کو بھی شامل کیا گیا تھا، وہ اس سرکش مخلوق سے حیرت انگیز کام لیا کرتے۔ جنات اور شیاطین سمندروں کی گہرائیوں میں غوطہ لگا کر قیمتی و نایاب موتی نکالا کرتے اور پہاڑوں کو تراش خراش کر عمدہ و قیمتی پتھر، ہیرے جواہرات لایا کرتے تھے۔

یہ سب سیدنا علیہ السلام کے مطیع و فرمانبردار ہونے کے علاوہ آپ سے لرزاں و ترساں رہا کرتے تھے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صوفیاء کرام میں یہ جو مشہور مقولہ ہے:

ہر کہ ترسد از حق و تقویٰ گزید
ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

ترجمۃ: جو کوئی اللہ سے ڈرتا رہتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے، اس سے جن و انس اور ہر مخلوق ڈرتی ہے۔

آیت سے اس جانب اشارہ ملتا ہے:

⑱ ﴿وَ اَیُّوۡبَ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿ۚ۸۳﴾﴾ [سورة الأنبياء: 38]

ترجمۃ: اور ایوب کا تذکرہ کیجئے جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھ کو تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں۔

تَفسِیر: سیدنا ایوب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بھرپور خوشحالی و آسودگی عطا کی تھی، آپ بڑے صابر و شاکر بندے تھے۔ اللہ نے پھر آپ کو ابتلاء و آزمائش میں ڈالا، یہ اس کی حکمت و مصلحت تھی کہ سیدنا

ایوب علیہ السلام کو کائنات میں صبر وشکر کرنے والوں کے لیے نمونہ بنائے۔

کھیت و باغات جل گئے، مویشی مر گئے، نوکر و چاکر فرار ہو گئے، اولاد محل کے گر جانے سے دب کر فوت ہو گئی، عزیز رشتہ دار، دوست احباب الگ ہو گئے۔ خود آپ کے بدن میں سخت بیماری لگ گئی، دوستوں نے طعنہ دینا شروع کیا کہ یقیناً ایوب نے کوئی بڑا گناہ کیا ہے جس کی اسے سزا مل رہی ہے۔ وَقَدْ اَعَاذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ

صرف ایک وفادار بیوی نے آخر وقت تک ساتھ دیا۔

پھر سیدنا ایوب علیہ السلام نے اپنے رب کو رُو رُو کر ایسی دلسوزی، بے قراری و عاجزی سے پکارا کہ دریائے رحمت امڈ پڑا، فوت شدہ اولاد کے علاوہ مزید اتنی ہی اولاد عطا ہوئی، کھیت و باغات، مواشی، حشم وخدم، محلات، ساز و سامان سب کچھ ملا بلکہ دو چند ملا۔

حدیث میں یہ واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب غسل کر رہے تھے تو آسمان سے سونے کی ٹڈیاں برس پڑیں، سیدنا ایوب علیہ السلام بے تحاشا سمیٹنے لگے۔ اللہ نے وحی کی: اے ایوب! کیا میں نے تجھے غنی نہیں بنایا؟ آپ نے جواب دیا: (لَا غِنىً عَنْكَ يَا رَبَّنَا) (حدیث) اے رب! تجھ سے بے نیازی کیونکر ممکن ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے دو مسئلے اخذ کیے ہیں:

① اللہ سے رُو رُو کر دعا کرنا توکل کے خلاف نہیں۔

② ضرورت وحاجت کے وقت اللہ سے شکوہ کرنا رضا بالقضا کے خلاف نہیں۔

ملحوظه: تورات کی روایت ہے کہ سیدنا ایوب علیہ السلام کے ہاں سات ہزار بھیڑ بکریاں اور تین ہزار اونٹ، پانچ سو جوڑے گائے بیل، پانچ سو خچر تھے۔ ان کے نوکر چاکروں کی تعداد سینکڑوں تھی، اہل مشرق میں ایسا کوئی مال دار نہ تھا۔ (تفسیر ماجدی)

اسی روایت میں ان کی دعا کا ذکر اس طرح ملتا ہے:

ایوب علیہ السلام نے سجدہ کیا اور کہا: میں اپنی ماں کے پیٹ سے ننگا نکل آیا تھا اور آخرت میں ننگا جاؤں گا۔ خداوند نے دیا، خداوند نے لیا، خداوند کا نام مبارک ہے۔

عمر شریف (۲۱۰) سال پائی۔

⑲ ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝﴾

[سورة الأنبياء: 90]

ترجمة: بلاشبہ یہ سب نیک کاموں میں دوڑنے والے تھے اور ہم کو پکارتے رہتے تھے امید وخوف کے ساتھ اور یہ سب ہمارے آگے عاجزی کرنے والے تھے۔

اوپر کی آیات میں چند اولوالعزم نبیوں کا تذکرہ اور ان کی سیرت اور ان پر اللہ کے فضل وکرم کی تفصیلات بیان کی گئی تھیں، مذکورہ آیت میں اس فضل وکرم کی علت و وجہ بیان کی جارہی ہیں کہ یہ حضرات نیکیوں میں سبقت کرنے والے، اللہ کو خوف وشوق سے پکارنے والے اور ہر وقت اللہ کے آگے جھکنے والے تھے۔

سُلوك: حکیم الامت ؒ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ طاعات وعبادات سے دنیوی نعمتیں بھی ملتی ہیں۔

ملحوظه: بعض بے علم صوفی کہا کرتے ہیں کہ اللہ کو نعمتوں کی توقع اور عذاب کے خوف سے پکارنے والے اصلی محب نہیں ہوتے بلکہ اللہ کو بے غرض یاد کرنا چاہیے۔

مذکورہ آیت سے ان کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے، نبیوں سے بڑھ کر اللہ کا اور کون محب ہوسکتا ہے؟ اس کے باوجود مذکورہ انبیاء کرام کے بارے میں اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرمارہے ہیں کہ وہ حضرات ہم کو امید وخوف سے پکارا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اهْدِناَ وَسَدِّدْنَا خُطَانَا

⑳ ﴿وَ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ۝﴾ [سورة الأنبياء: 109]

ترجمة: اور میں خبر نہیں رکھتا کہ تم سے جو وعدہ کیا گیا ہے، آیا وہ قریب آگیا ہے یا دور دراز ہے؟

تفسير: مطلب یہ کہ بغاوت وسرکشی پر جو عذاب آنے والا ہے، اس کا وقت اور دن کیا ہے، اس تفصیل سے میں بے خبر ہوں۔ رہا عذاب کا آنا، وہ قطعی ویقینی ہے، بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ نبی کریم ﷺ کا جواب تھا جو آپ نے اپنی قوم کو دیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت ؒ نے لکھا ہے کہ نبیوں کو قطعی علم تو صرف عذاب کے واقع ہونے اور قیامت کے پیش آنے کا رہتا ہے، وقت اور زمانے کے تعین کا علم انہیں نہیں ہوتا اِلاَّ یہ کہ اللہ ہی کسی کو دے دے تو وہ اس بات سے واقف ہوجاتا ہے۔

آیت میں علم کامل کی نفی جب رسول اکرم، اشرف الانبیاء ﷺ سے کی جارہی ہے تو پھر کسی پیر یا ولی میں غیب دانی کا اعتقاد رکھنا کیسی کھلی نادانی وجہالت ہے۔

سُورَةُ الحَجّ

پَارَۃ: 17

(1) ﴿وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ﴾ [سورة الحج: 2]

ترجمة: اور (اے مخاطب!) تجھ کو لوگ نشہ کی سی حالت میں دکھائی دیں گے، حالانکہ وہ نشہ میں نہ ہوں گے۔

تفسیر: آیت کا پورا ترجمہ یہ ہے:

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو کیونکہ قیامت کا زلزلہ ایک بھاری چیز ہے۔ جس روز تم اس زلزلہ کو دیکھو گے، اس روز تمام دودھ پلانے والیاں (مارے ہیبت) اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائیں گی اور تمام حمل والیاں اپنا حمل (پورے دن ہونے سے پہلے) ڈال دیں گی اور تجھ کو لوگ نشہ کی حالت میں دکھائی دیں گے، حالانکہ وہ واقع میں نشہ میں نہ ہوں گے، البتہ اللہ کا عذاب ہے ہی سخت چیز۔

قیامت کے قریب دو خوفناک زلزلے پیش آئیں گے جو ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

پہلا زلزلہ وقوع قیامت سے پہلے ہوگا اور دوسرا قیامت کے واقع ہوتے وقت۔

ان دونوں زلزلوں کی شدت وحدت کا حال مذکورہ آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر آخر میں عام لوگوں کی بد حواسی و بے قراری کو لفظ سُکارٰی سے تشبیہ دی گئی ہے کہ اس دن سارے انسان نشہ کی سی حالت میں ہوں گے لیکن یہ نشہ نہ ہوگا بلکہ زلزلے کا ہیبت ناک اثر ہوگا جو انسانوں کو معطل کر دے گا۔

ملحوظه: مذکورہ آیت میں لفظ مُرْضِعَةٌ آیا ہے۔

عربی زبان میں دودھ پلانے والی عورت کو مُرْضِعٌ، مُرْضِعَةٌ کہا جاتا ہے (رضاعت کے معنی دودھ پلانا) لیکن دونوں لفظوں کے معنی میں ایک لطیف فرق پایا جاتا ہے۔

بچے کو دودھ پلانے والی خواہ وہ اس وقت دودھ پلا رہی ہو یا موقوف کر چکی ہو، ایسی عورت کو مُرْضِعٌ کہا جاتا ہے۔ لیکن مُرْضِعَةٌ ایسی عورت کو کہا جاتا ہے جو فی الحال بچے کو دودھ پلا رہی ہو اور دودھ پلانے کا عمل جاری ہو۔ قیامت کا بھونچال کچھ ایسا ہیبت ناک و وحشت ناک ہوگا کہ ماں کا یہ احساس ختم ہو جائے گا کہ اس کا شیر خوار بچہ اس کے سینے سے لگا ہوا ہے اور وہ بھاگ کھڑی ہوگی۔ اللہ اکبر۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے حالت سکر کی اصطلاح ثابت کی ہے جو تصوف میں بولی جاتی ہے۔ بعض حالات کے مد و جزر کے باعث سالک کو حالت سکر پیش آتی ہے حالانکہ وہ سکر (نشہ) نہیں ہوتا۔

(بلکہ سکر جیسی کیفیت ہوتی ہے جو لذت ذکر یا عظمت الٰہی سے سالک کو بے خود کر دیتی ہے)

② ﴿ذٰلِكَ ۖ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ [سورة الحج: 32]

ترجمة: بات یہ ہے کہ جو شخص دین خداوندی کے یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو اس کا یہ لحاظ رکھنا دلوں کی پرہیزگاری سے ہے۔

تفسیر: محترم علامات اسلام چیزیں شعائر اللہ کہلاتی ہیں۔ ان میں قربانی کے جانور اور زمین حرم جس کا آیت میں ذکر ہے، اسی طرح بیت اللہ، ملتزم، میزاب رحمت، حجر اسود، چاہِ زمزم، حطیم کعبہ، صفا و مروہ، منیٰ، عرفات، مزدلفہ، تمام مساجد، قرآن حکیم، اذان، اقامت، نماز، روزہ، حج بلکہ تمام احکام واجبہ شامل ہیں۔ ان چیزوں کا ادب و احترام کرنا اور ان کے حقوق ادا کرنا تقوی القلوب کی علامت ہے۔ ایسا شخص اللہ اور اس کی طرف جملہ منسوب چیزوں کا قدردان وقدرشناس سمجھا جاتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے دو ② مسئلے اخذ کیے ہیں:

اوّل ① یہ کہ تقویٰ کا بنیادی محل قلب ہے۔

دوم ② شعائر اللہ کی تعظیم میں انبیاء اور اولیاء کے آثار بھی داخل ہیں (بشرطیکہ حد شرع کے اندر رہوں)۔

③ ﴿فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾ [سورة الحج: 36]

ترجمة: تو خود بھی اس قربانی کے گوشت سے کھاؤ اور بے سوال اور سوالی کو بھی کھلاؤ۔

تفسیر: قربانی کے گوشت کے بارے میں ہدایات دی جارہی ہیں کہ اس کا گوشت قابل انتفاع ہے، خود کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ یہ شرکی ذبیحہ نہیں ہے جس میں غیر اللہ کا تقرب اور خوشنودی کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

آیت میں اہل حاجت کی دو ② قسم بیان کی گئی ہیں: اَلْقَانِعُ، اَلْمُعْتَرُّ

قانع ایسا محتاج جو صبر کیے بیٹھا ہے۔ جو کچھ بھی مل جاتا ہے، اس پر قناعت کرتا ہے، کسی سے اپنی حاجت ظاہر نہیں کرتا۔

معتر وہ شخص ہے جو بے قرار ہو ہو کر سوال کرتا ہے، تنگی وسختی کو برداشت نہیں کرتا گویا وہ سوالی قسم کا آدمی ہے۔

یہ ہر دو ضرورت منداور محتاج ہیں۔ انہیں جہاں صدقات واجبہ کا استحقاق ہے، قربانی کا گوشت بھی انہیں دیا جائے۔

سُلوك: بعض عارفین نے لکھا ہے کہ چونکہ نبی کریم ﷺ نے قربانی کا گوشت اہتمام سے تناول فرمایا ہے۔ آپ کا یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ قربانی کا گوشت کھانا مستحب وپسندیدہ عمل ہے اور اس اہتمام وپسندیدگی کا یہ راز ہے کہ جو چیزیں اخلاص کے ساتھ اللہ کی جانب منسوب ہوجاتی ہیں، ان کا رغبت وشوق سے استقبال کرنا چاہیے نیز یہ بھی لکھا ہے کہ بعض بزرگوں نے اشیاء مباحہ سے جو اعتناء برتی ہے، اس کی وجہ بھی یہی ہے۔

④ ﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ [سورة الحج: 37]

ترجمۃ: اللہ کے پاس نہ ان قربانی کے جانوروں کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

تفسیر: اہل بابل (عراق) کا جاہلی عقیدہ تھا کہ دیوتاؤں کی دعوت آسمانوں پر ہوتی ہے چنانچہ دنیا میں ان کے نام سے جو بھینٹ چڑھائی جاتی ہے، وہ اس کی خوشبو محسوس کرتے ہیں اور پھر سب مل کر تناول فرماتے ہیں۔

سُلوك: فقہاء نے لکھا ہے کہ قلب کی نیت صرف اللہ سے وابستہ ہے، اس عمل میں کوئی بھی شریک نہیں۔ یہی نیت جب کسی عمل میں ہو تو اس کا نام اخلاص اور وہ عمل خیر وثواب کہلاتا ہے۔

اور شرک اس لیے قبیح و برا ہے کہ اس میں اللہ کے علاوہ اوروں کی بھی نیت رہتی ہے جس سے جانور کا گوشت حرام ہو جاتا ہے۔ رہا گوشت کھانا کھلانا، ہدیہ دینا، فروخت کرنا یا اس قسم کے اور فوائد کے لیے جانور ذبح کرنا، جائز ہے۔ لحم ودم وغیرہ سے اللہ کی ذات بالکل بے نیاز وغنی ہے، نیت اور اکل دو علیحدہ چیزیں ہیں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ [سورۃ الحج: 38]

ترجمۃ: بے شک اللہ ایمان والوں سے (مشرکین کے غلبہ واقتدار) کو دور کر دے گا۔

تفسیر: آیت کا نزول اس صورت حال سے متعلق ہے جب کہ مکۃ المکرمۃ میں مشرکین کا غلبہ وتصرف تھا اور مسلمانوں کو حج وعمرہ کرنے کی اجازت نہ تھی اور مسلمان ہر طرح کمزور وبے بس تھے۔

پھر مستقبل قریب میں مشرکین کا وہ غلبہ واقتدار باقی نہ رہا اور ۸ھ میں مکۃ المکرمۃ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور کفر وکفر کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا اور آج ۱۴۱۷ھ تک مکۃ المکرمۃ پر کفر وشرک کا غلبہ نہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص عادت کا ذکر ہے کہ وہ اپنے مقبول بندوں کا بہت جلد انتقام لیتے ہیں۔

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [سورۃ الحج: 41]

ترجمۃ: یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں حکومت دے دیں تو یہ نماز کی پابندی کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور دوسروں کو بھی نیک کاموں کا حکم دیں گے اور برے کاموں سے منع کریں گے۔ اور انجام تو سب کا اللہ ہی کے یہاں ہے۔

تفسیر: آیت میں اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کی تشریح کی گئی ہے کہ حکومت اگر سچے مسلمانوں کی قائم ہو جائے تو مسجدیں آباد اور پر رونق ہو جائیں، ہر طرف تکبیر وتہلیل کی صدائیں گونجا کریں، بیت المال کے قیام کے بعد کوئی ننگا بھوکا نہ رہے، عدالتوں میں انصاف بکنے کے بجائے ملنے لگے۔ رشوت خوری،

سودخوری، جعلسازی، دروغ حلفی کا بازار سرد پڑ جائے۔ بدکاریاں، چوریاں ڈاکے خواب وخیال ہوجائیں، آبکاری کے محکمہ کو کوئی پانی بھی نہ دے۔ مہاجنوں، سودخوروں بینکوں کے ٹاٹ الٹ جائیں۔ گوئیے، نچیے اگر تائب نہ ہوں تو شہر بدر کردیئے جائیں، سینما تھیٹر، شہوانی تماشہ گاہوں کے پردوں کو آگ لگادی جائے، گندہ وفحش افسانہ وشاعری کی جگہ پاکیزہ ادبیات آجائیں، غرض دنیارہ کر بھی دنیا جنت بن جائے۔ (تفسیر ماجدی)

سُلوك: بعض صوفیاء نے لکھا ہے کہ آیت میں اشارہ ہے اہل تمکین کے مقام کی طرف کہ ان کے یہاں شطحیات نہیں ہوتے اور نہ ان کے اقوال واعمال سے کوئی گمراہ ہوتا ہے۔

ملحوظہ: شطحیات ایسے کلام وپیام کو کہا جاتا ہے جو غلبۂ حال میں بے قصد وارادہ زبان سے نکل جائے اور جو شریعت کے بظاہر خلاف معلوم ہوتا ہو۔ چونکہ اس میں قصد وارادہ نہیں ہوتا اس لیے اس کے کہنے والے پر گناہ بھی نہ ہوگا، البتہ ایسے کلام وپیام کی نقل کرنی اور اس کی تبلیغ کرنی جائز نہ ہوگی۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے غلبۂ حال کی ایک مثال قرآن حکیم سے بھی دی ہے۔

نبی کریم ﷺ عبداللہ رضی اللہ عنہ کی درخواست پر ان کے منافق باپ عبداللہ بن ابی بن سلول کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مداخلت کی اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! اللہ نے آپ کو منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع کیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے: ﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ [سورة التوبة: 80]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ نے مجھے اختیار دیا ہے، میں ستر سے زائد مرتبہ مغفرت کی دعا کروں گا، چنانچہ آپ نے نماز جنازہ پڑھ دی، ابھی ہٹنے بھی نہ پائے تھے کہ دوسری آیت نازل ہوئی اور آپ کو ہمیشہ کے لئے منع کردیا گیا: ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا﴾ [سورة التوبة: 84]

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ہمارے استاذ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کا یہ عمل غلبۂ حال کے تحت تھا۔ چونکہ آپ کی فطرت سلیمہ میں رأفت ورحمت غالب تھی، آیت کے ظاہری الفاظ سے تمسک کرلیا اور آیت کو تخییر پر محمول فرمایا، آیت کے ظاہری الفاظ میں اس کی گنجائش پائی جاتی ہے۔

(واقعہ کی تفصیل کے لیے ''ہدایت کے چراغ'' جلد صفحہ ۲/۲۶۷ مطالعہ کیجئے)

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ [سورة الحج: 46]

ترجمة: بات یہ ہے کہ نہ سمجھنے والوں کی آنکھیں اندھی نہیں ہوجایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں، وہ اندھے ہوجایا کرتے ہیں۔

تفسیر: اوپر کی آیات میں بڑی بڑی قوموں کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں اور ان کے تباہ شدہ مقامات کے کھنڈر اور ان کا انجام بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر موجودہ قومیں ان سے عبرت و نصیحت حاصل نہ کریں تو یہ اندھے پن کی علامت ہے۔ یہ اندھا پن آنکھوں کا نہیں، دلوں کا اندھا پن ہے کہ دل اندھے ہو گئے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جسمانی آنکھوں کی طرح قلوب کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ (ایک حدیث سے اس کی تائید بھی ملتی ہے: «اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُوْمِنِ فِاِنَّه يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ» (حدیث)

﴿فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ﴾ [سورة الحج: 52]

ترجمة: پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو نیست و نابود کر دیتا ہے اور اپنی آیات (احکام) کو اور زیادہ مضبوط کر دیتا ہے۔

تفسیر: شیاطین کی خواہ وہ انسانوں سے ہوں یا جنات سے ہمیشہ یہ روش رہی ہے کہ جب حق کو ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں تو مقابلہ کے لیے مستعد ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کے شکوک و شبہات سے مسلمانوں کے ایمان کو خراب کرنا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ (تم پر مردہ جانور حرام کیا گیا) تو شیطان نے شبہ ڈالا کہ دیکھو اپنا مارا ہوا جانور تو حلال ہے اور اللہ کا مارا حرام۔

اسی طرح آیت ﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ (تم اور جن جن کو تم نے اللہ کے سوا پوجا ہے، سب جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ اس میں تم سب کو داخل ہونا ہے۔

تو شیاطین نے دلوں میں یہ شبہ ڈالا کہ بہت سی قوموں نے عیسیٰ علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام اور اللہ کے فرشتوں کی بھی عبادت کی ہے تو پھر یہ حضرات بھی جہنم میں جائیں گے۔

مذکورہ آیت میں اس وسوسہ اندازی کا جواب دیا گیا ہے۔ ایسے شکوک و شبہات سے ایمان والوں کے قلوب متاثر نہیں ہوتے بلکہ نزول قرآن سے ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ شیطانی وساوس خود بخود مضمحل ہو جاتے ہیں۔ ان کے دفعیہ کے لیے مستقل تدبیر کرنے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے قلوب کی خود حفاظت فرماتے ہیں۔

اہل طریق مشائخ دفع وساوس کے لیے جدوجہد نہیں کرتے اور نہ اپنے مریدوں کو اس کی تلقین کرتے ہیں۔

﴿وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ [سورة الحج: 68]

ترجمة: اور اگر اس پر بھی یہ لوگ آپ سے جھگڑا کرتے رہیں تو آپ (اخیر بات) یہ فرما دیجئے کہ اللہ تمہارے

کاموں کو خوب جانتا ہے۔ (وہ قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا)

تفسیر: ضد و عناد جہاں بھی ہوں گے، مصالحت یا موافقت کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا، اختلاف کی خلیج بڑھتی ہی جائے گی۔ ایسی صورت میں علیحدہ ہو جانا ہی اس قضیہ کا آخری حل ہوا کرتا ہے، آیت میں اسی کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

سلوک: آیت میں صوفیاء عارفین کی اس عادت کی تائید ملتی ہے کہ جب ان سے کوئی مخالف معاند الجھ جاتا ہے تو وہ اس سے فوری علیحدہ ہو جاتے ہیں، بحث و مباحثہ میں نہیں پڑتے۔

⑩ ﴿وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ﴾ [سورة الحج: 72]

ترجمة: اور جب ان لوگوں کے سامنے ہماری آیات جو (اپنے مضامین میں) خوب واضح ہیں، پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو تم ان کافروں کے چہروں میں بُرے آثار دیکھتے ہو، قریب ہے کہ یہ ان لوگوں پر حملہ کر بیٹھیں گے جو ہماری آیتیں ان کے سامنے پڑھ رہے ہیں۔

تفسیر: یہ ایک حقیقت ہے کہ دین بے زار اور آخرت فراموش انسان آیات الٰہی اور اس کے احکام کا تذکرہ سن کر اداس ہو جاتے ہیں اور ان کا جی متلانے لگتا ہے، دل پراگندہ و پریشان ہوتا ہے، دل کی اس ناگواری کا اثر چہروں پر نمایاں ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے اس کیفیت کو دوسری جگہ بھی بیان کیا ہے: ﴿اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ﴾

جب ان کے آگے اللہ واحد کا ذکر کیا جاتا ہے تو جن لوگوں کو آخرت کا یقین نہیں ہے، ان کے قلوب وحشت زدہ ہو جاتے اور جب اس کے علاوہ دوسری بات کہی جاتی ہے تو یہ خوش ہو جاتے ہیں۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت سے ان مدعیان تصوف کی مذمت بھی نکلتی ہے کہ جب ان کے آگے وہ آیات پڑھی جاتی ہیں جو ان کے زعم و پندار کے خلاف پڑتی ہیں تو ان کے چہروں پر ناگواری کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

پھر حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ایسے لوگ موجودہ زمانے میں کثرت سے ہیں۔

تفسیر ماجدی کے مفسر لکھتے ہیں کہ آج بھی دشمنانِ دین کے علاوہ بہت سے ''روشن خیالوں'' کے چہروں پر یہ کیفیت دیکھی جا سکتی ہے۔

⑪ ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ [سورة الحج: 78]

ترجمة: اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔

تفسیر: مطلب یہ کہ دین کے کاموں میں غفلت یا سستی نہ کرو بلکہ دین کا ہر کام چاہے وہ زبانی ہو، مالی، بدنی، قلمی ہو، پوری مستعدی وتندہی سے کرتے رہو۔

جہاد قرآن حکیم کی ایک خاص اصطلاح ہے جو ہر قسم کی دینی واخروی جدوجہد کو شامل ہے۔اس میں دعوت و تبلیغ، وعظ ونصیحت، درس وتدریس، تصنیف وتالیف جملہ دینی امور شامل ہیں، ان سب خدمات کو اہتمام وخوبی سے ادا کرنے کو جہاد فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔

اسی جہاد کی ایک عظیم قسم قتال فی سبیل اللہ (میدانی جنگ) بھی ہے۔

سُلوك: صوفیاء عارفین نے لکھا ہے کہ آیت ہر قسم کے مجاہدات کو شامل ہے۔

مثلاً مجاہدۂ نفس، مجاہدۂ قلب، مجاہدۂ روح (بیضاوی وکبیر)۔

مجاہدۂ نفس سے مراد ہر قسم کے حقوق کو ادا کرنا جو بندے پر واجب ہیں اور لذات وشہوات دنیا سے اپنے نفس کو پاک رکھنا۔

مجاہدۂ قلب سے مراد دل کو اغراض فاسدہ سے پاک کرنا اور اغراض حسنہ سے آراستہ کرنا۔

مجاہدۂ روح سے مراد اپنی شخصیت وانفرادیت کو فنا کر دینا۔

تصوف کی حقیقی روح یہی اعمال ہیں۔

⑫ ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا﴾ [سورة الحج: 78]

ترجمة: تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر ہمیشہ قائم رہو۔اللہ نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے۔نزول قرآن سے پہلے اور اس قرآن میں بھی تاکہ رسول اللہ ﷺ تم پر گواہ رہیں اور تم اور لوگوں پر گواہ ثابت ہو۔

تفسیر: اسلام کوئی موقتی یا نسلی، قومی یا جغرافیائی مذہب نہیں اور نہ دیگر مذاہب کی طرح نوزائیدہ مذہب ہے۔یہ عالم گیر قدیم مذہب ابتدائے عالم کے پہلے انسان سیدنا آدم علیہ السلام کا دین تھا جس کی ارتقائی منزلیں خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت پر مکمل ہوگئیں اور قیامت تک نسل انسانی کے لیے یہی دین مذہب قرار پایا۔اللہ تعالیٰ نے اس دین کا نام اسلام رکھا اور اس مذہب کے ماننے والوں کا لقب مسلمان۔

آسمانی کتابیں تورات، انجیل، زبور، صحف ابراہیم علیہ السلام میں بھی اسلام کے ماننے والوں کا یہ لقب موجود تھا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بعض صوفیاء کے اس عمل کی تائید نکلتی ہے کہ انہوں نے اپنے حلقہ کے مریدوں کو ایک اچھا سا لقب دیا ہے۔(بشرطیکہ یہ شان وفخر کے لیے نہ ہو اور نہ مشرکانہ صفت کا حامل ہو)

حکیم الامت رحمہ اللہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ لقب معنوں سے خالی نہیں ہوسکتا۔لہٰذا امت محمدیہ کے افراد میں انقیاد واتباع کا مادہ یقیناً زیادہ ہوگا (کیونکہ اسلام کے معنی گردن جھکا دینا ہے)۔

سُورَةُ الْمُؤْمِنُون

پارہ: 18

⑪ ﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ﴾ [سورة المؤمنون: 2]

ترجمة: (ان مسلمانوں نے فلاح پائی) جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں۔

تفسير: خشوع کے معنی سکون اور خوف کے ہیں جو قلب کی صفت ہے اور اس کے ساتھ ایک لفظ خضوع بھی ہے جس کے معنی پست ہونا، جھک جانا۔ یہ جسم وبدن کی صفت ہے۔

نماز میں خشوع وخضوع کا یہ مطلب ہوا کہ قلب خاشع وخائف اور جسم ساکن وساکت ہو جس کے ظاہری آثار بازو اور سر جھکانا، نگاہ پست رکھنا، ادب سے دست بستہ کھڑا ہونا، اِدھر اُدھر نہ دیکھنا وغیرہ۔

احادیث میں تذکرہ ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وسیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نماز میں ایسے ساکن ہوتے تھے جیسے بے جان لکڑی۔

سُلوك: آیت سے معلوم ہوا کہ نماز میں خشوع خضوع مطلوب وپسندیدہ عمل ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ تحقیقی بات یہی ہے کہ خشوع وخضوع قبولیت صلوٰۃ کی شرط ہے۔ (روح المعانی)
(یعنی اللہ کے یہاں وہی نماز مقبول ہے جس میں خشوع ہو)

⑫ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ﴾ [سورة المؤمنون: 3]

ترجمة: اور جو لوگ نکمّی (فضول) بات پر دھیان نہیں دیتے۔

تفسير: لغو کہتے ہر اس حرکت وعمل کو جو فضول اور بے حاصل ہو، نہ اس میں دنیا کا نفع ہو نہ آخرت کا۔ ایمان والے فضول اور بے کار مشغلوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ اگر کوئی شخص لغو نکمّی بات یا کام کرتا ہو تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور علیحدہ ہو جاتے ہیں، اسی مبارک خصلت کا ذکر آیت میں کیا جا رہا ہے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ اسی قرآنی حکمت کو اپنی ایک حکایت میں اس طرح ذکر کرتے ہیں۔

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خو   چوں بگذشت بر عارف جنگجو
گرایں مدّعی دوست بشناختے   بہ پیکار دشمن نہ پر داختے

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آیت سے مبالغہ فی الورع (تقویٰ کا اعلیٰ ترین اہتمام) ثابت ہوتا ہے جس کو اہل طریقت اختیار کرتے ہیں۔ یہ حضرات ایسے امور کو بھی ترک کر دیتے ہیں جس میں نہ نفع ہو نہ نقصان۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ بھی لکھتے ہیں کہ لغویات کا ادنیٰ درجہ مباحات ہیں اور آخری درجہ گناہ ومعصیت ہیں۔

(33) ﴿قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ﴾ [سورة المؤمنون: 26]

ترجمة: (نوح نے پکارا) عرض کیا: اے میرے پروردگار! تو میرا بدلہ لے لے، انہوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔

تفسیر: سیدنا نوح علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ نہایت صبر آزما حالات سے دوچار رہی ہے، طبقۂ انبیاء میں جن نبیوں نے اپنی قوم اور قوم کے سرداروں سے سخت اذیتیں اٹھائی ہیں، ان میں آپ سرفہرست ہیں۔

سیدنا نوح علیہ السلام ساڑھے نوسو سال اپنی قوم میں رہے، شب وروز انہیں نصیحتیں کرتے رہے، ہر شبہ کا جواب دیا، تبلیغ وتفہیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ بحث ومناظرہ بھی کرتے رہے۔ اس کام میں صدیاں گزر گئیں، قوم اور قوم کے سرداروں نے ایک نہ مانی۔ تاریخی روایات میں یہ تصریح ملتی ہے کہ اس طویل مدت میں صرف اسّی (80) افراد ایمان لائے۔ واللہ اعلم

آخر قوم نے پکا فیصلہ کرلیا کہ نوح کو خاموش کردیا جائے اور ان کی دھمکی کا یہ جواب دیا جائے کہ اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس کا تم اندیشہ کررہے ہو۔

سیدنا نوح علیہ السلام نے قوم کی ایذاؤں سے عاجز وبے بس ہوکر اللہ کی جناب میں شکوہ کیا: الٰہی! میں مغلوب وبے بس ہوچکا ہوں، آپ اس قوم سے بدلہ لیجیے، انہوں نے مجھے بُری طرح جھٹلا دیا ہے۔

پھر قوم کا وہ حشر ہوا (جس کی تفصیل ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۱ صفحہ ۷۱ پر مطالعہ کیجئے)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں: پیغمبروں کا صبر بھی غیر محدود نہیں ہوتا۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ پیام حق کی برابر تکذیب ہورہی ہے تو ایک مدت کے بعد ان کا پیمانہ صبر لبریز ہوجاتا ہے پھر وہ ہلاکت کی دعا کردیتے ہیں۔ ﴿رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا﴾ [سورۂ نوح: 26]

(34) ﴿يٰٓأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ [سورة المؤمنون: 51]

ترجمة: اے پیغمبرو! تم نفیس پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔

تفسیر: نفیس چیزوں سے حلال پاکیزہ غذائیں مراد ہیں۔ اسلام میں ترک حلال کی گنجائش نہیں ہے۔ جو چیزیں حلال کردی گئیں ہیں، اس کا مقصد یہی ہے کہ ان کو استعمال کیا جائے اور اس اکل وشرب کی غرض یہی ہے کہ نیک اعمال کرنے کے لیے قوت حاصل کی جائے، اکل برائے عبادت ہونا چاہیے نہ کہ اکل برائے اکل۔

شیخ سعدی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

آدم برائے زیستن وذکر کردن است، تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں رہبانیت (ترک عیش) کا ابطال ہے جس میں بعض غالی دین دار مبتلا ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اهْدِهِم

⑤ ﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ ﴾ [سورة المؤمنون: 55]

ترجمة: کیا یہ کافر لوگ یوں گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو جو کچھ مال و اولاد دیتے چلے جارہے ہیں تو ہم ان کو جلدی جلدی فائدے پہنچا رہے ہیں؟ بلکہ یہ لوگ نہیں جانتے (اس کے انجام کو)۔

تفسیر: مال و دولت، شان و شوکت، تاج و تخت اللہ کے مقبول بندوں کی علامت ہیں، تب ہی تو انہیں دنیا میں سرفراز کیا جارہا ہے۔ یہ عالم گیر دھوکہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے اور آج بھی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ افسوس تو یہ ہے بعض مسلمان بھی اس خبط میں پڑے ہوئے ہیں۔

عیش و عشرت اگر اللہ کے یہاں مقبولیت و تقرب کی علامت ہیں تو جانوروں اور سانپ بچھوؤں کی عیش و عشرت کو کیا کہا جائے گا؟ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عارفین نے کہا ہے کہ جس طرح ظاہری نعمتوں سے دھوکہ نہ ہونا چاہیے، اسی طرح باطنی نعمتوں (احوال، کشف والہام وغیرہ) پر مغرور نہ ہونا چاہیے، کہ کہیں یہ احوال سالک کی ابتلاء و آزمائش کا ذریعہ نہ بن جائیں۔

⑥ ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴾

[سورة المؤمنون: 60]

ترجمة: اور جو لوگ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور (باوجود دیتے رہنے کے) ان کے دل اس سے خوف زدہ رہتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جانے والے ہیں۔

تفسیر: آیت میں نیک بندوں کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ راہِ خدا میں خرچ کرنے کے باوجود خوف زدہ رہتے ہیں کہ ان کے صدقات و خیرات اللہ کے ہاں قبول بھی ہوتے ہیں یا نہیں کہ ہم نے اس کی مرضی کے مطابق خرچ بھی کیا ہے یا نہیں، نیت و اخلاص ٹھیک تھا یا نہیں، مال حلال و پاک تھا یا نہیں وغیرہ۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے اعمال اور نفس پر مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ (نفس کی مثال ایک دشمن کی سی ہے، وہ کسی بھی وقت دھوکہ دے سکتا ہے۔ دشمن سے بے خبر رہنا خطرناک حالت ہے، اللہ کے نیک بندے نفس و شیطان سے ہر وقت چوکنا رہتے ہیں)

⑦ ﴿ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴾ [سورة المؤمنون: 66]

ترجمة: میری آیتیں تم لوگوں کو پڑھ کر سنائی جاتی تھیں تو تم الٹے پاؤں بھاگا کرتے تھے۔ تکبر کرتے ہوئے قرآن کو مشغلہ بناتے ہوئے، بے ہودہ بکتے ہوئے۔

تفسیر: کافروں کا حال بیان کیا جارہا ہے کہ انہیں آخرت میں طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا

اور وہ اس میں بے اختیار فریاد و استغاثہ کریں گے اور عاجزی و بے بسی سے رحم و کرم کی درخواست کریں گے، ان کے بڑے لیڈر، سردار، پیشوا جو دنیا کی زندگی میں ہر طرح کا سامان جاہ و حشم رکھتے تھے، وہ آخرت میں عذاب و مشکلات میں اپنے ماتحت کافروں کے لیڈر و رہنما کی حیثیت سے مبتلا ہوں گے۔ انہیں یہ کہا جائے گا کہ یہ عالم دار العمل نہیں دار الجزاء ہے، یہاں چلانا، پکارنا، عاجزی کرنا، بھیک مانگنا لا حاصل ہے۔ جو دار العمل تھا، اس میں تو تم ناز و اکڑا کرتے تھے، ایمان و عمل سے تم کو عار و تکبر تھا۔

شان نزول کی روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ یہ فخر و ناز کرنے والے اہل قریش تھے جنہیں خانہ کعبہ کی تولیت و خدمت پر ناز و فخر تھا۔

سُلوك: مشائخ طریقت نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ کسی نسبت و فضیلت پر ناز و فخر کرنا برا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد ہیں، فلاں سلسلہ سے وابستہ ہیں، فلاں مزار کے سجّادہ نشین و خادم ہیں، فلاں بزرگ کے خلیفہ ہیں، فلاں فلاں برکات کے امین ہیں وغیرہ۔

(8) ﴿وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ﴾

[سورة المؤمنون: 71]

ترجمة: اور اگر دین حق ان لوگوں کی خواہشات کا تابع ہوجاتا تو آسمان و زمین اور جو ان میں آباد ہیں، سب تباہ ہوجاتے۔

تفسیر: آیت میں دین اسلام کا انکار کرنے والے کافروں کا مزاج بیان کیا گیا ہے کہ ان کا ذہن و فکر اس قدر فاسد ہوچکا ہے کہ حق کی اتباع کرنا تو درکنار، دین حق کو اپنا تختۂ مشق بنانا چاہتے ہیں کہ اس میں یہ اضافہ کیا جائے، یہ یہ ترمیم کی جائے وغیرہ۔

آیت میں اسی زعم فاسد کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ ان کی خواہشات و مرضیات پر نظام عالم کو جاری کردے تو زمین و آسمان کا نظام درہم برہم ہوجائے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کا انتظام محض چند لوگوں کی خواہشات کے تابع کردیا جائے تو وہ بھی دو چار دن قائم نہیں رہ سکتا چہ جائیکہ زمین و آسمان کی حکومت وہ بھی ابد الآباد تک قائم رہ سکے۔

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس میں اہل طریق کے معمولات کی اصل ہے کہ وہ مریدوں و معتقدوں کی خواہشات اور فرمائشوں کا اتباع نہیں کرتے بلکہ حکمت و مصلحت کا پاس و لحاظ کرتے ہیں۔

(9) ﴿اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ﴾ [سورة المؤمنون: 72]

ترجمة: کیا آپ ان سے کچھ آمدنی چاہتے ہیں تو آمدنی آپ کے رب کی سب سے بہتر ہے اور وہ بہتری روزی

دینے والا ہے۔

تفسیر: آیت کا یہ مطلب ہے کہ نبی کریم ﷺ کی صدق وامانت کا حال کافروں کو خوب معلوم ہے۔ آپ ان سے اپنی دعوت وتبلیغ پر کچھ بدلہ طلب نہیں کر رہے ہیں، آپ کی نصیحت تو صرف ان کی ہی خیر خواہی کے لیے ہے۔ اس کے باوجود وہ لوگ غور وفکر نہیں کرتے۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جس شخص کی اصلاح وتربیت میں کوشش کی جاتی ہے، اس سے مال ونفع طلب کرنا بُرا ہے کیونکہ یہ مقصود کی تحصیل میں مخل ثابت ہوتا ہے۔

﴿111﴾ ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ﴾ [سورة المؤمنون: 96]

ترجمة: ان کی برائی کا ازالہ ایسے طور پر کر دیجئے کہ جو بہت ہی اچھا ہو۔

تفسیر: یعنی مشرکین کی شرارتوں وخباثتوں کا انتقام اپنی طرف سے نہ لیں۔ کیا عجب ہے کہ آپ کا یہ خلق عظیم ان کے حق میں مفید ثابت ہو اور وہ ایمان لے آئیں۔ ویسے انتقام لینا بھی درست ہے لیکن نبی کا مقام رخصت کا نہیں ہوتا، عزیمت کا ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا آپ خلق عظیم پر قائم رہیے، ہم خود انتقام کے لیے کافی ہیں۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عوام کی بے ادبی وگستاخیوں کو درگزر کرنا چاہیے اور خواص ومتعلقین کی تادیب کی جائے۔

﴿111﴾ ﴿وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۙ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴾

[سورة المؤمنون: 97 تا 98]

ترجمة: (آپ یوں دعا کیجئے:) اے میرے پروردگار! میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں شیاطین کے وسوسوں سے اور رب! پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ میرے قریب آئیں۔

تفسیر: وسوسہ ڈالنا تو شیاطین کا کارنامۂ حیات ہے اگرچہ پیغمبر اس کے اثر اندازی سے محفوظ ہیں تاہم شر سے بچنے کے لیے تعلیم دی جارہی ہے کیونکہ دشمن بہرحال دشمن ہی رہتا ہے اس سے ہر وقت خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔

خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ کو ہے جیسا کہ قرآن حکیم کا عام عنوان ہے لیکن مخاطب مسلمان ہوا کرتے ہیں، انہیں مزید محتاط رہنا چاہیے۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جب وساوس کاملین کو بھی پیش آسکتے ہیں تو عام مسلمان اس سے بے خوف کیوں کر رہ سکتے ہیں (احتیاط وبیداری کے علاوہ مذکورہ دعا بھی کرنی چاہیے)

﴿112﴾ ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴾

[سورة المؤمنون: 101]

ترجمۃ: پھر جب صور پھونکا جائے گا تو باہمی رشتے ناطے اس دن نہ رہیں گے اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا۔

تفسیر: قیامت کے دو ﴿۲﴾ صور کا ذکر قرآن حکیم میں بار بار آیا ہے۔ پہلا صور تو وہ ہوگا جس سے کائنات فنا ہو جائے گی پھر دوسرے صور سے مردے جی اٹھیں گے اور ان کا حشر ہوگا۔ اسی دوسرے صور کا اثر آیت میں بیان کیا جارہا ہے کہ اس وقت باہمی رشتے ناطے، قرابتیں، نسبتیں، تعلقات، کام نہ آئیں گے، کوئی کسی پر رحم نہ کرے گا، ہر شخص کو صرف اپنی فکر رہے گی جیسا کہ دیگر آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

اس دن کی یہ نفسا نفسی ایک خاص وقت تک محدود رہے گی پھر اہل ایمان ایک دوسرے کی شفاعت اور مدد کریں گے اور ان کے تعلقات کام آئیں گے۔ (تفسیر مظہری)

اس کا ثبوت سورۂ طور آیت ۲۱ میں واضح طور پر ملتا ہے، اہل ایمان کی اولاد اور ان کی اتباع کو بھی اللہ تعالیٰ (بشرط ایمان) ان کے نیک ماں باپ کے ساتھ کردیں گے۔ (ترجمہ شیخ الہند، سورۂ طور: ۲۱، حاشیہ ۲)

ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے وہ بچے جو نابالغی کی حالت میں فوت ہوگئے تھے، جنت کا پانی لے کر اپنے ماں باپ کو تلاش کر رہے ہوں گے تاکہ انہیں محشر کی گرمی میں ٹھنڈا پانی پلائیں۔ رواہ ابن ابی الدنیا عن ابن عمر رضی اللہ عنہ وعن ابی ذر رضی اللہ عنہ۔ (تفسیر مظہری)

اسی طرح ایک حدیث صحیح میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن ہر نسبی تعلق ٹوٹ جائے گا بجز میرے نسب اور دامادی رشتے کے۔ ﴿اِلاَّ نَسَبِیْ وَصَھْرِیْ﴾ (حدیث)

اس حدیث شریف کو سن کر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سیدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب سے نکاح کرلیا تھا اور چالیس ہزار درہم مقرر کیا۔ رواہ ابن عساکر بسند صحیح عن ابن عمر رضی اللہ عنہ (ترجمہ شیخ الہند، سورۃ المؤمنون: ۱۰۱، حاشیہ ۲)

سلوک: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بعض صوفیاء محققین لکھتے ہیں کہ رشتے ناطوں کا یہ پارہ پارہ ہوجانا کافروں کے حق میں ہے۔ اس دن کافروں کے رشتے ناطے، تعلقات کسی بھی کافر کے کام نہ آئیں گے۔ لہٰذا وعید کافروں کے بارے میں ہوگی۔ علم تفسیر میں یہ قاعدہ معروف ہے کہ وعید و توبیخ کی آیات میں مفہوم مخالف کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اہل ایمان کو بعض نسبتیں کام آئیں گی ان شاء اللہ مگر شرط وہی اِلاَّ بِاِذْنِہٖ بہر صورت ہوگی۔

⑬ ﴿قَالَ اخْسَئُوْا فِیْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ۝﴾ [سورة المؤمنون: 108]

ترجمۃ: ارشاد ہوگا: (اے کافرو!) اسی جہنم میں دھتکارے ہوئے پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔

تفسیر: آیت میں اہل جہنم کے ایک رسوا کن واقعہ کا ذکر ہے۔ واقعہ کا آغاز اوپر کی آیات میں اس طرح آیا

ہے کہ جب کافروں کو جہنم میں گرادیا جائے گا تو ان کے چہروں کو آگ جھلستی ہوگی اور اس میں ان کے منہ (کالح) بگڑے ہوئے ہوں گے۔ (کالحون) کے معنی ایسا شخص جس کے دونوں ہونٹ اس کے دانتوں کو چھپا نہ سکیں، ایک اوپر ہو جائے دوسرا نیچے لٹک جائے اور دانت کھلے نظر آئیں جیسے بھنی بکری کا سر۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کالحؐ کے معنی پوچھے گئے۔ فرمایا: (اَلَمْ تَرَ اِلَى الرَّأْسِ الْمَشِيْطِ.) کیا تم نے بکری کی بھنی ہوئی سری نہیں دیکھی؟ ایسی شکل کو کالحؐ کہا جاتا ہے۔ جہنمی کے چہرے آگ کی تپش سے زندہ رہتے ہوئے ایسے ہی ہو جائیں گے)

کالحون کی ایک اور تفسیر حدیث مرفوع میں اس طرح آئی ہے: جہنم کی آگ سے جلتے جلتے بدن سوج جائے گا، نیچے کا ہونٹ لٹک کر ناف تک آجائے گا اور اوپر کا ہونٹ سکڑ کر کھوپڑی تک پہنچ جائے گا اور زبان باہر زمین پر لٹکتی ہوگی۔ (رواہ الترمذی، بیان القرآن)

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر سنائی نہیں جاتی تھیں؟ جنہیں تم جھٹلایا کرتے تھے؟ وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہماری بدبختی نے ہم کو گھیر لیا تھا اور ہم گمراہ لوگ تھے۔ اے ہمارے رب! ہم کو اس جہنم سے باہر نکال دیجئے۔ اب اگر ہم پھر ایسا کریں گے تو بے شک ہم پورے قصوروار ہوں گے۔ ارشاد ہوگا: دھتکارے ہوئے اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔

(اِخْسَئُوْا کا ترجمہ اردو میں دھتکارنا کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ کلمہ کتے کو دھتکارتے وقت جس لہجہ سے بولا جاتا ہے، ایسا دھتکارنا مراد ہوتا ہے۔)

اللہ فرمائے گا: ایک گروہ میرے بندوں میں ایسا بھی تو تھا جو کہا کرتا تھا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے سو ہم کو بخش دیئے اور رحم کیجئے اور آپ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر ہیں۔ تو تم نے (اے کافرو!) ان کا ٹھٹھہ اڑایا تھا یہاں تک کہ اس مشغلہ نے تم کو ہماری یاد بھی بھلادی اور تم ان ایمان والوں سے ہنسی ہی کرتے رہے۔ میں نے آج ان کو ان کے صبر کا بدلہ دیا ہے کہ وہی پوری طرح کامیاب رہے۔

سُلوك: اہل تحقیق علماء لکھتے ہیں کہ اہل ایمان کی بڑی شان ہے۔ ان سے عداوت رکھنا اور ٹھٹھہ کرنا بڑی گستاخی و بے ادبی ہے جس کا نتیجہ وانجام عذاب جہنم ثابت ہوا۔

ملحوظہ: امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن کعب القرظی کی ایک روایت نقل کی ہے کہ قرآن حکیم نے اہل جہنم کی پانچ درخواستیں نقل کی ہیں جس میں وہ بے بس و بے قرار ہو کر اپنے رب کو پکاریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی چار درخواستوں کا تو جواب دیں گے اور پانچویں درخواست کے جواب میں حکم ہوگا: ﴿قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ﴾ (دور ہو مجھ سے، پڑے رہو اس میں اور مجھ سے بات نہ کرو)

حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ کا یہ آخری جواب ہوگا۔ اس کے بعد اہل جہنم کچھ بول نہ سکیں گے، پھر وہ جہنم میں جانوروں کی طرح ایک دوسرے کو بھونکتے رہیں گے۔ (تفسیر مظہری)

اہل جہنم کی وہ پانچ درخواستیں یہ ہیں:

سُؤَال ①: ﴿قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾ [سورة المؤمن: 11]

ترجمة: وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! تو نے واقعی ہمیں دو دو موت دی اور دو دفعہ حیات دی، اب ہم اپنے قصوروں کا اعتراف کرتے ہیں، کیا اب یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے؟

جَوَابْ: ﴿ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ﴾ [سورة المؤمن: 12]

ترجمة: یہ حالت جس میں مبتلا ہو، اس وجہ سے ہے کہ جب ایک اللہ کی طرف تم کو بلایا جاتا تھا تو تم لوگ ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو ملا دیا جاتا تو تم مان لیتے تھے۔

سُؤَال ②: ﴿رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴾ [سورة السجده:12]

ترجمة: اے ہمارے پروردگار! ہم نے خوب دیکھ لیا اور خوب سن لیا۔ اب ہمیں دنیا میں واپس بھیج دے تا کہ ہم نیک عمل کریں، ہمیں اب یقین ہو چکا ہے۔

جَوَابْ: ﴿فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا﴾ [سورة السجده: 14]

ترجمة: پس اب چکھو مزہ اپنی اس حرکت کا کہ تم نے اس دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا تھا، ہم نے اب تمہیں فراموش کر دیا ہے۔

سُؤَال ③: ﴿رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ﴾ [سورة ابراهيم: 44]

ترجمة: اے ہمارے پروردگار! ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت کو لبیک کہیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے۔

جَوَابْ: ﴿اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴾ [سورة ابراهيم: 44]

ترجمة: کیا تم وہی لوگ نہیں جو اس سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم پر تو کبھی زوال آنا ہی نہیں ہے؟

سُؤَال ④: ﴿رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ﴾ [سورة الفاطر: 37]

ترجمة: اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نکال دے تا کہ ہم نیک عمل کریں ان اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے ہیں۔

جَوَابْ: ﴿اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ۖ فَذُوْقُوْا فَمَا

لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿٣٧﴾ [سورة الفاطر: 37]

ترجمة: کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہے تو سبق لے سکتا تھا؟ اور تمہارے پاس خبردار کرنے والا بھی آچکا تھا۔ اب مزہ چکھو، ظالموں کا یہاں کوئی مدد گار نہیں ہے۔

سُؤَالُ ⑮: ﴿رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿١٠٦﴾﴾ [سورة المؤمنون: 106]

ترجمة: اے ہمارے رب! ہماری کم بختی ہم پر چھا گئی تھی، ہم واقعی گمراہ لوگ تھے۔ اے پروردگار! اب ہمیں یہاں سے نکال دیجیے پھر ہم ایسا قصور کریں گے تو بے شک ہم ظالم ہوں گے۔

جَوَابٌ: ﴿قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿١٠٨﴾﴾ [سورة المؤمنون: 108]

ترجمة: دور ہو مجھ سے، پڑے رہو اسی میں اور مجھ سے بات نہ کرنا۔

⑭ ﴿وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿١١٨﴾﴾ [سورة المؤمنون: 118]

ترجمة: اور آپ کہیے: اے میرے پروردگار! میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما، بے شک آپ رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر ہیں۔

تفسير: آیت میں اللہ سے مغفرت ورحمت طلب کرنے کی درخواست کا مضمون ہے۔

مغفرت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ گناہ مٹا دئے جائیں اور مخلوق کی نگاہ سے انہیں پوشیدہ کر دیا جائے تا کہ رسوائی نہ ہو اور رحمت نیک اعمال کی توفیق وسعادت کو کہا جاتا ہے کہ اس میں اضافہ کیا جائے۔ (ابن کثیر)

سُلوك: تفسیر ماجدی کے مفسر لکھتے ہیں کہ اس الحاح وزاری کے ساتھ دعا کرنے کی ترغیب افضل البشر ﷺ کو دی جارہی ہے تو دوسروں کا ذکر کیا ہوگا؟

اللہ اللہ! آیت میں کتنا زور عبدیت پر اور کتنی تاکید توحید کی ہے۔

سُوْرَةُ النُّوْر

پَارَہ: 18

① ﴿وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ [سورة النور: 2]

ترجمة: اور تم لوگوں کو ان دونوں (زنا کاروں) کے بارے میں ترس نہ آئے اللہ کا حکم جاری کرنے میں اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

تفسير: زنا کار مرد اور زنا کار عورت کا اسلامی حکم بیان کیا گیا کہ انہیں (اس جرم میں جب کہ وہ شادی شدہ نہ ہوں) سو (۱۰۰) سو (۱۰۰) کوڑے مارے جائیں، مجرم پر ترس کھا کر سزا معاف کر دینا یا کم کر دینا یا ہلکی کر دینا ایمان باللہ کے خلاف ہے۔ گویا ایسا شخص جو نرمی کرے، مسلمان نہیں۔ قوانین الٰہی بہر حال جاری ہونے ہیں۔ مجرموں پر ترس کھانا گویا مخلوق خدا کے ساتھ بے رحمی کرنی ہے اور اسلامی معاشرے کو غیر محفوظ اور ناپاک کر دینے کے مرادف ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں: آیت سے مشائخ کے اس عمل کی تصدیق، تائید ہوتی ہے کہ وہ مریدوں کی بعض خطاؤں میں نرمی نہیں کرتے (اور بھر پور سزا جاری کرتے ہیں)

② ﴿وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [سورة النور: 2]

ترجمة: اور چاہیے کہ دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت حاضر رہے۔

تفسير: زنا ہی کا مسئلہ نہیں، ہر فحش جرم کی سزاؤں میں اعلان وتشہیر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ وہ منظر عام پر جاری کی جائیں۔ مثلاً چوری، شراب نوشی، تہمت و بغاوت، قتل کی سزاؤں پر علی الاعلان جاری کیا جاتا ہے اور یہ اعلان وتشہیر گویا سزا کا ایک جزء ہے تاکہ خود مجرم اور دوسروں کو نصیحت و عبرت ہو۔

سُلوك: علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: اس میں اشارہ ہے کہ شیخ جب اپنے مرید کو تادیب کرنا چاہے تو اس کو مریدوں کے مجمع میں سزا دے تاکہ اس کے نفس کو شکستگی ہو اور دوسروں کو عبرت ملے۔ (روح المعانی)

③ ﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً﴾ [سورة النور: 3]

ترجمة: زنا کار مرد نکاح بھی کسی سے نہیں کرتا بجز زنا کار عورت یا مشرک عورت کے اور زنا کار عورت بھی نکاح نہیں کرتی مگر زانی مرد یا مشرک مرد سے اور زنا کاروں سے نکاح کرنا مومنوں پر حرام کر دیا گیا ہے۔

تفسير: بہت سی جاہلی قوموں میں یہ دستور رہا ہے کہ عورت ایک طرف کسی مرد کے نکاح میں بھی ہے، دوسری

طرف شوہر کے علم میں بلکہ اس کی اجازت سے زنا کاری میں مبتلا ہے۔ زمانہ جاہلیت کا ذکر ہی کیا ہے، موجودہ متمدن یورپی قوموں میں یہ ناسور آج بھی باقی ہے اور اس کو ''آزادئ نسواں'' کا خوبصورت عنوان دیا جاتا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

قرآن حکیم نے ایسے رشتوں کو حرام و ناپاک قرار دیا ہے۔

آیت قرآنی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایسی بے عصمت عورت اور ایسے بدکار مرد کی طرف کوئی شریف یا شریف عورت رغبت بھی نہیں کر سکتے جب تک وہ بھی ایسی مسخ شدہ ذہنیت کا شکار نہ ہوں۔

آیت میں یہی حقیقت بیان کی جارہی ہے کہ زناکار مرد، زناکار عورت ہی سے نکاح کر سکتا ہے۔

سُلوك: علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں اشارہ ہے نیکوں کو بُرے آدمیوں سے میل جول نہ کر رکھنا چاہیے۔

﴿وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا﴾ [سورة النور: 4]

ترجمة: اور کبھی ان لوگوں کی گواہی قبول نہ کرو اور یہی لوگ گنہگار ہیں۔

تفسیر: آیت میں زنا کی جھوٹی تہمت لگانے والوں کا حکم بیان کیا جارہا ہے کہ کسی عفیفہ پاک دامن عورت پر یا کسی عفیف و پارسا مرد پر بدکاری (زنا) کا الزام لگانا دراصل اس کی آبروریزی کرنا ہے جو اللہ کی نگاہ میں سخت جرم ہے۔ جب زنا کاری خود ایک بڑا گناہ ٹھہرا تو اس کی تہمت بھی کسی کلمہ گو کے حق میں شدید ترین ہی ہوگی، کیونکہ اس الزام میں جھوٹ کے علاوہ مسلمان کی عزت ریزی بھی ہے۔ جس کو اللہ نے ایمان واسلام کی نعمت سے عزت دی، اس کو ذلیل ورسوا کرنا اللہ سے بغاوت کرنے کے مرادف ہے۔

بہرحال زنا کی جھوٹی تہمت لگانے والے کو جب کہ وہ چار چشم دید گواہ نہ پیش کر سکے سزاء اسّی (۸۰) کوڑے اس کی پیٹھ پر برسادیے جائیں گے اور اس کو معاملات میں مردود الشہادت قرار دیا جائے گا (یعنی معاملات، لین دین، شادی بیاہ وغیرہ میں اس کی گواہی قبول نہ کی جائے گی)۔

اگر اس نے توبہ کرلی اور نیک سیرت اختیار کرلی تو اللہ اس کے گناہ کو معاف کردے گا یعنی ایسے توبہ کرنے والے کو نیک بندوں میں شمار کرلے گا۔ البتہ مردود الشہادت ہونے کی صفت اب بھی باقی رہے گی کیونکہ آیت ﴿وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا﴾ کہا گیا ہے (یعنی کبھی بھی اس کی شہادت قبول نہ کی جائے گی)

(دُرِّمنثور، ابن کثیر)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بعض مشائخ کی عادات میں یہ بات ملتی ہے کہ اپنے مرید کی کسی خطا پر معاف کردینے کے بعد اپنا خاص تعلق نہیں رکھتے البتہ اسلامی خیرخواہی کے تحت اس کو دوسرے شیخ

کامل سے وابستگی کا مشورہ دیا کرتے ہیں۔

⑤ ﴿لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ [سورة النور: 11]

ترجمة: تم (اس افواہ کو) اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے حق میں بہتر ہی بہتر ہے۔

تفسیر: آیت میں اس بدترین تہمت کا تذکرہ ہے جو ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر منافقین نے لگائی تھی۔

(تفصیل کے لئے "ہدایت کے چراغ" جلد ۲ر صفحہ ۲۸۹ دیکھئے جو اس واقعہ کی قرآنی تشریح ہے)

تہمت زدہ بے گناہ شخصیت کو تو فطرتاً رنج وغم ضرور ہی تھا لیکن عام مسلمانوں کو بھی غم وصدمہ تھا کہ ملت اسلامی کی مادرِ محترمہ ومکرمہ پر بہتان عظیم لگایا گیا۔ آیت میں تسلی دی جا رہی ہے کہ اس حادثہ پر غم نہ کریں، انجام اس کا خیر ہی خیر ہے۔ قیامت تک کے لیے بے گناہ اور پاک دامن عورتوں کی عزت وناموس کا قانون جاری ہوگیا، ہزاروں نہیں لاکھوں خواتین اسلام عزت واحترام سے معاشرے میں اپنا تشخص قائم رکھ سکیں گی اور خود سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی براءت وطہارت کی شہادت آسمان سے نازل ہوئی اور قیامت تک نمازوں میں مسجدوں ومنبروں پر ان آیات کی تلاوت جاری رہے گی، یہ خیر ہی خیر نہیں تو اور کیا ہے؟

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں: صوفیاء محققین نے کہا ہے کہ آیت میں اشارہ ہے کہ مشائخ کو اس بات پر غمگین نہ ہونا چاہیے کہ منکرین ومخالفین ان سے طعن وتشنیع کے ساتھ پیش آتے ہیں، اس عمل سے تو ان کے مراتب میں اضافہ ہوتا ہے۔

⑥ ﴿لَوْ لَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّ قَالُوْا هٰذَاۤ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ [سورة النور: 12]

ترجمة: جب تم لوگوں نے یہ افواہ سُنی تھی تو مومن مرد اور مومن عورتوں نے آپس والوں کے ساتھ نیک گمان کیوں نہ کیا اور یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟

تفسیر: اسی بہتان عظیم پر مسلمانوں کو ادب سکھایا جا رہا ہے کہ نیک گمان بھی تو ایک حقیقت ہے، اس حقیقت سے آنکھیں کیوں بند کرلی گئیں؟ خود اپنے لیے جس بات کو پسند کیا جاتا ہے، مسلمان بھائی کے لیے کیوں اختیار نہیں کیا جاتا؟ یہ کیسی خودغرضی اور نفس پرستی ہے کہ کسی کی عزت وناموس کا لحاظ نہ رکھا جائے کیا تہمت لگا کر تم پاک وبری ہوگئے؟

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں اس بات کی تاکید ہے کہ خبروں اور افواہوں میں سخت احتیاط اور تحقیق سے کام لینا چاہیے، محض عام شہرت اور سنی سنائی باتوں سے متاثر ہونا گناہ کی بات ہے۔

اہل اللہ بعید احتمال پر بھی حسنِ ظن رکھتے ہیں پھر اس کی معمولی سی توجیہ بھی کرلیتے ہیں۔

تفسیر ماجدی کے مفسر رحمہ اللہ نے آیت کے لفظ "بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا" سے اخلاقیات کا ایک لطیف درس اخذ کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ اَنْفُسِهِمْ لاکر قرآن حکیم نے امت مسلمہ کو "احساس" کا درس دیا ہے کہ امت کے ہر فرد کو دوسرے فرد کی بدنامی اسی طرح محسوس ہونی چاہیے جیسے خود کو اپنے نفس کی رسوائی محسوس ہوتی ہے۔

ملحوظہ: سیدہ طاہرہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر جو تہمت لگائی تھی، اس کا بانی مبانی مدینہ منورہ کا مشہور منافق عبداللہ بن ابی تھا۔ یہی خبیث سیدھے سادے مسلمانوں کو جمع کرتا اور اس تہمت کی اشاعت کرتا، اس جھوٹی تہمت کی شہرت سے دو تین مخلص مسلمان بھی متاثر ہوگئے تھے اور وہ بھی اس کمینے کا ساتھ دینے لگے۔

مردوں میں دو حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اور مسطح رضی اللہ عنہ اور عورتوں میں حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا جو سزا کے بعد تائب ہو گئے۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اسی طوفان بدتمیزی کے وقت اپنے شوہر سے کہا کہ عام لوگ تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ایسا ہی کہہ رہے ہیں۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ سب جھوٹے ہیں کیا تم ایسا کام کرسکتی ہو؟ بیوی نے کہا: ہرگز نہیں۔

فرمایا: پھر صدیق کی بیٹی، نبی کی بیوی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تم سے بڑھ کر طاہرہ وعفیفہ ہے۔ ان کی نسبت ایسا بُرا گمان کیوں؟ بیوی خاموش ہوگئی۔

(۴۹۳) ﴿وَ لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۗ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ [سورة النور: 16]

ترجمة: اور جب تم نے یہ تہمت سنی تو کیوں نہ کہہ دیا: ہم کو ایسی بات زبان سے نکالنا جائز نہیں۔ یہ تو بہت بڑا بہتان ہے۔

تفسیر: اس آیت میں بھی سابقہ آیت کی مزید تاکید ہے کہ مسلمانوں کو ایسی خبر سننے کے وقت عمل کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ صاف صاف کہہ دینا چاہیے، بلا کسی گواہی کے ایسی بات زبان سے ہرگز نکالنا درست نہیں، یہ تو بڑا الزام ہے۔ یہ واقعہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ مقدسہ کا ہے، یہاں تو مزید احتیاط کی ضرورت تھی۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے اس تاکید سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ شیخ کے اہل وعیال کے ساتھ ادب واحترام کا معاملہ کرنا چاہیے، ان کو ایذا دینا دوسروں کو ایذا دینے سے زیادہ بُرا ہے۔

(۴۹۴) ﴿وَ لَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَ لْيَعْفُوْا وَ لْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ﴾

[سورة النور: 22]

ترجمة: اور قسم نہ کھائیں بڑے درجے والے اور گنجائش والے تم میں کے کہ وہ خرچ نہ دیں گے رشتہ داروں کو اور

محتاجوں کو اور ان لوگوں نے جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی ہے۔ چاہیے کہ معاف و درگزر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ بھی (تمہاری خطاؤں سے) تم کو معاف کرے؟ اللہ تو بخشنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر: سیدہ عائشہ طاہرہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی براءت و طہارت کی تصدیق آسمان سے نازل ہونے کے بعد منافقوں کو عذاب آخرت کے لیے چھوڑ دیا گیا اور جو نادان مسلمان اس تہمت میں شریک ہو گئے تھے، انہیں تہمت کی سزا اسّی 80 کوڑے لگائی گئی اور معاملہ صاف کر دیا گیا۔

البتہ بعض حیثیت والے صحابہ نے شدت غیرت سے قسم کھالی تھی کہ جس جس نے اس تہمت میں حصہ لیا ہے، انہیں کسی قسم کی مالی امداد نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ بعض غریب مسلمانوں کے مالی تعاون بند ہو گئے۔ ان میں حضرت مسطح رضی اللہ عنہ صحابی تھے جن کا مالی تعاون سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کیا کرتے تھے۔

مذکورہ آیت اسی سلسلے میں نازل ہوئی کہ رزق و روزی کا دروازہ کسی جرم و خطا پر بند نہیں کیا جانا چاہیے۔ اگر اللہ بھی تمہاری خطاؤں پر اپنا دروازہ بند کر لے تو پھر کو کون رزق دے گا۔

آیت کے نزول پر سب سے پہلے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا تعاون جاری کر دیا اور بقیہ صحابہ کرام نے بھی ان کی تقلید کی۔

سُلوك: علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں اشارہ ہے: مشائخ کو اپنے مریدوں کی خطاؤں و لغزشوں پر اپنے فیوض (علمی و روحانی) بند نہ کرنے چاہئیں۔ (روح المعانی)

89 ﴿ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ﴾ [سورة النور: 30]

ترجمة: یہ ان کے حق میں زیادہ صفائی کی بات ہے۔

تفسیر: اہل ایمان کو یہ تعلیم دی گئی کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں۔ نیچی رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے نگاہیں نیچی رہنی چاہئیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ نگاہیں حرام منظر پر نہ پڑنی چاہئیں۔ اگر کہیں ایسا موقع و محل آجائے تو نظریں نیچی کر لی جائیں اور حرام منظری سے احتیاط کی جائے، اسی کو قرآنی الفاظ میں ''غضِّ بصر'' کہا جاتا ہے۔ مذکورہ آیت میں مسلمان مرد اور عورتوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے۔

یہ پاکیزہ تعلیم نظر کرنے والے کے قلب و نظر کی طہارت و شرافت کا ذریعہ ہے۔ اکثر برائیاں نظر کے غلط استعمال پر پیدا ہوتی ہیں۔ زنا اور فحش کاری جو بڑے گناہوں میں سرفہرست ہیں، اسی بدنگاہی کا انجام ہوا کرتے ہیں اور دلوں کا بگاڑ اسی سے پیدا ہوتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نظر بازی چونکہ زنا اور فحش کا مقدمہ ہیں، اس لیے اس کا انسداد کیا گیا ہے۔ یہ تعلیم سلوک کا عظیم درس ہے کہ نگاہیں نیچی رکھیں۔

ملحوظہ: دہلی کے شاعر ذوق کا شعر ہے:

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا، کہیں یہ جائے نہ اس جنگ وجدل میں مارا۔

اسی شہر دہلی کے ایک غیر معروف ہندو شاعر لالہ مکندرام نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے:

دل کا نہیں قصور مکند آنکھیں ہیں ظالم، یہ جا کے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہ ہوتا

غیر مسلم شاعر بھی کبھی سچی بات کہہ دیتا ہے: اَلْحَقُّ يَعْلُوْ وَلاَ يُعْلٰى

نبی کریم ﷺ نے ایک واقعہ پر فرمایا: ((اِنَّ الْكَذُوْبَ قَدْ يَصْدُقُ.)) (حدیث) جھوٹا کبھی سچ بھی کہہ دیتا ہے۔

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ [سورة النور: 35]

ترجمة: اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

تفسیر: یعنی اللہ ہی نورِ ہدایت بخشنے والے ہیں آسمان والوں کو اور زمین والوں کو (یعنی جملہ مخلوقات کو)۔ نور اس روشنی کو کہا جاتا ہے جو آنکھوں سے نظر آئے لیکن اللہ کو ظاہری آنکھ سے ممکن نہیں، اس لیے نور کے مجازی معنی مراد لیے جائیں گے یعنی زمین و آسمانوں میں جو کچھ بھی موجود ہیں، وہ اللہ کا فیض و کرم ہو۔

شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ سے رونق بستی ہے زمین و آسمان کی، اس کی مدد نہ ہو تو سب ویران ہو جائے۔ (موضح القرآن)

سُلوك: امام غزالی رحمہ اللہ نے نور کی تفسیر ظَاهِرٌ بِنَفْسِهٖ مُظْهِرٌ لِغَيْرِهٖ (اپنی ذات سے موجود اور دوسروں کو وجود دینے والا) لکھ کر نور کا مصداق "وجود" قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے ﴿نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ کا مطلب "وجود السموات والارض" یعنی زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ کے وجود سے قائم ہے۔

اس تفسیر پر حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ "وحدۃ الوجود" کا مطلب بھی یہی ہے۔

ملحوظہ: نور کا ترجمہ اردو میں مختلف الفاظ سے کیا گیا ہے۔ شیخ الہند رحمہ اللہ نے "روشنی" لکھا ہے۔ حکیم الامت رحمہ اللہ نے نور کا ترجمہ نور ہی لکھا ہے۔ "منور ہادی" شاہ رفیع الدین صاحب محدث رحمہ اللہ نے بھی نور ہی لکھا ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ نے "رونق" لکھا ہے۔

عربی تفسیروں میں تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما میں نور کا ترجمہ "ہادی" لکھا ہے۔

امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے منور لکھا ہے۔

اور امام غزالی رحمہ اللہ نے "ظَاهِر بِنَفْسِهٖ مُظْهِر لِغَيْرِه" لکھ کر نور کا مصداق "وجود" قرار دیا ہے اور پھر

﴿نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کامطلب "وجود السموات والأرض" کہا ہے۔

⑩ ﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ یُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ﴾ [سورة النور: 36]

ترجمة: (یہی ہدایت یافتہ لوگ) ایسے گھروں میں جا کر عبادت کرتے ہیں جن کی نسبت اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے (مراد مسجدیں ہیں)، ان مسجدوں میں ایسے لوگ صبح وشام اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ (یعنی نمازیں پڑھتے ہیں)

تَفسِیر: بیوت سے مراد مساجد ہیں، اس کی پاکی وصفائی اور ادب واحترام کا حکم دیا جارہا ہے اس میں ہر قسم کی گندگی، فضول گوئی اور دنیاوی اعمال سے پرہیز کیا جائے۔ نماز، تسبیح وتہلیل وتلاوت قرآن سے اللہ کا نام بلند کیا جائے۔

مساجد کی تعظیم میں یہ بھی داخل ہے کہ داخل ہو کر دو ② رکعت تحیۃ المسجد ادا کی جائے۔

سُلوك: فقہاء کرام نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ مساجد میں دنیاوی باتیں کرنا اور خرید وفروخت کرنا، حکایت و شکایت بیان کرنا ممنوع ہیں۔ (جصاص)

⑪ ﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ﴾ [سورة النور: 37]

ترجمة: (وہ ایسے لوگ ہیں) جنہیں نہ تجارت غفلت میں ڈالتی ہے اور نہ خرید وفرخت اللہ کی یاد سے اور نماز سے اور زکوٰۃ دینے سے اور وہ خوف زدہ رہا کرتے ہیں ایسے دن کے پیش آنے سے (یعنی قیامت) جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی۔

تَفسِیر: اللہ کے نیک بندوں کو روزی ومعاش کے دھندے اللہ کی یاد اور اس کے احکام کی بجا آوری سے غافل و بے پروا نہیں کر سکتے، بڑے سے بڑا بیوپار اور کوئی بھی خرید وفروخت اللہ سے غافل نہیں کرتی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے تصوف کے ایک مشہور مقولہ "خلوت درانجمن" کی اصل نکالی ہے (یعنی دل بیار دست بکار، دل تو اللہ سے وابستہ رہے اور ہاتھ پیر کاروبار میں)

⑫ ﴿وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً﴾ [سورة النور: 39]

ترجمة: کافروں کے اعمال ایسے ہیں جیسے چٹیل میدان میں چمکتی ہوئی ریت کہ پیاسا آدمی اس کو دور سے پانی خیال کرتا ہے اور جب اس کے قریب جاتا ہے تو پانی وانی کچھ نہیں پاتا محروم رہ جاتا ہے۔

تَفسِیر: کافر اور مشرکوں کے اعمال ظاہری حالت میں پر رونق اور بھاری معلوم ہوتے ہیں لیکن اللہ کے یہاں بے حقیقت ہیں کیونکہ بغاوت (ایک اللہ کو تسلیم نہ کرنا) ایسا شدید جرم ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے باغی

کو کہیں پناہ نہیں ملتی اگرچہ وہ بڑے بڑے رفاہی کام انجام دیتا ہو۔

قرآن حکیم نے ایسے باغیوں کے اعمال کو ریت کے میدان سے تشبیہ دی ہے کہ دھوپ کے وقت دور سے ریت کا میدان پانی کی لہروں جیسا نظر آتا ہے لیکن پیاسا آدمی جب اس کے قریب پہنچتا ہے تو مٹی و ریت کے سوا اور کچھ نہیں پاتا، مایوس پیاسا رہ جاتا ہے۔ ایسا ہی حال آخرت میں کافروں و مشرکوں کے اعمال کا ہوگا، ان کے سارے اعمال خاک کا تودہ ثابت ہوں گے۔

ایک عربی شاعر اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَاانْکَشَفَ الْغُبَارُ اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ اَمْ حِمَارُ

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے اس قرآنی مثال سے بعض فریب خوردہ صوفیوں کا انجام ظاہر کیا ہے کہ وہ اپنے اعمال و احوال کو حقائق خیال کرتے ہیں حالانکہ ان کی حقیقت خیالات سے زیادہ نہیں ہوتی جن کی حقیقت امتحان یا موت کے وقت معلوم ہو جائے گی۔ وَالْعِیَاذُ بِاللہ

(143) ﴿وَ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ [سورة النور: 47]

ترجمة: اور یہ لوگ کہتے تو ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لے آئے اور ان کا حکم مان لیا پھر ان میں کا ایک گروہ اس کے بعد سرتابی کر جاتا ہے اور یہ لوگ ہرگز ایمان لانے والے نہیں۔

تفسير: آیت میں منافقین کا ذکر ہے۔ یہ لوگ زبان سے تو ایمان و اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن عمل کا وقت آتا ہے تو صاف پھر جاتے ہیں۔ حقیقت تو یہی ہے کہ ان کے دلوں میں شروع ہی سے ایمان نہ تھا، جو کچھ بھی ہے وہ صرف زبانی جمع خرچ ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت کے مضمون سے ان لوگوں کی طرف اشارہ نکلتا ہے جو دل سے مشائخ کو تسلیم نہیں کرتے اور زبان سے باتیں بناتے ہیں۔

(144) ﴿وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾ [سورة النور: 40]

ترجمة: اور جس کو اللہ نور نہ دے، اس کے لیے کہیں بھی نور نہیں۔

تفسير: چنانچہ کافر لوگ اپنے انکار و عناد کی وجہ سے تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں، ان کا کوئی سہارا نہیں، ہدایت سے وہی محروم رہتے ہیں جو خود ہی ہدایت حاصل کرنے کا ارادہ نہیں کرتے۔

سُلوك: صوفیاء نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جس شخص میں قبول حق کی استعداد نہیں، اس میں عقل بھی نہیں ہوتی۔

(145) ﴿وَ اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا﴾ [سورة النور: 54]

ترجمة: اور اگر تم نے رسول کی اطاعت کر لی تو راہ سے جالگو گے۔

تَفسِیر: اہتداء کے معنی راہ یاب ہونا، منزل پر پہنچ جانا، کامیاب ہو جانا۔

لہٰذا جس نے رسول کی اطاعت و پیروی کر لی، وہ سیدھی و درست راہ پر آ گیا، اس کے بعد منزل خود بخود مل جاتی ہے، اصل سیدھی راہ پر آ جانا ضروری ہے۔

قرآن حکیم کی پہلی سورت میں پہلی دعا ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کی تعلیم آئی ہے۔

سُلوك: علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اطاعت رسول سے کشف حقائق ہوتا ہے کیونکہ تَهْتَدُوْا کا انجام حقیقت تک پہنچ جانا ہے۔(روح المعانی)

سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ

پارہ: 18

① ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ﴾ [سورة الفرقان: 4]

ترجمة: اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ یہ قرآن صرف خالص جھوٹ ہے جس کو اس شخص محمد ﷺ نے گھڑ لیا ہے اور دوسروں نے اس میں اس کی مدد کی ہے۔

تفسیر: اردو کی مثل ہے کھسیانی بلی کھبا نوچے۔ قرآن کا جواب پیش کرنا تو درکنار مضحکہ خیز تبصرہ کر دیا کہ محمد ﷺ بڑے ذہین و زیرک آدمی ہیں، انہوں نے ایک اثر انگیز کتاب اپنی طرف سے لکھ دی اور اس تصنیف میں دوسروں نے ان کی مدد بھی کی، اس کے بعد اس کو خدا کا کلام قرار دے دیا۔

چوں نہ دید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ایسا ہی طعن و اعتراض بعض خشک علماء نے اتقی اولیاء اللہ پر کیا ہے کہ ان کے بعض مرید علماء نے ان کے اقوال و اعمال کی تاویلیں کیں ہیں۔

② ﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ [سورة الفرقان: 7]

ترجمة: اور یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ یہ رسول کیسا ہے جو کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

تفسیر: وہی جاہلی فکر کہ رسول کو تو فوق البشر ہونا چاہیے۔ کھانے پینے، چلنے پھرنے، خرید و فروخت کرنے کی ضرورتیں پوری کرنے میں یہ رسول عام انسانوں کی طرح ہے، فرشتے کیوں نہیں ان کی مدد کرتے؟ کیوں نہیں ان کے یہاں آسمانی خزانہ ہوتا وغیرہ، پھر انہیں رسول و نبی کیوں تسلیم کیا جائے۔

جاہلیت کے عجائب زمانہ میں ایک یہ بھی عجوبہ ہے کہ خدا خود تو دنیا میں آسکتا ہے۔ کسی بھی انسان بلکہ سانپ بچھو کے قالب میں سہی، لیکن کسی بشر کو اپنا نائب، اپنا سفیر، اپنا پیامبر نہیں بنا سکتا۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے مشی فی الاسواق (بازاروں میں چلنا پھرنا) کا جائز ہونا ثابت ہوتا ہے اور حدیث میں جو اس کی کراہت آئی ہے، وہ بلا ضرورت بازاروں میں گھومنا پھرنا مراد ہے۔ (ایسا عمل مکروہ ہے)

③ ﴿لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا﴾ [سورة الفرقان: 21]

ترجمة: یقیناً ان لوگوں (کافروں) نے اپنے دلوں میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ رکھا ہے اور حد سے بہت دور

نکل گئے ہیں۔

تَفسِیر: زعم و پندار ایسی ناپاک خصلتیں ہیں جو انسان کو انسانیت ہی سے نکال کر خواب وخیال کے عالم میں پہنچادیتی ہیں۔ ایسا انسان ہم چوں من دیگرے نیست کے چکر میں پڑا رہتا ہے، حالانکہ وہ اہل دنیا کی نظروں میں گر چکا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جو سالک علم سلوک میں غیر اختیاری احوال کا منتظر رہا کرتا ہے، اس کا یہ انتظار تکبر کی علامت ہے کہ وہ احوال کو اپنے مجاہدات واعمال کا ثمرہ سمجھتا ہے۔

④ ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ [سورة الفرقان: 23]

ترجمة: اور (قیامت میں) ہم ان کے کاموں کی طرف متوجہ ہوں گے جو یہ دنیا میں کر چکے ہیں سو ان کو ایسا کردیں گے جیسا پریشان غبار ہوا کرتا ہے (یعنی بےقدرو قیمت).

تَفسِیر: قیامت کے دن کافروں کے اعمال کا انجام بیان کیا جارہا ہے کہ جن جن کو دنیا میں اپنے اعمال کا غرور و غرّہ تھا کہ ہم نے فلاں فلاں کام انجام دیے ہیں، اس کا بدلہ ہمیں ضرور ملے گا، ہماری یہ جدوجہد ضائع نہ جائے گی وغیرہ۔

آیت میں ان اعمال کا وزن بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ ان کے یہ اعمال ایمان واخلاص سے خالی تھے، قیامت کے دن اڑتی ہوئی غبار کی طرح ہلکے اور بےوزن ہوں گے، ان کا کوئی مقام نہ ہوگا، خاک کی طرح پڑے رہیں گے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے دو ② مسئلے اخذ کیے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ بغیر اخلاص وایمان کوئی عمل مفید نہیں۔ دوسرا یہ کہ عجب وخود پسندی اعمال کو غارت کر دیتی ہیں۔

⑤ ﴿يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا﴾

[سورة الفرقان: 27]

ترجمة: جس دن ظالم اپنے دونوں ہاتھ کاٹ کاٹ کھائے گا اور کہتا ہوگا: کیا اچھا ہوتا رسول کے ساتھ میں راہ پر لگ جاتا۔ ہائے میری کمبختی! میں فلاں کو اپنا دوست نہ بناتا۔ اس نے تو مجھ کو بہکا دیا اس ہدایت کے بعد جو میرے یہاں آچکی تھی۔ اور شیطان تو ہر وقت انسان کو دغا دینے والا ہی ہے۔

تَفسِیر: ظالم سے بے دین وکافر آدمی مراد ہے۔ قیامت کے لیل ونہار دیکھ کر کافر و بے دین آدمی حسرت و ندامت سے اپنے ہاتھ کاٹ لے گا اور زبان سے کہتا پھرے گا: ہائے افسوس! میں نے دنیا کی زندگی میں پیغمبر کا راستہ کیوں نہ اختیار کر لیا تھا اور بروں کا کہا مانا اور ان کے فریب میں آگیا ورنہ آج یہ روز بد دیکھنا نہ پڑتا۔ اے کاش! کہ میں نے فلاں فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا، اے کاش! اس کے اور

میرے درمیان دوستی ورشتہ ہوتا تاکہ میں اس سے دور ہی رہتا۔ اے کاش! کہ میں نے پیغمبر کی بات کیوں نہ مانی جو ہدایت کے لیے کافی تھی مگر اس کمبخت دوست نے کان دھرنے نہ دیا اور میں دین حق سے ہمیشہ دور رہا۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ لکھتے ہیں کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اشرار (بُروں) کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہیے۔ شریر اس شخص کو کہتے ہیں جو اللہ کی یاد سے غافل کردے۔

ملحوظہ: تفسیری روایات میں آیت کا شانِ نزول اس طرح بیان کیا گیا ہے:

عقبہ بن ابی معیط مکۃ المکرمۃ کے سرداروں میں شامل تھا۔ یہ جب کبھی بیرونی سفر سے واپس آتا تو شہر کے معززین کی کھانے پر دعوت کرتا۔ ایک مرتبہ حسبِ عادت اس نے دعوت کا انتظام کیا، اس میں نبی کریم ﷺ کو بھی مدعو کیا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو آپ نے اپنا ہاتھ روک لیا اور فرمایا: میں تمہارا کھانا اس وقت تک نہ کھاؤں گا جب تک تم یہ گواہی نہ دے دو کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ عقبہ نے روا روی میں یہ کلمہ کہہ دیا، آپ نے کھانا تناول فرمایا۔

عقبہ کا ایک جگری دوست ابی بن خلف تھا، اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ عقبہ مسلمان ہوگیا ہے، بہت پیچ وتاب کھایا۔ عقبہ نے عذر کیا کہ قریش کے معززین میں محمد ﷺ بھی تھے۔ اگر وہ بغیر کھائے چلے جاتے تو میری بڑی رسوائی ہوتی، اس لیے میں نے ان کی دل جوئی کے لیے یہ کلمہ کہہ دیا۔ ابی نے کہا: میں ایسی واہی تباہی باتوں کو قبول نہیں کرتا جب تک کہ تم جا کر محمد ﷺ کے منہ پر تھوک نہ آؤ۔ العیاذُ باللہ۔

آخر اس مردُود نے یہ گستاخی کر ہی دی، مذکورہ آیات اس حادثہ کے بعد نازل ہوئیں۔

واقعہ اگرچہ خاص ہے لیکن آیات کا حکم اور خطاب عام ہے۔ اللّٰهم احفظنا منه

⑯ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ [سورة الفرقان: 31]

ترجمة: اور ہم اس طرح مجرموں میں سے ہر نبی کے دشمن رکھے ہیں۔ اور آپ کا پروردگار ہدایت ونصرت کے لیے کافی ہے۔

تفسیر: یہ عادتِ قدیمہ ہمیشہ جاری رہی ہے کہ ہر نبی اور حق کے داعیوں کی مخالفت میں جن وانس کی ایک جماعت قائم رہی ہے جو نبی کی بات ماننے میں رکاوٹیں ڈالتی رہی ہے لیکن جن کی نیتوں میں حق طلبی وحق پرستی رہی ہے، انہیں تو ہدایت مل گئی اور جو مخالفت وعناد میں پڑے رہے وہ محروم ونا کام ہی رہے اور اللہ کی نصرت وحفاظت اہل حق کے لیے کافی رہی ہے۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی ﷫ نے لکھا ہے کہ اگر اس قول کو آیت کے ساتھ ملا لیا جائے کہ ہر ولی ایک نبی کے

قدم پر ہوتا ہے تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ہر ولی کا بھی ایک دشمن ہوا کرتا ہے۔(اور اللہ اس ولی کا ناصر ومحافظ ہوا کرتا ہے)۔(روح المعانی)

﴿كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝﴾ [سورۃ الفرقان: 32]

ترجمۃ: (آیت کا پورا ترجمہ یہ ہے) کافر کہتے ہیں کہ اس نبی پر قرآن یکبارگی (مکمل کیوں نہ اتارا گیا؟ (تھوڑا تھوڑا) ہم نے اس لیے اُتارا تاکہ اس کے ذریعہ سے آپ کے قلب کو قوی رکھیں اور ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر اتار دیا۔

تفسیر: کافروں کے بے ہودہ شبہات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ یہ قرآن اگر اللہ کا کلام ہے تو پھر تھوڑا تھوڑا کیوں نازل کیا گیا؟ یکدم کیوں نازل نہ ہوا (جیسا کہ تورات، انجیل اور دوسری کتابیں یکدم نازل ہوئی ہیں)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام اللہ کا نہیں، خود محمد ﷺ نے سوچ سوچ کر حسب موقع تصنیف کرلیا ہے۔ آیت میں اس بکواس کا جواب ملتا ہے کہ تدریجی نزول میں اپنے نبی ورسول کی مصلحت کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ یکدم پورے کلام کے نزول سے قلب رسول متاثر نہ ہو، اللہ کا کلام بھاری اور پُرعظمت ہوا کرتا ہے۔

تدریجی نزول میں قلب رسول کی تقویت وحفاظت کے علاوہ عام مسلمانوں کی رعایت وسہولت بھی ہے کہ کلام اللہ کو یاد رکھنے اور سمجھنے میں آسانی رہے، اس طرح تھوڑا تھوڑا کلام محفوظ ہوتا رہا۔

سُلوک: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مشائخ نے کہا ہے کہ عبادات کے ثمرات اور مقامات جب تدریجی طور پر پیدا ہوتے ہیں تو اس میں رسوخ و پختگی اور دوام کی کیفیت رہتی ہے۔ جو چیز جلد آتی ہے، جلد چلی بھی جاتی ہے۔ سالک کو تاخیر ہونے سے تنگ دل نہ ہونا چاہیے بلکہ صبر کرنا چاہیے۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ علماء کے یہاں تعلیم وتدریس کا سبقاً سبقاً ہونا اور مشائخ کے ہاں افادہ و اضافہ کا تدریسی طور پر ہونا اسی قرآنی حکمت کے تحت ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ﴾ [سورۃ الفرقان: 34]

ترجمۃ: یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے چہروں کے بل جہنم کی جانب لے جائے جائیں گے۔

تفسیر: قرآن اور رسول پر اعتراضات کرنے والے جن کا مقصد اعتراض کے سوا اور کچھ نہیں، ان کا حشر آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ محشر سے جہنم کی طرف پیروں کے بل نہیں، چہروں کے بل گھسیٹتے ہوئے اوندھے منہ پھینک دیئے جائیں گے، دنیا میں ان کی عقلیں اوندھی تھیں، آخرت میں اوندھے منہ گر پڑیں گے۔

سُلوک: علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جو لوگ اپنی طبیعت کے تقاضوں پر رہے، پستی میں گر پڑے۔(روح المعانی)

﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ [سورۃ الفرقان: 43]

ترجمة: کیا آپ نے اس شخص کی حالت دیکھی جس نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا بنائے رکھا ہے؟

تفسیر: یعنی جن لوگوں کا معبود و مقصود ہی بطن اور بطن کی خواہشات ہوں کہ جدھر خواہش گئی، ادھر جھک پڑے۔ جو بات خواہش کے موافق ہوئی قبول کرلیا، جو مخالف ہوئی رڈ کر دیا۔ آج ایک پتھر اچھا معلوم ہوا، اسے پوجنے لگے، کل دوسرا اس سے خوبصورت ملا، پہلے کو چھوڑ کر اس کے آگے سر جھکا دیا۔

عرب جاہلیت کے لوگ آج بھی فرنگی لباس میں موجود ہیں، بت پرست نہ سہی مریم پرستی اور ہوا پرستی میں تو مبتلا ہیں ہی۔

سُلوك: آیت سے خواہشات نفسانی کے اتباع کی مذمت نکلتی ہے اور صوفیاء کے اس مشہور قول کی تصدیق ہوتی ہے: كُلُّ مَا شَغَلَكَ عَنِ الْحَقِّ فَهُوَ طَاغُوْتُكَ جو چیز بھی حق سے غافل کردے، وہ تمہارا معبود باطل ہے۔

⑩ ﴿وَهُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِبَاسًا وَّ النَّوۡمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوۡرًا﴾

[سورة الفرقان: 47]

ترجمة: اور اللہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات کو پردہ اور نیند کو آرام کی چیز بنایا اور دن کو جی اٹھنے کا وقت بنایا۔

تفسیر: آیت میں ذات حق کی توحید و یکتائی کا بیان ہے۔ اس نے دن و رات کو ایک خاص مقصد کے لیے بنایا، رات کی تاریکی چادر کی طرح فضا پر محیط ہوجاتی ہے جس میں لوگ اپنے مشاغل چھوڑ کر آرام کرتے ہیں، پھر دن کا اجالا ہوتا ہے تو نیند سے اٹھ کر اپنے کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں۔ اسی طرح موت کی نیند کے بعد قیامت کی صبح آئیگی جس میں کائنات دوبارہ اٹھ کھڑی ہوگی۔ آیت کی پوری تفسیر اس وقت سمجھ آئے گی جب مشرک قوموں کے عقیدے بھی پیش نظر ہوں جنہوں نے دن و رات کو دیوتا قرار دیا ہے، انہیں کسی دیوی دیوتا کا پیدا کیا ہوا نظام مانا ہے۔

سُلوك: علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ رات کو لباس قرار دینے میں اشارہ نکلتا ہے کہ رات تمہارے احوال باطنہ (شوق و دعا و گریہ و زاری) کا لباس ہے اور نیند مجاہدات نفس سے بدن کو راحت دیتی ہے اور دن اپنی ضروریات معاش کے لیے چلنے پھرنے کا وقت ہے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت سے چار فوائد معلوم ہوئے: اول ① یہ کہ اپنے احوال باطنہ کو مخفی رکھنا چاہیے۔ دوم ② صاحب مجاہدات کو ضرورت کے موافق آرام کرلینا چاہیے۔ سوم ③ طلب معاش کی اجازت ہے ممنوع نہیں۔ چہارم ④ طلب معاش طریقت کے منافی نہیں۔

⑪ ﴿وَهُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ الرِّیٰحَ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِهٖ﴾ [سورة الفرقان: 48]

ترجمة: اور وہ ایسی ذات ہے جو بارانِ رحمت سے پہلے خوشگوار ہواؤں کو بھیجتی ہے کہ وہ خوش کر دیتی ہیں۔

تفسیر: سنت اللہ یہی ہے کہ بارش سے پہلے ٹھنڈی و راحت افزا ہوائیں چلتی ہیں گویا یہ بارش کی خوشخبری کا اعلان ہے، پھر بارش سے مردہ زمین میں حیات پیدا ہوتی ہے، خشک و بنجر زمین سرسبز و شاداب ہوجاتی ہے، قحط و خشک سالی دور ہوتی ہے، فضا میں سکون و قرار پیدا ہوتا ہے، باغ و کھیت سرسبز ہونے لگتے ہیں۔ جہاں خاک اڑتی تھی، وہاں سبزہ زار بن جاتا ہے۔ انسانوں کے علاوہ جانور بھی سیراب ہوجاتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ سالک کو واصل باللہ ہونے سے پہلے وصول کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

ملحوظه: علم تصوف میں وصل کے دو ② لفظ لکھے اور بولے جاتے ہیں۔

وصل کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کثرت ذکر و فکر سے بندے کو اللہ کے ساتھ ایک خاص ذوقی تعلق اور حضوری کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور غیر سے غفلت و دوری، یہی تعلق و کیفیت جب پختہ اور دائمی ہوجائے تو اس کو وصل کہا جاتا ہے اور اس نسبت والے کو واصل باللہ کہا جاتا ہے۔

(اس تشریح سے ''نسبت'' کی بھی تعریف نکل آئی جو تصوف میں کثرت سے بولی جاتی ہے۔)

⑫ ﴿وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ﴾ [سورة الفرقان: 53]

ترجمة: اور وہ ذات ایسی ہے جس نے دو دریاؤں کو ملا دیا۔ ایک کا پانی شیریں و تسکین بخش ہے اور دوسرا تلخ و کڑوا۔ اور دونوں کے بیچ میں ایک آڑ ہے جو ایک دوسرے کو ملنے نہیں دیتی۔

تفسیر: عجائب قدرت کا ذکر ہے جو اللہ کی شان و قدرت ظاہر کر رہی ہیں۔ دو ② دریا ایک ساتھ مل کر جاری ہیں، ایک دریا کا پانی شیریں، فرحت بخش اور دوسرے کا کڑوا و تلخ۔ دونوں دریا اپنی اپنی کیفیت پر قائم ہیں۔ نہ شیریں پانی، کڑوے پانی میں ملتا ہے اور نہ کڑوا پانی شیریں پانی کو متاثر کرتا ہے، دونوں پانی کے وسط میں ایک خدائی آڑ ہے جو ایک دوسرے کو ملنے نہیں دے رہی ہے۔ یہ مُحیّر العقول نظام اللہ کی قدرت و شان کو ظاہر کر رہا ہے۔

اس کے بعد بھی اگر کوئی ہدایت نہ لے، اس کا اپنا قصور ہے۔

آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ یہ دو ② دریا کسی خاص مقام پر موجود ہیں کہ جس کی نشان دہی کی جاسکے، بلکہ اس کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک دریا کے ایک جانب سے پانی لیا جائے تو شیریں ہے اور اسی کے دوسری جانب سے لیا جائے تو تلخ و کڑوا پانی ملتا ہے۔

مثال کے طور پر ہندوستان میں مشرقی سرحد پر ضلع ارکان (علاقہ برما) اور چاٹگام ضلع بارسیال میں ایسے دو دریاؤں کا ثبوت ملا ہے۔ (بیان القرآن و ترجمہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ)

تفسیر کبیر میں آیت کی تفسیر اس طرح بیان کی گئی ہے:

دنیا میں پانی کے دو عظیم الشان ذخیرے ہیں۔ ایک سمندری پانی جو تلخ اور پیاس بڑھانے والا ہوتا ہے، دوسرا جو دریاؤں، جھیلوں، تالابوں اور پہاڑی چشموں سے نکلتا ہے اور جو شیریں و فروحت بخش ہوا کرتا ہے۔ اللہ عظیم کی قدرت وصنعت کو دیکھو کہ دونوں متضاد صفت پانی ایک ہی زمین سے نکل رہے ہیں، تلخ پانی کے قریب ہی زمین کھودی جائے تو وہاں سے شیریں پانی نکلتا ہے۔ آخر یہ غیبی نظام کسی قادر مطلق کا نہیں تو پھر کس کا ہے؟ کہ ایک دوسرے کو ملنے نہیں دیتا۔ ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ﴾

سُلوك: صوفیاء کرام نے بحرین کی اس مثال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معنوی حیثیت سے بھی دو بحر قرار دیئے ہیں: (1) بحر روح (2) بحر نفس

روح کی صفات حمیدہ ہیں اور نفس کی صفات ذمیمہ (بری) ہیں۔ یہ دونوں متضاد صفات ایک جسم میں اس طرح جمع کر دی گئی ہیں کہ سطحی نظر میں دونوں ایک دوسرے سے ملتبس اور مختلط معلوم ہوتی ہیں مگر واقع میں دونوں میں امتیاز ہے جسے صاحب بصیرت معلوم کر لیتا ہے۔

(13) ﴿وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِيۡنَ يَمۡشُوۡنَ عَلَى الۡاَرۡضِ هَوۡنًا﴾ [سورة الفرقان: 63]

ترجمة: اللہ رحمن کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں۔

تفسیر: اللہ کے نیک بندوں کی صفات واخلاق میں تواضع، انکساری ہوا کرتی ہے جس کا اثر ان کی چال ڈھال، رفتار گفتار سے ظاہر ہونے لگتا ہے، متکبرین کی طرح اکڑفوں نہیں کرتے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اہل اللہ میں یہ صفات نمایاں پائی جاتی ہیں۔

(14) ﴿وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الۡجٰهِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا﴾ [سورة الفرقان: 63]

ترجمة: اور جب ان سے جاہل لوگ جہالت کی بات کرتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں: خیر۔

تفسیر: اللہ کے نیک بندوں کی یہ بھی علامت ہے کہ وہ جہالت، گالی گلوچ کا جواب نہیں دیتے اور نہ قولی وفعلی انتقام لیتے ہیں بلکہ درگزر کر دیتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں اور علیحدہ بھی ہو جاتے ہیں۔

آیت میں اس خصلت کو "قَالُوۡا سَلٰماً" کے الفاظ سے ادا کیا ہے۔ اردو محاورہ میں ایسے موقع پر خیر صاحب یا بس بس بولا جاتا ہے اور بات ختم کر دی جاتی ہے۔

لفظ "سَلٰماً"، تسلیم سے نہیں بلکہ تَسَلُّمْ سے مشتق ہے جس کے معنی علیحدہ ہونا، بری ہونا ہیں۔ اس لفظی تحقیق کے بعد آیت کا یہ ترجمہ ہوگا:

اللہ کے نیک بندے جاہلوں سے الجھتے نہیں، اگر ایسا موقع پیش آجائے تو علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ (قرطبی)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ضبط وتحمل اور درگزر کرنا انسانی اخلاق کی بلند ترین خصلت ہے۔

⑮ ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا﴾ [سورة الفرقان: 64]

ترجمة: اور جو راتوں کو اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ وقیام میں لگے رہتے ہیں۔

تفسیر: نیک بندوں کی شب بیداری، عبادت گزاری کے لیے ہوا کرتی ہے۔ یہ نہیں کہ یہ لوگ اپنی راتوں میں شراب خانوں، نشاط خانوں، قحبہ خانوں، سینما خانوں، جوا خانوں، کلبوں، ناچ گھروں میں مارے مارے پھرتے ہوں۔

جائز استراحت کے لیے بقدر ضرورت آرام بھی کرتے ہیں۔ اکثر تو نمازوں ودعاؤں میں ساری ساری رات گزار دیتے ہیں، اس کے باوجود بھی شامت اعمال سے لرزاں وترساں رہا کرتے ہیں کہ کہیں اعمال کھوٹے ثابت نہ ہو جائیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ کے نیک بندے اپنی عبادت وریاضت پر مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ یہ خلش انہیں بے چین کیے رہتی ہے کہ کہیں ہمارے یہ اعمال کھوٹے ثابت نہ ہوں۔

⑯ ﴿قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا﴾

[سورة الفرقان: 77]

ترجمة: آپ کہہ دیجئے کہ میرا پروردگار تمہاری ذرا بھی پروا نہ کرے گا اگر تم عبادت نہ کرو گے، سو تم خوب جھٹلا چکے ہو، عنقریب یہ جھٹلانا وبال بن کر رہے گا۔

تفسیر: کافروں نے حق کو جو جھٹلا دیا، ان کا یہ عمل خود ان کے گلے کا ہار ثابت ہوگا، آخرت کی ابدی زندگی میں ابدی ہلاکت وعذاب سے دوچار ہوں گے۔ دنیا میں بھی بہت جلد اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، چنانچہ غزوہ بدر ۲ھ میں کفر کی طاقت پاش پاش ہوگئی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں تردید ہے ان جاہل صوفیوں کی جو محض تبرکات یا کسی بزرگ کے انتساب کو اپنی مقبولیت کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دربار خداوندی میں بندوں کی جو بھی قدر وعزت ہے، وہ ایمان وعمل صالح کی بناء پر ہے۔

سُوْرَةُ الشُّعَرَاء

پَارَہ: 19

1 ﴿ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴾ [سورة الشعراء: 3]

ترجمة: شاید آپ ان کافروں کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دے دیں گے۔

تفسیر: آیت کا پس منظر ہے کہ مکۃ المکرمۃ کے کافر جس شدت سے نبی کریم ﷺ کی دعوت وتبلیغ کی مخالفت کررہے تھے، ویسے ہی آپ کی خیر خواہی ودل سوزی اور زیادہ ہورہی تھی۔

شب وروز آپ اس غم وفکر میں گھل رہے تھے، کہ آخر یہ لوگ اللہ کی یکتائی کیوں تسلیم نہیں کررہے ہیں؟ آپ کی یہ بے قراری وبے چینی اس حد تک پہنچ رہی تھی کہ اس بات کا اندیشہ پیدا ہوگیا کہ آپ کسی ذہنی یا جسمانی حادثہ سے دوچار نہ ہوجائیں۔

قرآن حکیم نے آپ کی اس حالت کو مذکورہ آیت میں اس طرح ظاہر کیا ہے: شاید آپ ان ہٹ دھرم لوگوں کے غم وفکر میں اپنی جان کھودینے والے ہیں۔

یہ ایک مشفقانہ خیر خواہی کا بلیغ انداز ہے جس میں اعتدال کی تعلیم کے علاوہ نصیحت وخیر خواہی کا پہلو ہوا کرتا ہے۔

"لَعَلَّكَ بَاخِعٌ" شاید آپ اس غم میں اپنی جان ضائع کردیں گے، کھودیں گے، متاثر کردیں گے۔

"بَاخِعٌ بَخْعٌ" سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی پوری طرح ذبح کرڈالنے کے ہیں، لہٰذا لفظی ترجمہ یہ ہوگا: شاید آپ خود کو ذبح کرنا چاہتے ہوں۔

مقصود یہ کہ آپ ان کافروں کے ایمان نہ لانے پر اس قدر غم وحزن نہ کیجئے، آپ کا کام "ابلاغ" پہنچادینا ہے، ایمان قبول کرنا نہ کرنا ان کے اختیار کی بات ہے، ان بے نصیبوں کے غم وفکر میں اپنے آپ کو اس قدر گھلادینے کی ضرورت نہیں۔

سُلوك: علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے آیت سے دو 2 باتیں اخذ کیں ہیں:

ایک 1 یہ کہ نبی کریم ﷺ کو اپنی امت (امت دعوت پر) انتہائی شفقت وکرم تھا۔

دوم 2 کافروں کے ایمان لانے کی حرص وخواہش رکھنا تقدیر کے خلاف نہیں۔ (روح المعانی)

حکیم الامت رحمہ اللہ نے بھی آیت سے دو 2 باتیں اخذ کیں ہیں۔

اوّل 1: شفقت وخیر خواہی میں اعتدال مناسب ہے۔

دوم 2: کسی کی اصلاح وتہذیب شیخ کے اختیار وتصرف میں نہیں۔

❷ ﴿اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۝﴾

[سورة الشعراء: 4]

ترجمة: اگر ہم چاہیں تو آسمان سے کوئی ایسی نشانی اتار دیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے بالکل ہی جھک جائیں۔

تفسیر: مطلب یہ ہے کہ سارے جہاں کے لوگوں کا ایمان لے آنا ہماری مرضی ہوتی تو سب کے سب ایمان لے آتے، کسی کو انکار کی گنجائش ہی نہ رہتی۔ غیب سے ایسا کوئی نشان دکھا دیا جاتا جس کے بعد چار و ناچار ایمان لانا ضروری ہو جاتا لیکن ہم نے اس عالم کو دار ابتلاء (آزمائش کا گھر) بنایا ہے، کسی پر جبر و اکراہ روا نہ رکھا گیا۔ اب جو ایمان لائے گا اپنے فائدے کے لیے ہوگا اور جو کفر پر قائم رہے گا وہ اپنے آپ کو خسارے میں رکھے گا۔ ﴿وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ﴾ ۔الآیۃ

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ کسی کو ایمان لانے کے لیے مجبور نہیں کرتے۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ چونکہ باطنی طور پر کسی کو مجبور کر دینا بھی جبر و اکراہ کی تعریف میں آجاتا ہے لہٰذا مشائخ طریقت نے طریق سلوک و ارشاد میں اس کو پسند نہیں کیا ہے۔

❸ ﴿وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ۝﴾ [سورة الشعراء: 13]

ترجمة: اور میرا سینہ تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان بھی خوب نہیں چلتی، براہِ کرم ہارون کے پاس اپنا پیام بھیج دیجئے۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اب اپنی دعوت و تبلیغ فرعون اور فرعونی سرداروں تک پہنچاؤ، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اس عظیم و پر خطر اقدام پر خوف و اندیشہ ہوا کہ کہیں قتل نہ کر دیا جاؤں۔ اس کے علاوہ یہ بھی احساس تھا کہ وہ روانی سے اپنا مافی الضمیر ادا نہ کر سکیں گے۔

عرض کی: الٰہی! اس اقدام پر میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے، میری زبان بھی زور آور نہیں، میرا بھائی ہارون فصاحت و بلاغت کی زبان رکھتا ہے، اس کو میرے ساتھ کر دیجئے تاکہ میری پشت پناہی ہو۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض طبعی نقصانات روحانی کمال کے منافی نہیں ہوتے۔ (یعنی خوف، اندیشہ، خطرہ، زبان کی لکنت وغیرہ بڑے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہیں، یہ چیزیں بڑائی و بزرگی کے لیے عیب نہیں ہیں)۔

❹ ﴿قَالَ فَعَلْتُهَاۗ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ۝﴾ [سورة الشعراء: 20]

ترجمة: موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: واقعی میں نے وہ حرکت کی اور مجھ سے غلطی سرزد ہوگئی۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور اپنی نبوت کا اعلان کیا تو فرعون اور

فرعونیوں نے بجائے اس کے کہ ان کی باتوں پر غور کرتے، کہنے لگے: اے موسیٰ! کیا تم وہ نہیں ہو جس کو ہم نے بچپن میں پالا پوسا تھا اور ایک عرصہ تم ہماری سرپرستی میں رہے پھر جوانی میں ہمارے ایک آدمی کو مار بھی ڈالا تھا، اس کے بعد تم فرار ہو گئے؟ وغیرہ وغیرہ۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے سب باتوں کا بے تکلف جواب دیا اور اپنی خطا کا بھی اقرار کرلیا اور پھر اپنا پیغام دُہرایا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نبیوں کے اخلاق میں کس قدر صدق و امانت ہوا کرتی ہے کہ بے تکلف اپنے قصور کا اعتراف کرلیا۔ یہی خصلت اولیاء اللہ میں بھی پائی جاتی ہے۔

﴿وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [سورة الشعراء: 22]

ترجمة: اور یہی وہ احسان ہے جس کا تو مجھ پر بار رکھ رہا ہے، تو نے تو بنی اسرائیل کو سخت غلامی میں ڈال رکھا ہے۔

تفسیر: فرعون سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر احسان جتلا رہا ہے کہ میں نے بچپن میں تجھے ڈوب مرنے سے نجات دی پھر اپنے محل سرا میں تیری شاہی پرورش کی اور ناز و نعمتوں میں تجھ کو رکھا گیا حتیٰ کہ تو جوان ہو گیا۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اس احسان جتلانے کا جواب دیا کہ تیرے ہی ظلم و ستم کے باعث مجھے دریا میں بہا دیا گیا تھا، تیرے گھر والوں نے لاوارث سمجھ کر نکال لیا اور پرورش کی تا کہ بے اولاد گھر میں رونق ہے اور گھر والوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ اگر بنی اسرائیل کے بچوں پر تیرا ظلم نہ ہوتا تو مجھے دریا میں یوں ڈالا نہ جاتا اور نہ میری پرورش تیرے یہاں ہوتی، میری پرورش پر احسان جتلانا فضول ہے۔

خود کردہ را علاج نیست

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اہل تحقیق علماء نے لکھا ہے کہ کافر کے احسان کا اعتراف کرنا چاہیے، محض کفر و شرک کی وجہ سے کفرانِ نعمت نہیں کی جاسکتی۔ (تفسیر کبیر)

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَ مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [سورة الشعراء: 23]

ترجمة: فرعون نے کہا: پروردگار عالم کیا چیز ہے؟

تفسیر: یہ سوال فرعون کا ہے جو مجسمۂ شرک تھا، مصری عقیدہ میں سورج دیوتا، سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا اور فرعون کو اس کا اوتار یا مظہر قرار دیا گیا تھا جس سے اس کا دماغ خراب ہو چکا تھا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے جواب پر اس کو بڑی حیرت ہوئی۔ بولا: یہ ربّ العالمین کیا چیز ہے؟ کائنات کا پالنے والا کیا صرف ایک ہو سکتا ہے؟

جاہلی دماغ ہر مخلوق کے لیے ایک ایک علیحدہ دیوی، دیوتا قبول کر لیتا ہے لیکن اس حقیقت کو قبول کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہوتا کہ ساری کائنات کا صرف ایک ہی رب ہے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے پھر جواب دیا کہ زمین و آسمان اور درمیانی فضا کا صرف ایک ہی خدا ہے جو سب کی پرورش کر رہا ہے اور روزی دے رہا ہے اور رہنمائی بھی کر رہا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے جواب سے معلوم ہوا کہ اللہ کی صورت اور حقیقت بیان نہیں کی جاسکتی ہے جس کو علم الکلام میں معرفت بالکنہ کہا جاتا ہے۔ صرف معرفت بالصفات بیان کی جاسکتی ہے جس کو آپ نے ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا﴾ الآیۃ سے ادا کیا ہے۔

ورنہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام فرعون کے جواب میں اللہ کی حقیقت بیان فرماتے کیونکہ فرعون کا سوال اسی بارے میں تھا۔

﴿فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ [سورة الشعراء: 38]

ترجمة: چنانچہ ماہر جادوگر ایک معین دن کے خاص وقت پر جمع کر لیے گئے۔

تَفسِیر: فرعون نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے ملک کے نامور جادوگروں کو جمع کر لیا اور عوام کو عام شرکت کی دعوت دے دی گئی، مقابلہ کے لیے وقت و تاریخ مقرر کر دی گئی۔

سورۂ طٰہٰ میں تصریح ہے کہ وہ مصریوں کی خاص عید کا دن تھا۔ "يَوْمُ الزِّيْنَةِ" چنانچہ مقابلہ ہوا اور جادوگر شکست کھا گئے اور اپنے عجز و بے بسی کا اعتراف کیا اور وہ اور عوام الناس کی ایک بڑی تعداد مسلمان ہوگئی، حق غالب ہوا اور سحر و نظر بندی فنا و غارت ہوگئی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اہل باطل کے اجتماعات میں کسی دینی و اسلامی غرض کے لیے شرکت کرنا جائز ہے جس کو بعض غیر مخلص علماء اپنی کسر شان سمجھ کر گوارہ نہیں کرتے۔ (مقصود صرف اصلاح و تبلیغ ہو، مفاداتِ قومی یا ملکی نہ ہوں)

﴿قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ﴾ [سورة الشعراء: 43]

ترجمة: موسیٰ نے جادوگروں سے کہا: تم کو جو کچھ ڈالنا ہو ڈال لو۔

تَفسِیر: جادوگروں نے مقابلہ سے پہلے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: اے موسیٰ! تم اپنا کرتب کر دکھاؤ یا ہم اس کا آغاز کریں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ تم ہی پہلے بازو آزماؤ۔

اس پر جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں جو ڈھیروں لائے تھے، میدان میں ڈال دیں۔ وہ سب کے سب چھوٹے بڑے، موٹے پتلے سانپ بن کر چوطرفہ دوڑنے لگے پھر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا، وہ ایک ایک کر کے سارے کرتبوں کو نگلنے لگا اور میدان صاف کر دیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے جواب سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے جادوگروں کو سحر کرنے کا مشورہ دیا جب کہ سحر کرنا یا اس کا مشورہ دینا بھی حرام ہے تو پھر سیدنا موسیٰ علیہ السلام

نے ایک حرام کام کی اجازت کیونکر دی؟

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے سحر کی نہ اجازت دی اور نہ مشورہ دیا بلکہ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ کسی بے دین سے کہا جائے کہ اپنے دعویٰ پر دلیل پیش کرو۔ اس کا مطالبہ سے اجازت یا رضا مندی کا کوئی پہلو نہیں ہوتا کہ دعویٰ اور دلیل دونوں صحیح ہیں بلکہ ایسا عنوان باطل کو توڑنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔

جادوگروں کے کرتب اسی صورت میں فنا ہو سکتے تھے جب وہ فن ظاہر کریں۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ اس لیے سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اپنے کرتب دکھانے کے لیے کہا۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے یہ تفصیل لکھ کر ایک عادت کی توثیق کی جو بعض بزرگوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض مرتبہ منکرات کو دیکھ کر یہ حضرات چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ حقیقت میں یہ چشم پوشی نہیں ہوتی بلکہ اس کی تہہ میں کوئی دینی و موقتی مصلحت ہوا کرتی ہے جو اس وقت عام نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے، بعد میں اس کا فائدہ ظاہر ہوتا ہے۔

⑨ ﴿فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝﴾ [سورة الشعراء: 46]

ترجمة: سو جادوگر سجدہ میں گر پڑے۔

تفسیر: سحر کا یہ عمل ان کے فن کا انتہائی آخری عمل تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ عمل آناً فاناً فنا ہوتا جا رہا ہے تو ان کے قلوب نے بلا توقف اعتراف کر لیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا عمل انسانی قوت سے مافوق ہے، ایک غیبی قوت و قہری طاقت ہے جو سب طاقتوں سے بالاتر ہے، بے ساختہ سجدہ میں گر پڑے اور ایمان لے آئے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بزرگوں کے کلام میں ''جذب الٰہیہ'' کا بکثرت ذکر ملتا ہے۔ وہ اسی جیسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو یکدم اللہ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔

⑩ ﴿قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝﴾ [سورة الشعراء: 62]

ترجمة: موسیٰ نے کہا: ہرگز نہیں کیونکہ میرے ساتھ پروردگار ہے، وہ مجھے ابھی راہ بتا دے گا۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام فرعون کے ظلم سے اپنی قوم کو بچانے کے لیے راتوں رات مصر سے نکل گئے، صبح صبح دریا کے کنارے پہنچ گئے جس کو پار کرنا تھا۔ اتنے میں فرعون اپنی فوج کو لے کر قریب آ گیا۔ قوم نے جب یہ منظر دیکھا تو پکار اٹھے۔ تورات کی ایک دلچسپ روایت یہ ہے۔

''موسیٰ نے کہا: کیا مصر میں قبروں کے لیے جگہ نہ تھی کہ جو ہم کو وہاں سے جنگل میں مرنے کے لیے لے آیا۔''

(توراۃ خروج ۱۴: ۱۰، ۱۱)

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیغمبرانہ وقار و تمکنت کے ساتھ فرمایا: گھبراؤ نہیں ایسا ہرگز نہ ہوگا، میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ نجات کی راہ بھی دکھا دے گا۔ چنانچہ دریا پھٹ پڑا اور راستہ نکل آیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا: مذکورہ بالا آیات کے مجموعہ سے تدبیر اور ترک تدبیر کے مسئلے میں اعتدال و توسط کی تعلیم ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو تدبیر تو یہ بتائی کہ قوم کو لے کر راتوں رات ملک چھوڑ دیں، پھر جب قوم نے اپنے پکڑے جانے کا اندیشہ ظاہر کیا تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے انہیں "اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ" کہہ کر اللہ کی معیت ہوتے ہوئے اپنی تدبیر پر بھروسہ نہیں کیا، بلکہ کہا: اللہ ہی نجات دینے والا ہے۔

پھر حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عارفین کی بھی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ اسباب اختیار کرتے ہیں مگر توسط و اعتدال کے ساتھ اور اس میں مبالغہ وغلو نہیں کرتے۔

⑪ ﴿وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ ۝﴾ [سورة الشعراء: 79]

ترجمة: اور وہی مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی شفاء بھی دیتا ہے۔

تَفسِیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کا خلاصہ ان آیات میں ملتا ہے۔

اللہ کی ذاتِ عالی تمام صفات کمال کی جامع ہے، وہی خالق ہے، وہی مدبر وہادی ہے، کھانا پانی وہی دیتا ہے، صحت وشفا اسی کے اختیار میں ہے، موت وحیات کا وہی مالک ہے، دنیا وآخرت کے سارے اختیارات اسی کو حاصل ہیں، یہ نہیں کہ مخلوق کا کام کسی دیوی دیوتا کے حوالہ کیا ہو۔

مشرک جاہلی قوموں نے انہی صفات کے لیے علیحدہ علیحدہ دیوی دیوتاؤں کے وجود کو تسلیم کیا ہے اور اللہ کے اختیارات کو سینکڑوں فرضی وخیالی دیوی دیوتاؤں کے حوالہ سمجھا ہے۔ ان قوموں کو جب بھی ٹھوکریں لگی ہیں، وہ انہی صفات سے متعلق رہی ہیں۔ ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ الآیۃ

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیات کے مضمون میں عبدیت کی کامل تعلیم اور ادب موجود ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعاؤں میں یہ ظاہر کر دیا کہ جس طرح دینی نعمت (یعنی ہدایت) کی مجھے ضرورت ہے، اسی طرح دنیاوی نعمت کھانے پینے کی بھی احتیاج ہے (یعنی ہر دو نعمتوں کا محتاج ہوں)۔

بعض زہد وقناعت کے دعویدار دنیاوی نعمتوں سے بے نیازی برتتے ہیں اور اس کو رضا وتسلیم کے خلاف خیال کرتے ہیں لیکن سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اپنی قوم میں اعلان کر رہے ہیں کہ جس طرح ہدایت ورہنمائی کا میں محتاج ہوں، اسی طرح کھانے پینے، صحت وشفا کا بھی محتاج ہوں۔

ملحوظه: ﴿وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ﴾

آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام یہ نہیں فرماتے کہ وہی مجھے بیمار کرتا ہے اور وہی شفا دیتا ہے بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے۔ گویا بیماری ونقص کی نسبت اپنی

طرف کرتے ہیں اور شفا بخشی وصحت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر رہے ہیں، اسی کا نام ادب واحترام اور حقِ عبدیت ہے۔

⑫ ﴿وَالَّذِيٓ اَطۡمَعُ اَنۡ يَّغۡفِرَ لِيۡ خَطِيۡٓـَٔتِيۡ يَوۡمَ الدِّيۡنِ﴾ [سورة الشعراء: 82]

ترجمۃ: اور وہی اللہ ہے جس سے میں آس لگائے بیٹھا ہوں کہ وہ قیامت کے دن میری خطاؤں کو معاف کردے گا۔

تفسیر: اللہ کے ساتھ نبیوں کا ادب واحترام بے مثال ونادر قسم کا ہوا کرتا ہے۔ سیدنا ابراہیم ابوالانبیاء، خلیل اللہ، رسول اللہ ہیں، اللہ کی جناب عالی میں کس درجے ادب واحترام سے عرض کر رہے ہیں کہ مجھے آس و امید ہے کہ وہ میری خطاؤں کو معاف کردے گا۔

یہاں ان صوفیاء خام کار کے دعوے کیا حقیقت رکھتے ہیں جنہوں نے کہا: ہم اپنے مریدوں ومعتقدوں میں سے جس کو چاہے، چھڑالیں گے۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت سے دو ② ادب مستفاد ہوتے ہیں۔

اول ①: پیغمبر اپنے لیے صاف صاف خطا ولغزش کا وجود تسلیم کرتے ہیں، محض اجتہادی غلطی کہہ کر گزر نہیں جاتے۔

دوم ②: اپنی معافی کو بھی جزم ویقین کے ساتھ بیان نہیں کرتے بلکہ اس کی صرف امید وآس رکھتے ہیں۔

⑬ ﴿رَبِّ هَبۡ لِيۡ حُكۡمًا وَّ اَلۡحِقۡنِيۡ بِالصّٰلِحِيۡنَ﴾ [سورة الشعراء: 82]

ترجمۃ: اے میرے رب! مجھے حکمت عطا کر اور نیک لوگوں میں مجھ کو شامل فرمالے۔ اور میرا ذکر آئندہ آنے والوں میں جاری رکھیے اور مجھ کو جنت النعیم کے لوگوں میں داخل فرما۔

تفسیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے۔ انہوں نے اپنے رب سے طلب مغفرت کے علاوہ چار اور دعائیں بھی طلب کی ہیں:

① ﴿رَبِّ هَبۡ لِيۡ حُكۡمًا﴾ علم ودانائی عطا فرما۔

② ﴿اَلۡحِقۡنِيۡ بِالصّٰلِحِيۡنَ﴾ مجھ کو نیکوں میں شامل رکھیے۔

③ ﴿وَاجۡعَلۡ لِّيۡ لِسَانَ صِدۡقٍ﴾ آنے والے انسانوں میں میرا ذکر خیر باقی رکھیے۔

④ ﴿وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيۡمِ﴾ مجھے جنت النعیم کا وارث بنا (جو جنت کا اعلیٰ درجہ ہے)۔

نبیوں کی دعائیں جہاں دنیا وآخرت کی جامع ترین دعائیں ہوا کرتی ہیں، وہاں یہ دعائیں اللہ رب العزت کے مزاج ومرضی کے عین مطابق بھی ہوا کرتی ہیں۔ نبی ورسول اپنے رب سے وہی چیزیں مانگتے ہیں جو اللہ کو محبوب

و پسندیدہ ہوا کرتی ہیں۔(اس لیے بھی ان کی دعائیں قبول ہو جاتی ہیں)

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے پہلی دعا سے علم وحکمت کی طلب ثابت کی ہے کہ علم وحکمت میں ترقی کے لیے مسلسل دعا کی جانی چاہیے۔

دوسری ② دعا بڑے درجوں کی دعا و تمنا کرنا جائز اور پسندیدہ عمل ہے۔

تیسری ③ دعا سے بعض بزرگوں کی دعا و تمنا کی اصل ملتی ہے کہ انہوں نے اپنے سلسلۂ تعلیم و تربیت کی بقاء و تحفظ کے لیے دعائیں کی ہیں)۔

چوتھی ④ دعا سے جنت کی تمنا اور حرص کرنی چاہیے۔خاص طور پر بڑے درجہ کی جنت کے لیے جیسے جنت النعیم، جنت الفردوس وغیرہ۔

حکیم الامت ﷫ نے اس چوتھی دعا کی طلب وحرص سے ان جاہل صوفیوں کا رد کیا ہے جو جنت اور ذکر جنت سے بے نیازی برتتے ہیں۔

ارے ظالم تو نے پی ہی نہیں

⑭ ﴿قَالُوٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ﴾ [سورة الشعراء: 111]

ترجمة: وہ بولے: کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں جب کہ تیری پیروی کرنے والے کم درجہ کے لوگ ہیں؟

تَفسِیر: سیدنا نوح ﵇ نے جب دعوت وتبلیغ کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے قوم کے غریب غرباء کم درجہ لوگوں نے لبیک کہا اور ایمان لائے۔قوم کے سرداروں اور خوشحال لوگوں نے ساتھ دینے سے اس لیے انکار کیا کہ اس کام میں قوم کے خستہ پستہ لوگ شریک ہیں، ان کی رائے اور فیصلہ کا کیا اعتبار؟ یہ کوئی عجیب وغریب بات نہ تھی، ہر نبی کی پیروی واطاعت کرنے والے ابتداءً غریب غرباء ہی رہے ہیں۔

سیدنا عیسیٰ ﵇ کی دعوت وتبلیغ کو قبول کرنے والے ادنیٰ معاش ماہی گیر تھے، خود سیدنا خاتم النبیین ﷺ کی رسالت پر ابتداء ایمان لانے والے بھی تو مکۃ المکرمۃ کے غریب غرباء کی اکثریت تھی۔اور آج بھی کسی اسلامی و ایمانی تحریک سے وابستہ ہونے والے ایسے ہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔

اہل دولت، جاہ عزت والے ہر دور میں نکمے اور عیش خور رہے ہیں پھر جب حق کا غلبہ دیکھتے ہیں تو ساتھ لگ جاتے ہیں۔ اللّٰھمّ اھْدِنا وَسَدِّد خُطاھم

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے آیت سے ایک اہم تنبیہ اخذ کی ہے: بعض دنیادار لوگ اہل اللہ سے محض اس لیے دور رہتے ہیں کہ ان کی ذاتی حیثیت وخاندانی وجاہت معمولی اور ادنیٰ درجے کی ہے۔

انہیں ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں اپنی کسرِ شان نظر آتی ہے اور وہ اس کو اپنی توہین خیال کرتے ہیں،

اس طرح اہل اللہ کے خیرات وحسنات سے محروم ہوجاتے ہیں۔
آیت سے اس نظر وفکر کی مذمت نکلتی ہے۔

⑮ ﴿فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِي وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [سورة الشعراء: 118]

ترجمة: سو آپ ہی میرے اور ان کے درمیان ایک کھلا فیصلہ فرمادیں اور مجھ کو اور جو میرے ساتھ ایمان والے ہیں، نجات دیجئے۔

تفسیر: سیدنا نوح علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ اپنی قوم میں ساڑھے نوسو سال ۹۵۰ تک جاری رہی۔ یہ طویل مدت بڑی کٹھن اور صبر آزما حالات میں گزری ہے اور جب قوم نے بطور آخری فیصلہ سیدنا نوح علیہ السلام کو سنگسار کردینے کی دھمکی دے دی تو آپ نے بھی وہ آخری دعا کردی جو ہر نبی کو اپنی امت کے بارے میں دی جاتی ہے، یہی دعا قوم کی غرقابی کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ استنباط کیا کہ جو شخص دین کو ضرر پہنچا رہا ہو، اس کے لیے بددعا کرنی جائز ہے اور یہ عمل صبر وحلم کے خلاف نہیں۔

ملحوظه: ذخیرۂ احادیث میں یہ روایت ملتی ہے کہ ہر نبی کو ایک مقبول دعا دی گئی ہے جس کو وہ کسی بھی وقت اختیار کرسکتے ہیں۔ چنانچہ ہر نبی نے اپنی زندگی میں وہ دعا حاصل کرلی لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ دعا قیامت کے دن اپنی امت کی عام بخشش کے لیے محفوظ رکھی ہے۔

فصلوات ربي و سلامه عليه

⑯ ﴿أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ۝ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ۝﴾

[سورة الشعراء: 128 تا 129]

ترجمة: کیا تم فضول یادگاریں ہر اونچے مقام پر بناتے ہو اور بڑے بڑے محلات بھی کہ تمہیں اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے؟

تفسیر: قوم عاد کی تہذیب وتمدن کا ذکر ہے کہ یہ قوم صنعت وحرفت وتعمیرات کی شوقین تھی، زندگی کی ساری دلچسپیوں میں اونچے اونچے پہاڑوں پر مکانات وقلعے بنانا اور تفریح گاہ میں سجانا تھا۔ ان کا یہ شوق تعمیر کسی رہائشی ضرورت کی بناء پر نہ ہوا کرتا تھا، محض جذبات کی تسکین اور نام ونمود اور شان وشوکت کا اظہار مقصود ہوا کرتا تھا۔

اس قوم کا اصلی جرم انکار آخرت تھا جو اللہ تعالیٰ کے ضابطۂ تعزیرات میں انکار توحید کے بعد شدید ترین جرم ہے۔ اس قوم کی ہدایت کے لیے سیدنا ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا۔ قوم نے ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو پیشتر

وانبیاء کے ساتھ قوموں نے کیا ہے۔ آخر ایک زبردست خوفناک تیز وتند آندھی نے جو سات رات آٹھ دن تک مسلسل برق رفتاری سے چلتی رہی، پورے شہر اور اہل شہر کو اوندھا کر دیا۔

سلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: عبث وفضول کام کی مذمت آیت سے ظاہر ہوتی ہے۔

عقیدے کے لحاظ سے تو یہ قوم دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کی قائل نہ تھی لیکن زبردست اور مضبوط تعمیرات کی ساخت پرداخت کا مشغلہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ انہیں دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے، اس لیے انہیں اس عقیدے کا معتقد قرار دیا گیا۔ (آج بھی جو لوگ دنیا اور دنیا سازی کے مشغلہ میں رات دن ایک کیے ہوئے ہیں، ان کی نظر وفکر بھی قوم عاد سے مختلف نہیں۔)

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے مزید یہ لکھا ہے کہ یہاں حضرات صوفیاء کے اس تعامل کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کافروں جیسے عمل کرنے والوں کو کافر کہہ دیا جاتا ہے نیز احادیث میں بھی اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

⑰ ﴿وَاِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِيۡنَ ۝﴾ [سورة الشعراء: 130]

ترجمة: اور جب تم کسی پر گرفت کرتے ہو تو بالکل جابر بن کر گرفت کرتے ہو سو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

تفسیر: عیش وسرمستی کے علاوہ قوم عاد کی دوسری عادت ظلم وتشدد کی تھی۔ ان کے قومی جرائم میں غریبوں، مسافروں اور اجنبیوں پر ظلم وزیادتی کرنا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ان کی گرفت ظالمانہ ہی ہوا کرتی تھی۔ مسافروں کے لیے ان کے یہاں کوئی ضابطہ قانون تھا اور نہ ملک کی عدالتیں اس کو جرم سمجھتی تھیں۔

سُلوك: صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اس گرفت سے مراد ایسی گرفت ہے جس میں نہ رحم ہو، نہ اس سے تادیب کا قصد ہو اور نہ اس میں انجام پر نظر رہے۔ (ایسی گرفت ظلم وتشدد کہلاتی ہے)

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جس گرفت میں یہ تینوں مثبت امور ملحوظ رہیں، وہ اصلاح وتربیت ہے، ظلم وتشدد نہیں۔ (یعنی جس گرفت میں نرمی ① ہو اور تعلیم وتادیب ② کا قصد ہو اور انجام ③ پر نظر رہے، ایسی گرفت طریق سلوک کے منافی نہیں (بلکہ ایسی گرفت سلوک کی بنیادی تعلیمات وہدایات میں شامل ہے)

⑱ ﴿فَعَقَرُوۡهَا فَاَصۡبَحُوۡا نٰدِمِيۡنَ ۝ فَاَخَذَهُمُ الۡعَذَابُ﴾ [سورة الشعراء: 157 تا 158]

ترجمة: سو ان لوگوں نے اونٹنی کو مار ڈالا پھر نادم ہوئے۔ آخر عذاب نے انہیں پکڑ لیا۔

تفسیر: سیدنا صالح علیہ السلام کی قوم کا تذکرہ ہے۔ قوم نے آپ کی نبوت کی تصدیق کے لیے مقامی پہاڑ سے اونٹنی پیدا کرنے کا مطالبہ کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے پہاڑ سے پہاڑ جیسی اونٹنی ظاہر کر دی اور قوم سے یہ عہد لیا گیا کہ قومی کنویں پر ایک دن یہ اونٹنی اور اس کا بچہ پانی پیئے گا اور دوسرے دن قوم کے جانور پیا کریں گے۔

کچھ دن تو قوم نے پابندی کی، آخر تنگ آ گئے کیونکہ جس دن وہ اونٹنی پیا کرتی تھی، سارا کنواں خالی ہو جاتا تھا۔ دوسرے دن قوم کے جانوروں کو برائے نام ہی پانی ملا کرتا تھا۔ آخر اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے ان لوگوں نے اونٹنی کو مار ڈالا۔ دوسرے دن سے عذاب کے آثار شروع ہو گئے تو بہت نادم و پشیمان ہوئے۔ لیکن تیسرے دن عذاب نے انہیں تہس نہس کر دیا۔

(تفصیل کے لیے ''ہدایت کے چراغ'' جلد ا صفحہ ۱۳۶ دیکھئے جو اس عذاب کی قرآنی تشریح ہے۔)

سُلوك: صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ قوم کی ندامت اس لیے لاحاصل رہی کہ انہوں نے اپنے جرم کی تلافی ایمان سے نہ کی (یعنی ایمان نہ لائے کیونکہ توبہ کی یہی حقیقت ہے کہ اس جرم کو ترک کر دیا جائے۔)

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ توبہ کے لیے طبعی ندامت کافی نہیں، عقلی ندامت ہونی چاہیے، طبعی ندامت تو ہر نقصان پر ہوا کرتی ہے۔

سچی توبہ کے تین ③ رکن ہیں:

اول ① گناہ کو فوری ترک کر دیا جائے۔

دوم ② دل سے نادم و شرمندہ ہونا۔

سوم ③ آئندہ کے لیے پختہ عزم و ارادہ کرنا کہ اب یہ گناہ نہ کیا جائے گا۔

(قوم صالح کی ندامت و پشیمانی میں یہ تینوں امور نہ تھے، اس لیے عذاب سے بچ نہ سکے۔)

⑲ ﴿وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ [سورة الشعراء: 186]

ترجمة: اور تم تو ہماری طرح ایک بشر ہو اور ہم تم کو جھوٹوں میں شامل سمجھتے ہیں۔ اچھا پھر تو تم ہم پر آسمان کا ایک ٹکڑا گرا دو اگر تم سچے ہو۔ شعیب نے کہا: تمہارے اعمال کو میرا رب خوب جانتا ہے۔

تَفسِیر: قوم شعیب کا بھی وہی جاہلی عقیدہ تھا جو پیشرو قوموں کا رہا ہے۔ یہ لوگ نبوت و بشریت میں تنافی کے قائل تھے کہ جو نبی ہے وہ بشر نہیں ہوتا، نبی کو فرشتہ یا اور کوئی مخلوق ہونا چاہیے، انسان کیونکر نبی ہو سکتا ہے۔ شعیب تو ہماری طرح ایک بشر ہے، پھر نبوت کا دعویٰ کرنا جھوٹا دعویٰ ہے۔

یہ اوندھی فکر ماضی کی سینکڑوں قوموں کو لاحق رہی ہے۔ سیدنا شعیب علیہ السلام کی قوم بھی یہی فکر دہراتی تھی اور اس پر بھی بس نہیں کرتی بلکہ یہ بچکانا مطالبہ بھی کرتی رہی کہ اگر تم سچے ہو تو آسمان کا ایک ٹکڑا ہی گرا دو تاکہ ہم یقین کر لیں کہ تم نبی و رسول ہو۔

گویا اس اندھی فکر سے قوم کا مطلب یہ تھا کہ آسمان کا ٹکڑا گرا دینا ممکن ہے لیکن نبی، بشر نہیں ہو سکتا۔

ہر دور کے انبیاء کرام کو تقریباً ایسے ہی احمقوں سے سابقہ پڑا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آج بھی بعض پڑھے لکھے جاہل لوگ اولیاء اللہ کو لوازم بشریت کی بناء پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں کیونکہ ان کی زندگی عام انسانوں کی طرح مجبور بے بس ہے۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ بھی اخذ کیا ہے کہ کشف وخوارق اہل اللہ کے بس میں نہیں ہوا کرتے ہیں۔

20 ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿١٩٥﴾﴾ [سورة الشعراء: 193 تا 195]

ترجمة: اس قرآن کو روح الامین نے آپ کے قلب پر اتارا ہے تا کہ آپ (اللہ کے عذاب سے) ڈرانے والوں میں شامل ہوں۔ صاف صاف عربی زبان میں۔

تفسیر: قرآن حکیم وہ مبارک عظیم کتاب ہے جسے ربّ العالمین نے جبرئیل امین کے واسطے سے اپنے رسول کے قلب پر اتارا ہے کیونکہ یہ نبی ہی کا قلب تھا جو اللہ کی اس بھاری امانت کو برداشت کر سکے۔ چنانچہ وحی آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اتری، آپ نے اس کو اپنے دل سے سنا اور سمجھا اور محفوظ کرلیا۔ آپ دل کے کانوں سے وحی کی آواز سنتے تھے، دل کی آنکھوں سے فرشتے کو دیکھتے تھے۔

قلب مبارک پر قرآن کا یہ نزول الفاظ و معنی ہر دور کے ساتھ ہوا کرتا تھا، اختتام وحی کے بعد آپ پڑھ کر سنا دیا کرتے اور کاتبان وحی کو لکھوا دیتے۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو ایک ''قوت سامعہ'' (سننے کی قوت) اور ایک ''قوت باصرہ'' (دیکھنے کی قوت) دی گئی تھی جس کا ذکر ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ﴾ (سورۃ النجم: ١١ میں موجود ہے) اس حقیقت کے بعد یہ ثابت ہوا کہ قلب میں سمع و بصر بھی ہوا کرتے ہیں جیسا کہ ظاہر میں ہیں اور جب کبھی یہ دونوں مل جاتے ہیں تو ادراک قوی تر ہو جاتا ہے۔ احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

21 ﴿فَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتَكُونَ مِنَ الْمُعَذَّبِينَ ﴿٢١٣﴾﴾ [سورة الشعراء: 213]

ترجمة: پس آپ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکاریئے ورنہ آپ کو سزا ہونے لگے گی۔

تفسیر: شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''فرمایا تو رسول کو اور سنایا اوروں کو۔'' (موضح القرآن) (مطلب یہ کہ جو خود توحید کا داعی ہو وہ شرک کیوں کرے گا؟ لہٰذا خطاب عام انسانوں کو کیا جا رہا ہے۔)

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آیت سے مفہوم ہوتا ہے کہ ولی کبھی ایسی حالت پر نہیں آتا کہ جس سے شرعی احکام معاف ہو جائیں (کیونکہ ولی کا درجہ نبی سے بلند نہیں ہے۔ جب نبی کے لیے یہ حالت ممکن نہیں تو پھر ولی کے لیے کیوں کر ممکن ہے؟)۔

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [سورة الشعراء: 215]

ترجمۃ: اوران لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آیئے جنہوں نے آپ کی پیروی کی ہے۔

تفسیر: کہاں پیغمبر اور کہاں امّتی۔ شرافت وکرامت کے اعتبار سے دونوں کا مقابلہ ہی کیا۔

یہاں صراحت سے مخدوم وآقا کو اپنے غلاموں کے ساتھ نرمی وانکساری سے پیش آنے کا حکم دیا جارہا ہے، یہ تعلیم اسلام کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے؟

سُلوك: علماء نے لکھا ہے کہ جب نرمی وانکساری کا حکم بڑوں کو مل رہا ہے تو خود چھوٹوں اور خادموں، مریدوں، شاگردوں کو اپنے بزرگوں، مرشدوں، استادوں کے حضور میں کہیں زیادہ انکساری کے ساتھ رہنا چاہیے۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ طریق کے شیوخ کو اس میں تعلیم وہدایت ملتی ہے کہ اپنے مخلص تابعین سے نرمی وتواضع کے ساتھ پیش آئیں۔

﴿فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ [سورة الشعراء: 216]

ترجمۃ: اور اگر یہ لوگ آپ کا کہنا نہ مانیں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے افعال سے بیزار ہوں۔

تفسیر: اوپر کی آیت ۲۱۵ میں حُبّ فی اللہ کی تعلیم تھی، مذکورہ آیت میں بُغض فی اللہ کی تعلیم ہے (یعنی نصیحت وخیر خواہی کے بعد بھی کوئی کہنا ماننے اور مخالفت پر اڑا رہے تو اس سے دور ہو جانا ہی بہتر ہے کیونکہ جب وہ خود اپنا نقصان کررہا ہے تو اس کے ضرر سے کم از کم ہم تو محفوظ ہو جائیں۔)

آیت میں مخالفوں سے کنارہ کش ہو جانے کا جو عنوان بیان کیا گیا ہے (یعنی میں تمہارے افعال سے بیزار ہوں) خود دعوت وتبلیغ کا بھی عنوان ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں سے بری ہو کر بھی پیام حق پہنچا دیا گیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ طریق میں جن مشائخ نے اپنے نافرمان مرید سے انقطاع کرلیا ہے، آیت سے اس کی تائید ملتی ہے۔

﴿تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ﴾ [سورة الشعراء: 222]

ترجمۃ: شیاطین ایسے لوگوں پر اُترتے ہیں جو بڑے درجے کے جھوٹے اور بدکردار ہوں۔

تفسیر: یعنی شیاطین کی ساز باز ایسے ہی لوگوں سے رہا کرتی ہے جو لپا پے قسم کے بےعمل، بدعمل ہوں اور جو خود شیاطین کو دعوت بھی دیتے ہوں، ورنہ اہل ایمان پر شیاطین کا سایہ تک نہیں پڑ سکتا۔

حدیث شریف میں یہ مضمون ملتا ہے کہ جب مومن شیطان پر غالب آجانا چاہتا ہے تو شیطان کی طاقت چیونٹی سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوتی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ صادق وکامل الایمان پر شیطان ایسا تصرف نہیں کرسکتا جس سے اس

کے دین کو ضرر پہنچے (وہ ترغیب تو دے سکتا ہے، گناہ نہیں کروا سکتا)۔

ملحوظہ: جن اللہ والوں کو شیاطین سے ضرر پہنچا ہے، وہ صرف صُوری (ظاہری) ہوا کرتا ہے جس کے اندر سینکڑوں فوائد ہوا کرتے ہیں جن کا ظہور کچھ تو دنیا میں ہوا باقی آخرت میں کامل طور پر ظاہر ہوگا۔

㉕ ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ﴾ [سورة الشعراء: 224]

ترجمة: اور شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ وہ ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں اور زبان سے وہ باتیں کرتے ہیں جو خود کرتے نہیں۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور انہوں نے اللہ کا ذکر کثرت سے کیا۔

تفسیر: قرآن حکیم نے شعر گوئی کی ہمت افزائی نہیں کی کیونکہ اچھی بات اچھی ہی ہے خواہ نظم ہو یا نثر حَسَنُه حَسَنٌ وَقَبِيْحُه قَبِيْحٌ (اچھا شعر اچھا ہے اور بُرا شعر بُرا ہے)۔

اس بحث کا یہ آخری فیصلہ ہے۔ رہے باقی دلائل، اس میں جانبداری اور غیر جانبداری سب کچھ پائی جاتی ہے۔

ملحوظہ: قرآن حکیم نے شعر و شاعری کو شانِ نبوت کے لیے غیر مناسب قرار دیا ہے۔ (سورۃ یٰسین: ۶۹)

روایات حدیث میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو کوئی شعر پورے طور پر یاد نہ تھا، دورانِ گفتگو اگر کسی شاعر کا کوئی اچھا شعر زبان مبارک پر آجاتا تو غیر موزوں پڑھ جاتے تھے یا اس میں الفاظ کا اُلٹ پھیر ہو جاتا تھا۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا: کیا رسول اللہ ﷺ اپنی تقریر و وعظ میں کبھی اشعار پڑھا کرتے تھے؟ فرمایا کہ شعر سے بڑھ کر آپ ﷺ کو کسی چیز سے نفرت نہ تھی البتہ کبھی کبھار بنو قیس کے شاعر کا ایک آدھا شعر پڑھتے مگر اوّل کو آخر۔ آخر کو اوّل پڑھ جاتے تھے۔ ایسے موقع پر میرے والد ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے: یا رسول اللہ! شعر یوں نہیں بلکہ یوں ہے، تو آپ ﷺ فرماتے: بھائی میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر گوئی میرے کرنے کا کام ہے۔ (انتھی) تاہم جس شعر میں اچھی بات ہوتی تو ﷺ آپ اس کو پسند فرماتے:

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً» بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں۔

امیہ بن ابی الصلت کا کلام سن کر فرمایا: «آمَنَ شِعْرُه وَكَفَرَ قَلْبُه» اس کا شعر مومن ہے مگر دل کافر۔

ایک مرتبہ ایک صحابی نے سو (۱۰۰) کے قریب عمدہ عمدہ اشعار آپ کو سنائے، آپ ﷺ نے خوشی کا اظہار فرمایا۔

قرآن حکیم نے اچھے شعر اور نیک شاعروں کو ان عام شاعروں سے علیحدہ قرار دیا ہے جو تخیلات، خرافات،

عریانیات، فاحشات پر مبنی مضامین کی تخلیق میں اپنا زورِ بیان ختم کرتے ہیں۔

باایمان صالح کردار شاعروں کی نظر وفکر، مقصد ونیت عام شاعروں سے بالکل مختلف ہوا کرتی ہے۔

جب وہ دیکھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کا مذاق اڑایا جارہا ہے تو پھر اپنی زبان سے وہی کام لیتے ہیں جو ایک مردِ مجاہد توپ وتفنگ سے کام لیا کرتا ہے، ورنہ ہر وقت گنگناتے رہنا، شعر وشاعری کا مشغلہ رکھنا صالحین کا شیوہ نہیں ہے۔

سُلوك: بعض عارفین نے حق کی حمایت اور تاثیر فی القلب کے لیے اشعار سے کام لیا ہے۔

(عہدِ نبوت کے حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے لے کر مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ جامی رحمۃ اللہ علیہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ حافظ عراقی رحمۃ اللہ علیہ اور ماضی قریب کے اقبال رحمۃ اللہ علیہ جوہر رحمۃ اللہ علیہ اصغر رحمۃ اللہ علیہ اکبر رحمۃ اللہ علیہ اور زمانہ حال کے حکیم اختر [1] کی شاعری اسی طبقے میں آجاتی ہے۔ واللہ اعلم)

---

[1] مولانا حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم (۱۴۱۷ھ م ۱۹۹۶ء) خلیفہ مجاز حضرت محی السنۃ شاہ مولانا ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم، خانقاہ امدادیہ اشرفیہ گلشن اقبال ۲، کراچی، پاکستان۔

سُوْرَةُ النَّمْلِ

پَارَہ: 19

❶ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۴﴾ [سورة النمل: 4]

ترجمة: جولوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم نے ان کے اعمال ان کی نظروں میں خوشنما بنا رکھے ہیں سو وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔

تَفسِیر: یہ ایک کھلی بات ہے کہ جن قوموں کے دلوں سے آخرت کا خیال مٹ جاتا ہے، وہ اپنا سارا وقت اور ساری توانائی اسی دنیا کی دوڑ دھوپ اور اس کی ترقی کے لیے وقف رکھتے ہیں۔

یہ اس لیے کہ جنہیں اپنے انجام کی کوئی فکر اور مستقبل کا خیال نہ ہو، وہ اسی دنیائے فانی میں ڈوبے ہوئے ہیں، ان کی تمام کوششوں کا مرکز یہی چند روزہ زندگانی ہے۔ وہ دنیا کی محبت میں غرق ہو کر اللہ والوں پر آوازیں کسا کرتے ہیں، آسمانی نظام کا ٹھٹھہ کرتے اور قانون شریعت کو جنگل کا قانون قرار دیتے ہیں۔

اور اگر اسلام اور مسلمانوں سے قریب بھی ہوتے ہیں تو مذہب کو پرسنل (شخصی) معاملہ کہہ کر گزر جاتے ہیں اور جو کام خود انجام دے رہے ہیں، اس کو بہت اچھا اور مفید تر خیال کرتے ہیں اور اسی میں اپنا سر ٹکراتے رہتے ہیں۔ آخرت میں سب سے زیادہ خسارہ انہی لوگوں کو رہے گا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت کے مضمون سے یہ اخذ کیا ہے کہ ہر شخص کے قلب کی شہادت معتبر نہیں ہوتی۔ یعنی اگر کسی آخرت فراموش کا خود اپنا قلب کسی عقیدہ پر مطمئن اور پر اعتماد ہو تو یہ اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہوگی کیونکہ سارے باطل مذاہب والے اپنے مذہب اور اس کے عقیدوں کو حق ہی سمجھتے ہیں۔

قرآن حکیم نے اس پُر پیچ مسئلہ کی صحیح تشخیص کردی کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، انہیں اپنے اعمال وعقائد خوبصورت اور حق معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خدا بیزاری وآخرت فراموشی کا نتیجہ ہے جس کا انجام وہ دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔

❷ ﴿وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [سورة النمل: 15]

ترجمة: اور ان دونوں نے کہا: تمام تعریفیں اللہ کے لیے سزاوار ہیں جس نے ہم کو اپنے بہت سارے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی ہے۔

تَفسِیر: سیدنا داؤد وسلیمان علیہما السلام کا تذکرہ ہے۔ دونوں باپ بیٹے اللہ کے ان انعامات کا ذکر کر رہے ہیں جو انہیں حاصل تھے۔ طبقۂ انبیاء میں مال ودولت، حکومت وطاقت، شان وشوکت جس قدر ان دونوں حضرات

کو ملی ہیں، قرآن حکیم نے اس کو خصوصیت سے بیان کیا ہے۔

(تفصیل ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۲ر صفحہ ۲۲ دیکھئے)

سیدنا داؤد و سلیمان علیہما السلام اللہ کے اس فضل و کرم کو بطور حمد و ثنا بیان کر رہے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ غلبۂ فنا کے آثار کا قائم اور مستمر رہنا کاملین کے لیے بھی لازم نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ کسی انسان پر خاکساری و تواضع کے آثار کا ہر وقت قائم رہنا ضروری نہیں۔ کبھی کبھی انسان اپنے فضائل و کمالات کا جو اللہ کی عطاء و بخشش ہوا کرتی ہیں، ذکر کر دیتا ہے۔ ایسا اظہار خاکساری و تواضع کے خلاف نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں نعمت کا اظہار کرنا عجب و تکبر میں شمار نہیں کیا جاتا۔ البتہ جو اظہار فخر و شان کے لیے کیا جاتا ہے، وہ عجب و کبر کی علامت ہے۔ سیدنا داؤد و سلیمان علیہما السلام اللہ کے احسان و عطایا کو بطور اظہار نعمت و شکر گزاری بیان کر رہے ہیں۔

﴿وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [سورة النمل: 16]

ترجمة: اور ہم کو ہر قسم کی نعمتیں عطا ہوئی ہیں۔

تفسیر: سیدنا سلیمان علیہ السلام اپنی قوم میں اللہ کے فضل عظیم کو بیان کر رہے ہیں جو انہیں نصیب تھا۔ ان انعامات میں ایک انعام منطق الطیر (پرندوں کی بول چال) کا علم تھا۔ پرندے ان سے اور وہ پرندوں سے اس طرح گفتگو کر لیا کرتے تھے جیسا دوست دوست سے کیا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر قسم کی نعمتیں بھی نصیب تھیں۔ (جس کی تفصیل ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۲ر ۴۰ صفحہ پر مطالعہ کیجئے)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ مال و دولت کی کثرت کاملین کو نقصان نہیں دیتی۔

﴿وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [سورة النمل: 24]

ترجمة: میں نے اس کو اور اس کی قوم کو دیکھا ہے کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے یہ عمل ان کے لیے خوشنما بنا رکھا ہے اور راہِ حق سے دور رکھا ہے، پس وہ لوگ ہدیات یافتہ نہیں ہیں۔

تفسیر: سیدنا سلیمان علیہ السلام کی رعایا میں جنات و حیوانات کے علاوہ پرندے بھی تھے۔ ایک پرندہ جس کا نام قرآن حکیم نے ہدہد بیان کیا ہے، فلسطین ملک شام سے سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے ملک سبا (یمن) کی ایک فرمانروا خاتون کی خبر لایا اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کو اس کی اطلاع دی کہ وہ ملک پر بڑی شان و شوکت سے حکمرانی کر رہی ہے لیکن وہ اور اس کی ساری قوم مشرک ہے، سورج کی پرستش کرتی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے مذکورہ واقعہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ جانوروں میں بھی بقدر ضرورت علم و معرفت موجود ہے۔ (احادیث سے بھی اس حقیقت کی تائید ملتی ہے۔ بعض جانوروں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

کلام کیا اور آپ کی نبوت کی تصدیق کی۔علاوہ ازیں اپنی شکایات بھی آپ کو سنائی ہیں۔)

﴿قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً﴾

[سورۃ النمل: 34]

ترجمۃ: ملکہ نے کہا: بادشاہ جب کسی بستی میں (فاتحانہ) داخل ہوتے ہیں تو اسے تہ و بالا کر دیتے ہیں اور بستی کے عزت والوں کو ذلیل بھی کر دیتے ہیں اور اسی طرح یہ لوگ بھی کریں گے۔

تفسیر: سیدنا سلیمان علیہ السلام کا ایک خط لے کر ہدہد پھر ملک سبا گیا اور ملکہ کے تخت پر جب وہ حکمرانی کر رہی تھی، ڈال دیا۔ملکہ نے خط پڑھا اور اپنے اہل دربار سے کہا: میرے یہاں ایک عظیم الشان بادشاہ کا خط آیا ہے جس میں ان کی اطاعت قبول کرنے (ایمان لانے) کی ہدایت ہے، خط کا یہ مضمون ہے:

﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

﴿أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ﴾

تم لوگ میرے مقابلے میں بڑائی نہ کرو اور اطاعت قبول کر کے چلے آؤ۔

دربار کے سرداروں نے جب یہ شاہی فرمان سنا تو بگڑ گئے۔کہنے لگے: ہم کمزور قوم نہیں ہیں، قوت و طاقت والے جنگ آزما ہیں، ان کا مقابلہ کیا جائے گا۔باقی آپ کی جو مرضی ہو، ہم اطاعت کریں گے۔

ملکہ ذہین و عقل مند خاتون تھیں۔اہل دربار کو وہ جواب دیا جو مذکورہ آیت میں موجود ہے۔

سُلوك: خلاصۃ التفاسیر کے مفسر (المتوفی ۱۹۰۵ء) نے اپنے استاذ فخر المتاخرین مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ استاذ مرحوم نے اثنائے درس مذکورہ آیت پر فرمایا تھا کہ کسی مسلمان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ انقلاب کا خواہش مند ہو، البتہ یوں دعا کرے: اے اللہ! حاکم طاقت کو ایسی اور ایسی توفیق دے اور ہدایت نصیب کر کہ وہ عدل و انصاف قائم کرے۔یہ نہ کہے کہ اے اللہ! حاکم معزول و برطرف ہو اور فلاں فلاں شخص حاکم و حکمراں ہو۔یہ اس لیے کہ ایسی صورت میں ہزار ہا بے گناہ و بے جرم شرافت والے پس جاتے ہیں۔(تفسیر ماجدی)

امام رازی رحمہ اللہ نے سیدنا سلیمان علیہ السلام کے خط سے یہ استنباط کیا ہے کہ نبیوں کے کلام میں طوالت نہیں ہوتی، عبارت مختصر ہوا کرتی ہے، نفس مطلب پر اکتفا کرتے ہیں۔(تفسیر کبیر)

﴿قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ أَنَا آتِيْكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَّرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾

[سورۃ النمل: 40]

ترجمۃ: جس شخص کے پاس کتاب الٰہی کا علم تھا، اس نے کہا: میں اس تخت کو آپ کے آگے پلک جھپکنے سے پہلے

لے آؤں گا۔

تفسیر: ہُدہُد پرندے نے ملکہ سبا کی تفصیلات میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ اس ملکہ کا ایک عظیم الشان تخت ہے جو جواہرات سے مرصع سونے چاندی سے آراستہ، جس پر بیٹھ کر وہ حکمرانی کرتی ہے۔

سیدنا سلیمان علیہ السلام نے جب یہ سنا تو اپنے اہل دربار سے کہا: کیا تم میں کوئی ایسا بھی ہے جو اس تخت کو اٹھا لائے قبل اس کے کہ وہ اطاعت قبول کر کے یہاں چلی آئے۔

ایک دیو ہیکل جن نے کہا: میں حاضر ہوں۔ آپ کی مجلس برخاست ہونے سے پہلے اس تخت کو اٹھا لاؤں گا۔

اس پر دوسرے نے کہا: حضور! میں تو آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اٹھا لاؤں گا۔

چنانچہ چند سیکنڈوں میں اٹھا لایا۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے جب یہ تخت دیکھا تو بے ساختہ فرمایا: یہ میرے رب کا فضل و کرم ہے۔

(واقعہ کی تفصیل ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۲ ر صفحہ ۵۳ پر مطالعہ کیجئے جو تاریخ قدیم کی عجیب و غریب حکایت ہے۔)

دربارِ سلیمانی کا یہ دوسرا شخص کون تھا؟ اور اس کو کس کتاب کا علم تھا؟ روایات مختلف ہیں۔

بعضوں نے جبرئیل امین کہا ہے اور بعض نے ایک فرشتہ قرار دیا ہے۔ اہل تحقیق علماء نے ان کا نام آصف بن برخیا لکھا ہے جو مملکت سلیمانی کے وزیر بھی تھے، انہیں اسماء الٰہی کا علم حاصل تھا جس کے ذریعے بڑے بڑے محیر العقول کارنامے انجام دیا کرتے تھے۔ (تفسیر کبیر)

سُلوک: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ سے خوارق و کرامات کا ثبوت پیش کیا ہے۔

اہل سنت والجماعت کہتے ہیں: كَرَامَاتُ الْأَوْلِيَاءِ حَقٌّ۔ (فقہ اکبر)

۞ ﴿قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝﴾

[سورة النمل: 41]

ترجمۃ: سلیمان علیہ السلام نے اہل دربار کو حکم دیا کہ اس کے تخت کی صورت بدل دو تا کہ ہم دیکھیں کہ وہ ہدایت پاتی ہے یا ان لوگوں میں شامل ہے جو ہدایت نہیں پاتے۔

تفسیر: ملکہ سبا کا وہ تخت دربار سلیمانی میں جب پہنچا تو آپ نے فرمایا: اس تخت میں کچھ ترمیم کر دو تا کہ ملکہ کا امتحان لیا جا سکے کہ وہ اپنے تخت کے جاننے پہچاننے میں ہدایت پاتی ہے یا نہیں۔

(گویا معجزہ دیکھ کر ایمان لاتی ہے یا نہیں۔)

چنانچہ جب ملکہ دربار سلیمانی میں آئی تو اس سے پوچھا گیا: کیا آپ کا تخت شاہی بھی ایسا ہے؟

ملکہ نے فوری جواب دیا: ہاں یہ تو گویا وہی ہے۔ اس کے بعد ملکہ نے کہا: ہم لوگ اس معجزے کے جاری ہونے سے پہلے ہی آپ کی نبوت کی تصدیق کر چکے اور مسلمان ہو گئے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے لکھا ہے کہ آیت سے بعض مشائخ طریقت کے اس عمل کی تائید ہوتی ہے کہ وہ اپنے سلسلے میں کسی کو داخل کرنے سے پہلے اس کا امتحان لیا کرتے ہیں۔

8 ﴿قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى﴾ [سورة النمل: 59]

ترجمة: آپ کہیے: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے سزاوار ہیں اور اس کے ان بندوں پر سلام ہو جن کو اس نے منتخب کر لیا ہے۔

تفسیر: مذکورہ سورت میں جن جن قوموں کی ہلاکت و بربادی کا ذکر آیا ہے، ان کی ہلاکت خیزی کے اختتام پر نبی کریم ﷺ کو حمد و ثنا کرنے کی ہدایت جاری ہی ہے۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی ﷫ نے لکھا ہے کہ کفار کی ہلاکت کے موقع پر حمد الٰہی کرنے کا تذکرہ آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

حکیم الامت ﷫ نے اس پر مزید استنباط کیا ہے کہ دشمنوں کی ہلاکت پر مسرور ہونا اخلاق فاضلہ کے خلاف نہیں۔

9 ﴿حَتّٰى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا﴾ [سورة النمل: 84]

ترجمة: یہاں تک کہ جب وہ قیامت کے دن حاضر ہوں گے تو اللہ ان سے پوچھے گا: کیا تم نے میری آیات کو جھٹلایا تھا حالانکہ تم ان آیات کو اپنے احاطۂ علم میں بھی نہ لائے؟

تفسیر: قیامت کے قریب کثرت سے چھوٹے بڑے حادثے پیش آئیں گے۔ یہ تمام حادثے اس آخری تباہی کا پیش خیمہ ہوں گے جو قیامت کی شکل میں ظاہر ہونے والی ہے۔

ان حادثات میں "دَابَّةُ الْاَرْض" کا بھی خروج ہوگا۔ اس جانور کا نام "جساسه" بیان کیا گیا ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب محدث ﷫ لکھتے ہیں کہ قُربِ قیامت میں مکۃ المکرمۃ کا صفا پہاڑ اچانک پھٹ پڑے گا اور اس میں سے ایک جانور نکلے گا جو انسانوں سے باتیں کرے گا اور ایمان والوں اور بے ایمانوں کو ایک خاص نشان لگا کر جدا کر دے گا۔ (تفصیل کے لیے "ہدایت کے چراغ" جلد ۲ دیکھئے)

مذکورہ آیت میں بے ایمان لوگوں کی فہمائش کی جارہی ہے کہ انہوں نے بے علم و تحقیق آیات الٰہی کی تکذیب کیوں کی؟

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ جس بات کی حقیقت معلوم نہ ہو، اس کا انکار کرنا بُرا ہے جیسا کہ بعض کوتاہ نظر لوگ عارفین کا کلام بے غور و فکر رد کر دیتے ہیں۔

آیت سے ایسے عمل کی مذمت نکلتی ہے۔

⑪ ﴿وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا﴾ [سورة النمل: 93]

ترجمة: اورآپ کہہ دیجئے کہ ساری تعریف اللہ ہی کے لیے ثابت ہے۔ الخ

تفسیر: سورۃ النمل کی یہ آخری آیت ہے۔ سورت کا اختتام حمد وثنا پر کیا گیا ہے کہ علم وحکمت، ملک و دولت، طاقت وقدرت، کون ومکان، زمین وزمان، عزت وشان سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے سزاوار ہے، وہی اس کا خالق ومالک وحق دار ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اہل اشارات نے کہا ہے کہ سورت کے خاتمے پر الحمد للہ لانے میں یہ تعلیم ہے کہ مسلمانوں کو بھی اپنے سارے اقوال واعمال کے خاتمہ پر حمد وثنا کرنی چاہیے۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ

سُوۡرَۃُ القَصَص

پَارَہ: 20

1 ﴿وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ [سورة القصص: 5]

ترجمة: اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زور ملک میں گھٹا جا رہا ہے، ان پر احسان کریں اور انہیں سرداری عطا کریں اور انہیں زمین کا مالک بنائیں۔

تفسیر: ملک مصر میں قبطی آباد تھے جو فرعون کی قوم تھی اور سبطی بھی تھے جو بنی اسرائیل کہلاتے تھے لیکن فرعون بنی اسرائیل کو ابھرنے نہیں دیتا تھا۔ گویا ملک کے سارے قبطی آقا بنے ہوئے تھے اور پیغمبروں کی اولاد بنی اسرئیل کو غلام بنا رکھا تھا، ان سے ذلیل سے ذلیل کام لیتے اور ان کو کسی طرح اس قابل نہ ہونے دیتے کہ وہ ملک میں کوئی مقام حاصل کرسکیں، ظلم صرف اس حد تک نہ تھا بلکہ کسی کاہن نے فرعون سے کہہ دیا تھا کہ تمہاری سلطنت کا زوال ایک اسرائیلی کے ہاتھ ہوگا۔ اس پر اس پاگل نے اپنے زعم میں قضاوقدر کی روک تھام کے لیے ''قتل اولاد'' کا قانون جاری کیا، پھر کیا تھا، ملک میں ہر روز بنی اسرائیل کے نومولود بچے قتل کردیئے جاتے تھے۔

آیت میں اسی ظلم و جبر کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فرعون کے انتظامات تو یہ تھے لیکن ہم نے یہ فیصلہ کرلیا کہ کمزوروں کو قوی اور پستوں کو بالا کردیں، جس قوم کو فرعونیوں نے ذلیل غلام بنا رکھا تھا، ان کے سروں پر دین کی امامت اور دنیا کی سرداری کا تاج رکھیں۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ جس اسرائیل کے ہاتھ فرعون اور فرعونیوں کی تباہی مقدر تھی، اللہ نے اس بچے کی اسی کے محل میں اسی کے بستر پر اسی کی گود میں شاہانہ ناز و نعمت سے پرورش کروائی اور یہ دکھلایا کہ اللہ جو انتظام کرنا چاہے، کوئی طاقت اسے نہ روکے۔ (موضح القرآن)

سُلوك: حکیم الامت ﷫ لکھتے ہیں: عارفین نے اس واقعہ سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ کسی کو ناحق کمزور، مظلوم بنانا دراصل اس پر اللہ کی تائید و نصرت کو دعوت دینا ہے (لہٰذا مظلوم کو پریشان نہ ہونا چاہیے کیونکہ اللہ کی طرف سے مظلوموں کی تائید و نصرت بہرحال ہوجاتی ہے)۔

شفق بن کے ہوتا ہے گردوں پہ ظاہر
یہ کس کشتۂ بے گناہ کا لہو ہے؟

2 ﴿وَ قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَ لَكَ﴾ [سورة القصص: 9]

تفسیر: اور فرعون کی بیوی نے کہا: یہ بچہ میری اور آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اسے قتل نہ کرنا، کیا عجب ہے

کہ یہ ہمیں نفع دے یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں۔ (اللہ فرماتا ہے) اورانہیں اپنے انجام کی کچھ خبر نہ تھی۔

تَفسِیر: جس زمانے میں فرعونی حکومت کے قانون میں ''قتل اولاد'' کا سلسلہ جاری تھا، سیدنا موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ماں نے تقریباً تین ماہ تک تو چھپائے رکھا اور جب راز فاش ہونے لگا تو اللہ نے وحی نازل کی کہ بچہ کو ایک محفوظ صندوق میں بند کرکے دریائے نیل میں بہا دیا جائے۔ دریا فرعون کے شاہی محل کے نیچے ہو کر گزرتا تھا، صندوق بہتے بہتے وہاں پہنچا تو فرعون کی بیوی نے اسے اٹھالیا۔ کھولا تو اس میں ایک حسین وجمیل بچہ تھا۔ بچہ کی پرکشش مظلومانہ صورت نے ان کے دل کو بیحد متاثر کر دیا اور وہ دل سے فریفتہ ہوگئی۔

سُلوك: عارفین نے لکھا ہے کہ اللہ والوں سے محبت کرنا خواہ طبعی حیثیت سے کیوں نہ ہو، رائیگاں نہیں جاتا۔ اس کا فائدہ بہر حال ملتا ہے۔ چنانچہ فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہا نے بچہ سے محبت کی تھی۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے اعلان نبوت پر ایمان لائیں بلکہ ''سَیِّدَةُ نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ'' کے لقب سے مشرف ہوئیں۔

(3) ﴿وَ اَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰی فٰرِغًا﴾ [سورة القصص: 10]

ترجمة: اور موسیٰ کی والدہ کا دل بے قرار ہوا۔ قریب تھا کہ وہ اپنے بچہ کا حال ظاہر کر دیتیں اگر ہم ان کے دل کو مضبوط نہ کیے ہوتے (ہمارا ارادہ تھا کہ) وہ یقین کرنے والوں میں شامل رہیں۔

تَفسِیر: اللہ کی وحی والہام سے موسیٰ کی والدہ نے اپنے شیر خوار بچے کو دریا میں تو ڈال دیا لیکن بعد میں ہر لحہ بے قراری میں اضافہ ہوتا گیا، قریب تھا کہ صبر وضبط کا دامن چھوٹ جاتا اور راز کو ظاہر کر دیتیں لیکن خدائی الہام کہ وہ بچہ تمہاری گود میں بہت جلد آجائے گا، تسلی لیتی رہیں۔

سُلوك: عارفین نے لکھا ہے کہ کاملین بھی طبیعت کے اثرات سے بالکل محفوظ نہیں ہوجاتے، انہیں تردّد وتشویش پیدا ہوتی ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو تردّد وتشویش پیدا ہوگئی تھی حالانکہ اللہ کی وحی اور اس کا الہام انہیں واضح طور پر مل چکا تھا کہ بچہ بہت جلد تمہاری گود میں آجائے گا۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: ﴿لَوۡ لَاۤ اَنۡ رَّبَطۡنَا عَلٰی قَلۡبِہَا﴾ سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ اخلاق کی تکمیل میں انسانی عمل دخل کافی نہیں، تائید الٰہی کا ہونا بھی ضروری ہے، بغیر تائید الٰہی کوئی شخص کامل نہیں ہوتا۔

(4) ﴿وَ قَالَتۡ لِاُخۡتِہٖ قُصِّیۡہِ ۫ فَبَصُرَتۡ بِہٖ عَنۡ جُنُبٍ وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿ۙ۱۱﴾﴾

[سورة القصص: 11]

ترجمة: ماں نے موسیٰ کی بہن سے کہا: موسیٰ کا سراغ تو لگا، سو اس نے بچے کو دور سے دیکھا اور لوگ (اہل فرعون) اس سے بے خبر تھے۔

تفسیر: یعنی جب فرعون کے دربار میں صندوق کھلا اور بچہ برآمد ہوا تو شہر میں شہرت ہوگئی۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اپنی بیٹی سے کہا: بچہ کا پتہ لگانے کے لیے نکل جا اور اجنبی بن کر اس کے حالات معلوم کر۔ چنانچہ وہ ساری تفصیلات لے آئی۔

سُلوک: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اعتدال کے ساتھ تدبیر کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔

⑤ ﴿وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ﴾ [سورة القصص: 13]

ترجمة: تاکہ وہ جان لیں اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے البتہ اکثر لوگ اس کا یقین نہیں رکھتے۔

تفسیر: اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے دو ② وعدے کیے تھے: اپنے نومولود بچے کو فرعون کے ظلم سے بچانے کے لیے دریا میں چھوڑ دو، ہم اس بچے کو پھر تمہاری گود میں پہنچا دیں گے۔

دوسری بات یہ کہ ہم اس بچے کو نبوت سے بھی سرفراز کریں گے۔ چنانچہ پہلا وعدہ تو ماں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حیرت انگیز طریقے سے موسیٰ اپنے گھر اپنی ماں کی گود میں آ گئے۔

دوسرا وعدہ جوانی میں پورا ہوا اور نبوت سے سرفراز کیے گئے، اللہ کے دونوں وعدے پورے ہوئے۔

شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ایسے مسئلے میں بڑے بڑے لوگ چکرا جاتے ہیں اور بے یقین سے ہو جاتے ہیں۔

سُلوک: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اللہ کا وعدہ ظاہر ہونے سے پہلے اطمینان کی کیفیت نہ ہونا کمال ایمان کے خلاف نہیں (یعنی ایک شخص کو اللہ کے وعدوں پر ایمان و یقین تو ہے، اس کے باوجود قلب کو اطمینان کی کیفیت حاصل نہ ہو تو یہ ایمان و یقین کے خلاف نہیں ہے کیونکہ ایسی تشویش فطرت کے طبعی تقاضوں میں شامل ہے جس پر شرعی مواخذہ نہیں ہوتا)۔

⑥ ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝﴾
[سورة القصص: 16]

ترجمة: موسیٰ نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! مجھ سے قصور ہوگیا، سو آپ معاف کر دیں، سو اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام نبوت سے پہلے فرعون کے محل میں مقیم تھے، آئے دن بنی اسرائیل پر فرعونیوں کے ظلم و ستم دیکھا کرتے تھے۔ ایک دن ایسے ہی ہوا کہ ایک فرعونی اسرائیلی کو زدوکوب کر رہا تھا اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مدد چاہی لیکن فرعونی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خاطر میں نہ لایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس ظلم و زیادتی کو برداشت نہ کر سکے، اس فرعونی کو ایک گھونسہ رسیدہ کر دیا، بس وہ وہیں گر پڑا، حضرت موسیٰ علیہ السلام

کو یہ اندازہ نہ تھا کہ ایک گھونسہ میں دم توڑ دے گا۔ بہت پچھتائے اور پھر اللہ سے معافی طلب کی۔ چونکہ نیت وارادہ قتل کا نہ تھا اور نہ ہی ایسا عمل قتل کا سمجھا جاتا ہے، بے قصد وارادہ خون ہوگیا۔ اللہ سے اس تقصیر کی معافی طلب کی، اللہ نے بذریعہ وحی معافی کی اطلاع دے دی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ کاملین کو خشیت الٰہی نسبتاً اوروں کے زیادہ ہوا کرتی ہے۔ (بے قصد وارادہ لغزش پر بھی اللہ سے توبہ واستغفار کرتے ہیں)

﴿فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِينَةِ خَائِفًا يَتَرَقَّبُ﴾ [سورة القصص: 18]

ترجمة: پھر موسیٰ نے شہر میں خوف واندیشہ وانتظار کی حالت میں صبح کی۔

تفسیر: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو اس فرعونی کو دفع ظلم کے لیے گھونسہ رسیدہ کیا تھا لیکن وہ بودا ثابت ہوا کہ پانی تک نہ مانگا، فوری مرگیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ساری رات بے قرار رہے کہ جب اس کی شہرت ہوگی تو میرا کیا ہوگا، عدالت کیا فیصلہ کرے گی، عوام کا ردّ عمل کیا رہے گا وغیرہ۔

سُلوك: فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ جو لوگ غیر اللہ کے خوف کو مطلقاً ناجائز کہتے ہیں، مذکورہ آیت اس نظریہ کی تردید کر رہی ہے۔ (مدارک)

(حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اہلِ فرعون سے ساری رات خوف واندیشہ رہا، طبعی خوف تھا جو خطرات کے وقت پیش آتا ہے، ایسا خوف واندیشہ عیب نہیں)

﴿فَسَقَىٰ لَهُمَا ثُمَّ تَوَلَّىٰ إِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ﴾ [سورة القصص: 24]

ترجمة: سو موسیٰ نے ان دو لڑکیوں کے جانوروں کو سیراب کیا پھر پلٹ کر سایہ میں آگئے اور عرض کی: اے میرے پروردگار! آپ اس وقت جو بھی نعمت عنایت فرمائیں، میں اس کا سخت محتاج ہوں۔

تفسیر: مصر میں فرعونی کے نادانستہ قتل پر خوف زدہ ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وطن چھوڑ دیا اور شہر مدین کی جانب کوچ کیا۔ شہر مدین ملک مصر سے آٹھ دن کی مسافت پر تھا اور مصر کی حدود سے باہر۔ بھوکے پیاسے پہنچے، ایک کنویں پر لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے۔ اس مجمع کے پیچھے دو شریف لڑکیاں اپنے جانور لیے کھڑی تھیں اور لوگ انہیں کنویں کے قریب آنے نہیں دے رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ظلم برداشت نہ ہوسکا، لڑکیوں سے پوچھا: تمہارا کیا قصہ ہے؟ وہ بولیں: ہمارے والد بوڑھے اور کمزور آدمی ہیں۔ اگر وہ تندرست ہوتے تو ہم کو اپنے جانوروں کے چارہ پانی کی حاجت نہ ہوتی،

جب قوم کے یہ مرد اپنے جانوروں کو سیراب کر لیتے ہیں تو پھر ہم کو بچا کچھا پانی مل جاتا ہے، ہم اپنے جانور سیراب کر لیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سخت غیرت آئی اور لڑکیوں پر یہ ظلم برداشت نہ ہو سکا۔ اٹھے اور مجمع کو چیرتے پھاڑتے کنویں پر پہنچے اور لڑکیوں کے جانوروں کو سیراب کر دیا پھر واپس آ کر درخت کے سائے تلے بیٹھ گئے اور اپنے رب سے مناجات کی: اے میرے پروردگار! میں بھوکا پیاسا ہوں، شہر اجنبی ہے، میرا یہاں کوئی نہیں، میں آپ کے فضل و کرم کا محتاج ہوں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے: کاملین کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ اپنی ہر چھوٹی بڑی حاجت کا اللہ کے سامنے اظہار کر دیتے ہیں۔

آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کاملین اور بڑے لوگوں کو خدمت خلق سے عار نہیں ہوتی۔

⑨ ﴿فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۫ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ﴾ [سورة القصص: 25]

ترجمة: پھر ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی موسیٰ کے پاس آئی، چلتی تھی شرم و حیا سے۔ بولی: میرے والد آپ کو بلاتے ہیں تاکہ اس خدمت کا بدلہ دیں جو آپ نے ہمارے جانوروں کو سیراب کیا تھا۔

تفسير: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شریف لڑکیوں کے جانوروں کو پانی پلا کر رخصت کر دیا تھا اور خود ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے رب سے بھوک پیاس کی فریاد کی۔

ادھر وہ خیر طلب کر رہے تھے، اُدھر اللہ نے اپنے فضل سے خیر بھیجی۔ انہی دو لڑکیوں میں سے ایک شرمیلے انداز سے چلتی آئی اور منہ چھپا کر کہا: ہمارے والد آپ کو یاد کرتے ہیں تاکہ اس خدمت کا صلہ دیں جو آپ نے انجام دی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ساتھ ہو گئے۔ بات شرم و حیا کی اس لیے تھی کہ لڑکی ایک اجنبی مرد کے پاس اکیلے آئی تھی، اگر گھر میں کوئی خادم ہوتا یا اور کوئی مرد تو اس کی نوبت نہ آتی۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مذکورہ آیت کی تفسیر اس طرح کی ہے:

((جَاءَتْ تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَاءٍ قَائِلَةً بِثَوْبِهَا عَلٰى وَجْهِهَا لَيْسَتْ بِسَلْفَعَ مِنَ النِّسَاءِ دَلاَّ وَّلاَجَةً خَرَّاجَةً.)) (ابن جرير، ابن ابی حاتم)

ترجمة: وہ شرم و حیا سے چلتی ہوئی اپنا چہرہ گھونگھٹ میں چھپائے ہوئے آئی، ان بیباک عورتوں کی طرح دندناتے چلی نہیں آئی جو ہر طرف نکل جاتی ہیں اور ہر جگہ گھس جاتی ہیں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ حیاداری کا تصور قدیم ترین اور شرفاء کی علامت رہا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ واضح الفاظ میں چہرہ ڈھانکنے کو حیا کی علامت اور اس کو اجنبی مردوں کے سامنے کھولنے کو بے

حیائی قرار دے رہے ہیں۔

علاوہ ازیں عورت کے لیے غیرت وحیاداری اگر مطلوب نہ ہوتی تو قرآن حکیم کو ان تصریحات کی کیا ضرورت تھی؟ شریف زادیوں کے لیے چٹک، مٹک، لچک ہرگز ہرگز سزاوار نہیں ہیں۔

شہر مدین کے سردار اور نبی محترم سیدنا شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیوں کی یہ غیرت وحیاداری اونچی اونچی شریف زادیوں کے لیے کس قدر سبق آموز ہے۔ ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ﴾

ملحوظہ: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ لڑکیوں کی خدمت مواشی سے بے پردگی کا شبہ نہ کیا جائے۔ کیوں کہ ضرورت کے لیے گھر سے نکلنا جائز ہے جب کہ لباس کامل اور جسم مستور (پوشیدہ) ہو۔ (بیان القرآن)

110 ﴿قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ﴾ [سورة القصص: 27]

ترجمۃ: شعیب علیہ السلام نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو (2) لڑکیوں میں سے ایک تمہارے نکاح میں دے دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو۔ اگر تم نے دس سال پورے کر دیئے تو یہ تمہاری طرف سے احسان ہوگا اور میں تم پر کوئی سختی نہیں چاہتا۔ ان شاء اللہ تم مجھ کو خوش معاملہ پاؤ گے۔

تفسیر: سیدنا شعیب علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ نبی ورسول تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کرنے کے بعد فراست نبوت سے محسوس کرلیا کہ یہ نوجوان مستقبل کا عظیم نبی ورسول ہوگا، پھر ان کو اپنا داماد بنالینے کا ارادہ کرلیا جس کا تذکرہ آیت میں ہے۔

ان صاحبزادی کا اسم گرامی اسلامی تاریخی کتب میں سیّدہ صفورہ رضی اللہ عنہا بیان کیا گیا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے نکاح ہوگیا اور مہر آٹھ سالہ ''گھریلو خدمت'' قرار پائی۔ غالباً مواشی کا چارہ پانی اور ان کی نگہداشت تھی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بیوی کے مہر میں ''گھریلو خدمت'' یا دیگر اور کوئی خدمت لڑکی کی رضامندی سے طے کرنا شریعت اسلامی میں بھی جائز ہے۔ (ردّ المحتار، بیان القرآن)

(یعنی مہر کے لیے نقد مال ہونا ضروری نہیں۔ مہر میں کوئی خدمت بھی طے کرلی جاسکتی ہے)

111 ﴿قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا﴾ [سورة القصص: 35]

ترجمۃ: اللہ نے فرمایا: ہم ابھی تمہارے بھائی (ہارون) کو تمہاری قوت بازو بنائے دیتے ہیں اور تم دونوں کو (ایک خاص) شوکت عطا کرتے ہیں، سو ان لوگوں کا تم پر غلبہ نہ ہوگا۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نبوت ملنے کے بعد فرعون اور اہل فرعون کے یہاں دعوت وتبلیغ کے لیے جانے کا حکم ملا۔ آپ نے اللہ کی جناب میں اپنے دو (2) عذر پیش کیے: پہلا تو یہ کہ میں قادر الکلام نہیں ہوں اور

زبان میں لکنت ہے۔ دوسرا یہ کہ فرعون اور اہل فرعون سے مجھ کو جان کا خطرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے عذر کا یہ حل عنایت فرمایا کہ اپنے بھائی ہارون کو اپنے ساتھ رکھو، وہ تمہارے دست و بازو ثابت ہوں گے۔ سیدنا ہارون علیہ السلام قادر الکلام، فصیح البیان بھی تھے۔

اور جان کے خطرے کو اس طرح دور کردیا کہ دونوں بھائیوں کے جسم پر ایک وہبی شوکت و ہیبت پیدا کردی کہ کوئی برے ارادے سے قریب نہ آسکے۔ چنانچہ سیدنا موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے نہایت اطمینان و بے خوفی سے اللہ کا پیام فرعون اور اہل فرعون کو پہنچا دیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ والوں کو من جانب اللہ ایک شان و شوکت عطا ہوتی ہے جس سے وہ بے خوف و خطر دین کے کام انجام دیا کرتے ہیں (چنانچہ سلاطین بھی اولیاء اللہ سے خائف رہے ہیں)۔

⑫ ﴿أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ﴾

[سورة القصص: 54]

ترجمة: ان لوگوں کو دوہرا اجر ملے گا اس لیے کہ انہوں نے صبر کیا اور برائی کا بدلہ نیکی سے کرتے رہے اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا تھا، اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہے۔ اور جب کوئی بات لغو سنا کرتے تو اسے ٹال دیا کرتے اور کہا کرتے کہ ہمارے اعمال ہمارے (نفع) کے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہم تم کو سلام کرتے ہیں۔ ہم بے سمجھ لوگوں سے تعلقات نہیں رکھتے۔

تفسیر: اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کو قرآن حکیم نے یہ خوشخبری دی کہ اگر انہوں نے اسلام قبول کرلیا تو انہیں دوہرا اجر ملے گا۔ ایک تو خود ان کے آسمانی مذہب کا، دوسرا اسلام لانے کا۔

جیسا کہ ازواج مطہرات کو خوشخبری دی گئی تھی کہ ان کے نیک اعمال پر دوہرا اجر ملے گا۔ (سورۂ احزاب: ۳۱)

مذکورہ آیت میں نیک لوگوں کے اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔

1. صبر کرتے ہیں۔
2. برائی کا بدلہ نیکی سے ادا کرتے ہیں۔
3. اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔
4. لغو فضول کاموں سے دور رہتے ہیں۔
5. بے سمجھ جاہل لوگوں سے علیحدہ رہتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے دو ② مسئلے اخذ کیے ہیں:

نیک لوگ ① حب جاہ اور ② حب مال سے دور رہتے ہیں۔

''یَدْرَءُوْنَ'' سے حب جاہ اور ''یُنْفِقُوْنَ'' سے حب مال کا زوال ثابت ہوتا ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ عموماً یہی دو② سبب ایمان لانے سے مانع ہوا کرتے ہیں۔

⑬ ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ [سورة القصص: 56]

ترجمة: آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے البتہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

تفسیر: صحیح مسلم شریف میں روایت ہے کہ یہ آیت نبی کریم ﷺ کے حقیقی چچا ابوطالب کے بارے میں نازل ہوئی جب کہ وہ بستر مرگ پر تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں نہایت دلسوزی سے اسلام کی دعوت دی اور فرمایا: چچا جان! صرف ایک بار کلمہ پڑھ لیجئے، میں ان شاء اللہ اسی کے ذریعہ آپ کی نجات کے لیے سفارش کروں گا۔ (حدیث) قریب تھا کہ ابوطالب کلمہ پڑھ لیتے لیکن قریش کے کافر سردار جوان کے اردگرد کھڑے تھے، منع کر دیا۔ آخر ابوطالب اپنے آبائی دین پر فوت ہو گئے۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بلاضرورت اس مسئلہ پر گفت وشنید نہ کرنی چاہیے کیونکہ اس میں خاندانی سادات کی تاذّی اور مذمت کا پہلو نکلتا ہے لہٰذا احتیاط بہتر ہے۔ (بیان القرآن)

⑭ ﴿وَرَبُّكَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ﴾ [سورة القصص: 68]

ترجمة: اور آپ کا رب جس چیز کو بھی چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ اور مخلوق کو تجویز کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

تفسیر: کائنات کے جملہ اختیارات وتصرفات صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں، اس میں کوئی مخلوق شریک نہیں، نہ جن، نہ ملک، نہ مقبولانِ بارگاہ الٰہی، وہ یکتا وتنہا مالک ومتصرف ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے انسانی اختیارات وتصرفات میں انسان کے ''جبر محمود'' ہونے کا عقیدہ ثابت کیا ہے (یعنی انسان اپنے اختیارات میں نہ ''مجبور محض'' ہے اور نہ ''قادر مطلق'' ہے بلکہ ''مجبور محمود'' ہے یعنی ایسا مجبور جو اللہ کے یہاں پسندیدہ ہے اور وہ یہ کہ اللہ تو مستقلاً قادر ومختار ہے اور بندہ اپنے غیر مستقل ہونے کا علماً وعملاً اعتقاد رکھے، یہی ''جبر محمود'' ہے۔)

⑮ ﴿لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَةِ﴾ [سورة القصص: 70]

ترجمة: سب تعریف اسی کی ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

تفسیر: حمد وثنا کے مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہیں کیونکہ جو بھی نعمت ہے، اسی کی جانب سے آتی ہے پھر مخلوقات میں تقسیم ہوتی ہے۔

سُلوك: اہل تحقیق نے لَهُ الْحَمْدُ سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل بالآخر خیر ہی خیر ہوتا ہے، ورنہ ہر حال میں حمد وثنا اس کے لیے ثابت نہ ہوتی۔

⑯ ﴿إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ﴾ [سورة القصص: 76]

ترجمة: جب اس کی قوم نے اس سے کہا: اترانا نہیں۔ بے شک اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

تَفسِیر: قارون کا تذکرہ ہے۔ یہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی تھا اور فرعون کا وزیر خزانہ بھی۔ جیسا کہ ظالم بادشاہوں کا دستور ہے کہ وہ کسی قوم یا جماعت کا خون چوسنے کے لیے انہی میں سے بعض افراد کو اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں، فرعون نے بنی اسرائیل (قوم موسیٰ) میں سے اس ملعون کو چن لیا تھا، اس سے فائدہ اٹھا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹی۔

جب فرعون اور اہلِ فرعون غرقِ آب ہو گئے تو یہ تنہا رہ گیا اور قوم میں اپنی دولت وثروت پر اترانے لگا اور علی الاعلان سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت شروع کر دی اور یہ سب کچھ مال و دولت کے گھمنڈ میں تھا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم نے اسے فہمائش کی کہ اترانا ٹھیک نہیں ہے، اللہ کو یہ خصلت ناپسند ہے لیکن وہ ان باتوں کو خاطر میں نہ لایا اور مخالفت تیز کر دی، آخرکار وہ خود اپنے ہاتھوں دفن ہوا۔

(تفصیل کے لیے ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۱ رصفحہ ۵۳۲ دیکھیے جو قدیم تاریخ کی عبرت ناک داستان ہے)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے اس واقعہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ سالک کو اپنے احوال اور واردات قلبی پر ناز کرنا مذموم ہے اور اگر ان نعمتوں کو اللہ کی عطا و بخشش سمجھ کر خوش تو یہ مذموم نہیں۔

⑰ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾

[سورة القصص: 80]

ترجمة: ان لوگوں نے جن کو دین کی فہم عطا ہوئی تھی، کہا: تمہارا ناس ہو۔ اللہ کے ہاں کا ثواب کہیں زیادہ بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے جو ایمان لایا اور نیک عمل کیے۔

تَفسِیر: قارون کی دولت وثروت دیکھ کر آخرت فراموش لوگ کہا کرتے تھے کہ قارون کی کیا ہی عیش ہے اور اس کا کتنا بلند نصیب ہے۔

انجام کے جاننے والے اس پر ملامت کرتے کہ آخرت کے ثواب کے مقابلے میں اس کی عیش ہیچ در ہیچ ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''دنیا میں کچھ آرام ہے تو دس ⑩ بیس ⑳ برس اور مرنے کے بعد کاٹنے ہیں ہزاروں برس۔'' (موضح القرآن)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے ''وَيْلَكُمْ'' (تنبیہ کا کلمہ) سے استنباط کیا ہے کہ نصیحت و تعلیم میں زجر و تنبیہ جائز ہے جب کہ بات واضح ہو اور مخاطب قبول نہ کرے۔

⑱ ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا﴾

[سورة القصص: 83]

ترجمة: یہ عالم آخرت تو ہم انہی لوگوں کے لیے خاص کر دیتے ہیں جو زمین میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں۔ اور اچھا انجام تو صرف تقویٰ اختیار کرنے والوں کا ہے۔

تفسير: قارون کی دولت وحشمت کو نادان لوگوں نے بہت بڑی کامیابی سمجھی اور اس کی زندگی کو حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے اور کہنے لگے کہ کیا ہی قسمت والا ہے۔

قرآن حکیم نے بیان کیا کہ یہ بڑی قسمت نہیں۔ بڑی قسمت تو آخرت کی کامیابی ہے اور آخرت صرف انہی لوگوں کا نصیب ہے جو اللہ کے ملک میں فساد و بگاڑ نہیں چاہتے اور اس فکر میں نہیں رہتے کہ زمین میں ان کا بول بالا ہو، بول بالا تو اسلام کا، قرآن حکیم کا چاہتے ہیں۔

سُلوك: آخرت کی زندگی جس طرح گناہوں سے خراب ہو جاتی ہے، اسی طرح تکبر (عُلُوّاً فِي الْأَرْضِ) سے بھی خراب و ناکام ہوتی ہے۔ اس لیے مشائخ اہل طریقت ترک معاصی کی طرح تکبر کے ازالہ کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔

ملحوظه: ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا﴾

ترجمة: خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جنہیں اہل علم نے خلیفہ راشد کہا ہے، بستر مرگ پر اپنی نزع کے وقت یہی آیت کی تلاوت کر رہے تھے۔

تفسیر ماجدی کے مفسر نے لکھا ہے کہ آیت ایسی جامع و کامل ہے کہ ہر شخص اس کا کتبہ کمرے میں لٹکا کر ہر وقت پیش نظر رکھے۔

⑲ ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ [سورة القصص: 88]

ترجمة: اللہ کی ذات کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

تفسير: علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ذات حق کے علاوہ ہر موجود ہالک یعنی معدوم ہے۔ کیونکہ ہالک اسم فاعل ہے جس کے معنی یہ نہیں کہ آئندہ کسی زمانے میں ہلاکت طاری ہوگی بلکہ مراد یہ ہے کہ عملی فنا ہر موجود پر مستقلاً طاری ہوتا رہتا ہے اور اس کا تحقق اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہالک کو کالہالک اور معدوم کو کالمعدوم کے معنی میں لیا جائے اور مراد یہ سمجھی جائے کہ موجودات کا وجود ذاتی اور مستقل نہ ہونے کے سبب ہر وقت قابل عدم اور وجود لا وجود جیسا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وحدۃ الوجود کا حاصل بھی یہی ہے۔ مذکورہ آیت اس مسئلہ پر روشنی ڈالتی ہے۔

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْت

پَارَہ: 20

﴿ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ ﴾

[سورة العنكبوت: 2]

ترجمة: کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ محض یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لائے، چھوٹ جائیں گے اور وہ آزمائے نہ جائیں۔

تفسیر: زبان سے اسلام وایمان کا دعویٰ کرنا آسان ہے لیکن اسلام کا ثبوت پیش کرنا آسان نہیں۔ طرح طرح کے مصائب ومشکلات آتے ہیں، اس وقت صبر وضبط سے کام لینا اور ایمان ویقین میں خلل پیدا نہ ہونے دینا ضروری ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ آدمی کو اس کی دینی حیثیت سے آزمایا جاتا ہے۔

پھر یہ بھی فرمایا کہ سب سے زیادہ آزمائش انبیاء کرام کی ہوتی ہے، پھر ان کے بعد نیک صالحین کی، پھر درجہ بدرجہ ان لوگوں کی جو ان حضرات سے قریب قریب ہیں۔

صحابہ کرام نے ایک دفعہ کفار قریش کی ایذاء رسانیوں سے پریشان ہو کر آپ سے شکایت کی اور دعا کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے دعا فرمادی اور ارشاد فرمایا: تم سے پہلے زمانہ میں ایمان والوں کو سخت سے سخت ایذائیں دی جاتی تھیں، کسی کو زمین میں زندہ گاڑ دیا جاتا، کسی کے سر پر آرہ چلا کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا، کسی کے بدن پر لوہے کی کنگھیاں پھیرا کر چمڑا اور گوشت اُدھیڑ دیا جاتا تھا، پھر بھی یہ سختیاں انہیں دین وایمان سے پھیرا نہیں کرتی تھیں۔ (بخاری)

مومن کی یہ آزمائش دنیا وآخرت میں اس کے امتیاز اور خصوصی موقف کے لیے کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نفاق اور غیر اخلاص کو ہرگز ہرگز پسند نہیں کرتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مجاہدات اور آزمائش وصول الی المقصود کے شروط (عادیہ) میں شامل ہیں۔ بغیر مجاہدہ منزل نہیں ملتی، مجاہدہ خواہ اختیاری ہو یا اضطراری، بہر حال ضروری ہوا کرتا ہے۔

﴿ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾

[سورة العنكبوت: 6]

ترجمة: اور جو کوئی محنت کرتا ہے اپنے ہی لیے محنت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سارے عالم سے بے نیاز ہے۔

تفسیر: بے نیازی کے معنی اردو کے بے نیازی (بے پروا) کے نہیں ہیں بلکہ غیر محتاج کے معنی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ

مخلوقات کی کسی بھی چیز کا محتاج اور ضرورت مند نہیں۔

اگر کسی نے محنت کی، اس نے خود اس کا پھل کھایا، اللہ کو اس سے کیا نفع وفائدہ؟

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے آیت سے استنباط کیا کہ اللہ کی صفت بے نیازی سے انسانوں کے عجب ودعویٰ استحقاق کی بنیاد گر جاتی ہے۔ (عجب وتکبر وہ کرے جو کسی کا محتاج نہ ہو)

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا﴾ [سورة العنكبوت: 8]

ترجمة: اور ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

تفسیر: والدین کی خدمت اور اطاعت کا حکم قرآن حکیم میں بار بار آیا ہے اور اس مخلصانہ رشتہ کی اہمیت کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کے بعد زمین پر ماں باپ سے زیادہ اور کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا۔ اسی خیر خواہی کی وجہ سے ماں باپ کا درجہ بلند تر ہو جاتا ہے۔

آیت تو حضرت سعد بن ابی وقاص ﷜ کے بارے میں نازل ہوئی لیکن اس کا خطاب عام ہے۔ جب یہ مسلمان ہو گئے تو ان کی مشرکہ والدہ حمنہ بنت ابی سفیان سخت ناراض ہو گئیں اور قسم کھالی کہ جب تک تم اپنے آبائی دین میں واپس نہیں آتے، اپنا کھانا پینا ترک رکھوں گی اور چھت کے نیچے آرام نہ کروں گی۔

حضرت سعد ﷜ اسلام لانے سے پہلے بھی اپنی والدہ کے نہایت فرمانبردار اور خدمت گزار مشہور تھے۔ ماں کی یہ تکلیف دیکھی نہ جاسکی، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا۔

مذکورہ آیت نازل ہوئی اور حضرت سعد ﷜ کو مشرکہ ماں کی بات ماننے سے روک دیا گیا۔

آخر دو چار دن بعد ماں نے خواہی نخواہی اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔

سُلوك: تفسیر ماجدی کے مفسر لکھتے ہیں کہ غالباً تاریخ عالم کی یہ پہلی بھوک ہڑتال تھی (بلکہ بھوک پیاس ہڑتال) جس کو اسلام نے برداشت نہیں کیا۔ فَقَدْ خَابَتْ وَخَسِرَتْ

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطَايَاكُمْ﴾ [سورة العنكبوت: 12]

ترجمة: اور کافر لوگ ایمان والوں سے کہتے ہیں: ہماری راہ چلو اور تمہارے گناہ ہمارے ذمہ ہوں گے۔ حالانکہ یہ لوگ ان گناہوں میں سے ذرا بھی نہیں لے سکتے، یہ بالکل جھوٹے ہیں۔

تفسیر: عہد نبوت میں اہل مکہ کی اکثریت غریب غرباء کی تھی۔ ابتداء انہیں میں چند سعادت مندوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ آبائی مذہب چھوڑ دینے سے اہل دولت وثروت نے ان کا مقاطعہ (بائیکاٹ) کر رکھا تھا اور یہ اور زیادہ تنگ حال ہو گئے۔ ان کی تنگی وعسرت پر بعض کافر کہا کرتے تھے کہ سب اسلام قبول

کرنے کا نتیجہ ہے، تم اپنے آبائی دین پر آجاؤ۔ جن گناہوں کے اندیشہ پر تم نے اپنا دین چھوڑا ہے، ان گناہوں کی ذمہ داری ہم قبول کرلیں گے، اللہ کے ہاں ہمارا نام لے لینا کہ فلاں فلاں نے ہم سے یہ وعدہ کیا ہے۔

اللہ نے جواب دیا کہ یہ جھوٹے ہیں جھوٹے، دوسروں کا بوجھ تو کیا اٹھاتے، اپنا بوجھ بھی بھاری کررہے ہیں۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے ان جاہل پیروں کے وعدہ وعید کی تردید کی ہے جو اپنے مریدوں کے مجمع بڑھانے کے لیے کہہ دیا کرتے ہیں کہ میاں! ہمارے سلسلہ میں آجاؤ، سلسلہ کے بزرگوں کی نسبت کام آجائے گی۔

5 ﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ﴾ [سورة العنكبوت: 20]

ترجمة: آپ کہیے: تم لوگ زمین میں چلو پھرو اس پر غور کرو کہ اللہ نے مخلوق کو کس طرح پہلی بار پیدا کیا، پھر دوسری بار بھی پیدا کرے گا۔

تَفسِیر: قرآن حکیم نے زمین کی سیر و سیاحت کی ترغیب اس لیے نہیں دی کہ اپنے فاضل اوقات گزارے جائیں یا دنیا کا کھیل تماشہ دیکھا جائے اور لطف کی زندگی حاصل کی جائے۔

بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنی پیدائش کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کی پیدائش میں بھی غور کیا جائے اور چل پھر کر معلوم کیا جائے کہ اللہ نے کیسی کیسی مخلوق پیدا کی ہیں اور ان کے لیل ونہار کیسے کچھ ہیں اور انہوں نے اپنا مقصد حیات کیا کیا قرار دے لیا ہے۔ اس طرح غور کرنے سے ایک تمہاری خود اپنی زندگی کا جائزہ ملے گا پھر دوسروں کی زندگی عبرت و نصیحت کا کام دے گی، اس کے بعد ایک تیسری اُخروی زندگی سامنے آئے گی جہاں ساری مخلوقات کو جمع ہونا ہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت کے تقاضہ پر بعض اہل طریقت نے اپنی زندگی میں سیاحی زندگی کو شامل کرلیا تھا تاکہ عالم میں گھوم پھر کر اللہ کی صفت خلق کا مشاہدہ کریں اور مخلوقات کے احوال سے عبرت حاصل کریں اور اس سے اپنی آخرت کو کامیاب بنائیں۔

6 ﴿وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾

[سورة العنكبوت: 25]

ترجمة: اور ابراہیم علیہ السلام نے یہ بھی کہا کہ تم نے تو صرف اپنے باہمی تعلقات کی وجہ سے اللہ کو چھوڑ کر بت پرستی تجویز کرلی ہے پھر قیامت کے دن تم میں سے ہر ایک دوسرے کا منکر ہو جائے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمہارا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

تَفسِیر: بت پرستی کو کوئی بھی عقل والا درست نہیں سمجھتا۔ خود مشرکوں میں بھی آج بہت سی قومیں ہیں جو بت پرستی

کی مخالف ہیں۔ بے روح و بے جان پتھروں کو پوجنا، ان کے آگے ادب واحترام کے مراسم ادا کرنا، ان کو نفع ونقصان کا مالک سمجھنا اور ان سے خوف وامید رکھنا آخر یہ کیوں اور کس لیے ہے؟ لیکن نادان لوگوں نے یک جہتی واتفاق واتحاد کے لیے ہر قوم وقبیلہ کے لیے ان کے معبود مقرر کر لیے تاکہ ایک مذہب پر سب لوگوں کو متحد کیا جائے اور وہ ایک دوسرے کے معاون ثابت ہوں، اس طرح انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں دلالت ہے کہ جس اتحاد واتفاق میں اسلام کا فساد و بگاڑ ہو، ایسا اتحاد واجب الترک ہوگا۔

⑦ ﴿وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝﴾ [سورة العنكبوت: 27]

ترجمة: اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کا صلہ دنیا میں بھی دیا اور آخرت میں وہ صالحین میں ہوں گے۔

تَفسِير: سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر اللہ کی بے شمار نعمتیں رہی ہیں۔ ان میں سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ آپ کے بعد توحید ورسالت کی دعوت آپ ہی کی اولاد سے ہوئی۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں انبیاء ورسل سارے جہاں کے لیے ہدایت ونور کا ذریعہ رہے ہیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دو بڑی نسلی شاخیں تھیں۔ ایک اسرائیلی جو سیدنا یعقوب بن اسحاق علیہ السلام سے چلی، دوسری اسمٰعیلی جو سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے چلی جس میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

سیدنا اسحاق اور سیدنا اسمٰعیل علیہما السلام دونوں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں جاہ ومال، عزت وخوش اقبالی حاصل تھی اور آخرت میں آپ کو قربِ الٰہی کے منصب سے نوازا گیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ دنیوی نعمتوں کی کثرت جیسا کہ بعض اہل اللہ کو نصیب رہی ہے، آخرت میں ان کے مراتب کو گھٹا نہیں دیتی (جیسا کہ بعض کم علموں کا خیال ہے)۔

⑧ ﴿قَالَ رَبِّ انْصُرْنِىْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ۝﴾ [سورة العنكبوت: 30]

ترجمة: لوط علیہ السلام نے کہا: اے میرے پروردگار! میری مدد کر ان شریر لوگوں پر۔

تَفسِير: سیدنا لوط علیہ السلام کی یہ بددعا تھی جو انہوں نے اپنی باغی وسرکش قوم پر کی ہے۔ ان کی یہ دعا ان آخری لمحات میں ہوئی جب قوم کی ہدایت ونیکی کے سارے اسباب ٹوٹ گئے تھے۔ یہ ایسے ہی تھا جیسا کہ سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہدایت سے ناامید ہو کر بددعا کی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ دین کے دشمنوں کے لیے بددعا کرنا جائز ہے، علاوہ

ازیں اس قسم کی دعا اخلاقی اقدار کے خلاف نہیں ہوتی۔

ملحوظہ: سیدنا لوط علیہ السلام کی قوم کا بنیادی جرم تو توحید و رسالت کا انکار تھا، علاوہ ازیں ان کا ایک قومی گناہ بھی تھا جو روئے زمین پر پہلی مرتبہ ایجاد کیا گیا تھا جس سے جنگل کے جانور بھی نا آشنا ہوں گے۔

یعنی مرد، مرد سے اور عورت، عورت سے ملوث تھی۔ نہ مرد کو عورت سے دلچسپی تھی، نہ عورت کو مرد سے تعلق تھا۔ عربی زبان میں ایسے فحش عمل کو "لواط، مساحقہ" کہا جاتا ہے۔

سیدنا لوط علیہ السلام کی بددعا پر اللہ نے عذاب کے لیے فرشتوں کو نازل کیا، فرشتوں کی یہ جماعت جس کی تعداد تین اور بعض روایات میں سات آئی ہے، پہلے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئی اور انہیں سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی خوشخبری دی کہ عنقریب آپ کو انتہائی پیرانہ سالی میں بُردبار لڑکا پیدا ہوگا، اس کے بعد یہ جماعت سیدنا لوط علیہ السلام کے شہر سدوم پہنچی اور صبح صبح پورے شہر کو تہس نہس کر دیا۔

(تفصیل کے لیے "ہدایت کے چراغ" جلد ۱ رصفحہ ۲۶۹ دیکھئے جو تاریخ عالم کا رسوا کن واقعہ ہے)

علامہ نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ فرشتوں کا ایک سفر میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو صاحبزادے کی خوشخبری دینا اور قوم لوط کی ہلاکت کی خبر دینے میں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ اگر ایک ظالم و باغی قوم اللہ کی زمین سے خالی کی جانے والی ہے تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ ایک عظیم الشان قوم بنی اسرائیل کی بنیاد ڈالنے والے ہیں۔

شہر سدوم کی تہ و بالا شدہ آبادیوں کے کھنڈر آج بھی تقریباً پانچ ہزار سال گزر جانے کے باوجود مشرق اردن میں بحر میت (Dead Sea) کے مشرقی حصہ میں نگاہ عبرت کے لیے موجود ہیں۔

⑨ ﴿قَالَ اِنَّ فِيۡهَا لُوۡطًا ؕ قَالُوۡا نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَنۡ فِيۡهَا﴾ [سورة العنكبوت: 32]

ترجمة: ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اس بستی میں لوط علیہ السلام بھی ہیں۔ فرشتوں نے کہا: ہم کو خوب معلوم ہے وہاں کون کون رہتے ہیں۔ ہم لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کو بچالیں گے البتہ ان کی کافر بیوی عذاب میں شامل ہونے والوں میں رہ جائے گی۔

تفسیر: فرشتوں نے جب یہ خبر دی کہ ہم شہر سدوم کو تاخت و تاراج کرنے آئے ہیں تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بھتیجے سیدنا لوط علیہ السلام کا ذکر کیا کہ وہ اور ان کے ساتھی بھی تو وہاں رہتے ہیں، فرشتوں نے مذکورہ بالا جواب دیا جو آیت میں موجود ہے۔

سلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے مستفاد کیا ہے کہ کسی مجمع میں اہل اللہ کا ہونا نزول عذاب سے حفاظت کا سبب بن جاتا ہے۔

⑩ ﴿وَلَا تُجَادِلُوۡۤا اَهۡلَ الۡكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ﴾ [سورة العنكبوت: 46]

ترجمة: اور تم اہل کتاب (یہود و نصاریٰ وصائبین) سے بحث و مناظرہ نہ کرو سوائے مہذب طریقہ کے۔

تفسیر: مسلمانوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ غیر مسلموں سے دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں بحث و مباحثہ سے حتیٰ الامکان بچنا چاہیے کیونکہ اس طریقے سے بہت کم لوگوں کو ہدایت ملی ہے۔

(تاہم بحث و مباحثہ کی ضرورت و اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے) اگر کہیں ضرورت پیش آجائے تو نرمی و خیر خواہی سے کام لینا چاہیے تاکہ انہیں اسلام قبول کرنے کی رغبت ہو۔

البتہ مخالفین میں جو بدزبان و بدتمیز قسم کے ہوں، انہیں حسبِ مصلحت ترکی بہ ترکی جواب دیا جاسکتا ہے، قرآن حکیم نے ایسا عنوان بھی اختیار کیا ہے۔

سلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت میں دلالت ہے کہ مخالف کے ساتھ پہلے تو نرمی برتی جائے اور جب اس کا عناد ظاہر ہونے لگے تو سختی کرنے کی بھی اجازت ہے۔

﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ﴾ [سورة العنكبوت: 56]

ترجمة: اے میرے بندو جو ایمان لائے ہیں! بے شک میری زمین تو بہت وسیع ہے سو صرف میری ہی عبادت کرو۔

تفسیر: مکۃ المکرمۃ کے غریب مسلمانوں کو خطاب ہے کہ اگر تم لوگوں کو مشرک و کافروں نے تنگ کر رکھا ہے تو کوئی اندیشہ نہ کرو، اللہ کی زمین تنگ نہیں ہے۔ ہجرت کر جاؤ، وہاں تمہارا سب کچھ انتظام ہو جائے گا، دراصل یہ اللہ کی جانب سے خوشخبری اور وعدہ تھا۔

شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مکۃ المکرمۃ کے کافروں نے جب انتہاء کر دی تو مسلمانوں کو ہجرت کرنے کا حکم ملا۔ چنانچہ تراسی (۸۳) مسلمان ہجرت اولیٰ رجب ۵ھ نبوی میں مکہ چھوڑ کر حبشہ چلے گئے، اللہ نے انہیں تسلی دی کہ زندگی کے چند دن میں جہاں بن پڑے، وہاں کاٹ دو پھر ہمارے پاس اکٹھے آجاؤ گے۔ (موضح القرآن)

سلوك: علماء نے آیت سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ جس ملک میں کفر و فسق کی کثرت ہو اور خدا پرستی کا موقعہ نہ ملتا ہو، وہاں سے ہجرت کر جانا ضروری ہے۔ رہا بے گھر و بے وطن ہونا۔ یہ کوئی مصیبت نہیں ہے۔ اللہ نے ایسے لوگوں کے لئے وعدہ کیا ہے کہ انہیں چین کی زندگی ملے گی۔

اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ

سُورَةُ الرُّوم

پَارَہ: 21

1 ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝﴾ [سورة الروم: 7]

ترجمة: یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے محض بے خبر ہیں۔

تفسیر: یعنی کافروں کی ساری عقلیں، ساری کوششیں صرف اسی مادّی کائنات کی اُدھیڑ بن میں کھپ گئی ہیں، اس کے آگے اور اس کے بعد کا انہیں ذرا بھی خیال نہیں اور نہ غور کرنے کو تیار ہیں۔

بس اسی دنیا کی آرائش، زیبائش، کھانا پینا، اوڑھنا سونا، پیسہ کمانا، مزے اڑانا اور پھر مر جانا یہی مقصد حیات، یہی ان کے لیل ونہار ہیں، یہ کیوں غور نہیں کرتے کہ اس کے بعد ایک ایسی زندگی بھی آنے والی ہے جس میں اپنے کیے کرائے کا حساب بھی دینا ہوگا۔

دنیا کا یہ نظام ویسے ہی بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا جب کہ ایک معمولی عقل رکھنے والا بھی کوئی حرکت بے مقصد نہیں کرتا تو پھر کائنات کا یہ عظیم و بے کراں انتظام بے مقصد کیوں ہوگا؟

حقیقت یہ ہے کہ جاہل صفت انسانوں نے غور کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار ہی نہیں کیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں دلالت ہے کہ آخرت سے غفلت کرنا جہل کی علامت ہے۔

2 ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ [سورة الروم: 21]

ترجمة: اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کی بیویاں پیدا کیں تاکہ ان سے سکون حاصل کرو۔

تفسیر: آیت میں مردوں کے لیے تین باتیں بطور اصل بیان کی گئیں ہیں۔

اول 1: تمہاری بیویاں خود تمہاری ہم جنس ہیں یعنی تمہاری ہی جیسی خواہشات، جذبات، احساسات رکھنے والی ہیں۔

دوم 2: ان کی پیدائش کی غرض وغایت خود تمہارے لیے سرمایہ راحت اور باعث تسکین ہے کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور راحت پاؤ۔

سوم 3: تمہارے اور ان کے تعلقات کی بنیاد باہمی محبت وخلوص وہمدردی پر ہونی چاہیے۔

مردوں پر اللہ کا یہ ایسا عظیم احسان ہے کہ اس نے اس پر آشوب دنیا میں ان کے لیے بیویوں میں سامان چین وسکون مہیا کر دیا ہے۔ ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بیویوں کی طرف میلان والتفات ہونا کمال تقویٰ کے خلاف نہیں جیسا کہ بعض خشک حضرات سمجھا کرتے ہیں۔

ملحوظہ: دین اسلام میں عورت کا مقام دیگر مذاہب کی طرح مرد کی کنیز کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ مرد کی رفیق حیات، مونس غم وخوار، یار وفادار ہے اور جذبات وخواہشات میں مرد کے مساوی ہے۔ علاوہ ازیں شوہر کے ایمان واسلام کی محافظ اور اس کے بچوں کی مربی ومشفق مادر عزیز بھی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک بیوی کو نصف ایمان قرار دیا ہے جس کا یہ مطلب ہوا کہ کسی کو اگر نیک بیوی مل جائے تو اس کے نصف ایمان کی ضمانت ہوگئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا: لوگو! تمہاری دنیا کی تین چیزیں مجھے محبوب ہیں۔

① خوشبو ② نیک بیویاں اور ③ آنکھوں کی ٹھنڈک (سرور) جو نماز میں ہے۔ (حدیث)

③ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ﴾ [سورة الروم: 23]

ترجمة: اور اللہ کی نشانیوں میں سے تمہارا لیٹنا بھی ہے رات اور دن میں اور اپنے لیے اس کی دی ہوئی روزی کا تلاش کرنا ہے۔

تَفسِیر: اللہ تعالیٰ نے رات کی نیند اور دن میں تلاش معاش کو اپنی عظیم نعمتوں میں شمار کیا ہے۔ بہت کم لوگوں کا ذہن اس جانب گیا ہے کہ یہ دونوں حالتیں بھی عظیم نعمتیں ہیں لیکن غور وفکر کرنے والوں کو قرآن حکیم یہ دعوت دیتا ہے کہ اس حقیقت پر غور کریں کہ یہ کیسی عظیم تر اور ضروری نعمت ہیں۔ رات کی راحت نیند میں پوشیدہ رکھی ہے اور دن کا چین وسکون رزق وروزی سے وابستہ ہے۔ یہ نعمتیں اللہ نے ہر انسان کو دی ہیں۔ اگر ایک بھی گم ہوجائے تو انسان موت کو پسند کرنے لگتا ہے چہ جائیکہ دونوں گم ہوجائیں۔

شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ انسان کی دو ② حالتیں عجیب ہیں۔ سویا تو بے خبر پتھر کی طرح اور روزی کی تلاش میں لگا تو ایسا ہوشیار کوئی نہیں۔ (موضح القرآن)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ استراحت (آرام لینا) کے لیے سونا اور اسباب معاش کے لیے نکلنا تقویٰ وکمال کے خلاف نہیں البتہ اس میں انہماک (ڈوب جانا) بُرا ہے۔

ملحوظہ: روایتی وموروثی مشائخ نے محنت مزدوری کو بزرگی کے خلاف تصور کیا ہے اور اپنے تقدس کو مریدوں کے تحفہ تحائف سے تقویت دیا کرتے ہیں۔

④ ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ [سورة الروم: 30]

ترجمة: اللہ کی اس فطرت کا اتباع کرو جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کی بنائی

فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں۔

تَفسِیر: فطرت سے مراد وہ صلاحیت وقابلیت ہے جو اللہ نے ہر انسان کی خلقت میں امانت رکھی ہے۔انسان اگر حق کو سننا اور سمجھنا چاہے تو حق سمجھ میں آجاتا ہے اور اس کو وہ قبول کر لیتا ہے۔

انسان کی ساخت پرداخت ہی ایسی بنائی گئی ہے گویا ہر انسان کی طبیعت میں قبول حق کا جوہر موجود ہے۔اگر کوئی اس کو ضائع کر دے یا خارجی اسباب اس کو مغلوب کر دیں تو یہ انسانی فطرت کا قصور نہیں، اپنا اور خارجی قصور ہے۔اور جن علماء نے فطرت سے مراد اسلام لیا ہے، ان کی مراد بھی یہی قبول حق ہے، کیونکہ اسلام بھی حق ہے۔

قبول حق کی یہ صلاحیت بدل نہیں سکتی یعنی فنا نہیں ہوتی، ہر انسان میں موجود ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ فطریات میں تبدیلی نہیں ہوتی البتہ ریاضت اور مجاہدہ سے تعدیل ہوجاتی ہے۔

یعنی فطرت کا رخ موڑا جاسکتا ہے، زائل وفنا نہیں کیا جاسکتا۔مثال کے طور پر غضب کی کیفیت کو لیجئے۔ہر انسان کی فطرت میں یہ کیفیت رکھی گئی ہے، یہ صفت حلال وحرام دونوں موقعوں پر استعمال ہوتی ہے۔غضب کا بے جا استعمال حرام ہے اور حق کے لیے غصہ کرنا حلال ہے۔اب اگر کوئی چاہے کہ غضب کی یہ کیفیت ہی دل سے زائل ہوجائے کہ غصہ پیدا ہی نہ ہو تو یہ ممکن نہیں کیونکہ فطرت میں تبدیلی نہیں ہوسکتی جو فطرت ہے۔وہ موجود رہے گی البتہ ریاضت ومجاہدہ سے اس کیفیت کا رخ تبدیل کیا جاسکتا ہے کہ صرف جائز اور حق کے لیے غصہ کیا جائے۔اہل طریق نے اس حقیقت کو مختصر الفاظ میں اس طرح لکھا ہے:

''فطرت کا ازالہ ممکن نہیں، اِمَالَہ ممکن ہے۔'' (اِمالَہ کے معنی رُخ پھیر دینا)

⑤ ﴿فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ [سورة الروم: 50]

ترجمة: سو ذرا رحمت الٰہی کے آثار دیکھو کہ اللہ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد کس طرح زندہ کرتا ہے۔کچھ شک نہیں کہ وہ مردوں کو بھی زندہ کرنے والا ہے۔اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

تَفسِیر: آیت میں حیات بعد الممات کا تذکرہ ہے کہ دنیا کی اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی پیش آنے والی ہے جس کو آخرت کہا جاتا ہے۔اس عالم کے لیے انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا تاکہ دنیوی زندگی کا دائمی صلہ دیا جائے لیکن دوبارہ زندگی پھر کیونکر ہوگی، اس کو مذکورہ آیت میں ایک ظاہری مثال سے سمجھایا گیا ہے کہ موسم گرما میں جب زمین خشک وبنجر ہوجاتی ہے اور اس میں خشکی سے شگاف پڑ جاتے ہیں، گویا وہ مردہ انسان کی طرح بے رونق وبے فیض ہوجاتی ہے۔حقیقت میں یہ کیفیت زمین کی موت ہے۔

پھر اللہ کی مشیت ہوتی ہے تو پانی برسا کر اسی زمین کو سرسبز وشاداب بنا دیا جاتا ہے گویا یہ زمین کی دوسری

حیات ہوئی۔ اسی طرح قیامت کے بعد مردہ انسانوں کو دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا، اسی کو یوم الحشر کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت انہی لوگوں کو ملتی ہے جو غور و فکر کرتے ہیں اور حق کی تلاش میں رہتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آیت میں تجلی افعال کے مشاہدہ کا حکم ملتا ہے۔

(تجلی افعال کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کارخانۂ عالم کا نظام جن اسباب کے تحت چلایا جا رہا ہے، اس نظام پر غور و فکر کیا جائے تاکہ خالقِ کائنات کی تدبیر و تخلیق کا مشاہدہ حاصل ہو، اللہ کی معرفت صفات ہی کے مشاہدے سے ممکن ہے، ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ اس جہاں میں ممکن نہیں ہے۔)

﴿فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴾ [سورة الروم]

ترجمة: آپ مردوں کو سنا نہیں سکتے اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہیں جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں اور نہ آپ اندھوں کو ان کی بے راہی سے راہ پر لا سکتے ہیں۔ آپ صرف انہی لوگوں کو اپنی بات سنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں کا یقین رکھتے ہیں اور مانتے بھی ہیں۔

تفسیر: یعنی ضدی و عنادی کافر مُردوں، بہروں، اندھوں کی سطح پر ہیں۔ لہٰذا آپ ان سے نہ ایمان لانے کی توقع رکھیں، نہ ان کے انکار و تکذیب پر غم زدہ ہوں۔ جب کوئی سننا ہی نہ چاہے اور نہ نفع حاصل کرنے کا ارادہ کرے بلکہ مخالفت و بغاوت کرنے لگے تو ایسے شخص کو کون نفع پہنچا سکتا ہے۔

سُلوك: آیت کے تینوں جملوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہدایت نہ نبی کے اختیار میں ہے اور نہ کسی اور کے اختیار میں، بعض نادانوں کا یہ خیال کہ کامل بنا دینا شیخ و مرشد کے اختیار میں ہے کہاں تک درست ہے؟ ﴿اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ﴾

﴿فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ﴾ [سورة الروم: 60]

ترجمة: سو آپ صبر کیجئے، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور جو لوگ بے یقین ہیں، کہیں آپ کو بے برداشت نہ کر دیں۔

تفسیر: حالات کیسے ہی سنگین و صبر آزما ہوں، آپ کے ہاتھ سے صبر و استقامت کا دامن کسی حال میں چھوٹنے نہ پائے، آپ اپنی دعوت و تبلیغ جاری رکھیے، نتائج پر نظر نہ رکھیے۔ نتائج تو اللہ کے اختیار میں ہیں، وہ جس کو چاہے ہدایت دے اور جس کو چاہے اس کی گمراہی میں اس کو چھوڑ دے۔ آپ سے کامیابی اور سربلندی کا جو وعدہ کیا گیا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔ آپ ان بدعقیدہ و بے ایمان لوگوں کو ایسا کوئی موقعہ نہ دیں کہ وہ آپ پر طنز و طعن کر سکیں، پھر دیکھئے کہ یہی بدعقیدہ لوگ آپ کو ذرا بھی جنبش نہ دے سکیں گے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آیت میں تعلیم ہے ساری امت کے لیے، خصوصیت سے امت کے ان لوگوں کو جو مقتدائی شان رکھتے ہیں کہ وہ اپنا ظاہر و باطن یکساں حالت میں رکھیں اور حتی الامکان کافروں اور بدکار لوگوں کو اعتراض و طعن و تشنیع کا موقع نہ دیں۔

سُورَةُ لُقْمَان

پَارَہ: 21

① ﴿هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ [سورة لقمان: 3]

ترجمة: (قرآن حکیم کی یہ آیات) ہدایت ورحمت ہیں نیک کاروں کے حق میں۔

تفسیر: آیت میں قرآن حکیم کی غرض وغایت بیان کی گئی ہے کہ یہ کوئی سیاسی، تاریخی، حکایاتی کتاب نہیں ہے، راہِ حق بتانے والی نیک کاروں کے لیے رہنما اور رحمت ہی رحمت ہے۔ اس کی ہدایات پر چل کر بے خوف وخطر اپنی دنیا اور آخرت کامیاب کر لیتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے ایک لفظ "لِلْمُحْسِنِيْن" سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ محسنین جو ہدایت کے اعلیٰ درجات پر فائز ہیں، انہیں قرآن کی یہ آیات رہنمائی وہدایت کرتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہدایت کے بے شمار مراتب ہیں، درجہ احسان کی کوئی حد نہیں۔ انسان قرآن کی ہدایت اختیار کر کے اللہ کے یہاں درجہ بدرجہ قریب تر ہوتا رہتا ہے۔ لاَ تَقِفُ عِنْدَ حَدٍّ

② ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾ [سورة لقمان: 6]

ترجمة: اور بعض آدمی ایسے ہیں جو ان باتوں کو خریدا کرتا ہے جو (آخرت سے) غافل کرنے والی ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھ لوگوں کو گمراہ کرے اور اس کا مذاق اڑائے۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

تفسیر: احادیث میں آیت کا شانِ نزول یہ بیان کیا گیا کہ مکۃ المکرمۃ کا ایک کافر رئیس نضر بن حارث تجارت کے لیے فارس (ایران) وروم جایا کرتا تھا، واپسی میں وہاں سے جاہلی لٹریچر کی فحش کتابیں لاتا اور اہل عرب کو سناتا اور کہا کرتا کہ پڑھنے کی چیز تو یہ کتابیں ہیں، قرآن میں کیا رکھا ہے وغیرہ۔

عملی دل بہلائی کے لیے اپنے ساتھ حسین لڑکیاں بھی رکھتا تھا جو راگ راگنی، رقص وسرور سے لوگوں کے مجمع کو بڑھاتی تھیں، قرآن کریم نے ایسی جدوجہد اور تجارت کرنے والوں پر آخرت میں ذلت کے عذاب کی اطلاع دی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آیت سے ہر اس گانے وراگ راگنی وعیاشی کی محفلوں کی ممانعت نکلتی ہے جو دین وآخرت سے غفلت پیدا کرتی ہیں یا عقائد خراب کرتی ہیں۔

③ ﴿أَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۗ إِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝﴾ [سورة لقمان: 14]

ترجمة: اے مخاطب! تو میری اور اپنے والدین کی شکرگزاری کر۔ میری ہی جانب واپس ہونا ہے۔

تفسیر: سیدنا لقمان نے جو نصیحتیں اپنے بیٹے کو کی ہیں، ان میں مذکورہ نصیحت بھی شامل ہے کہ اللہ کے حقوق کے ساتھ اپنے والدین کے حقوق بھی پورے کیے جائیں۔

حقوق الٰہی کے ساتھ ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کا ذکر اس بات کی طرف خبردار کرتا ہے کہ والدین کے حقوق کو معمولی نہ سمجھا جائے، ساری زندگی اس کا اہتمام رکھنا چاہیے۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ منعم حقیقی (اللہ تعالیٰ) کی طرح جو لوگ بھی نعمت کا واسطہ و ذریعہ ہوں، ان کا بھی شکر کرنا مطلوب ہے۔ لہٰذا والدین کی شکر گزاری کے ساتھ استاذ، خیر خواہ، شیخ و مرشد بھی اس فہرست میں شامل ہوں گے، ان کا بھی حق ادا کیا جائے۔

ملحوظہ: شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سیدنا لقمان نے اپنے بیٹے کو اللہ کے حقوق تو بیان کیے ہیں لیکن ماں باپ کے حقوق بیان نہیں کیے۔ یہ غالباً اس لیے کہ اپنی نصیحت میں غرض شامل نہ ہو۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے توحید کی نصیحت کے بعد دیگر نصیحتوں سے پہلے ماں باپ کا حق بیان کیا کہ اللہ کے حق کے بعد ماں باپ کا حق ہے، اس کو بھی ادا کرو۔ پھر شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: باپ نے اللہ کا حق بتایا، اللہ نے باپ کا۔ (موضح القرآن)

④ ﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ [سورة لقمان: 18]

ترجمة: اور لوگوں سے اپنا رخ نہ پھیر اور نہ زمین پر اکڑ کر چل۔ بے شک اللہ تکبر کرنے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ۔

تفسیر: یہ بھی سیدنا لقمان کی نصیحتیں ہیں جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی تھیں۔

اسلامی معاشرت کے اصول میں یہ چار نصیحتیں بنیادی کردار کی حامل ہیں:

① تکبر سے کسی کو نہ دیکھنا۔

② اکڑ کر اترا کر نہ چلنا۔

③ اپنی چال میں تواضع و متانت اختیار کرنا۔

④ بات کرنے میں آواز کو نرم و پست رکھنا۔

ہدایات میں پہلی دو نصیحتیں تو جسم کی کیفیت سے متعلق ہیں اور باقی دو جسم کے عمل سے وابستہ ہیں۔ جس کا حاصل یہ نکلا کہ مسلمان کا حال و قال معتدل، متواضع، شریفانہ ہونا چاہیے۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ متکبرین کی چال ڈھال سے پرہیز کرنا چاہیے۔

ملحوظہ: شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اترانے اور شیخی کرنے سے آدمی کی عزت نہیں بڑھتی

بلکہ اچھا خاصا آدمی عام نگاہوں میں ذلیل وحقیر ہوجاتا ہے، سامنے نہیں تو پیچھے لوگ برا کہتے ہیں۔

⑤ ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهُ﴾ [سورة لقمان: 23]

ترجمة: اور جو کوئی کفر کرے سو آپ کو اس کا کفر غمگین نہ کرے۔ ان سب کو ہمارے پاس لوٹنا ہے۔

تفسیر: نبی کریم ﷺ کو دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں جن آیات سے تسلی دی گئی ہے، ان میں ایک آیت یہ بھی ہے کہ آپ کسی کے کفر وعناد سے دلگیر نہ ہوں۔ آخر ان سب کو ایک دن ہمارے پاس آنا ہے، اس دن ان سب کا کیا کرایا دھرارہ جائے گا۔ تھوڑے دن کا عیش ہے، موت کے بعد سخت سزا کے نیچے کھنچے چلے آئیں گے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ مخلوق کی ہدایت واصلاح کے لیے بہت ہی زیادہ اہتمام ومبالغہ نہ کرنا چاہیے (ضروری نصیحت کر کے علیحدہ ہوجانا اور نتیجہ کو اللہ کے حوالہ کرنا چاہیے، نتیجہ سامنے آئے گا خواہ دنیا میں یا آخرت میں)۔

سُوۡرَۃُ السَّجۡدَۃ

پارۃ: 21

(1) ﴿الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ وَ بَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ ﴿۷﴾﴾ [سورة السجدة: 7]

ترجمة: جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی۔

تفسیر: اللہ نے جس چیز کو بھی پیدا کیا، ٹھیک اسی کے مناسب حال اس کی ساخت وفطرت رکھی اور کائنات کی کوئی چیز بھی بے مقصد پیدا نہیں کی۔

مراقبۂ کائنات کا یہ ایسا وسیع وعریض میدان ہے جس کے کنارے نہیں ملتے۔ قرآن حکیم نے جابجا تفکیر فی الخلق کی ترغیب دی ہے، مخلوقات کی تخلیق میں غور وفکر کرنے سے معرفت الٰہی کے دروازے کھلتے ہیں اور قلب وجگر پر اللہ کی عظمت وقدرت کا عرفان گہرا ہوجاتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اللہ کی ہر مخلوق میں حسن وخوبی ہے، یہاں تک کہ صفات کبر وبخل میں بھی۔

(مطلب یہ کہ اللہ کی پیدا کردہ چیزوں میں کوئی چیز فضول اور بُری نہیں، اس کے اپنے منافع ہیں جب کہ ان کا قصد کیا جائے، غلط وناجائز استعمال بہرحال غلط وبُرے نتائج پیدا کرتا ہے۔)

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ھٰذَا بَاطِلًا﴾

(2) ﴿اِنَّمَا یُؤۡمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِّرُوۡا بِہَا خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوۡا بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَ ہُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾ [سورة السجدة: 15]

ترجمة: بس ہماری آیات پر وہی لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو ہماری آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرنے لگتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

تفسیر: یعنی اللہ کے نیک وفرمانبردار بندے وہی ہیں جب ان کو نصیحت کی جاتی ہے یا خیر کی دعوت دی جاتی ہے تو بلاتامل قبول کرلیتے ہیں، اعراض یا انکار نہیں کرتے بلکہ اس عمل سے ان کا خشوع وخضوع اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اللہ کی حمد وثنا کرنے لگتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آیت میں کامل الایمان لوگوں کی علامت اور شان بیان کی گئی ہے۔

(3) ﴿تَتَجَافٰی جُنُوۡبُہُمۡ عَنِ الۡمَضَاجِعِ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا ۫ وَّ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿۱۶﴾﴾ [سورة السجدة: 16]

ترجمة: ان کے پہلو خواب گاہوں سے جدا رہتے ہیں، اپنے پروردگار کو وہ پکارتے ہیں خوف وامید سے اور جو

کچھ ہم نے انہیں دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔

تَفسِیر: پہلوؤں کا خواب گاہ سے علیحدہ رہنے کا مطلب ہے کہ وہ نیک بندے راتوں کو اپنے بستر چھوڑ چھوڑ کر عبادت میں لگے رہتے ہیں۔

خوف اور امید سے اللہ کو پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ عذاب کے اندیشے سے وہ غافل نہیں رہتے اور امید اس کی رکھتے ہیں کہ ان کی عبادتیں قبول ہوں گی۔ علاوہ ازیں اپنی ہر اس چیز میں سے صدقہ وخیرات کرتے رہتے ہیں جو اللہ نے انہیں دی ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بعض روایات میں رات کی اس عبادت سے مراد تہجد کی نماز ہے۔ اس لحاظ سے نماز تہجد کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم اپنی ذات پر رات کی نماز (تہجد) واجب کرلو کیونکہ تم سے پہلے تمام نیک بندوں کی یہی عادت رہی ہے۔) (حدیث)

ملحوظه: رات کی اس عبادت کرنے والوں کا صلہ اگلی آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے:

''سو کسی کو علم نہیں جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان (بے شمار نعمتیں) ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔ یہ ان کے اعمال کا صلہ ہے جو وہ کیا کرتے تھے۔'' [سورة السجدة: 17]

شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جس طرح ان نیک بندوں نے راتوں کی تاریکی میں لوگوں سے چھپ کر بے ریا عبادت کی ہے، اس کے بدلے میں اللہ نے ان کی نعمتیں دیگر بندوں سے چھپا کر آخرت میں رکھی ہیں۔

شاہ صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ اللہ سے لالچ کرنا اور ڈرنا برا نہیں، دنیا کا ہو یا آخرت کا۔ (موضح القرآن)

(البتہ غیروں سے ڈرنا اور لالچ کرنا برا ہے)

﴿وَ لَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝﴾ [سورة السجدة: 21]

ترجمة: اور ہم انہیں قریب کا عذاب بھی اس بڑے عذاب سے پہلے چکھادیں گے تاکہ یہ لوگ باز آجائیں۔

تَفسِیر: کفر ومعصیت کا انجام آخرت میں دیکھنا ہی ہے لیکن حیات دنیا میں بھی اس کا انجام بدملا کرتا ہے۔ جیسے جرم کو مجرم جرم نہیں سمجھتا، اسی طرح اس کے انجام کو انجام ونتیجہ خیال نہیں کرتا حالانکہ اس کو زندگی میں مختلف مکروہات سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے۔ لیکن اس کو یہ نادان حوادث زمانہ یا اتفاقی حادثات قرار دے کر اپنے گناہ گار دل کو مطمئن کر دیتا ہے۔ اس کا یہ اندھا پن ہے جو نور اور تاریکی کو ایک خیال کر رہا ہے۔

آخرت کے بڑے عذاب سے پہلے دنیا کے مصائب، زلازل، امراض، قحط وخشک سالی، قتل وغارت گری، مال واولاد کی تباہی وبربادی، خوف وہراس کی کیفیات یہ سب کفر ومعصیت کے نتائج ہیں جو انہیں دنیا کی زندگی میں مل رہے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بعض صوفیاء نے عذاب ادنیٰ سے دنیا کی حرص وہوس مراد لی ہے اور عذاب اکبر سے اس حرص کی سزا مراد لی ہے جو آخرت میں ملے گی۔

⑤ ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝﴾ [سورة السجدة: 24]

ترجمة: اور ہم نے ان میں جب کہ انہوں نے صبر کیا، بہت سے پیشوا بنا دیئے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور وہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔

تفسیر: یعنی جو لوگ صبر وبرداشت کرتے ہیں اور اللہ کی آیات واحکام کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہوا کرتے ہیں تو اللہ کا معاملہ بھی ان کے ساتھ احسان وکرم کا ہوا ہے، انہیں دین ودنیا دونوں کا پیشوا بنایا گیا اور عزت وشان عطا کی ہے۔ اللہ کی یہ سنت دائمی رہی ہے۔ قدیم زمانے میں بھی ایسا ہوا اور آج بھی یہی ہوگا۔ شرط یہ ہے کہ اللہ کے وعدوں کا یقین بھی ہو۔

یقین محکم:

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت میں دلالت ہے مشائخ کے اس عمل کی کہ جب وہ مرید میں ریاضت ویقین کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس کو خلافت دے دیا کرتے ہیں۔

⑥ ﴿فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ۝﴾ [سورة السجدة: 30]

ترجمة: سو آپ ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے اور انتظار کیجئے، یہ بھی انتظار کر رہے ہیں۔

تفسیر: مشرکین کی طعن وتشنیع پر آپ ملولِ خاطر نہ ہوں، آپ کا مذاق اڑا کر یہ خود اپنا مذاق اڑا رہے ہیں، ان کا انجام بہت جلد سامنے آنے والا ہے گویا یہ انجام بد کا انتظار کر رہے ہیں۔

یہ آیت بھی ان آیات میں شامل ہے جن میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جاتی رہی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جو لوگ عارفین صادقین کے کمالات وفضائل کے منکر ہیں اور ان کے ساتھ مذاق کا معاملہ کرتے ہیں، جب انہیں خبردار کیا جاتا ہے تو اس کی پرواہ نہیں کرتے تو ایسے لوگوں سے کنارہ کشی کر لینی چاہیے اور انتظار کرنا چاہیے کہ انہیں کوئی وبال نہ پکڑ لے۔

❀ ❀ ❀

سُورَةُ الأحزاب

پارہ: 21

1 ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ﴾ [سورة الأحزاب: 1]

ترجمة: اے نبی! اللہ سے ڈرتے رہیے اور کافروں ومنافقوں کا کہانہ مانیئے۔

تفسیر: قرآن حکیم ہدایت وخیر خواہی کی کتاب ہے۔ قرآن حکیم کا آغاز ہی اس تعارف سے ہوا ہے: ﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ﴾

یہ کتاب سراپا ہدایت ورہنمائی ہے، اس لحاظ سے قرآن حکیم میں بعض ہدایات مکرر سہ کرر آئی ہیں، ان میں مذکورہ آیت بھی شامل ہے۔ نبی کریم ﷺ کو جابجا مشرکین وکافرین کی ایذاءرسانیوں پر تسلی دی جاتی رہی ہیں۔ اے نبی! اللہ سے ڈرتے رہیے جیسا کہ اب تک ڈرتے رہے ہیں اور مشرکین ومنافقین کا کہانہ مانیئے جیسا کہ اب تک آپ نے کہانہیں مانا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کامل الایمان آدمی کسی وقت بھی ایسی حالت میں نہیں ہوتا کہ اس سے احکام شرعیہ معاف ہوجائیں (جیسا کہ بعض نادانوں کا خیال ہے)۔

آیت میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ﴾

2 ﴿مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ﴾ [سورة الأحزاب: 4]

ترجمة: اللہ نے کسی انسان کے سینے میں دو 2 دل نہیں بنائے ہیں۔

تفسیر: سینے میں کسی شخص کے دو 2 دل نہیں ہوتے۔

جس طرح کسی کے منہ میں دو 2 زبانیں نہیں ہوتیں یا کسی کی دو 2 حقیقی ماں نہیں ہوتیں یا دو 2 حقیقی باپ نہیں ہوتے، اسی طرح ایک سینے میں دو 2 دل نہیں ہوتے۔ زمانۂ جاہلیت میں اگر کوئی اپنی بیوی کو ماں کہہ دیتا تو ساری عمر اس سے جدائی ہوجاتی گویا اس بکواس سے بیوی حقیقی ماں ہوگئی۔ اسی طرح کسی کو منہ بولا بیٹا بنالیا تو وہ اس کا بیٹا ہوگیا، حقیقی بیٹے کی طرح اس کے احکام بھی وہی ہوجاتے تھے حتیٰ کہ میراث میں بھی وہ شریک ہوجاتا تھا۔

قرآن حکیم نے اس لفظی ومصنوعی تعلق کو قدرتی وفطری تعلق سے جدا کرنے کے لیے ان مفروضات کی شدت سے تردید کی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر اپنی بیوی کو ماں کہہ دیا جائے تو کیا یہ شخص دو 2 ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا؟ اسی طرح کسی نے غیر کو اپنا بیٹا بنالیا تو کیا اس لڑکے کے دو 2 باپ ہوگئے؟

یہ ایک بے حقیقت بات ہے کہ جس کو لوگوں نے رواج دے لیا ہے، قرآن نے ایسی باتوں کو منکر اور جھوٹ کہا

ہے۔[سورة المجادلة: 2]

مذکورہ آیت کا پس منظر یہ ہے کہ عہد نبوت میں ایک کافر تھا جس کے بارے میں شہرت تھی کہ اس کے سینے میں دو ② دل ہیں۔ ایک دل سے سنتا ہے، دوسرے سے دیکھتا ہے۔ یعنی اس پر چودہ طبق روشن ہیں۔

غزوۂ بدر میں جب مشرکین پیٹھ پھیر پھیر کر بھاگ رہے تھے، یہ بھی اپنا ایک جوتا ہاتھ میں لیے اور دوسرا پیر میں ڈالے بھاگ رہا تھا۔ اس کے دوست ابوسفیان نے جب یہ تماشہ دیکھا تو اس کو یاد دلایا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ فوری متنبہ ہوا اور کہنے لگا: میں تو اپنے دونوں جوتے اپنے پیروں میں سمجھ رہا تھا۔ (دو ② دل والے کی یہ بیداری و باخبری تھی۔) (روح المعانی)

غرض قرآن حکیم نے اس مصنوعی رشتہ کو قدرتی وفطری تعلق سے جدا کیا اور خبر دار کیا کہ فضول اور بے حقیقت بات نہ کرنی چاہیے، ایسا کہنا بے ہودہ پن اور اللہ کے یہاں ناپسندیدہ ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے صوفیاء کے اس قول کی اصل نکل آئی کہ نفس ایک وقت میں دو ② طرف توجہ نہیں کر سکتا پھر اس پر یہ استنباط کیا کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں تسبیح پڑھتا ہوں اور باتیں بھی کرتا ہوں اور عین گفتگو کے وقت ذکر اللہ میں بھی مشغول رہتا ہوں، ایسا شخص جھوٹا اور فریب خوردہ ہے (ایک وقت میں دو جانب توجہ نہیں ہو سکتی کیونکہ دل ایک ہی ہے)۔

ملحوظه: آیت سے دفع وساوس کا علاج کیا گیا کہ جس شخص کو کثرت سے وساوس آتے ہوں، وہ ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے وساوس خود بخود دور ہو جائیں گے۔ کیونکہ دل بیک وقت دو باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتا (یعنی بیک وقت وساوس کی طرف اور ذکر اللہ کی طرف بھی)۔

③ ﴿ اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآئِهِمۡ هُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ ﴾ [سورة الأحزاب: 5]

ترجمة: تم ان بچوں کو ان کے باپ کی طرف نسبت کر کے پکارو۔ یہ اللہ کے ہاں راستی کی بات ہے اور اگر تم ان کے باپ کو نہ جانتے ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے دوست ہیں۔

تفسير: آیت میں زمانۂ جاہلیت کے اس دستور کی تردید ہے جو عام طور پر خاندانوں میں رائج تھی، منہ بولے بیٹے (لے پالک) کو اپنا حقیقی بیٹا قرار دے لیا کرتے تھے اور حقوق واحکام میں وہی معاملہ کرتے تھے جو حقیقی بیٹوں کے ساتھ کیا جاتا تھا یعنی اپنی بیوی اس کی ماں، اپنی بیٹی اس کی بہن اور اپنا بیٹا اس کا بھائی، اسی طرح نکاحی رشتہ میں برابر کا شریک حتیٰ کہ آدمی کے مرنے کے بعد اس کی میراث میں بھی برابر کا حصہ دار ہوا کرتا تھا۔

آیت میں اس جاہلی نظام کو ختم کر دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ جو جس کے صلب سے پیدا ہوا، وہی اس کا باپ

ہے، اسی کے نام سے اس کو پکارا جائے۔ اور اگر کسی لڑکے کے حقیقی باپ کا نام معلوم نہ ہو تو اس کو اپنا دینی بھائی اور دوست قرار دے لیا کرو اور ایک عام مسلمان کی طرح اس کو اپنے ساتھ رکھو۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے استنباط کیا کہ پیر بھائیوں کے حقوق بھائیوں جیسے، اسی طرح پیر کے حقوق باپ کی طرح ہونے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ نے دینی بھائیوں کو اخوان کہا ہے۔[سورة الحجرات: 10] اور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کو مسلمانوں کی ماں قرار دیا ہے۔[سورة الأحزاب: 6]

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: (اَنَا اُمُّ الرِّجَالِ مِنْكُمْ وَالنِّسَاءِ.) اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: (اَنَا اُمُّ رِجَالِكُمْ لاَ اُمُّ نِسَاءِ كُمْ.) (روح المعانی) میں تمہاری عورتوں اور مردوں کی ماں ہوں۔

ملحوظہ: ابتداء اسلام میں عرب کے دستور کے مطابق نبی کریم ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ چنانچہ دستور کے مطابق لوگ انہیں زید بن محمد (ﷺ) کہا کرتے تھے۔ جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے اوروں کی طرح ان کو بھی زید بن حارثہ پکارنے کا حکم فرمایا۔

چنانچہ آپ ﷺ نے بھی خود ایک موقع پر زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: (اَنْتَ اَخُوْنَا وَمَوْلاَنَا.) (تم ہمارے بھائی اور دوست ہو)

﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ﴾ [سورة الأحزاب: 10]

ترجمة: اور جب تم پر وہ لوگ آچڑھے تھے اوپر کی طرف سے اور نیچے کی طرف سے بھی اور جب کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تھیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کر رہے تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں کا سخت امتحان لیا گیا اور سخت زلزلے میں ڈالے گئے۔

تَفسیر: آیت میں غزوۂ احزاب جس کا دوسرا نام غزوۂ خندق ہے، کا تذکرہ ہے۔ غزوہ اس جہاد کو کہا جاتا ہے جس میں نبی کریم ﷺ بنفس نفیس شرکت فرما ہوں۔

یہ غزوہ ۴ھ یا ۵ھ پیش آیا (غالباً ۴ھ کا آخری اور ۵ھ کا ابتدائی حصہ ہو)۔

ہجرت نبوی کے چوتھے سال یہودیوں کے ایک قبیلے کو جو بنونضیر کے نام سے مدینہ منورہ میں آباد تھا، شہر بدر کر دیا گیا (جس کا ذکر سورۃ الحشر میں آیا ہے)۔ ان لوگوں نے عرب قبائل میں گھوم پھر کر عرب کی متحدہ طاقت کو مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے تیار کر لیا، تقریباً بارہ ہزار کا لشکر تھا جو سامان ضرب وحرب سے مسلح ہو کر مدینہ منورہ پر چڑھ آئے۔ یہودیوں کا ایک اور قبیلہ بنو قریظہ جو مسلمانوں سے معاہدہ کر کے امن کی حالت میں تھا، اپنا معاہدہ توڑ کر بنونضیر سے مل گیا۔ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ اس طرح یہودیوں کو ایک بڑی طاقت فراہم

ہوگئی۔مسلمانوں کی کل جمعیت تقریباً تین ہزار تھی جن میں ایک تعداد ان دغاباز منافقین کی بھی تھی جو عین موقع پر میدان جنگ سے فرار اختیار کیا کرتے تھے۔

مدینہ منورہ پر یہ پہلا بڑا حملہ تھا۔اس سے پہلے اتنی بڑی تعداد حملہ آور نہ ہوئی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے اس پر خطر حملہ کے بارے میں مشورہ کیا۔حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جو عجمی جنگوں سے واقف تھے،مشورہ دیا کہ مدینہ کے اطراف جہاں سے حملہ ہونے کا امکان ہے،طویل خندق کھودی جائے۔ چنانچہ ساڑھے تین میل لمبی خندق تیار کرلی گئی۔سخت سردی کا موسم،کھانے پینے کی تنگی،ساز وسامان کی قلت اور دشمن کسی بھی وقت سر پر آنے والا تھا۔ایسے سنگین حالات تھے کہ کلیجے منہ کو آرہے تھے اور مارے دہشت آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تھیں اور بعض لوگ طرح طرح کے گمان میں مبتلا ہورہے تھے۔تقریباً ایک ماہ یہ غیر یقینی کیفیت رہی،دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں لیکن مشرکین کو یکبارگی حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوسکی۔البتہ دور دور سے تیر اندازی کرتے رہے جس کا جواب بھی دیا جاتا رہا۔آخر ایک تاریک رات کو اللہ نے ہوا کا ایک خوفناک جھکڑ چلادیا،ریت اُڑ اُڑ کر مشرکین کی آنکھوں میں گھس پڑی،سارا ساز وسامان منتشر ہونے لگا،اونٹ اور گھوڑوں نے راہِ فرار اختیار کی،خیمے اُکھڑ اُکھڑ کر ہوا میں اُڑنے لگے،پھر تاریکی اور جسم کاٹنے والی سردی نے ایک کو دوسرے سے جدا کردیا۔ابوسفیان جو لشکر کا سپہ سالار تھا،اس خدائی فوج کی تاب نہ لاسکا اور کوچ کا اعلان کردیا۔آخر نامراد و ناکام ہوکر متحدہ عرب کی اس جمعیت نے راہ فرار اختیار کی۔(تفصیل ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۲ رصفحہ ۵۷۰ دیکھئے)

مذکورہ بالا آیت میں اس واقعہ کا تذکرہ ہے۔اللہ نے اس کو اپنی خاص نعمت قرار دیا ہے جو اس وقت مسلمانوں پر نازل ہوئی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت کے الفاظ ''وَتَظُنُّوْنَ'' سے خواطر نفس کا اثبات کیا ہے جس کا تذکرہ علم تصوف میں ملتا ہے۔خواطر ان وساوس کو کہا جاتا ہے جو طبعی طور پر انسان کے قلب میں پیدا ہوتے ہوں۔ایسے وساوس عموماً چار قسم کے ہوا کرتے ہیں۔

ایک (1) اللہ کی طرف سے،دوسرے (2) فرشتوں کی طرف سے،تیسرے (3) خود اپنے نفس کی طرف سے، چوتھے (4) شیطان کی طرف سے۔

پہلے وسوسہ کو خاطر حق کہا جاتا ہے،دوسرے کو الہام وکشف،تیسرے کو ہاجس اور چوتھے کو وسواس کہا جاتا ہے۔

ان خواطر کی پہچان یہ ہے کہ اگر کوئی نیک بات دل میں آئے اور عمل کی توفیق ہوجائے تو یہ خاطر حق ہے،لیکن نیک بات دل میں آئے لیکن عمل کی توفیق نہ ہو تو اس کو الہام کہا جاتا ہے۔

اسی طرح کوئی بری بات دل میں آئے اور اس سے شہوت یا غضب یا تکبر وریا وغیرہ صفات نفس کی طرف

رغبت ہوتی ہو تو اس کو ہاجس کہا جاتا ہے (لیکن اس کا دل میں قرار نہیں رہتا) اور اگر دل میں گناہ کا میلان پیدا ہو جائے اور وسوسہ کا قرار ہو جائے تو اس کو وسواس کہا جاتا ہے (جس کا سورۃ الناس میں ذکر ہے: ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾)(شریعت وطریقت: ص ۲۵۵۔)

پھر حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے طبعی خوف کا بھی اثبات کیا ہے جو بڑے لوگوں کو بھی پیش آتا ہے۔ غزوۂ احزاب میں دشمنوں کی متحدہ یلغار کے موقع پر صحابہ کرام کی حالت کو بیان کیا گیا کہ ان کے کلیجے منہ کو آرہے تھے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تھیں، ایسا خوف ایمان ویقین کے خلاف نہیں ہوتا۔ یہ ایک طبعی حالت ہے جو ناگہانی اور خلاف توقع حالات پر پیدا ہو جاتی ہے۔ تقاضۂ طبیعت سے کوئی محفوظ نہیں۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کا سخت امتحان لیا گیا اور آزمائش میں ڈالے گئے۔ بلاؤں کا پیش آنا خیر ہی ہوا کرتا ہے لہٰذا سالک کو قبض کی حالت پیش آنے پر صبر کرنا اور طاعات پر قائم رہنا چاہیے۔

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾ [سورة الأحزاب: 22]

ترجمة: اور جب اہل ایمان نے (کافروں کو) لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے: یہ وہی موقع ہے جس کی ہم کو اللہ اور اس کے رسول نے خبر دی ہے اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا اور اس سے ان کے ایمان اور اطاعت میں اور ترقی ہوگئی۔

تفسیر: غزوۂ احزاب (خندق) میں جیسا کہ بیان کیا گیا، شہر مدینہ کے اطراف خندقیں کھودی گئیں تھیں۔ اس عمل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شرکت فرماتے تھے۔ ایک جگہ سخت چٹان نکل آئی جس نے صحابہ کو بے بس کر دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا نام لے کر کدال سے اس پر دو چار ضرب لگائیں، ہر ضرب پر آگ کا شرارہ نکلا، شرارے کی روشنی میں آپ کو ملک ایران، فارس، شام وروم ویمن کے محلات نظر آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، یہ سارے ملک اسلام کے زیر تسلط آجائیں گے۔

پھر جب مسلمانوں نے مشرکین کی فوجوں کو دیکھا کہ چاروں طرف ٹوٹ پڑی ہیں، بجائے اس کے کہ شک میں پڑتے یا پریشان ہوتے، ان کا ایمان ویقین اور جذبہ فداکاری اور بڑھ گیا۔

مکی زندگی میں مسلمانوں کو خوشخبری دی گئی تھی کہ کافروں کے احزاب (جماعتیں) شکست کھا جائیں گے۔

﴿جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝﴾ [سورة ص: 11]

اور جب غزوۂ احزاب میں ان لشکروں کی تباہی دیکھی تو مسلمانوں کا ایمان اور ترقی کر گیا۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے واقعہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ کاملین پر بھی کبھی قبض طاری ہوتا ہے لیکن یہ قبض ان کے لیے مغفرت الٰہی کی زیادتی کا سبب بن جاتا ہے۔ (اس کے بعد ایمانی قوت اور زیادہ ہو جاتی ہے)

⑯ ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ﴾

[سورة الأحزاب: 28]

ترجمة: اے نبی! آپ اپنی بیویوں سے فرمادیں کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں مال متاع دے دلا کر خوبی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور عالم آخرت کو چاہتی ہو تو اللہ نے تم نیک کرداروں کے لیے اجر عظیم تیار رکھا ہے۔

تفسیر: فتح خیبر شوال ۵ھ فروری ۶۲۷ء مسلمانوں کے معاشی حالات کچھ بہتر ہو گئے تھے، مال غنیمت بھی کثرت سے آ رہا تھا۔ مسلمانوں کے گھروں میں خوشحالی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ ایسے وقت ازواج مطہرات نے بھی آپس میں گفتگو کر کے طے کیا کہ ہم سب مل کر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے گھریلو خرچ میں کچھ اضافہ کا مطالبہ کریں۔ چنانچہ سیدہ عائشہ صدیقہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما دونوں نے سب بیویوں کی نمائندگی کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اضافہ خرچ کا مطالبہ کر دیا۔ آپ کو ان کا یہ مطالبہ و اصرار پسند نہ آیا اور باتیں شاق گزریں۔ پھر آپ نے یکماہ کے لیے کسی بھی بیوی کے گھر نہ جانے کی قسم کھالی اور مسجد نبوی کے ایک کونے میں بالاخانہ بنوا کر فروکش ہو گئے، شدہ شدہ یہ بات عام ہو گئی اور یہ تاثر پھیلنے لگا کہ آپ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی ہے، سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما خاص طور پر بہت فکر مند تھے کیونکہ یہ دونوں ازواج علی الترتیب آپ کی صاحبزادیاں تھیں۔

ایک ماہ بعد مذکورہ آیت نازل ہوئی جس کو آیت تخییر کہا جاتا ہے۔

اے نبی! اپنی ازواج سے صاف کہہ دیں کہ دو راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کر لیں۔ اگر دنیا کا عیش و بہار چاہتی ہو تو میرا اور تمہارا نباہ نہ ہو گا اور میں تم کو تمہارا حق دے دلا کر حسن و خوبی سے رخصت کر دوں گا۔ (یعنی طلاق دے دوں گا)

اور اگر تم اللہ اور رسول کی خوشنودی اور آخرت کے اعلیٰ مراتب کی خواہش مند ہو تو نبی کے ساتھ رہنے میں اس کی کمی نہ ہو گی۔

آیت کے نزول کے بعد آپ اپنی ازواج کے حجروں میں گئے اور فرداً فرداً ہر ایک سے دریافت فرمایا: سب نے اللہ و رسول اور آخرت کی کامیابی کو اختیار کیا اور دنیا کی عیش و عشرت کا خیال دل سے نکال دیا۔

سلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت میں دلالت ہے اس بات کی کہ دنیا کی محبت اور اس کی زینت اللہ و رسول سے دوری و اجنبیت پیدا کرتی ہے۔

ملحوظہ: جس وقت آیت تخییر نازل ہوئی، اس وقت آپ کی نو ⑨ بیویاں تھیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا، سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا، سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا، سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا (یہ پانچوں تو قریشی نسب تھیں)، سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا خیبریہ، سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا ہلالیہ، سیدہ زینب رضی اللہ عنہا اسدیہ، سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا مصطلقیہ رضی اللہ عنہا، ان سب نے اللہ اور رسول کو اختیار کیا اور گھریلو خرچ کی کمی پر صبر اختیار کیا۔

البتہ بعض روایات میں ایک بیوی عامرہ حمیریہ کا ذکر ملتا ہے، انہوں نے خرچ کی تنگی پسند نہ کی اور آپ ﷺ کی زوجیت سے خارج ہو گئیں۔ (روح المعانی)

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾

[سورة الأحزاب: 30]

ترجمۃ: اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کھلی بے ہودگی کرے گی، اس کو دوہری سزا دی جائے گی اور یہ بات اللہ کو آسان ہے۔

تفسیر: نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کو ایسا خطاب بطور تہدید و تنبیہ اور امکانی قسم کا ہے جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے: بیٹا! اگر تم نے اپنی ماں کو ستایا تو تمہارا کھانا پینا بند کر دیا جائے گا، بہر حال بڑوں کی غلطی بھی بڑی ہوتی ہے۔

نبی کی بیویوں کا انتخاب نبی کی شان کے مطابق ہی کیا گیا تھا۔ بھلا اس طبقہ میں بے حیائی تو کجا، برائی بھی قدم نہیں رکھ سکتی۔ قرآن حکیم میں اس عنوان کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔

ایک موقع پر نبی کریم ﷺ کو خطاب کیا گیا:

﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [سورة الأحزاب: 65]

اگر آپ شرک کریں تو آپ کے اعمال غارت ہو جائیں گے اور آپ نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے۔

اور ایک اور موقع پر فرمایا:

﴿وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۙ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۙ﴾ [سورة الحاقة: 44 تا 45]

اگر یہ پیغمبر ہمارے ذمے جھوٹی باتیں لگا دیتے (یعنی جو کلام ہمارا نہ ہوتا، اس کو ہمارا کلام قرار دیتے) تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے اور ان کی رگ جان کاٹ دیتے۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

﴿اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ﴾ [سورة بنی اسرائیل: 75]

(اگر آپ شرک کی طرف مائل ہوتے) تو اس حالت میں ہم آپ کو دوگنا عذاب چکھاتے زندگی میں بھی، موت کے بعد بھی۔

یہ سب تعبیرات نبی کریم ﷺ کے بارے میں امکانی و تمثیلی قسم کی ہیں، دوسروں کو دھمکانے اور خبردار کرنے کے لیے ایسا عنوان اختیار کیا جاتا ہے۔ مسئلہ چونکہ نہایت اہم و نازک تھا، اس لیے اس کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ کو راست خطاب کیا گیا ورنہ جو خود کائنات میں توحید کا داعی و علمبردار ہو، اس سے بغاوت یا شرک کیونکر ممکن ہے؟

آیت میں ازواج مطہرات کو بھی اسی قسم کی تہدید و تنبیہ کی گئی ہے، مقصود دوسروں کو متنبہ کرنا ہے۔

علاوہ ازیں لفظ فَاحِشَةٌ (کھلی بے ہودگی) کی ایک تفسیر محدث بیہقی رحمہ اللہ نے امام تفسیر مقاتل رحمہ اللہ سے نقل کی ہے کہ: اِنَّها الْعِصْيان لِلنَّبِيِّ ﷺ فاحشہ سے مراد نبی کی مرضی کے خلاف کرنا، تنگ کرنا، پریشان کرنا منقول ہے۔ اس تفسیر پر ظاہری شبہ بھی نہیں ہوتا۔ (بیان القرآن)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جس کی فضیلت زیادہ ہے، اس کا عصیان اور طاعت بھی زیادہ ہے۔

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ علماء اور بڑے بڑے درجے کے لوگوں پر گرفت عام لوگوں کی گرفت سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کا اجر و ثواب بھی عام لوگوں کے اجر و ثواب سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ (روح المعانی)

حکیم الامت رحمہ اللہ بھی لکھتے ہیں کہ اہل اللہ میں یہ جو مشہور ہے نزدیکاں را بیش بود حیرانی۔

آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ﴾

[سورة الأحزاب: 32]

ترجمة: اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار نہ کرو اس سے لہٰذا نامحرموں سے بات کرنے میں نزاکت اختیار نہ کرو کہ اس سے ایسے شخص کو برا خیال پیدا ہونے لگتا ہے جس کے دل میں کھوٹ و خرابی ہے اور قاعدہ کے مطابق بات کیا کرو۔

تَفسِیر: آیت میں عورتوں کو ایک عظیم اخلاقی تعلیم دی گئی ہے جو بداخلاقی و بدکرداری کی جڑ ہی کاٹ دیتی ہے، کسی بھی بگاڑ کی بنیاد عام طور پر زبان ہوا کرتی ہے۔ زبان سے جیسے نیکیوں کے چشمے پھوٹتے ہیں، ایسے ہی برائیوں کے دروازے بھی کھلتے ہیں، مذکورہ آیت نے خواتین کو یہ تعلیم دی ہے کہ ضرورت پر غیر محرم مردوں سے بات کرتے وقت دلکش و نرم نازک لہجہ اختیار نہ کریں بلکہ واضح طور پر سیدھا سادا جواب دے دیں تاکہ آواز کی نزاکت سے کسی کو ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے۔

عورت کی آواز میں فطرتاً و خلقۃً نزاکت پائی جاتی ہے لیکن پاک باز خواتین کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ حتی الامکان اجنبی مردوں سے دل سے دل ملائے بات نہیں کرتیں اور نہ ان کے قلبی میلان کو اپنی جانب جذب کرتیں۔

علماء ربانیین نے "فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ" کا ترجمہ اس طرح ادا کیا ہے:

① شیخ الہند مولانا محمود احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: تم دب کر بات نہ کرو۔

② شاہ رفیع الدین صاحب محدث رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: بولنے میں مت نرمی کرو۔

③ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: بولنے میں نزاکت نہ کرو۔

④ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: نرم ودلکش لہجہ میں کلام نہ کرو۔

⑤ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے: اجنبی سے بات کرنے میں قریب نہ ہوں۔ (الدر المنثور)

تعبیرات کے اختلاف کے باوجود سب کا ایک ہی مفہوم ہے کہ عورت کو ضرورت کے وقت اجنبی مردوں سے سیدھا سادا کلام کرنا اور پھر علیحدہ ہوجانا چاہیے۔

لیکن شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے مفہوم کو جس عبارت سے ادا کیا ہے، وہ تعبیر کا اعلیٰ ترین عنوان ہے اور اللہ کی مراد سے قریب تر بھی۔ لکھتے ہیں:

"عورتوں کو یہ ادب سکھایا کہ کسی اجنبی مرد سے بات کہو تو اس طرح کہو جیسے ماں اپنے بیٹے اور بات بھی بھلی و معقول ہو۔" (موضح القرآن)

تفسیر ماجدی کے مفسر لکھتے ہیں کہ مضبوط اور شریفانہ لہجہ اور ہے، دل شکن اور دل آزاد لہجہ اور (پہلا لہجہ پسندیدہ ہے اور دوسرا ناپسند و مردود)۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آیت سے ثابت ہوتا ہے: جیسے فتنے سے بچنا ضروری ہے، ایسے ہی فتنے کے اسباب سے بھی بچنا ضروری ہے اگرچہ اسباب بعید ہی کیوں نہ ہوں۔ خاص طور پر اجنبی عورتوں سے سلام وکلام میں خلا ملا رکھنا نہایت سنگین معاملہ ہے۔

اجنبی عورتوں سے سلام کلام کرنا، میل ملاقات رکھنا، بے تکلف ہوجانا، انہیں دیکھنا اور تاکنا، ان کے قریب ہونا، ان کا حسن و جمال بیان کرنا، ان کو بے پردہ کردینا، ان کے خیال وتصور سے لطف اندوز ہونا وغیرہ وغیرہ، یہ سب فتنے کے اسباب ہیں جن سے پرہیز کرنا ضروری ہوا کرتا ہے۔

ملحوظه: فتنے کے مذکورہ اسباب سے جہاں مردوں کو پرہیز کرنا ضروری ہے، عورتوں کے لیے بھی یہی ہدایت ہے کہ وہ بھی ان اسباب سے دور رہیں، فساد ہر دو جانب سے پیش آتا ہے۔

۞ ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ﴾ [سورة الأحزاب: 33]

ترجمة: اور اپنے گھروں میں قرار رکھو اور جاہلیت قدیمہ کی طرح اپنے آپ کو دکھاتی نہ پھرو اور نماز کی پابندی کرو، زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو۔

تفسیر: زمانۂ جاہلیت (اسلام سے پہلے) بھی عورتیں بناؤ سنگھار کر کے باہر نکلا کرتی تھیں اور اپنی زیبائش و آرائش سے عام مردوں کو دعوتِ نظارہ دیا کرتی تھیں۔

لیکن آج عام مسلمانوں کی عورتیں بھی اس روش پر آ گئی ہیں۔ اس بداخلاقی و بے حیائی کا طریقہ اسلام کیونکر پسند کرسکتا ہے جب کہ اس کی ساری تعلیمات عفت و شرافت، تہذیب و اخلاق پر قائم ہیں۔ اس لیے اسلام نے اس بے حیائی کا دروازہ بند کر دیا اور عورتوں کو گھروں میں زیادہ وقت گزارنے کا حکم دیا۔ مرد بیرون خانہ کا محافظ ہے تو عورت اندرون خانہ کی ذمہ دار، انسانی زندگی کے صرف دو ⑫ گھر ہیں: اندرون خانہ، بیرون خانہ۔

سُلوك: تفسیر ماجدی کے مفسر لکھتے ہیں کہ آیت میں مذکورہ احکام کی ترتیب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی حیاداری اور عزتِ نفس کا تاکیدی حکم، نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کے احکام پر مقدم رکھا گیا ہے۔ اس ترتیب سے پردہ داری اور حیاداری کا حکم کس قدر اہم اور قابل توجہ ہو جاتا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا سَدِّدْ خُطَانَا

ملحوظہ: فقیہ کبیر قاضی ابوبکر عبداللہ بن العربی اندلسی (متوفی ۵۴۲ھ) لکھتے ہیں کہ میں نے اپنی سیر و سیاحت میں کوئی ایک ہزار شہر و بستیاں دیکھی ہیں، شہر نابلس (فلسطین شمالی) کی عورتوں سے بڑھ کر اور کہیں کی عورتوں کو پاک دامن نہیں پایا۔ اس شہر میں کئی ماہ قیام کیا، شہر و بازاروں میں انہیں کبھی چلتا پھرتا نہیں دیکھا، صرف جمعہ کے دن نماز کے لیے نکلتی تھیں پھر نماز ادا کر کے اپنے گھروں میں داخل ہو جاتیں۔

پردہ داری اور باعصمتی کی یہ کیفیت مسجد اقصیٰ (فلسطین) کی معتکف عورتوں میں بھی پائی ہے، ورنہ اور مقامات میں جہاں عورتوں کو بے پردہ چلتے پھرتے دیکھا، ان کو طرح طرح کی برائیوں اور فتنوں میں ہی دیکھا ہے۔ (ابن العربی)

راقم الحروف کہتا ہے: یہ حال ۵۴۲ھ یعنی آج سے ساڑھے آٹھ سو سال پہلے کا ہے لیکن آج ۱۴۱۷ھ م ۱۹۹۶ء کوئی غیرت مند مسلمان قاہرہ، اسکندریہ، تہران، انقرہ، بغداد، کوفہ، بصریٰ، دمشق، کراچی، لاہور، ڈھاکہ، دہلی، لکھنؤ، بمبئی میں کھلی بے حیائی دیکھنے کی کیونکر تاب لاسکتا ہے؟ فَاِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى

⑩ ﴿وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ﴾

[سورة الأحزاب: 37]

ترجمة: اور آپ اس وقت کو بھی یاد کیجیے جب آپ اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے بھی فضل کیا ہے اور آپ نے بھی اپنی عنایت کی ہے کہ اپنی بیوی (زینب ﷞) کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اللہ سے ڈر، آپ اپنے دل میں وہ بات چھپاتے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور آپ لوگوں کی طرف

سے اندیشہ کر رہے تھے حالانکہ اللہ ہی اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

تفسیر: مذکورہ آیت ایک خاص واقعہ پر نازل ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا تھا جو ایک زمانے میں ایک نصرانی کی غلامی میں آچکے تھے۔ یہ آپ کے چہیتے تھے، یہاں تک کہ ایک مدت تک عوام میں زید بن محمد (ﷺ) کے نام سے پکارے بھی جاتے تھے پھر آپ ﷺ نے ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے کرنا چاہا جو قریشی خاندان کی تھیں لیکن خود زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے بھائی نے اس رشتہ کو پسند نہ کیا تھا۔ اس پر وہ آیت نازل ہوئی جس میں دھمکی دی گئی کہ اللہ و رسول کے فیصلے کے بعد کسی مومن مرد اور مومن عورت کو انکار کرنے کی گنجائش نہیں۔[سورة الأحزاب: 46]

بالآخر حضرت زید رضی اللہ عنہ کا نکاح سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے ہوگیا لیکن مزاج میں اتحاد و توافق نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اختلاف رہا کرتا تھا۔ آخر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے طلاق دینے کا ارادہ کرلیا، لیکن نبی کریم ﷺ ہر بار یہی فہمائش کرتے کہ طلاق نہ دو، صبر کرو پھر اس درمیان میں وحی الٰہی نے آپ ﷺ کو اطلاع دی کہ زید رضی اللہ عنہ بہر حال طلاق دے دیں گے، اس کے بعد زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح آپ سے کردیا جائے گا بلکہ ہم نے فیصلہ کرلیا ہے۔

اس کے باوجود حضرت زید رضی اللہ عنہ کے اصرار اور تقاضہ پر آپ ﷺ یہی فرمایا کرتے تھے کہ طلاق نہ دو، صبر کرتے رہو۔

آپ ﷺ کو یہ اندیشہ ہوا کرتا تھا کہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا اگر میرے نکاح میں آگئیں تو عام لوگوں میں خاص طور پر کافروں و مشرکوں میں یہ شکوک و شبہات پیدا ہوں گے کہ نبی نے اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرلیا جب کہ ایسا نکاح اس دور میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ادھر اللہ کو یہ منظور تھا کہ یہ بد رسم ہمیشہ کے لیے ختم کردی جائے تو فہمائش کی گئی کہ آپ کو عوام کی ایسی خیالی باتوں کا اندیشہ نہ کرنا چاہیے، اندیشہ صرف اللہ سے کرنا چاہیے۔ اس معاملہ میں بھی ہر معاملہ کی طرح آپ کا ظاہر و باطن یکساں رہنا چاہیے۔

اور لوگوں کے طعن و اعتراض کا خیال نہ کرنا چاہیے۔ اسی بات کو آیت میں کہا گیا کہ آپ ایک بات کو دل میں چھپائے ہوئے تھے (کہ زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوگا) اللہ اس کو ظاہر کرنا چاہتا تھا، آپ لوگوں سے اندیشہ کر رہے تھے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے: جس کام میں کوئی دینی مصلحت ہو جیسا کہ مذکورہ واقعہ میں مصلحت تھی، ایسے امور میں عوام کی ملامت اور طعن کی پروانہ کرنی چاہیے اور اس کو ظاہر کردینا چاہیے، البتہ جس کام میں عام مسلمانوں کے لیے کوئی مفسدہ و مضرت ہو تو اس میں احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے جیسا کہ حطیم کعبہ کی تعمیر میں نبی کریم ﷺ نے ملحوظ رکھا تھا۔

(تفصیل ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۲ رصفحہ ۲۴۸ دیکھئے)

⑪ ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الَّتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ﴾

[سورة الأحزاب: 50]

ترجمۃ: اے نبی! ہم نے آپ کے لیے آپ کی یہ بیویاں حلال کی ہیں جن کو آپ ان کے مہر دے چکے ہیں اور وہ عورتیں بھی جو آپ کی ملکیت ہیں جنہیں اللہ نے آپ کو مالِ غنیمت میں دلوایا ہے۔

تفسیر: آیت میں رسول اللہ ﷺ کے نکاحی احکامات میں جس میں امت کے افراد شریک نہیں ہیں، یہ خصوصی احکام آپ کی ذاتِ اقدس کی حد تک مخصوص ہیں اور اس کی وجہ قرآن حکیم نے یہ بتائی ہے کہ آپ کے مقاصد پیغمبرانہ اور تقاضوں اور ذمہ داریوں کے پیشِ نظر یہ احکام آپ ﷺ کو دیئے گئے ہیں تاکہ کارِ نبوت کی تکمیل میں آپ ﷺ کو حرج کا سبب نہ بنیں۔ وہ مخصوص احکام یہ ہیں:

① ازواج کے انتخاب میں آپ پر کوئی تحدید نہیں۔ (وفات تک آپ کی نو⑨ بیویاں باحیات تھیں)

② خاندان کی انہی عورتوں سے آپ ﷺ کا نکاح درست تھا جنہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ مکۃ المکرمۃ سے مدینہ منورہ ہجرت کی تھی۔

③ غیر خاندان کی عورتوں میں صرف مومنہ مسلمہ خاتون ہونا کافی تھا۔

④ وہ خواتین جو آپ ﷺ کو مالِ غنیمت میں ملی تھیں، اس میں مالِ غنیمت کی تقسیم سے پہلے آپ ﷺ اپنے لیے انتخاب کر سکتے تھے۔

⑤ ایسی خواتین بھی آپ کے لیے حلال تھیں جو بغیر مہر آپ کے نکاح میں آجاتی ہوں۔

⑥ کتابیہ (یہودیہ، نصرانیہ) سے آپ کا نکاح حلال نہ تھا۔

⑦ بیویوں میں شب گزاری و دیگر معاملات میں آپ پر مساوات کرنا واجب نہ تھا۔ (اگرچہ آپ ﷺ عدل برقرار رکھا کرتے تھے۔)

⑧ موجودہ ازواج کو علیحدہ کرکے دوسری ازواج کا اختیار کرنا درست نہ تھا۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ نے آیت سے استدلال کیا ہے کہ تعدد ازواج (مَثْنیٰ وثُلٰث ورُبٰع) دو② دو②، تین③ تین③، چار④ چار④ بیویاں رکھنا کمال زہد، قناعت کے خلاف نہیں۔

⑫ ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ﴾ [سورة الأحزاب: 59]

ترجمۃ: اے نبی! آپ ﷺ کہہ دیں اپنی بیویوں اور صاحبزادیوں اور عام مسلمانوں کی عورتوں کو کہ وہ نیچی کر لیا کریں اپنے اوپر تھوڑی سی چادریں، اس سے جلد پہچان ہو جایا کرے گی اور انہیں ستایا نہ جائے گا۔

تَفسیر: اگر کسی ضرورت سے عورتوں کو باہر نکلنا پڑے تو چادر سے سر اور اپنا چہرہ چھپا لیا کریں جیسا کہ [سورۂ نور: 31] میں ﴿وَلَا يُبۡدِينَ زِينَتَهُنَّ﴾ زینت کی قید آئی ہے یعنی اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، زینت میں اگر چہرہ اور سر شامل نہ ہو تو پھر عورت کی کوئی زینت، زینت ہی نہ ہوگی۔ بے چہرے کی عورت میں کیا زینت ہوگی؟ بلکہ ایسی بے سر عورت کو دیکھ کر خود اس کے عاشق بھاگ کھڑے ہوں گے۔ لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہوا کہ باہر نکلنے کی صورت میں اپنے سر و چہرے پر نقاب ڈال لیا کریں۔

جلباب چادر، اوڑھنی، برقعہ وغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ عورت بے پردہ نہ ہو۔ اس ہیئت و لباس سے ہر شخص کو پہلی نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ یہ شریف و حیادار خاندانی عورت ہے، بازاری قسم یا بیباک و نچلی قسم کی نہیں۔ اس سے راہ کے بدمعاشوں، اوباشوں کو چھیڑ چھاڑ کرنے کی ہمت نہ ہوگی، اس طرح وہ اپنی جان و مال، عزت و آبرو سے حتی الامکان محفوظ ہو جائے گی۔

عورت کی عصمت و عفت کے تحفظ میں اس کی وضع قطع، چال ڈھال، لباس کے وقار کو بڑا دخل ہوا کرتا ہے۔ جو عورت اپنی وضع قطع و رفتار و گفتار سے آوارہ معلوم ہوتی ہے، اس کو دیکھ کر صرف اُچکوں، لفنگوں، بدمعاشوں کو نہیں، اچھے خاصے شریف لوگوں کے دلوں میں بھی گدگدی پیدا ہونے لگتی ہے۔

یہ ناپاک جذبہ کون غیرت مند مسلمان برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی بیوی بیٹی، ماں بہن کے لیے راہ کے چلتے انسانوں کے دلوں میں پیدا ہو۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ لباس میں وقار و تمکنت اور بھاری پن ہونا برا نہیں (جیسا کہ بعض مشائخ عمدہ و نفیس لباس استعمال کرتے ہیں البتہ نام و نمود شان و شوکت مقصود نہ ہو ورنہ قیامت کے دن یہی ذلت کا لباس ثابت ہوگا)

(115) ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَقُولُواْ قَوۡلٗا سَدِيدٗا ۝ يُصۡلِحۡ لَكُمۡ أَعۡمَٰلَكُمۡ﴾

[سورة الأحزاب: 70 تا 71]

ترجمۃ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات کرو۔ اللہ تمہارے اعمال درست کر دے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی سو وہ بڑی کامیابی کو پہنچ گیا۔

تَفسیر: انسان کی عادت اگر صحیح و سچی و پکی بات کرنے کی ہو جائے تو اس کی برکت سے اس کے دوسرے اعمال درست اور استوار ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک پوشیدہ حقیقت تھی جس کو اللہ کے کلام نے ظاہر کر دیا ہے۔

اہل علم لکھتے ہیں کہ ایمان کی اساس میں اکل حلال اور صدقِ مقال اہم ترین خصلت ہیں۔

فرمایا: کیوں نہیں۔

پھر پوچھا گیا: کیا چوری کر سکتا ہے؟

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ بھی کر سکتا ہے۔

دریافت کیا گیا: کیا مومن جھوٹ کہہ سکتا ہے؟

ارشاد فرمایا: نہیں۔ (حدیث)

بہر حال آیت میں اللہ کا یہ وعدہ ملتا ہے کہ سچ بولنے پر دیگر اعمال کی درستگی بھی کر دی جاتی ہے اور باقی جو رہ گئے، اللہ ان کی مغفرت کر دے گا۔

سُلوك: اہل علم نے لکھا ہے کہ وعدۂ الٰہی میں تخلف نہیں ہوتا (یعنی جھوٹ کا امکان نہیں) (قرطبی) لہٰذا صدقِ کلامی دیگر اعمال کی اصلاح کے لیے اکسیر ثابت ہوتی ہے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جیسا کہ صدق بیانی اور تقویٰ دیگر اعمال کی درستگی کا ذریعہ ہیں، اس لیے مشائخ حضرات بعض اوقات اپنے مریدوں کو ایک عمل کرنے کا حکم دیتے ہیں مگر مقصود اس سے کسی دوسرے عمل کی اصلاح کرنی ہوتی ہے (جیسے اذکارِ مخصوصہ و اعمال زائدہ و مراقبات سرّیہ وغیرہ) یہ ان کی اپنی فراست و ذکاوت ہے۔

﴿١٤﴾ ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا﴾ [سورة الأحزاب: 72]

ترجمة: ہم نے دکھائی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو سو کسی نے قبول نہ کیا کہ اس کو اٹھائیں اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ بڑا بے ترس نادان ہے۔

تفسیر: شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اپنی جان پر ترس نہ کھایا کہ امانت کیا ہے پرائی چیز رکھ لیا اپنی خواہش کو روک کر۔ (موضح القرآن)

امانت کیا تھی؟ مفسرین نے اس ایک حقیقت کو کئی تعبیرات سے ادا کیا ہے، مقصود سب کا ایک ہی ہے یعنی ''شریعت اور اس کی ذمہ داری'' اور اس کو پورا کرنا۔ (قرطبی)

مطلب یہ ہوا کہ انسان کے سوا باقی قوی سے قوی تر مخلوق نے اس ذمہ داری کو برداشت نہ کیا اور ڈر گئے کہ یہ کیونکر پوری ہوگی۔ ان کا یہ قبول نہ کرنا بغاوت و سرکشی کی بناء پر نہ تھا بلکہ خشیت الٰہی اس کا سبب تھی۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ساتوں آسمان اور عرش عظیم سے خطاب ہوا کہ تم یہ امانت اور جو کچھ اس میں ہے، قبول کرو گے؟

عرض کیا: اس میں کیا ہے؟

ارشاد ہوا: نیکی پر اجر و ثواب اور بدی پر مواخذہ و عذاب۔

اس پر سب نے معذرت کر دی۔ پھر ساتوں زمین اور پہاڑوں سے خطاب کیا: انہوں نے بھی وہی جواب دیا۔

ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ یہ معاملہ تین دن تک پیش ہوتا رہا لیکن ساری مخلوق نے خشیت و ہیبت الٰہی سے عذر کر دیا کہ پروردگار! ہم تو فقط تابع و حکم بردار ہیں، عذاب و ثواب کی ہمت نہیں رکھتے۔ (ابن کثیر)

کائنات کی ساری مخلوقات میں صرف حضرت انسان نے اس امانت کو قبول کر لیا اور پھر اللہ کی مرضیات و احکامات کا پابند بھی یہی ٹھہرا۔

تفسیر قرطبی میں حکیم ترمذی محدث رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں پر امانت پیش کرنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام پر یہ امانت پیش کی گئی جس کو انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔

لکھتے ہیں کہ بارِ امانت اٹھانے پر اتنا وقت بھی نہ گزرا تھا جتنا ظہر و عصر کے درمیان ہوتا ہے کہ ابلیس مردود نے سیدنا آدم علیہ السلام کو اس مشہور لغزش میں مبتلا کر دیا جس کے بعد سیدنا آدم علیہ السلام کا جنت سے اخراج عمل میں آیا۔ (قرطبی)

مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عرضِ امانت کا یہ واقعہ آسمانوں پر پیش آیا اور قبول کرنے والے سیدنا آدم علیہ السلام تھے جو نسل انسانی کے نقطۂ آغاز ہیں۔ فَصَلَوَاتُ رَبِّی وَسَلَامُه عَلَيْهِ وَاللهُ اَعْلَمُ وَعِلْمُه اَتَمُّ

سُلوك: کائنات میں انسان کی فضیلت اسی لیے ہوئی کہ اس نے ''امانت'' کو قبول کر لیا۔

بیعت میں اپنے شیخ سے جو اطاعت کا اقرار کیا جاتا ہے، وہ بھی امانت کی ایک قسم ہے جس کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔

سُورَةُ سَبَا

پارہ: 22

⑪ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۖ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ﴾ [سورة سبا: 10]

ترجمة: اور یقیناً ہم نے داؤد علیہ السلام کو بڑی فضیلت دی تھی۔ اے پہاڑ! ان کے ساتھ تسبیح کرتے رہو اور پرندوں کو بھی (یہی حکم تھا) اور داؤد علیہ السلام کے لیے ہم نے لوہے کو نرم کر دیا تھا۔ کہ وہ بنائے کشادہ زرہیں (جنگی آہنی لباس) اور یہ کہ (لباس کے) اکڑیوں کے جوڑ میں مناسب انداز رکھیں اور سب کام ٹھیک کیا کریں۔ میں تمہارے سارے اعمال کو دیکھ رہا ہوں۔

تفسیر: سیدنا داؤد علیہ السلام کبھی کبھی جنگل کی طرف نکل جاتے تو اللہ کی یاد اور خوف الٰہی سے روتے ہوئے تسبیح و تہلیل میں مشغول ہو جاتے، اللہ نے آواز بھی ایسی پرکشش و دلبری قسم کی دی تھی کہ قریب کے چرند و پرند حتیٰ کہ درخت و پہاڑ بھی ان کی تسبیح میں شریک ہو جاتے، اللہ کے ذکر سے جنگل گونج اٹھتا تھا۔

روایات حدیث میں یہ بھی تصریح ہے کہ یہی تسبیح دریا کے کنارے کی جاتی تو بہتا پانی ٹھہر جاتا تھا، صوت داؤدی اللہ کی ایک خاص عطاؤ بخشش تھی جو انہیں دی گئی۔

اسی طرح ایک دوسرا فضل یہ بھی تھا کہ لوہے اور فولاد کو جب وہ اپنے ہاتھ میں لیتے، وہ موم کی طرح نرم و گداز ہو جاتا، پھر جنگی آلات و جنگی لباس جس قسم کے چاہتے، بنا لیتے تھے۔

علاوہ ازیں اسی دستکاری کو فروخت کر کے اپنی اور اہل و عیال کی روزی کا بھی انتظام کرتے تھے۔

سیدنا داؤد علیہ السلام کارِ نبوت و رسالت کی انجام دہی کے علاوہ حکومت و سلطنت کے امور کی دیکھ بھال بھی انجام دیتے تھے، اپنی معاش زرہ سازی پر رکھی تھی، بیت المال سے روزینہ نہیں لیا کرتے تھے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے تین مسئلے اخذ کیے ہیں:

① خرقِ عادت کا ثبوت۔

② دستکاری سے کمانے کی فضیلت۔

③ ہر کام میں اعتدال کی رعایت رکھنا۔

② ﴿وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ﴾ [سورة سبا: 12]

ترجمة: اور جنات میں کچھ وہ تھے جو ان کے آگے ان کے پروردگار کے حکم سے کام کرتے تھے۔

تفسیر: سیدنا داؤد علیہ السلام کو جہاں بے شمار فضیلتیں حاصل تھیں، ان میں تسخیر جنات کی دولت بھی نصیب تھی۔

جنات کی ایک بڑی تعداد ہر وقت ان کی خدمت میں حاضر باش رہا کرتی تھی۔ سیدنا داؤد علیہ السلام ان سے ایسے بڑے بڑے کام لیا کرتے تھے جو انسانی طاقت سے بالاتر ہوا کرتے تھے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا کہ تسخیر جنات اگر کسی عمل ورمل کی وجہ سے نہ ہو بلکہ منجانب اللہ نصیب ہو تو یہ عبدیت کے خلاف نہیں۔ (بزرگوں نے جنات سے کام لیا ہے)

﴿ فَأَعۡرَضُواْ فَأَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ سَيۡلَ ٱلۡعَرِمِ ﴾ [سورة سبا: 16]

ترجمة: سوانہوں نے سرکشی کی پھر ہم نے ان پر بند کا سیلاب چھوڑ دیا۔

تفسیر: یعنی شہر والے کفر وشرک میں پڑ گئے اور نصیحت کرنے والوں کی پروانہ کی، پانی کے جس بند سے ملک اور اہل ملک کی حیات وابستہ تھی، وہی موت وہلاکت کا سبب بنا۔

آیت میں ملک سبا کا تذکرہ ہے۔ یہ ملک عرب کے جنوب میں واقع تھا جو آج علاقہ یمن کہلاتا ہے۔ نہایت سرسبز شاداب زرخیز علاقہ تھا، اس کا پایۂ تخت شہر مآرب جو موجودہ شہر صنعاء سے قریب ساٹھ میل مشرق میں واقع تھا۔ اس شہر کے دائیں بائیں باغات کا طویل وعریض سلسلہ میلوں تک چلا گیا تھا، پورا شہر باغ ہی باغ نظر آتا تھا۔ صدیوں تک اس پر قوم سبا کی حکمرانی رہی ہے۔ عہد سلیمانی میں تاریخ قدیم کی مشہور زمانہ ملکہ سبا (بلقیس نے) بھی اس ملک پر بڑی طمطراق سے حکومت کی ہے۔

اس ملک کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ملک میں پانی کے بڑے بڑے بند تعمیر کیے جاتے تھے جو ہر موسم میں پانی سے لبریز رہا کرتے تھے۔ ملک کی دولت وثروت اور عیش وعشرت کے قصے ملک فارس وروم کے ایوانوں میں بڑی حسرت وتعجب سے سنے جاتے تھے۔

پانی کے ان ذخائر میں سب سے بڑا عظیم الشان بند "سدِ مآرب" تھا جو دو بلند پہاڑوں کے درمیان ۸۰۰ قبل مسیح تیار کیا گیا تھا۔ یہ بند ملک کی تین سو مربع میل زمین کو سیراب کرتا تھا، خوشحالی وفراخی کا یہ حال تھا کہ ملک میں کوئی فقیر یا محتاج نہ تھا۔

روایات میں آیا ہے کہ اس قوم کی طرف تیرہ (۱۳) نبی روانہ کیے گئے تھے لیکن قوم نے ایک کی بھی بات نہ مانی، بالآخر اللہ کے قانون مکافات سے دو چار ہو گئے۔ نعمتیں، زحمتوں وعذاب میں تبدیل ہو گئیں، وہی آب حیات، ہلاک وممات ثابت ہوا۔ سد مآرب کو اللہ نے توڑ دیا، سارا شہر غرقِ آب ہو گیا۔

(عہد قدیم کا یہ نادر الوجود حادثہ "ہدایت کے چراغ" جلد ۲ رصفحہ ۲۶۸ پر مطالعہ کیجئے)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے واقعہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ طاعات کو دنیوی نعمتوں کے حصول اور معصیت کو اس کے زوال میں دخل ہوا کرتا ہے۔

(یعنی طاعت وعبادات سے جیسے دنیوی نعمتیں ملتی ہیں، گناہوں و نافرمانیوں سے نعمتوں کا زوال بھی ہوجاتا ہے۔)

﴿وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ﴾

[سورة سبا: 23]

ترجمة: اور نہ اس کے حضور میں کوئی سفارش کام آتی ہے البتہ اس کے حق میں جس کے لیے اللہ اجازت دے دے یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوجاتی ہے تو آپس میں دریافت کرتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا ارشاد فرمایا؟ وہ کہتے ہیں: حق بات ہی کا حکم فرمایا ہے اور واقعی وہ ذات عالیشان سب سے بڑی ہے۔

تفسیر: ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کا تذکرہ ہے جو اللہ کی بارگاہ میں ہمہ وقت حاضر باش ہیں۔ جب ان پر اوپر سے اللہ کا کوئی حکم نازل ہوتا ہے تو ان کے مجمع میں ہلچل پڑ جاتی ہے اور وہ سب حواس باختہ ہوکر خوف و عظمت میں تھرّا جاتے ہیں اور تسبیح پڑھتے ہوئے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ پھر جب یہ عظمت و جلالی حالت ختم ہوتی ہے تو اپنی فہم و یادداشت پر اعتماد نہیں کرتے، گھبرا کر ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگتے ہیں کہ اللہ رب العزت کا کیا حکم نازل ہوا؟ اوپر والے فرشتے نیچے درجے کے فرشتوں کو درجہ بدرجہ جواب دیتے ہیں کہ حق بات ہی نازل ہوئی ہے۔ یہ اللہ کی عظمت و کبریائی کا تذکرہ ہے۔

آیت کا پس منظر یہ ہے کہ مشرکین و کافرین نے اپنی شفاعت و نجات کے لیے سینکڑوں بت اس لیے تراش لیے تھے کہ وہ ان کے لیے نجات کی سفارش کریں گے اور اللہ بہرحال ان کی سفارش ضرور قبول کرلے گا۔

لیکن آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ جب مقربانِ بارگاہِ الٰہی کا اللہ کے حضور یہ حال ہے تو بھلا ان مردہ بے حس و بے جان پتھروں کا کیا اختیار ہوگا کہ اللہ کے حضور سفارش کریں اور کلام کریں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ کبھی خوف و ہیبت اس حد تک طاری ہوجاتی ہے کہ عقل و فہم معطل ہوجائیں، ایسے وقت انسان کو معذور قرار دینا پڑتا ہے جیسا کہ بعض اہلِ حال بزرگوں کو معذور سمجھا گیا ہے (یعنی ان پر کوئی شرعی حکم جاری نہیں کیا گیا)۔

سُورَةُ فَاطِر

پارہ: 22

1 ﴿وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ﴾ [سورة الفاطر: 4]

ترجمة: اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر جھٹلائے جا چکے ہیں۔

تفسیر: زمانۂ قدیم میں نبیوں کو جھٹلانے اور ان کو ستانے کا عام مرض تھا۔ یہ کوئی عجیب واتفاقی بات نہ تھی، مشرک قوموں کا مزاج ہی کچھ ایسا ہوا کرتا ہے کہ وہ حق کو دیکھنے، سننے، غور وفکر کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہیں پاتے، صرف آباء پرستی ہی ان کا دین وایمان ہوا کرتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کو بھی اپنی قوم سے یہی مکروہ صورت پیش آئی تھی۔ آپ کو انبیاء سابقین کی سیرت سے تسلی دی گئی کہ انہیں بھی بہت ستایا گیا، بعضوں کو زندہ دفن کر دیا گیا لیکن ان عظیم انبیاء نے صبر کیا، آپ بھی صبر کیجئے۔

سُلوك: تفسیر روح المعانی کے مفسر لکھتے ہیں: آیت میں جہاں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی، آپ کے وارثوں اور نائبوں کے لیے بھی اس میں تسلی ہے کہ وہ بھی مخالفوں کی ایذاؤں پر صبر کریں۔

2 ﴿فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝﴾ [سورة الفاطر: 8]

ترجمة: لہٰذا ان پر افسوس کر کے کہیں آپ کی جان نہ جاتی رہے۔

تفسیر: یعنی مشرکین کو اتنا سمجھانے اور منانے کے بعد بھی یہ آپ ﷺ کو جھٹلاتے رہیں تو اس پر غم وافسوس نہ کیجیے، آخرت میں بہت جلد فیصلہ ہو جائے گا۔ آپ ﷺ اپنی جان کو دکھ میں نہ ڈالیں۔

سُلوك: آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک میں انسانوں کی ہدایت وخیر خواہی کا کس قدر درد تھا اور ان کی خیر خواہی میں کس قدر بے قرار ہو جایا کرتے تھے کہ جان نکلنا باقی رہ جائے۔

فَصَلَوَاتُ رَبِّيْ وَسَلَامُه عَلَيْهِ

3 ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [سورة الفاطر: 28]

ترجمة: اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

تفسیر: علماء سے اصطلاحی علماء مراد نہیں ہیں کہ فلاں فلاں کتابیں پڑھ چکے ہوں یا فلاں فلاں سند رکھتے ہوں بلکہ وہ اشخاص مراد ہیں جو اللہ اور اس کی مرضیات کا علم رکھتے ہیں اور ان کا عمل بھی اسی علم کے مطابق ہوتا ہے۔ (روح المعانی)

شاہ عبد القادر صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سب آدمی ڈرنے والے نہیں ہوتے، اللہ سے ڈرنا علم والوں

کی صفت ہے۔

سُلوك: فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ آیت سے علم اور اہل علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی خشیت اور تقویٰ علم کی راہ سے حاصل ہوتا ہے۔ (جصاص)

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عظمت الٰہی کا علم اگر اعتقادی ہو تو اس سے اعتقادی خشیت پیدا ہوتی ہے اور اگر حالی ہو تو اس سے خشیت حالی (عملی) پیدا ہوتی ہے۔

(لہٰذا کامل خشیت الٰہی اس وقت حاصل ہوگی جب کہ عظمت الٰہی کا علم اعتقادی اور حالی دونوں طریقوں سے ہو، ایسی کیفیت صرف علماء راسخین ہی کو نصیب ہوتی ہے۔)

④ ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ [سورة الفاطر: 32]

ترجمة: پھر ہم نے یہ کتاب (قرآن حکیم) ان لوگوں کے ہاتھ پہنچائی جن کو ہم نے اپنے بندوں میں چن لیا ہے۔

تفسیر: نبی کریم ﷺ کے واسطہ سے قرآن حکیم کی امانت امت محمدیہ کے ہاتھوں میں آئی اور آیت سے یہ معلوم ہوا کہ یہی امت دنیا کی ساری ملتوں میں اللہ کی پسند کردہ ملت ہے۔ (ابن کثیر)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امت محمدیہ میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اعمال میں کوتاہی کرنے والے ہیں، اس کے باوجود اللہ کا ساری امت محمدیہ کو اِصْطَفَيْنَا (ہم نے چُن لیا) کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ مطلق اِصْطِفَاء ہر مومن کو حاصل ہے، اسی کو ولایت عامہ کہا جاتا ہے۔

(لہٰذا ہر مسلمان اپنے اپنے درجے میں ولی اللہ قرار پاتا ہے) ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [سورة البقرة: 257]

⑤ ﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۝﴾ [سورة الفاطر: 32]

ترجمة: پھر ان میں بعض تو اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض متوسط ہیں اور بعض اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کرتے ہیں۔ یہ بہت ہی بڑا فضل ہے۔

تفسیر: اللہ نے اپنی کتاب قرآن حکیم کی امانت جس امت کو دی ہے (یعنی مسلمانوں کو) ان میں عموماً تین طبقات ہیں:

پہلا ① وہ طبقہ جو باوجود امانت کی ذمہ داری قبول کرنے کے گناہ کر کے اپنی جان پر ظلم کر لیتا ہے۔

دوسرا ② وہ جو درمیانی حالت میں رہتا ہے، کبھی گناہ کر لیتا ہے اور کبھی نیکیاں بھی۔ گویا اس کا خیر و شر مساوی مساوی ہے۔

تیسرا ③ وہ طبقہ جو گناہوں سے بچتا بھی ہے اور طاعات و عبادات میں فرائض و واجبات کے علاوہ بہت کچھ

نیکیاں کرتے رہتا ہے۔

ان تینوں طبقات کو قرآن حکیم نے ظَالِمٌ، مُقْتَصِدٌ، سَابِقٌ کہا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے ان تینوں طبقات کی اس طرح تشریح کی ہے۔(تفسیر کبیر)

پہلا① وہ طبقہ جس کا ظاہر خراب ہے اور باطن ٹھیک، یہ ظَالِمٌ لِنَفْسِہ ہیں۔

دوسرا② وہ طبقہ جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو یعنی جس کے خیر و شر مساوی مساوی ہوں، یہ مُقْتَصِدٌ ہیں۔

تیسرا③ وہ طبقہ جس کے حسنات و خیرات زائد ہوں اور اس کا باطن ظاہر سے اچھا ہو۔ یہ سَابِقٌ بِالْخَیْرَات ہیں۔

اُمت محمدیہ کے یہ تینوں طبقات جو حاملِ قرآن ہیں، اہل جنت ہوں گے، اپنی اپنی حیثیت کے مطابق جنت کے درجات پائیں گے۔ جو دنیا میں سابق بالخیرات تھے، وہ آخرت میں بھی سابق ہوں گے اور جو مُقْتَصِدٌ تھے، نجات یافتہ ہوں گے اور جو ظَالِمٌ لِنَفْسِہ تھے، وہ مغفور و مرحوم ہوں گے۔ (قرطبی، ابن کثیر، روح المعانی)

سُلوک: ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا: اماں جان! آیت کے ان طبقات سے کون لوگ مراد ہیں؟

فرمایا: بیٹا! یہ تینوں طبقات اہل جنت ہی کے ہیں۔

ان میں سَابِقٌ بالخیرات وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں گزر گئے۔

اور مُقْتَصِدٌ وہ اصحاب ہیں جو آپ کے بعد بھی آپ کی پیروی آخر دم تک کرتے رہے ہیں۔

اور ظَالِمٌ لِنَفْسِہ کا مصداق میں اور تم جیسے لوگ ہیں۔ (محدث طیالسی رحمہ اللہ)

⑯ ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۝ اِسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ﴾ [سورة الفاطر: 43]

ترجمة: پھر جب ان کے پاس وہ ڈرانے والا آ ہی گیا تو بس ان کی نفرت ہی کو ترقی ہوگئی۔ زمین میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے۔

تَفسِیر: آیت میں مشرکین عرب کا حال بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ یہود و نصاریٰ کو طعنہ دیا کرتے تھے کہ تمہاری قوم میں سینکڑوں نبی آئے ہیں (حقیقت بھی یہی ہے کہ سارے انبیاء بنی اسرئیل تھے) لیکن تم نے ان کی قدر نہ کی۔ اگر ہماری قوم میں کوئی ایک نبی بھی آتا تو ہم اس کی پوری پوری قدر کرتے۔

مذکورہ آیت میں اسی بات کا تذکرہ ہے، لیکن جب مکۃ المکرمۃ میں انہی کی قوم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو سب سے پہلے انہی لوگوں نے مخالفت کی اور ان کی عداوت بڑھتی ہی چلی گئی۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے صوفیاء کے اس قول کی تائید ہوتی ہے جو وہ یہ کہا کرتے ہیں کہ جس کی استعداد فاسد و خراب ہوتی ہے، اس کا مرض، وظائف و اشغال و اذکار سے اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے کو بزرگوں میں شمار کرنے لگتا ہے۔ (آیت نے اس کا مرض تکبر قرار دیا ہے)

سُوْرَةُ يٰسٓ

پارہ: 22

⑪ ﴿اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْمٍ ۝﴾ [سورة يٰسين: 11]

ترجمة: آپ تو بس اسی کو ڈرا سکتے ہیں جو نصیحت کی پیروی کرے اور اللہ رحمٰن سے بے دیکھے خوف کرے۔ آپ اس کو مغفرت اور عمدہ اجر کی خوشخبری سنا دیجئے۔

تَفسِیر: دعوت و تبلیغ کا نفع انہی لوگوں کو ملتا ہے جو اچھی بات سننے اور اللہ سے خوف رکھنے والے ہیں۔ جس کو اللہ کا خوف نہیں، وہ نصیحت کی پروا کرتا ہے اور نہ نصیحت کرنے والوں کی پروا، ہدایت و نصیحت انہی افراد کو ملتی ہے جو حق کے طالب ہوں اور آخرت کا خوف رکھتے ہوں۔

سُلوك: حکیم الامت ؒ نے فرمایا کہ تعلیم و تربیت پر جو نفع مرتب ہوتا ہے، وہ طالب (سالک) کی استعداد کا ظہور ہے (یعنی اس کی قلبی صلاحیت کی علامت ہے)۔

حکیم الامت ؒ اس نکتہ پر متنبہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس نفع میں شیخ و مربی کی عطاو بخشش کا دخل نہیں ہوتا۔

⑫ ﴿اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ۝﴾ [سورة يٰسين: 14]

ترجمة: جب ہم نے ان کے پاس دو ② نبی بھیجے تو انہوں نے دونوں کو جھٹلا دیا پھر ہم نے تیسرے نبی سے ان دو ② کی تائید کی، ان سب نے مل کر کہا کہ ہم تمہارے پاس اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔

تَفسِیر: جس قوم کی طرف ان تینوں نبیوں کو روانہ کیا گیا تھا، وہ شہر انطاکیہ (ملک شام) تھا جو اس زمانے میں بت پرستی کا مرکز شمار کیا جاتا تھا۔ یہ زمانہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے دور سے کچھ پہلے کا ہے، اللہ نے اہل شہر کی اصلاح و تربیت کے لیے پہلے دو نبی روانہ کیے پھر ان کی تائید کے لیے مزید ایک نبی روانہ کیا۔ تینوں نے قوم سے کہا: ہم اللہ کے رسول ہیں، تمہاری اصلاح و تربیت کے لیے روانہ کیے گئے ہیں، ہماری بات مانو تاکہ تم نجات پاؤ۔ لیکن شہر والوں نے تینوں کو جھٹلا دیا اور انہیں سنگسار کر دینے کی دھمکی دی۔

سُلوك: حکیم الامت ؒ نے اس واقعہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ اس میں مشائخ کے اس عمل کی تائید ہے جو اپنے نائبین اور خلفاء کو دعوت و ارشاد کے لیے مختلف شہروں میں روانہ کرتے ہیں۔

⑬ ﴿قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ [سورة يٰسين: 15]

ترجمة: انہوں نے کہا: تم تو بس ہماری طرح معمولی آدمی ہو۔

تفسیر: شہر انطاکیہ کے باشندوں کا تذکرہ ہے کہ جب ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے تین نبی پہنچے تو انہوں نے یہ کہہ کر انہیں جھٹلا دیا کہ تم ہماری طرح ایک بشر، معمولی آدمی ہو، کیا اللہ کو کوئی اور معزز ہستی نہ ملی جس کے ذریعہ اپنا پیام پہنچاتا؟ جاہلی دماغ ہمیشہ ایسا ہی سوچا کرتا ہے کہ بڑا عہدہ بڑے دولت مند کو ملنا چاہیے، غریب غرباء تو صرف اطاعت و فرمانبرداری کے لیے ہوا کرتے ہیں۔ قدیم جاہلی قوموں کو نبیوں کی دعوت قبول کرنے میں سب سے بڑی ٹھوکر یہی لگی تھی کہ نبی و رسول بشر نہیں ہوسکتا، اس کو مظہر خدا یا اوتار یا دیوتاؤں کی اولاد ہونا چاہیے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ منتہی (کامل شخص) ظاہری احوال میں مبتدی (غیر کامل) کی طرح ہوتا ہے (لہٰذا اولیاء اللہ کو عوامی صورت میں شکل میں دیکھ کر ان کی بے قدری نہ کرنی چاہیے۔ یہ بڑی محرومی ہے)۔

ملحوظہ: انسان کامل اور غیر کامل کی شناخت کے لیے مذکورہ مثال دونوں کا فرق واضح کرتی ہے:

دو (2) شخص جو دریا کے دونوں کنارے پر کھڑے ہیں، یکساں حالت میں نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں دریا پار کرنے کے لیے منتظر ہیں حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ پہلا شخص تو یقیناً ایسا ہی ہے، اس نے ابھی تک دریا پار نہیں کیا لیکن دوسری جانب کھڑا شخص دریا پار کر چکا ہے اور اپنا مقصد پالیا ہے۔

یہی حال انبیاء کرام کا ہوا کرتا ہے۔ وہ حق و صداقت پر فائز ہو چکے ہیں لیکن ظاہری شکل و صورت میں عام انسانوں کی طرح ہیں۔ قدیم جاہلی قوموں نے غور و فکر سے کام نہیں لیا ورنہ انبیاء کرام کی ظاہری شکل و صورت دیکھ کر دھوکہ نہ کھاتے۔ ایسا ہی کچھ حال اولیاء اللہ کا ہوا کرتا ہے۔ ختم نبوت کے بعد ایسے کاملین کے ساتھ بعض لوگوں نے وہی معاملہ کیا ہے۔ ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ﴾

(4) ﴿قَالُوۡۤا اِنَّا تَطَیَّرۡنَا بِکُمۡ ۚ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَہُوۡا لَنَرۡجُمَنَّکُمۡ﴾ [سورة يٰسين: 18]

ترجمة: وہ لوگ بولے: ہم تو تمہیں منحوس سمجھتے ہیں۔ اگر تم اپنی تبلیغ سے باز آؤ تو سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔

تفسیر: سنگساری دنیا کی قدیم سلطنتوں اور تہذیبوں میں بکثرت رائج رہی ہے۔ قوم کے سرداروں نے اپنے ان خیر خواہوں کو ان کی نصیحت و خیر خواہی سے باز نہ آنے پر سنگساری کی دھمکی دے دی اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ جب سے تم نے اپنی دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا ہے، ہمارے ملک میں قحط سالی کا دور دورہ پڑ چکا ہے اور ہماری قوم میں پھوٹ پڑ چکی ہے، یہ سب تمہاری نحوست کی وجہ سے ہوا ہے۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جب قوم نے رسولوں کی تکذیب کی اور انہیں دھمکایا تو ملک پر

قحط اور مرض جذام مسلط ہوا اور یہ مرض عام طور پر پھیل گیا۔

پھر لکھتے ہیں کہ مقبولین (اہل اللہ) کے انکار کے وقت اللہ تعالیٰ کی یہی سنت رہی ہے کہ کوئی نہ کوئی مصیبت آ ہی جاتی ہے۔

⑮ ﴿قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ﴾ [سورة يٰسين: 19]

ترجمة: ان نبیوں نے کہا: تمہاری نحوست تو تمہارے ساتھ ہی چپکی ہوئی ہے۔ کیا نحوست یہ ہے کہ تمہیں نصیحت کی گئی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ تم ہی لوگ حد سے نکل جانے والے ہو۔

تفسیر: قوم کا یہ اعتراض کہ تمہاری نحوست سے قحط سالی اور امراض آئے ہیں ورنہ ہم خود خوشحال اور صحت مند تھے۔ نبیوں نے جواب دیا کہ تمہاری تکذیب و کفر سے یہ عذاب آیا ہے۔ نحوست کے اسباب خود تمہارے اندر موجود ہیں، نصیحت سے تو خیر و برکات پیدا ہوتے ہیں، تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟

سلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ نبیوں کے جواب سے معلوم ہوتا کہ قوم کی استعداد فاسد و ناقص تھی تب ہی تو حق بات سمجھ نہ سکے۔ (روح المعانی)

⑯ ﴿وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ [سورة يٰسين: 22]

ترجمة: اور میرے ہاں کونسا عذر ہے کہ میں اس ذات کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور تم سب کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔

تفسیر: شہر انطاکیہ کے باشندوں نے جب ان خیر خواہ نبیوں کو سنگسار کر دینے کا فیصلہ کر لیا تو یہ بات عام ہو گئی۔ شہر کے آخری کنارے ایک شخص حبیب نجار رحمۃ اللہ علیہ نامی مخفی طور پر مسلمان ہو چکا تھا، کفر و شرک کے شہر سے نکل کر عبادت الٰہی میں مشغول تھا۔ جب اس نے قوم کی یہ دھمکی سنی تو دوڑتا ہوا شہر آیا اور قوم کو فہمائش کی کہ ان بے غرض خیر خواہوں کو کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟ یہ لوگ تو تم سے کوئی معاوضہ بھی طلب نہیں کر رہے ہیں تو پھر ایسے مخلص و بے لوث بزرگوں کی بات کیوں نہیں سنتے؟ اس شخص نے یہ نصیحت خود اپنے اوپر رکھ کر دوسروں کو سنانا شروع کیا کہ میں اس ذات کی عبادت کیوں نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور روزی بھی دی ہے پھر اسی کی طرف مجھ کو لوٹ کر جانا بھی ہے۔ یہ اعلان شہر میں گھوم پھر کرنا شروع کیا لیکن قوم نے ان نبیوں سے پہلے اسی مردِ مجاہد کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ قرآن حکیم یہ بات نقل کرتا ہے کہ اس کو موت کے ساتھ ہی جنت کا پروانہ دے دیا گیا اور فرشتوں کو حکم ملا کہ اس کو ابھی جنت میں داخل کر دو۔

سلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ دعوت و تبلیغ میں اپنے اوپر بات رکھ کر کلام کرنا "تلطّف" (لطیف حیلہ) کہلاتا ہے اور یہی طرز مخلص مصلحین کا ہوا کرتا ہے۔

قرآن حکیم نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس مردِ مجاہد نے جنت میں پہنچ کر بھی اپنی خیر خواہی کو باقی رکھا اور وہاں بھی حسرت کے لہجہ میں کہنے لگا: اے کاش! میری قوم کو اس عالم جنت کے اعزاز و تکریم اور غیر فانی نعمتوں کی حقیقت معلوم ہوجاتی تو وہ سب ایمان لے آتے۔

سچوں کی خیر خواہی عارضی اور فانی نہیں ہوتی، قرآن حکیم نے اس کی خیر خواہی کو نقل کر دیا۔

﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝﴾

[سورۃ یٰسین: 60]

ترجمۃ: اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم کو تاکید نہ کردی تھی کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ تم صرف میری ہی عبادت کرنا۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔

تفسیر: قیامت کے دن جب سب انسانوں کے فیصلے ہوجائیں گے تو اہل جہنم سے خطاب ہوگا: اے انسانو! کیا میں نے تم کو نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ تاکید نہ کی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا؟ لیکن تم نے اس کو نہ مانا اور شیطانی راستوں پر چلتے رہے۔ اب رونے چلانے سے کیا فائدہ؟ ہدایت کا وقت تو گزر گیا۔

آیت میں شیطان کی عبادت نہ کرنے کا عہد یاد دلایا جارہا ہے۔ گمراہ قوموں نے شیطان کی اطاعت کی ہے لیکن اس عنوان کو لفظ عبادت سے ادا کیا گیا کیونکہ شیطان کی اطاعت، عبادت کی طرح سخت تر ہے۔

(روح المعانی، معالم التنزیل)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت کی اس تفسیر سے صوفیاء کے اس قول کی تاویل کی ہے جس میں ان لوگوں نے اپنے آپ کو یا کسی اور کو بُت پرست کہا ہے۔ صوفیاء کے ہاں بت سے نفس اور خواہشات نفس مراد ہوتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص نفس پرست یا نفس کا بندہ ہے۔

یہ مطلب نہیں کہ وہ واقع میں بت پرست ہے۔ یہ تو صریح کفر و شرک والی بات ہے۔

﴿فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝﴾ [سورۃ یٰسین: 76]

ترجمۃ: ان کی باتیں آپ کو غم زدہ نہ کریں۔ ہم ان کی چھپی و ظاہری باتیں سب جانتے ہیں۔

تفسیر: نبی کریم ﷺ کو کافر لوگ شاعر، ساحر، کاہن، مجنون وغیرہ کہا کرتے تھے جس سے آپ ﷺ کو طبعی طور پر دکھ و رنج ہوا کرتا تھا۔ آپ ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپ غم زدہ نہ ہوں، یہ بے نصیب لوگ اللہ کی جناب میں اس سے بھی زیادہ بے ہودہ باتیں کہا کرتے ہیں تو اگر آپ کو شاعر، ساحر کہہ دیں تو کیا تعجب ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کام کرنے والوں کو مخالفین کی باتوں کی پرواہ نہ کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ خود اس کا مناسب انتقام لے لیتے ہیں۔ (خواہ مخواہ اپنے کام میں سُست نہ ہونا چاہیے)

سُوْرَةُ الصَّافَّات

پارہ: 23

① ﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۞ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ۞﴾

[سورة الصافات: 60 تا 61]

ترجمة: بے شک بہت بڑی کامیابی یہی ہے۔ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔

تفسیر: اوپر کی آیات میں جنت کی نعمتیں، حور و قصور، عیش و عشرت، چین و سکون کا تذکرہ آیا ہے۔انہی نعمتوں کو حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اس کو فوز عظیم (عظیم ترین کامیابی) قرار دیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت کے مضمون سے ان جھوٹے مدعیان تصوف کی مذمت کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں جنت کی کیا پروا، حور و قصور سے کیا مطلب (ہم کو تو لقاء رب چاہیے وبس).

البتہ جن مغلوب الحال بزرگوں سے اس قسم کی باتیں منقول ہیں، وہ معذور ہیں۔ جنت اور جنت کی نعمتیں مطلوب ہیں جن کی ترغیب دی گئی ہے۔

② ﴿وَ نَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۞﴾ [سورة الصافات: 76]

ترجمة: اور ہم نے ان کو اور ان کے گھر والوں کو بڑے بھاری غم سے نجات دی۔

تفسیر: سیدنا نوح علیہ السلام کا تذکرہ ہے جنہوں نے اپنی قوم کو نو سو پچاس (۹۵۰) سال تک تبلیغ کی لیکن قوم نے اس ساری مدت تک انہیں خوب ستایا بجز چند افراد کوئی ایمان نہ لائے۔آخر اللہ نے پانی کے عالمگیر طوفان سے قوم کو غرق کر دیا۔سیدنا نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو جن کی تعداد اسی (۸۰) بیان کی جاتی ہے، نجات دی پھر انہوں نے اس غم سے فلاح پائی جو صدیوں تک برداشت کر رہے تھے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ طبعی غم و حزن کمال کے خلاف نہیں کیونکہ طبعی تقاضے کاملین میں بھی رہتے ہیں۔غم و حزن طبعی تقاضوں میں شامل ہیں، البتہ اس کے خلاف جو ثابت ہے، وہ غلبۂ حال ہے جس میں انسان معذور سمجھا جاتا ہے۔

③ ﴿وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۞ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا﴾ [سورة الصافات: 104 تا 105]

ترجمة: اور ہم نے آواز دی: اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔

تفسیر: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ذبح عظیم کا واقعہ ہے۔خواب میں اللہ نے حکم دیا کہ اپنے صاحبزادے اسمٰعیل کو اپنے ہاتھوں ذبح کریں۔دوسرے دن تعمیل میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو کروٹ پر لٹا کر گلے

پر چھری پھیر دی، خدائی انتظامات کے لیے اسباب کی ضرورت نہیں، اس لمحہ صاحبزادے اسمٰعیل کو ہٹا دیا گیا اور ایک دنبہ ذبح ہو گیا۔ (تفصیل کے لیے ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۱ صفحہ ۲۳۴ دیکھئے)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے عمل ذبح پر ندا آئی: اے ابراہیم علیہ السلام! تم نے خواب سچ کر دکھایا، یہ تمہارا بہت بڑا امتحان تھا، ہم نے اس عمل کو ذبح عظیم قرار دیا ہے اور قیامت تک اس کی یادگار قائم کر دی ہے۔ تم کو ہمارا سلام ہو، ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک آپ ہمارے مومن بندوں میں ہیں۔ ہم تم کو ایک اور صاحبزادے اسحٰق کی بشارت دیتے ہیں جو بلند نبیوں میں ہوں گے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صاحبزادے کو ذبح کرنے کا حکم بیداری میں بھی دیا جا سکتا تھا لیکن خواب میں حکم دیئے جانے کی غالباً یہ حکمت ہوگی کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت خوب سے خوب تر ظاہر ہو۔ چنانچہ آپ نے خواب کو خیال یا وسوسہ نہ سمجھا، اتنے بڑے کام پر آمادہ ہو گئے۔

ملحوظه: یہ واقعہ ہے کہ نبیوں کے خواب حقیقت ہوا کرتے ہیں، ان کی بیداری اور خوابی حالت احکام میں یکساں ہوا کرتی ہے۔ اللہ کی طرف سے ان پر جو بھی حکم نازل ہوتا ہے، وہ واجب العمل ہوا کرتا ہے۔ وہ حکم خواہ بیداری میں نازل ہو یا خواب میں، بہرصورت حقیقت ہی ہوا کرتی ہے۔

یہ مسئلہ خصوصیات نبوت سے متعلق ہے۔ (خواب کی حقیقت اور اس کی شرعی حیثیت کے لیے ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۱ صفحہ ۳۵۵ دیکھئے جو اس موضوع کی قرآنی تشریح ہے۔)

﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ ۝ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ۝﴾ [سورة الصافات: 88 تا 89]

ترجمة: پھر ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کو ایک نگاہ بھر دیکھا اور کہہ دیا: میں بیمار ہونے والا ہوں۔

تفسير: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو کئی ایک آزمائشوں سے سابقہ پڑا ہے اور ہر امتحان میں کامیابی سے ہمکنار رہے ہیں۔ انہی میں یہ واقعہ بھی ہے۔ قوم کے ایک سالانہ میلے کا وقت آ گیا جو شرک کی قسم کا تھا اور بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس قومی میلے میں شرکت کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے اصرار کیا گیا کہ بہرحال تم کو شرکت کرنی ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے انجانی حالت میں ستاروں کی طرف نظر کی پھر معاً فرمایا: میں بیمار ہونے والا ہوں ''إِنِّي سَقِيمٌ'' قوم جو ستارہ پرست تھی، یہ سمجھی کہ ابراہیم کے بارے میں ستاروں کا فیصلہ نافذ ہو چکا ہے، سرداروں نے معذور سمجھا اور انہیں چھوڑ کر میلے میں چلے گئے۔

اس طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام ایک شرکی عمل سے محفوظ ہو گئے۔

قوم کے باہر نکل جانے کے بعد مرکزی بت خانے میں داخل ہوئے اور بتوں کا وہ حشر کیا جو بت شکنی کی تاریخ کا نادر الوجود واقعہ ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے ثابت کیا ہے کہ دفع شر کے لیے حیلہ کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ دنیوی شر ہو یا دینی۔

ملحوظہ: حیلہ جس کو عربی اصطلاح میں توریہ کہا جاتا ہے، ایسے کلام کو کہا جاتا ہے جس میں دو ② مفہوم پائے جاتے ہوں۔ کہنے والا وہ مفہوم مراد لیتا ہے جو سننے والا عموماً نہیں لیتا۔

مثلاً کوئی اپنی بیوی کو دشمن کے کسی شر سے بچانے کے لیے کہہ دے کہ یہ میری بہن ہے تو ایسا کہنا درست ہے کیونکہ بہن جیسے حقیقی ہوا کرتی ہے، دینی و اسلامی بہن بھی ہوتی ہے، لیکن سننے والا اس کو حقیقی بہن ہی خیال کرے گا۔

ایسے ذو معنی کلام کو توریہ کہا جاتا ہے۔ صحیح غرض کے لیے ایسا کلام کیا جاتا ہے، اس کو جھوٹ نہیں کہا جا سکتا۔

مذکورہ آیت میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اِنِّی سَقِیْمٌ فرمایا جس کے معنی بیمار ہوں اور بیمار ہونے والا ہوں، دونوں ہو سکتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دوسرے معنیٰ مراد لیے جب کہ قوم نے پہلا معنیٰ سمجھا۔

ایسے ہی جب بتوں کا یہ حشر دیکھ کر سرداروں نے پوچھا: اے ابراہیم! ہمارے بتوں کا یہ برا حال کس نے کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا تھا: ''فَعَلَه كَبِيْرُهُمْ'' (ان کے بڑے نے یہ حرکت کی)

بڑے سے مراد بڑا بت اور خود سیدنا ابراہیم علیہ السلام بھی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ نبی قوم میں سب سے بڑا ہوتا ہے۔

⑤ ﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝﴾ [سورة الصافات: 106]

ترجمۃ: حقیقت میں یہ بڑا امتحان تھا۔

تفسیر: یعنی خوابی حکم پر صاحبزادے کے حلق پر چھری پھیر دینا کوئی آسان کام نہ تھا، سخت دشوار امتحان تھا۔ بڑے بڑے عزم و حوصلہ والوں کی برداشت بھی پارہ پارہ ہو جاتی ہے لیکن سیدنا ابراہیم علیہ السلام بلا تردّد کر گزرے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے واقعہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ اللہ کی طرف سے کبھی خواص (اونچے درجے والوں) کا بھی امتحان لیا جاتا ہے۔ اس سے یہ شُبہ نہ کرنا چاہیے کہ اللہ کے یہاں ان کی منزلت گر گئی تھی یا یہ قُرب الٰہی سے دور ہو گئے تھے۔ (امتحان کی حکمت اللہ ہی کے علم میں ہوا کرتی ہے۔)

سُورَۃ صٓ

پَارَہ: 23

(41) ﴿ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا ۚ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِي﴾ [سورة ص: 8]

ترجمۃ: توکیا ہم سب میں صرف اسی شخص پر کلام الٰہی نازل کیا گیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ میری وحی ہی کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا عذاب اب تک انہوں نے نہیں دیکھا۔

تفسیر: قدیم قوموں کا یہ احمقانہ نظریہ کہ نبوت و رسالت اہل دولت و ثروت انسان کو ملنی چاہیے، اہل مکہ کے مشرکین نے بھی اس مفروضہ کے تحت رسول اللہ ﷺ کو دیکھا اور اعتراض کیا کہ ایک یتیم و نادار انسان کو نبوت کیونکر ملی جب کہ ہم میں بڑے دولت مند وعزت والے موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس جہالت کی یہ وجہ بیان کی کہ یہ لوگ درحقیقت محمد ﷺ کی شخصی تکذیب نہیں کر رہے ہیں بلکہ وحی الٰہی کے مسئلہ میں بھٹک رہے ہیں کہ وحی ہم جیسے دولت و ثروت اور قوم کے سرداروں پر اترنی چاہیے تھی۔ یہ ان کا زعم و پندار ہے جو انہیں کفر تک لے گیا۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ چونکہ اس نظریہ کا منشاء کبر و تکبر تھا تو آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کبر ایسی بری خصلت ہے کہ بعض اوقات کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ (جیسے کہ اہل مکہ کا کبر تھا)

(42) ﴿إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُودَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ ۖ قَالُوا لَا تَخَفْ﴾ [سورة ص: 22]

ترجمۃ: اچانک داوٗد علیہ السلام کے پاس دونوں آ گئے، داوٗد علیہ السلام ان سے گھبرا گئے، بولے: آپ گھبرائیے نہیں، ہم دونوں اہل مقدمہ ہیں۔ ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے سو آپ انصاف کر دیجئے اور بے انصافی نہ کیجئے اور ہمیں سیدھی راہ بتا دیجئے۔

تفسیر: سیدنا داوٗد علیہ السلام جس طرح الوالعزم نبی و رسول تھے، اپنے زمانے کے حاکم اور بادشاہ بھی تھے۔ رعایا میں دو شخص اپنا جھگڑا بے وقت ان کی خدمت میں لائے جب کہ وہ اپنے مکان میں آرام کر رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی اپنا مقدمہ پیش کر دیا اور عدل و انصاف کرنے کی تاکید میں یہ بے ادب عنوان اختیار کیا کہ ہمارے فیصلہ میں بے انصافی نہ کیجئے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے مذکورہ عنوان سے یہ اخذ کیا ہے کہ خلاف تہذیب کلمات کو سیدنا داوٗد علیہ السلام نے برداشت کیا اور فیصلہ دے دیا۔ اسی طرح مفتی اور شیخ کو سوال کرنے والوں کی بدتمیزی برداشت کرنی چاہیے۔

ملحوظہ: نبی کریم ﷺ نے ایک دیہاتی کی بے تمیزی پر کہ اے محمد! یہ مال تیرا ہے نہ تیرے باپ دادا کا، مجھ کو

اللہ کے مال سے عطا کر۔

آپ ﷺ نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کو فرمایا: بے شک یہ سب اللہ کا مال ہے۔ سامنے بکریوں کا ریوڑ تھا، فرمایا: جا یہ سب اپنے گھر ہانک لے جا، اس بدّو نے پہلے تو آپ ﷺ کی طرف شک وشبہ سے دیکھا پھر سارا ریوڑ ہانک لے گیا۔ اپنے قبیلے میں پہنچ کر اعلان کرنے لگا: لوگو! محمد ﷺ اتنا دیتے ہیں کہ خالی ہاتھ رہ جانے کا اندیشہ نہیں کرتے۔

③ ﴿اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۝﴾ [سورة ص: 31]

ترجمۃ: (وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے) جب شام کے وقت ان کے روبرو اصیل عمدہ گھوڑے پیش کیے گئے تو کہنے لگے کہ میں اس مال کی محبت میں اپنے رب کی یاد سے غافل ہو گیا یہاں تک کہ آفتاب پردے میں چھپ گیا (غروب ہو گیا)۔ ان گھوڑوں کو میرے پاس لاؤ پھر انہوں نے گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا (یعنی ذبح کر دیا)۔

تفسیر: سیدنا سلیمان علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ یہ عظیم نبی ورسول گزرے ہیں۔ ان کا عہد ۹۹۰ قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے۔ طبقۂ انبیاء میں نبوت ورسالت کے ساتھ حکومت وسلطنت بھی عظیم الشان پائی تھی۔ انسانوں کے علاوہ حیوانات، چرند پرند، جنات اور ہوا پانی پر بھی حکمرانی کرتے تھے۔

ایک دفعہ جہاد کے اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کے معائنہ میں ذکر اللہ کا اپنا معمول فوت ہو گیا اور وقت گزر گیا۔ اس غفلت پر بہت دکھ ہوا اور تلافی مافات کے طور پر گھوڑوں کو ذبح کر کے اس کا گوشت مستحقین میں تقسیم کر دیا۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے سیدنا سلیمان علیہ السلام کے اس واقعہ سے کئی ایک مسائل اخذ کیے ہیں۔

اوّل ①: راحت وآرام کے لیے عمدہ سامان استعمال کرنا جائز ہے خصوصاً جب کہ دینی مصلحت بھی ہو۔

دوم ②: مستحب عمل سے غفلت ہو جانا بڑوں سے بھی ممکن ہے۔

سوم ③: غفلت کی تلافی کے لیے غافل کر دینے والی چیز کو صدقہ وخیرات کر دینا درست ہے۔

چہارم ④: غیرت حق بھی عمدہ خصلت ہے۔

ملحوظہ: جو چیز اللہ سے غفلت کا ذریعہ بن جائے، اس کو اپنے پاس نہ رکھنے کو "غیرت حق" کہا جاتا ہے۔

بعض مشائخ صوفیاء نے جن میں مشہور صوفی شبلی رحمہ اللہ بھی شامل ہیں، جامہ دری، جامہ سوزی کی سند فعل سلیمانی سے نکالی ہے۔ محققین صوفیاء نے اس استدلال کو قبول نہیں کیا کیونکہ جامہ دری ہو یا جامہ سوزی اس میں اسراف و تبذیر پایا جاتا ہے جو نص قرآن سے حرام وممنوع ہے۔

④ ﴿هٰذَا عَطَاۤؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ [سورة ص: 39]

ترجمۃ: یہ ہماری بخشش ہے سو آپ کسی کو دیں یا نہ دیں، آپ پر کوئی دار و گیر نہیں ہے۔

تفسیر: سلیمان علیہ السلام پر اللہ کے فضل و انعامات کا تذکرہ ہے۔ دنیا جہاں میں جس قدر نعمتیں دی گئیں تھیں، شاید و باید ہی کسی کو ملی ہوں۔ انسانوں پر حکمرانی، جنات پر حکومت، حیوانات پر قدرت، ہوا پانی پر تسلط اور زمین و پانی کے زر و جواہرات وغیرہ بے دریغ صرف کرنا۔

سیدنا سلیمان علیہ السلام ان سارے ساز و سامان، مال و جاہ کے امین یا خازن نہیں، مالک بنائے گئے تھے اور اس میں انہیں ہر طرح کا تصرف کرنے کا اختیار دیا گیا تھا چاہے کسی کو دیں یا نہ دیں۔ پھر مزید یہ خوشخبری دی گئی تھی کہ اس خرچ وغیرہ پر انہیں حساب و کتاب نہ دینا ہوگا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا سلیمان علیہ السلام کی اس خود مختاری سے یہ اخذ کیا ہے کہ اللہ نے ان کے قلوب کو ادائے حقوق کی ذمہ داریوں میں مشغول نہ رکھنے کے لیے یہ کامل اختیار دے دیا تھا تا کہ وہ منصب نبوت کی تکمیل میں کامل طور پر مشغول ہوں۔

پھر حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کا ایک اور مسئلہ بھی اخذ کیا کہ سالک کا بڑا سرمایہ جمعیت قلب ہے (دل کا پرسکون ہونا)۔ صوفیاء کرام کو اس کا خاص اہتمام رہا کرتا ہے (کہ دل پراگندہ نہ ہونے پائے)۔

﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ۝ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ﴾

[سورة ص: 41 تا 42]

ترجمۃ: جب کہ ایوب علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھ کو رنج و آزار پہنچایا ہے۔ (اللہ نے حکم دیا) اپنا پیر زمین پر مارو۔ یہ ٹھنڈا پانی ہے نہانے اور پینے کا۔

تفسیر: آیت میں سیدنا ایوب علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔ آپ کا وطن مشرقی فلسطین تھا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی عمر شریف دو سو دس (۲۱۰) سال تھی۔ مال و دولت کی کثرت کے علاوہ آل و اولاد کی بھی کثرت تھی۔ پھر اللہ نے انہیں ایک بڑی آزمائش میں مبتلا کر دیا جیسا کہ بڑے بڑے نبیوں میں اللہ کی یہ سنت جاری رہی ہے۔ مال و دولت کے علاوہ جسمانی صحت و عافیت بھی چھین لی گئی۔ اولاد، نوکر چاکر، حشم و خدم، عزیز دوست، رشتہ دار سب علیحدہ ہو گئے۔ صرف ایک اکیلی بیوی ساتھ رہ گئی جو صبح و شام آپ کی خدمت کرتی تھی و بس۔

سیدنا ایوب علیہ السلام نے اس طویل مدت میں اللہ ہی سے اپنا رشتہ قائم رکھا۔ جزع فزع، شکایت و حکایت، دکھ درد کسی سے بھی ظاہر نہیں کیا، اللہ کی جناب میں اس طرح پکارا کرتے تھے:

''شیطان نے مجھ کو سخت آزار میں کر دیا ہے، آپ ارحم الراحمین ہیں۔''

اللہ نے ان کی پکار قبول کی اور حکم دیا کہ اپنا پیر زمین پر مارو، پیر مارنا ہی تھا کہ چشمۂ آب پھوٹ پڑا، ٹھنڈا اور شیریں پانی بہنے لگا۔ حکم دیا کہ اس پانی سے غسل کرو اور پھر نوش کرو۔

سیدنا ایوب علیہ السلام نے وحی الٰہی کی پیروی کی اور اسی لحہ شفایاب ہو گئے۔ پھر اللہ نے سابقہ تمام مال واسباب، آل اولاد، جاہ وجائیداد اور اس سے دو چند مزید عطا کی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے ندائے ایوبی سے یہ اخذ کیا ہے کہ شیطان کا تصرف کاملین پر بھی ہو سکتا ہے، لیکن اس کا یہ تصرف گناہ ومعصیت میں نہیں چلتا کہ خواہی نخواہی کسی سے گناہ کرادے بلکہ مادّی وجسمانی ضرر کی حد تک ممکن ہے۔ (جیسا کہ سیدنا ایوب علیہ السلام کے صرف جان ومال میں تصرف کیا تھا)

ملحوظه: تفسیر قرطبی کے مفسر نے لکھا ہے کہ بعض جاہل صوفیاء نے "اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ" (اپنے پیر کو زمین پر پٹکو) سے ذکر اللہ میں رقص کرنے (جھومنے کودنے کا جواز نکالا ہے) اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

﴿وَ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَ لَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝﴾ [سورة ص: 44]

ترجمة: اور تم اپنے ہاتھ میں سینکوں کا ایک مٹھا لو اور اس سے اپنی بیوی کو مار دو، اپنی قسم نہ توڑو۔ بے شک ہم نے ایوب کو بڑا صابر پایا۔ کتنا اچھا بندہ ہے۔ اللہ کی طرف بار بار رجوع ہونے والا۔

تفسیر: سیدنا ایوب علیہ السلام اپنی بیماری کے زمانے میں بیوی سے کسی بات پر سخت ناراض ہو گئے تھے اور قسم کھائی تھی کہ صحت کے بعد تجھ کو سو (۱۰۰) کوڑے ماروں گا۔ (بیمار کی قوت برداشت بھی بیمار ہوتی ہے)

جب تندرست ہو گئے کہ تو اللہ نے حکم دیا کہ اپنی قسم کو پورا کرو۔ چونکہ رفیق حیات مخلص خاتون تھیں، سزا کے نفاذ کا یہ طریقہ بتایا گیا کہ سو (۱۰۰) عدد سینکوں (کاڑیوں) کا ایک گٹھا لے کر بیوی کے جسم پر ایک ضرب لگا دی جائے، سو (۱۰۰) مار پوری ہو جائیں گی۔ اس حیلہ سے خاتون کی خیر خواہی کا حق بھی ادا کیا گیا اور قسم بھی پوری کر دی گئی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جس حیلہ سے شرعی حکم کا منشاء فوت ہوتا ہو، ایسا حیلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ جن لوگوں نے آیت کے اس حیلے سے دین میں حیلہ سازی کا جواز نکالا ہے، وہ درست نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جس حیلہ سے شرعی حکم فوت ہو جاتا ہو مثلاً روپیہ، سونا چاندی پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اب اگر کوئی شخص گیارہ ماہ تو اپنے پاس مال رکھے اور اس سے استفادہ کرتا رہے، بارہویں مہینے اپنا کل مال اپنی بیوی یا بیٹے کو دے دے پھر بارہواں مہینہ گزرنے کے بعد اپنا واپس لے لے۔ چونکہ اس کی ملکیت میں سال بھر مال نہیں رہا لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوئی۔ اس شاطرانہ حیلہ سے شرعی حکم زکوٰۃ سے بچ گیا۔

ایسا حیلہ حرام اور احکام الٰہی کا مذاق کرنا ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سارے حیلے تراش لیے گئے ہیں جو باتفاق علماء حرام و ناجائز ہیں۔

ملحوظہ: سیدنا ایوب علیہ السلام کا مذکورہ بالا حیلہ اس حرام حیلے سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں یہ کوئی شرعی حکم فوت ہو رہا ہے، نہ کسی کا حق ضائع کیا جا رہا ہے بلکہ قصوروار نیک خاتون کو معاف کیا جا رہا ہے جو شرعاً مطلوب و پسندیدہ عمل ہے۔

﴿وَ عِنۡدَهُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ اَتۡرَابٌ﴾ [سورة ص: 52]

ترجمة: اور ان کے پاس نیچی نگاہ والیاں ہم عمر خواتین ہوں گی۔

تفسیر: جنت کی نعمتوں کی تذکرہ ہے۔ ان نعمتوں میں بڑی بڑی آنکھ والیاں حسین و جمیل خواتین بھی ہیں جن سے اہل جنت کے نکاح کر دیئے جائیں گے۔ ان بے مثال حسن والیوں کی یہ خوبی بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھنے والیاں ہوگی۔ عورت کا نگاہ نیچی رکھنا حسن و جمال اور دلبری کی علامت ہوا کرتی ہے۔

جنت کی یہ حوریں حسن و جمال کے علاوہ ادائے دلبری و ناز بھی رکھتی ہوں گی کہ آدمی فریفتہ ہو جائے۔

بعض مفسرین نے "قٰصِراتُ الطَّرف" کا ترجمہ آنکھوں کو روکنے والیاں کیا ہے یعنی اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور پر اپنی نظر نہ ڈالنے والی ہوں گی۔ یہ خصلت بھی عورت کی وفاداری کی علامت ہے کہ وہ صرف اپنے شوہر ہی سے محبت کرنے والی ہوں گی۔

بعض دیگر مفسرین نے یہ بھی ترجمہ کیا ہے: "نگاہ کو نیچے کرنے والیاں" یعنی وہ خود اس قدر حسین و جمیل ہوں گی کہ اپنے شوہروں کی نگاہوں کو ہمیشہ نیچے رکھنے والی ہوں گی کہ ان کو کسی اور عورت پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جنت کی ترغیب کے عین موقع پر حسین عورتوں کا تذکرہ اس بات کی دلیل ہے کہ مباح عورتوں کی جانب رغبت کرنا نہ حُبّ الٰہی کے خلاف ہے، نہ کسی فضیلت کے خلاف۔ (جیسا کہ بعض خشک مزاج صوفیاء یا باطل مذاہب کے رہنماؤں کا خیال ہے۔)

ایک موقع پر راقم الحروف کو یہ خیال آیا کہ خواتین کا اپنی نگاہوں کو نیچی رکھنا اگرچہ مشرقی تہذیب میں حسن و جمال اور شرافت کی علامت سمجھا جاتا ہے جیسا کہ عام مفسرین نے لکھا ہے لیکن مغربی تہذیب میں یہ کوئی خوبی نہیں بلکہ نقص سمجھا جاتا ہے۔ تاہم حوران جنت مشرقی و مغربی ہر مسلمان کے لیے ہیں تو قٰصِرات الطرف کا ترجمہ "نگاہیں نیچی رکھنے والیاں" کرنا مغربی مسلمان کی تسکین کے لیے کافی نہ ہوگا اور نہ عنوان ان کی زندگی میں دلچسپی و رغبت کا کا باعث بنے گا۔

لہٰذا "قٰصِراتُ الطَّرْفِ" کا بامحاورہ ترجمہ "خمار آلود آنکھ والیاں" کر دیا جائے تو مشرقی و مغربی دونوں

ذوق کا اختلاف ختم ہوجائے گا۔خمار آلود آنکھیں جس طرح مشرقی تہذیب میں خوبصورت سمجھی جاتی ہیں، اسی طرح مغربی تہذیب میں بھی حسین شمار ہوتی ہیں۔علاوہ ازیں خمار آلود آنکھوں میں قٰصِرات کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔واللہ اعلم

﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝﴾

[سورة ص: 82 تا 83]

ترجمة: کہا: مجھ کو تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو بہکا دوں گا۔بجز ان میں سے ان بندوں کے جو تیرے منتخب شدہ ہیں۔

تفسير: ابلیس لعین کا یہ کلام اس وقت کا ہے جب سیدنا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے جرم میں جنت سے نکالا جا رہا تھا۔پہلے تو اس نے اللہ کے عین غضب کی حالت میں اپنے لیے قیامت تک درازئ عمر کی دعا مانگی جو اسی وقت دے دی گئی پھر معاً اپنی خبیث فطرت پر لوٹ آیا اور مذکورہ بالا کلام کر دیا کہ زمین پر تیرے سارے بندوں کو گمراہ کر دوں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے (یعنی ان سے دور رہوں گا کیونکہ یہ میرے جال میں نہیں آئیں گے)۔

سُلوك: امام رازی رحمہ اللہ نے آیت سے ایک نکتہ اخذ کیا ہے کہ اس گستاخانہ کلام میں ابلیس نے اپنی سچائی کو قائم رکھا یعنی اندھا دھند یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں تیرے سارے ہی بندوں کو گمراہ کر دوں گا بلکہ اللہ کے نیک و پارسا بندوں کو اپنی گمراہی سے علیحدہ کر دیا کہ یہ میرے قابو میں نہیں آئیں گے۔پھر رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جھوٹ ایسی گندی خصلت ہے جس سے ابلیس تک کو حیا آئی (اور وہ سچی بات کہہ گیا)۔(تفسیر کبیر)

سُوْرَةُ الزُّمَر

پَارَة: 23

(1) ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾

[سورة الزمر: 3]

ترجمة: اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا اوروں کو تجویز کرلیا ہے (اور کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ کا مقرب بنادیں گے۔ بے شک اللہ ان کے درمیان فیصلہ کردے گا جس بات میں یہ باہم اختلاف کررہے ہیں۔

تفسیر: شرک کرنے والے عام طور پر یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ان معبودوں اور بزرگوں کی پرستش کرکے ہم اپنے خدا کے نزدیک ہوجاتے ہیں پھروہ ہم پر مہربان ہوجائے تو ہمارے کام بن جاتے ہیں۔

آیت میں اس جہالت کا جواب ہے کہ ان خالی باتوں سے ان لوگوں کا توحید میں جھگڑا کرنا مقصود ہوتا ہے، حقیقی فیصلہ تو قیامت کے دن ہو ہی جائے گا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اللہ کی صفات میں غیروں کی شرکت مطلقاً مذموم ہے۔ اس بارے میں بالذات و بالغیر کی فلسفیانہ موشگافیاں باطل و مردود ہیں۔

ملحوظه: آیت کا مضمون مسلمانوں کے لیے بھی دعوت فکر ہے۔ پیروں، بزرگوں، اولیاء صالحین وغیرہم کو نادان مسلمانوں نے اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں عملاً دخیل بنالیا ہے اور ان سے آس وامیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ یہ شرک فی الصفات مسلمانوں میں شدت سے پھیل گیا ہے۔ جو دین توحید خالص کے لیے آیا تھا، اس کو نادان مسلمانوں نے وثنیت وقبر پرستی سے داغدار کردیا ہے۔

وَاِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى

(2) ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ﴾ [سورة الزمر: 3]

ترجمة: بے شک اللہ اس کو راہِ مستقیم پر نہیں لاتا جو جھوٹا ناشکرا ہو۔

تفسیر: یعنی جس نے یہ بات ٹھان لی کہ وہ کبھی سچی بات (توحید) نہ مانے گا تو پھر ایسوں کے لیے ہدایت کا راستہ بند ہوجاتا ہے یعنی جھوٹ، خیر کے دروازے بند کردیتا ہے۔

سُلوك: صوفیاء نے کہا ہے: اس میں اس شخص کے لیے دھمکی وتنبیہ ہے جو اپنے آپ کے لیے ولایت کے کسی مرتبہ کا دعویٰ کرتا ہے حالانکہ وہ ایسا نہیں ہے۔

﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ یَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ﴾ [سورة الزمر: 9]

ترجمة: بھلا جو شخص رات کے اوقات سجدہ وقیام کی حالت میں عبادت کررہا ہو، آخرت سے خوف زدہ ہو اور اپنے رب سے رحمت کی امید کررہا ہو۔ اب کیا علم والے اور بے علم برابر بھی ہوسکتے ہیں؟

تفسیر: جس شخص کے عقائد درست ہوں اور اعمال بھی ٹھیک ہوں، وہ توحید اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہو اور عمل کی یہ کیفیت ہو کہ رات جو عموماً خواب اور غفلت کا وقت ہوتا ہے، عبادت میں مشغول رہتا ہو، کیا ایسا شخص اور وہ شخص جو بے علم و بے عمل ہو، اللہ کے یہاں برابر ہوسکتے ہیں۔

سُلوك: صوفیاء عارفین نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے رجا (امید) کا پہلو خوف کے پہلو پر غالب رہنا چاہیے۔ (یعنی اللہ کی ذات عالی سے توقع وامید زیادہ رکھنی چاہیے۔) (تفسیر کبیر)

﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ [سورة الزمر: 22]

ترجمة: سو جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا سو وہ اپنے رب کے نور پر چل رہا ہے۔ (کیا ایسا شخص اور اہل قساوت برابر ہوسکتے ہیں؟)

تفسیر: یعنی دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت فرمائی تو ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ شرح صدر (سینے کا کھل جانا) کیونکر ہوتا ہے؟

ارشاد فرمایا: جب دل میں نور داخل ہو۔

عرض کیا گیا: اس کی کیا علامت ہے؟

فرمایا: دارُ الخلود (جنت) کی رغبت ہو اور دارُ الغرور (دنیا) سے بے اتفاقی اور موت کی طرف آمادگی ہو۔ (معالم التنزیل)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں نور اور شرح صدر کی وضاحت ملتی ہے۔ (جو صوفیاء کی اصطلاح میں کثرت سے رائج ہے)

اہل تحقیق علماء نے آیت کے مضمون سے دو ② نکتے پیدا کیے ہیں:

ایک ① یہ کہ ہر مومن کسی نہ کسی میں سہی بہر حال معرفت ونور رکھتا ہے۔

دوسرے ② یہ کہ جس اسلام سے معرفت ونور پیدا ہوتا ہے، وہ وہ ہے جو یقین کامل کے ساتھ ہو۔ (شک وشبہ کی راہ سے نہیں)

ملحوظه: آیت میں شرح صدر اور قساوت قلب کا ذکر آیا ہے۔ قساوت قلب کو شرح صدر کے مقابلہ میں بیان کیا

گیا ہے۔شرح صدر میں قلب وجگر اطمینان، سکون اور اعتماد وعلم ویقین کی کیفیت سے معمور رہا کرتے ہیں اور قساوت قلب اس کے برعکس کو کہا جاتا ہے جس میں بے یقینی، شک وشبہ، پراگندی و بے لطفی کی کیفیات ہوا کرتی ہیں۔

﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ﴾ [سورة الزمر: 23]

ترجمة: اللہ نے نہایت عمدہ کلام نازل کیا ہے جو ایسی کتاب ہے جو باہم ملتی جلتی ہوئی اور بار بار دہرائی گئی ہوئی جس سے ان لوگوں کے بدن کانپ اٹھتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

تفسیر: اللہ سے ڈرنے والے انسان کے دل اللہ کی آیات سن کر خوف اور اس کی عظمت سے کانپ اٹھتے ہیں اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں پھر ان کے قلوب اللہ کی یاد وفکر میں جھک بھی جاتے ہیں یعنی وہ کتاب اللہ پر عمل کرنے لگتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اہل تحقیق علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کے خوف سے مراد ایمان وعقلی خوف ہے، جسمانی وظاہری خوف مراد نہیں۔لہٰذا آیات اللہ کی تلاوت سے کسی کے جسم پر کوئی ظاہری اثر، کپکپی یا بے قراری پیدا نہ ہو تو یہ خوف الٰہی کے خلاف نہیں۔

ملحوظه: امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب احیاء علوم الدین میں لکھا ہے کہ بہت سے صوفیاء ایسے ہیں جن پر شاعروں کا کلام سن کر وجد طاری ہو جاتا ہے اور وہ جھومنے لگتے ہیں اور قرآن حکیم کی آیات پڑھنے سے یہ اثر ظاہر نہیں ہوتا۔پھر اس کی مختلف توجیہات کی ہیں جن میں مذکورہ بالا توجیہ بھی شامل ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے امام غزالی رحمہ اللہ کی طرف اشارہ کر کے لکھا ہے:

”لیکن میں کہتا ہوں: میں تو اس تاثر سے ہمیشہ دور رہا ہوں۔میں نے جب بھی قرآنی مطالب پر غور وتدبر سے کام لیا ہے، اسی وقت میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دل کے اندر ہیبت وخشیت الٰہی پیدا ہو گئی اور جب میں نے شاعروں کا کلام سنا تو دل اچاٹ ہو گیا اور طبیعت متاثر نہ ہوئی۔میں سمجھتا ہوں کہ یہی صراط مستقیم ہے۔“ (تفسیر کبیر)

﴿ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾ [سورة الزمر: 28]

ترجمة: قرآن ہے عربی زبان کا جس میں کجی نہیں تاکہ لوگ ڈرتے رہیں۔

تفسیر: قرآن ایک صاف ستھری عربی زبان کی کتاب ہے، اس کلام میں کوئی ٹیڑھی ترچھی بات نہیں، سیدھی اور صاف ستھری باتیں ہیں جن کو ہر عقل سلیم والا قبول کر لیتا ہے۔

سُلوك: قرآن حکیم کا پہلا وصف پڑھی جانے والی کتاب ''قرآناً'' بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ مسجدوں، محرابوں، منبروں، مدرسوں، گھروں میں اس کی تلاوت ہو رہی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی۔

یہ حقیقت صرف مسلمان ہی بیان نہیں کر رہے ہیں، غیر مسلم بلکہ مخالفوں کا بھی یہی بیان ہے۔

''قرآن دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔'' (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) تفسیر ماجدی

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ﴾

[سورة الزمر: 29]

ترجمة: اللہ ایک مثال بیان کرتا ہے کہ ایک غلام ہے جس میں کئی ضدی قسم کے شریک ہیں اور ایک غلام ایسا ہے جس میں کوئی شریک نہیں، پورا ایک ہی شخص اس کا مالک ہے۔ کیا دونوں کی حالت یکساں ہے؟

تفسیر: اللہ نے اس مثال میں مومن اور غیر مومنوں کی حالت کو واضح کیا ہے یعنی ایک غلام کے کئی ایک آدمی مالک ہیں جو سب کے سب ضدی و جھگڑالو قسم کے ہیں۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ غلام صرف اسی کے کام میں لگا رہے، دوسرے مالکوں سے سروکار نہ رکھے۔ اس کھینچ تان میں ظاہر ہے غلام ہر وقت پریشان و پراگندہ حال رہے گا۔ برخلاف اس غلام کے جس کا صرف ایک ہی شخص مالک ہے، ایسے غلام کو ہر طرح یکسوئی اور اطمینان حاصل رہے گا اور کسی دوسرے آقا کو خوش رکھنے کی کشمکش میں گرفتار نہ ہوگا۔ اب ظاہر ہے یہ دونوں غلام برابر نہیں، اسی طرح توحید پرست انسان اور شرک پسند انسان کے فرق کو سمجھ لیا جائے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ دنیا پرست انسان اور آخرت پسند انسان کی زندگی کی یہی حالت ہے۔ پہلا شخص دنیا کی کشاکشی میں مبتلا ہے تو دوسرا مطمئن اور پُرسکون ہے۔

﴿وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ﴾ [سورة الزمر: 45]

ترجمة: اور جب فقط اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل منقبض ہونے لگتے ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اسی وقت خوش ہو جاتے ہیں۔

تفسیر: شرک کی یہ خاصیت ہے کہ مشرک آدمی بعض اوقات زبان سے اللہ کی عظمت و محبت کا اعتراف تو کرتا ہے لیکن اس کا دل صرف اللہ کے ذکر اور اس کی حمد و ثنا سے خوش اور مطمئن نہیں ہوتا۔ اور جب اللہ کے سوا کسی اور معبود، دیوی، دیوتاؤں کا ذکر کیا جاتا ہے تو مارے خوشی کے اچھلنے لگتا ہے جس کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

سُلوك: آیت میں توحیدی ذہن اور شرکی ذہن کی واضح شناخت ملتی ہے۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْهُ

ملحوظه: آج بہت سے نام نہاد مسلمانوں کو دیکھا جاتا ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ واحد کی قدرت و حکمت اور

اس کی عظمت وصفات کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے چہروں پر افسردگی کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور وہ پریشان پریشان سے ہوجاتے ہیں اور انجان بن کر کھسک جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مگر کسی پیر فقیر، مجذوب، شہید، غوث وقطب اور ان کی کچی پکی کرامات اناپ شناپ بیان کردی جاتی ہیں تو چہرے کھل پڑتے ہیں اور دلوں میں جذبات ومسرت جوش مارنے لگتی ہیں، بلکہ بعض اوقات توحید خالص بیان کرنے والے کو منکر اولیاء سمجھا جاتا ہے۔

یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ کا وظیفہ پڑھنے والے، مصیبت میں یا غوث یا غوث پکارنے والے، اجمیر کے مقبرہ کا طواف کرنے والے، یا خواجہ دے خواجہ، لے کر رہوں گا، دینا پڑے گا کے نعرے لگانے والے اسلامی توحید کے پاکیزہ چہرے پر کیسے کیسے مکروہ داغ ہیں۔ الامان والحفیظ

آیت میں جس مکروہ وناپاک کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ﴿اللّٰهُمَّ ثَبِّتْنَا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾

⑨ ﴿فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا﴾ [سورة الزمر: 49]

ترجمة: اور جب آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہم کو پکارنے لگتا ہے لیکن جب ہم سے اپنی جانب سے کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو کہتا ہے: یہ مجھے اپنی تدبیر سے ملی ہے۔

تفسیر: شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آدمی جس نام سے چڑتا تھا، مصیبت کے وقت اسی کو پکارتا ہے۔

آیت میں جاہل انسان کی خصلت کا ذکر ہے۔ مصیبت میں تو اللہ کو پکارتا ہے اور جب اس کو راحت ونعمت ملتی ہے تو اس کو اپنی قابلیت اور عقل وتدبیر کی جانب منسوب کرتا ہے کہ یہ سب میری تدبیر ومحنت کا نتیجہ ہے۔

آیت سے اس مدعی تصوف کی شناخت ہوتی ہے جو طریق کے ثمرات وفضائل کو جو حقیقتاً اللہ کے انعامات ہیں، اپنے عمل ومجاہدے کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

⑩ ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ [سورة الزمر: 53]

ترجمة: اے نبی! آپ (میری طرف سے) کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم زیادتیاں کرلی ہیں! اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک اللہ سارے گناہ معاف کردے گا۔ بے شک وہ بڑا غفور، بڑا رحیم ہے۔

تفسیر: آیت ایک خاص واقعہ پر نازل ہوئی لیکن اس کا خطاب عام ہے، اس میں قیامت تک کے گنہگاروں کی تسلی کا سامان ہے۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کے وسعت کرم وشفقت کی کوئی انتہا ہے کہ جنہوں نے اللہ کے دوستوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کیے ہوں، انہیں کو دعوت توبہ دی جارہی ہے۔ (ابن کثیر)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم میں وسعتِ کرم کی کوئی آیت مذکورہ آیت سے زیادہ وسیع نہیں ہے۔

ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: قرآن حکیم کی یہ آیت انتہائی امید وآس والی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ایک اور آیت اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے: ﴿وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ﴾ آپ کا رب لوگوں کی ظلم وزیادتیوں کو معاف کرنے والا ہے۔ (قرطبی)

سُلوك: توبہ سے گناہ تو معاف ہو ہی جاتے ہیں، ایسے ہی توبہ سے کفر وشرک بھی معاف ہو جاتا ہے۔ (مرتب)

مسیحیت جس کو اپنے رحم وکرم اور کشادہ دلی ہونے پر ناز ہے، خود انجیل کی زبانی سنیے:

''میں تم سے کہتا ہوں کہ آدمیوں کا گناہ تو معاف کیا جائے گا مگر جو کفر روح القدس کے حق میں ہو، وہ معاف نہیں کیا جائے گا۔'' (متی ۱۲:۳۲) تفسیر ماجدی

سُورَۃُ غَافِر

پَارَہ: 24

(1) ﴿وَ جٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ۝﴾

[سورة المؤمن: 5]

ترجمة: اورانہوں نے ناحق جھگڑے کیے تاکہ اس ناحق سے حق کو دبالیں، سومیں نے ان کی گرفت کی، سومیری سزا کیسی ملی؟

تفسیر: ہر قوم نے چاہا کہ اپنے پیغمبر کو پکڑیں، قید کریں، قتل کریں یا جلاوطن کردیں۔ انبیاء کرام کی پچھلی ساری تاریخ یہی ثبوت پیش کرتی ہے کہ ان کو ہر طرح دبایا گیا کہ حتی کہ بعض مرتبہ ایک ایک دن میں ستر ستر نبیوں کو قتل کیا گیا۔ الامان والحفیظ

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے ثابت کیا ہے کہ جدال (جھگڑا) جو اسلام میں ممنوع ہے، وہ وہ جدال ہے جو ناحق و باطل قسم کا ہو، آیت میں اسی کا ذکر ہے۔

البتہ جو جدال حق کے لیے اور حق کی تائید وحمایت کے لیے ہو تو ایسا جدال مطلوب و پسندیدہ عمل ہے، اہل اللہ دونوں جدال کی رعایت کرتے ہیں۔ (اس لیے ان کا جدال ناحق نہیں ہوتا)

(2) ﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [سورة المؤمن: 7]

ترجمة: جو فرشتے عرش الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے اردگرد ہیں وہ اپنے رب کی تسبیح حمد کے ساتھ کرتے رہتے ہیں اور اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لیے استغفار کیا کرتے ہیں۔

تفسیر: عرش عظیم کو اٹھانے والے فرشتے اور اس کے اطراف طواف کرنے والے بے شمار فرشتے دن رات اللہ کی تسبیح و پاکی بیان کرتے ہوئے زمین کے اہل ایمان انسانوں کے لیے اللہ سے مغفرت کی اور رحمتوں کی دعا کر رہے ہیں۔ اہل ایمان کا یہ عظیم رتبہ ہے کہ حاملانِ عرش ان کے گناہوں کی معافی کی دعا حضور رب میں طلب کر رہے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جیسا کہ حاملانِ عرش غائبانہ طور پر اہل ایمان کے لیے دعا کر رہے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کو بھی دوسرے مسلمانوں کے لیے غائبانہ دعا کرنی چاہیے۔

(3) ﴿وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ﴾ [سورة المؤمن: 28]

ترجمۃ: ایک مردمومن جوفرعون کے خاندان سے تھا، اپنا ایمان چھپائے ہوئے کہنے لگا: کیاتم لوگ ایک ایسے شخص کوقتل کرنا چاہتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے؟

تفسیر: اس مردمومن کا نام سمعان بیان کیا جاتا ہے۔ یہ فرعون کا چچازاد بھائی تھا، سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاچکا تھالیکن فرعون اور آلِ فرعون کے خوف سے اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا۔

اس نے جب یہ سنا کہ فرعون سیدنا موسیٰ علیہ السلام کوقتل کرنا چاہتا ہے تو اس انتہائی نازک حالت میں اپنا ایمان ظاہر کردیااور پھر وہ کلام کیا جو آیت میں مذکور ہے۔

سلوک: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اہل باطل کے سامنے حق بات کا چھپانا ضرورۃً جائز ہے خصوصاً جب کہ دینی مصلحت بھی ہو۔

ملحوظہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: صدیقین چندایک ہیں (یعنی ان کی تعداد قلیل ہے)۔

ایک حبیب نجار (جن کا قصہ سورۂ یٰسین میں آیا ہے)، دوسرے ② رجل مؤمن (جس کا ذکر مذکورہ بالا آیت میں ہے)، تیسرے ③ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور یہ ان سب میں افضل ہیں۔ (قرطبی)

④ ﴿وَاِنْ یَّكُ كَاذِبًا فَعَلَیْهِ كَذِبُهٗ﴾ [سورة المؤمن: 28]

ترجمۃ: اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا۔

تفسیر: یہ جملہ بھی اسی رجل مومن کا ہے جو فرعون اور آلِ فرعون سے کہہ رہا تھا۔ مردمومن کا یہ کہنا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کا پہلے تو جرم ہی کیا ہے؟ ولو بالفرض وہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں تو اس کی سزا انہیں ضرور ملے گی لیکن اگر وہ سچے ہیں اور یقیناً سچے ہیں تو پھر تم اپنی خبرلو۔

سلوک: امام رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جب کبھی مجھ کو کسی شریر نے خواہ مخواہ نقصان پہنچانا چاہا تو میں نے اس کی طرف قطعاً توجہ نہ دی بلکہ معاملہ اللہ کے حوالہ کردیا تو اللہ نے میری تائید ونصرت کے لیے کچھ ایسے لوگ کھڑے کردیئے جو اس شرکو دفع کرنے کے لیے پوری طرح لگ گئے۔ (تفسیر کبیر)

⑤ ﴿وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ﴾ [سورة المؤمن: 55]

ترجمۃ: اور آپ اپنی تقصیر کی معافی طلب کیجئے۔

تفسیر: آیت میں لفظ ذنب آیا ہے۔ اہل لغت لکھتے ہیں کہ ذنب اور اثم میں فرق ہے۔ اثم تو اردو میں گناہ ہی کے معنی میں آتا ہے لیکن ذنب کوتاہی وتقصیر کو کہا جاتا ہے۔ (تفسیر کبیر)

شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس معنی کے لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ دن میں سو (۱۰۰) سو (۱۰۰) مرتبہ استغفار کیا کرتے تھے۔

ہر بندے کی تقصیر اس کے درجے کے موافق ہے اس لیے ہر شخص کو استغفار کرنا چاہیے۔ (موضح القرآن)

سُلوك: حکیم الامت ؒ اس تفسیر پر لکھتے ہیں کہ اس میں صوفیاء کے اس مشہور قول کی تائید ملتی ہے جو وہ کہا کرتے ہیں: حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ یعنی عام مسلمانوں کی نیکیاں خاصان خدا کی تقصیرات ہیں۔

⑥ ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا﴾ [سورة المؤمن: 61]

ترجمة: اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تا کہ تم اس میں سکون پاؤ اور دن کو روشن بنایا۔

تَفسِير: مشرک جاہلی قوموں نے جیسے سینکڑوں معبود بنا لیے تھے، ایسے ہی دن و رات کو بھی اپنے معبودوں کی فہرست میں شامل کر لیا ہے اور ان کی پوجا بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی بھارت (ہندوستان) کے ہندو چاند سورج کی پرستش کرتے ہیں۔

قرآن حکیم نے ان احمقوں کے اس عمل کی تردید کی ہے کہ دن رات دیگر مخلوق کی طرح یہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں جو انسانوں کی خدمت کے لیے بنائے گئے ہیں۔ گویا یہ چاند، سورج، ستارے انسانوں کے خادم ہیں، مخدوم اور آقا نہیں۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی ؒ نے لکھا ہے کہ رات کے وقت ہر شخص کا سکون مختلف ہوا کرتا ہے۔

عوام کا سکون تو نفس و جسم کی راحت میں ہے اور عبادت گزاروں کا سکون عبادت کی حلاوت و شیرینی ہوا کرتی ہے اور اہل محبت و مغفرت کا سکون قلب کا ذوق و شوق ہے۔ (روح المعانی)

⑦ ﴿وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [سورة المؤمن: 78]

ترجمة: اور کسی رسول سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کوئی معجزہ بغیر اذنِ الٰہی ظاہر کریں۔

تَفسِير: کفار قریش کا یہ مطالبہ کرنا کہ اگر آپ رسول ہیں تو فلاں فلاں معجزہ ظاہر کیجئے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ مطالبہ اپنے آباؤ اجداد کی روش پر تھا، ان لوگوں نے بھی اپنے زمانے کے رسولوں سے ایسا ہی مطالبہ کیا ہے۔

آیت میں جواب دیا گیا کہ معجزات کا پیش کرنا کسی بھی نبی کے اختیار میں نہ تھا۔ پھر اس نبی سے مطالبہ کرنا کیونکر درست ہے؟ البتہ تمہارا مطالبہ اس وقت درست تھا جب نبی معجزات پیش کرنے کا دعویٰ کرتے، نبیوں نے تو یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم خود اپنے نفس کے مالک نہیں تو پھر دوسری چیزوں پر کیا قدرت رکھ سکتے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت ؒ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جب انبیاء کرام معجزات و تصرفات پر قادر نہیں تو پھر اولیاء اللہ بدرجۂ اولیٰ قادر نہیں ہو سکتے۔

⑧ ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ﴾ [سورة المؤمن: 80]

ترجمة: اور تمہارے لیے ان جانوروں میں بہت سارے فوائد ہیں تاکہ تم سوار ہو کر اپنے مقاصد حاصل کر سکو۔

تفسير: حیوانات کو اللہ نے انسانوں کے نفع و راحت کے لیے پیدا کیا ہے لہٰذا تم ان سے سواری کا کام لو اور ان کو اپنی غذائی ضرورتوں میں لاؤ یا خرید و فروخت کر کے اپنی معاش مضبوط کرو وغیرہ۔ لیکن یہ کیا جہالت بلکہ حماقت ہے کہ انسانوں نے ان کو اپنا معبود بنالیا اور حیوان پرستی میں پڑ گئے۔ جو خادم تھا اس کو اپنا آقا و مولیٰ بنالیا، بھارت (ہندوستان) میں آج بھی گاؤ پرستی کی حماقت زور و شور سے جاری ہے اور اس کو مقدس ماں کا درجہ دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں بیل، بھینس، سانپ، بچھو اور دیگر حشرات الارض کی پوجا کرنے والے بکثرت موجود ہیں۔

آیت میں منافع کا لفظ آیا ہے یعنی جانوروں کی پیدائش میں انسانوں کے لیے کئی ایک فوائد ہیں۔ مثلاً تازہ گوشت کی تجارت، خشک گوشت کی تجارت، اون کی تجارت، کھالوں کی تجارت، بالوں کی تجارت، دانت، آنت و ہڈیوں کی تجارت، دودھ، دہی، پنیر، گھی، مکھن، کریم، بالائی کی تجارت وغیرہ۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے ان جاہل صوفیاء کا رد کیا ہے جو تجارت اور اسباب معیشت سے نفع اٹھانے کو طریق و سلوک کے خلاف سمجھتے تھے۔

⑨ ﴿فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ﴾ [سورة المؤمن: 83]

ترجمة: پھر جب ان کے پیغمبر ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ لوگ اپنے اس علم پر نازاں ہوئے جو انہیں حاصل تھا۔

تفسير: آیت میں تاریخی استدلال ہے کہ گزشتہ زمانے کی بڑی بڑی متمدن و پر شوکت قوموں کے انجام کو دیکھو۔ جب انہیں نبیوں نے توحید کی دعوت دی تو ان مہذب قوموں نے اپنے علم پر ناز کیا اور دعوت توحید کو ٹھکرا دیا جس کی پاداش میں انہیں تباہ کیا گیا اور نام و نشان بھی مٹا دیا گیا۔ یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ اس زمین پر کتنی قومیں آباد تھیں اور ان کا کیا کیا انجام ہوا۔ قرآن حکیم کا یہ احسان ہے کہ اس نے ایسی چند اقوام کی نشاندہی کی جو اپنے دور کی متمدن و پر شوکت قومیں تھیں، آیت میں اسی تاریخی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے ایسے علم پر فخر کرنے کی مذمت ہے جو شریعت کے مخالف ہو۔ اسی کے تحت باطل تصوف بھی آجاتا ہے (جو بے علموں میں رائج ہے)

❀❀❀

سُوْرَۃُ فُصِّلَتْ

پارہ: ㉔

㉑ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝﴾ [سورة حم السجدة: 8]

ترجمۃ: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے، ان کے لیے ایسا بدلہ ہے جو ختم ہونے والا نہیں۔

تَفسیر: غیر ممنون ایسے صلہ و بدلے کو کہا جاتا ہے جس کا سلسلہ ختم نہ ہو یعنی اہل ایمان کو جنت کی وہ نعمتیں ملیں گی جو فنا یا بوسیدہ ہونے والی نہیں ہیں، دائمی باقی اور تروتازہ۔ یہ اس لیے کہ ان کا عمل دائمی تھا اگرچہ موت نے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جو ان کے اختیار میں نہ تھی۔

سُلوك: مشائخ طریقت نے سالکین کو اس سہولت سے تسلی دی کہ جب کسی عذر سے وہ اپنا وظیفہ پورا نہ کر سکیں تو انہیں پورا اجر ملے گا۔

ملحوظہ: آیت ان بوڑھے اور مریضوں کے حق میں نازل ہوئی جو مرض یا کمزوری کی وجہ سے عبادات کی کثرت نہیں رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خوشخبری ہے کہ ان کو وہی ثواب دیا جائے گا جو صحت و قوت کی حالت میں عمل کرنے سے ملا کرتا تھا۔

㉒ ﴿قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ۝﴾ [سورة حم السجدة: 11]

ترجمۃ: دونوں نے کہا: ہم بخوشی حاضر ہیں۔

تَفسیر: یہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش کا واقعہ ہے۔ اللہ نے ساتوں زمین کو دو ② دن میں پیدا کیا اور دو ② دن میں پہاڑوں کو اور زمین میں انسانی غذاؤں کے ذخائر پیدا کیے اور دو ② دن میں ساتوں آسمان کی پیدائش کی۔ اس طرح چھ دن میں کائنات کی تعمیر عمل میں آئی۔ جب یہ تعمیر مکمل ہوگئی تو زمین و آسمان کی طرف وحی اور سوال کیا: کیا تم اپنی خدمات پر بخوشی راضی ہو جو تمہیں سپرد کی گئیں ہیں؟

یا بے دلی سے قبول کرتے ہو؟

دونوں نے عرض کیا: ہم بسر و چشم حاضر ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے استدلال کیا ہے کہ جمادات میں بھی ادراک و شعور ہے۔

(اگرچہ ان کی فطرت کے لحاظ سے سہی، یہی وجہ ہے کہ کنکریوں نے رسول اللہ ﷺ کی شہادت دی، درخت و پتھر نے آپ ﷺ کو سلام کیا، پکے بھنے زہر آلود گوشت نے آپ ﷺ کو اپنے زہر آلود ہونے کی خبر دی وغیرہ۔)

ایسے کئی واقعات احادیث کی کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں۔

ملحوظہ: مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوال کا زمین و آسمان والا جواب (ہم بخوشی راضی ہیں) حقیقت ہے، مجاز یا تمثیل نہیں جیسا کہ بعض اہل علم نے لکھا ہے۔ یہ جواب سب سے پہلے زمین کے اس خطہ نے دیا جہاں آج خانہ کعبہ کی عمارت ہے، اسی طرح آسمانوں کا وہ حصہ سب سے پہلے جواب دیا جہاں ''بیت المعمور'' (فرشتوں کا آسمانی قبلہ) ہے جو خانہ کعبہ کے بالکل اوپر ہے۔ (ابن کثیر)

﴿فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا صَرۡصَرًا فِىۡۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ﴾ [سورة حم السجدة: 16]

ترجمة: سو ہم نے ان پر ایک تیز آندھی بھیجی ایسے دنوں میں جو منحوس تھے تا کہ دنیا کی زندگی ہی میں انہیں رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھائیں اور آخرت کا عذاب تو رسوا تر ہے ہی اور انہیں کوئی مدد نہ پہنچ سکے گی۔

تفسیر: ہوا کا یہ خوفناک طوفان جس قوم پر چلایا گیا تھا، وہ قوم عاد تھی جس نے اپنے جلیل القدر پیغمبر سیدنا ہود علیہ السلام کو جھٹلایا تھا۔ یہ ہوائی طوفان ان پر سات رات آٹھ دن تک مسلط رہا۔ طوفانی ہواؤں کا ہر جھٹکا پہلے جھٹکے سے شدید تر اور بھیانک ہوا کرتا تھا حتیٰ کہ ان فرشتوں کے ہاتھوں سے یہ سرکش ہوائیں نکل جاتی تھیں جن کے انتظام پر یہ فرشتے مامور ہیں۔ لَا اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ

پوری قوم اپنے ساز و سامان کے ساتھ چورا چورا ہوگئی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے نحوست کا عقیدہ باطل قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ جب عذاب کے سات رات آٹھ دن (گویا پورا ہفتہ بلکہ ایک دین مزید اضافہ) منحوس تھے تو پھر ہفتہ کا کونسا دن نیک اور سعد ہوگا؟

(لہٰذا اسلام میں کوئی دن منحوس نہیں۔ ممکن ہے سابق ملتوں میں کچھ دن منحوس رہے ہوں)

ملحوظہ: آیت میں ان عذاب والے دنوں کو ''نجاست'' کہا گیا ہے، اس لیے ظاہراً شبہ ہوا کہ یہ دن منحوس تھے لیکن یہ حقیقت نہیں ہے کہ دن منحوس تھے بلکہ اس رسوا کن عذاب کی وجہ سے یہ تمام دن اس قوم کے لیے منحوس ہو گئے۔ عذاب منحوس تھا، دن منحوس نہ تھے، دن و رات تو اللہ کے پیدا کردہ ہیں اور پھر وہ اللہ کی نشانیاں ''آیات'' بھی تو ہیں، بھلا نحوست کو اس سے کیا تعلق؟

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَكَ﴾

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَيۡهِمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّةِ الَّتِىۡ كُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ۞﴾ [سورة حم السجدة: 30]

ترجمة: جن لوگوں نے دل سے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے، ان پر فرشتے نزول کرتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) تم نہ اندیشہ کرو، نہ رنج کرو اور خوشخبری سنو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ

کیا گیا ہے۔ہم تمہارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی اور تمہاری اس جنت میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کو تمہارا جی چاہے اور تمہارے لیے اس میں وہ سب کچھ ہے جو طلب کرو۔

تَفسِیر: استقامت کے معنی احکام الٰہی پر ثابت قدم رہنا۔ ایسا نہیں کہ کبھی راہ پر اور کبھی بے راہ، لومڑیوں کی طرح اِدھر اُدھر راہ فرار اختیار کرنا۔ (مظہری)

استقامت والوں کو فرشتوں کی یہ خوشخبری تین مواقع پر ہوگی:

اوّل ① موت کے وقت۔

دوم ② قبر کے اندر سوال و جواب سے پہلے۔

سوم ③ محشر میں قبروں سے اٹھنے کے وقت۔ (معارف القرآن)

مفسر ابوحیان اندلسی نے لکھا ہے کہ اہل استقامت پر فرشتوں کا نزول ہر دن ہوا کرتا ہے جس کے آثار و برکات ان کے اعمال میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ فرشتوں کا کلام سننا اور ان کا مشاہدہ کرنا مذکورہ تینوں مواقع پر ہوگا۔ (تفسیر بحر محیط)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے "ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" کے اطلاق سے یہ اخذ کیا ہے کہ ہر مسلمان کی استقامت اس کے حسب مرتبہ ہوگی۔ لہٰذا ہر مومن صاحب استقامت ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مومن کو کوئی خوف و غم نہ موت کے وقت ہوگا، نہ قبر کی زندگی میں، نہ محشر میں۔ ان تمام مواقع پر وہ مطمئن و مسرور رہے گا۔ (تفسیر کبیر)

⑮ ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ [سورة حم السجدة: 33]

ترجمة: اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور خود نیک عمل کرے۔

تَفسِیر: آیت میں دعوت و تبلیغ کرنے والوں کی شان بیان کی گئی ہے کہ اس سے بہتر اور کوئی کام نہیں کہ انسانوں کو توحید کی دعوت دی جائے اور اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کروایا جائے اور خود بھی اس پر عمل پیرا ہوں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ داعی الی اللہ کا جن میں شیخ و مربی بھی شامل ہیں، خود بھی عامل و پابند ہونا چاہیے ورنہ اس کی تعلیم میں برکت نہیں ہوتی (یعنی اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا)۔

ملحوظہ: داعی الی اللہ کا مفہوم عام ہے خواہ حاکم عادل ہو یا فوجی مجاہد ہو یا معلم و مدرس ہو یا واعظ و خطیب ہو یا کتابوں کا مصنف ہو یا قاری و مقری ہو یا امام و موذن، سب داعی الی اللہ ہیں۔

⑯ ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ [سورة حم السجدة: 36]

ترجمة: اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے وسوسہ آنے لگے تو آپ اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے۔

تَفسِیر: کسی بھی برائی یا گناہ کا آغاز وساوس سے ہوا کرتا ہے پھر یہی وساوس انسان کو بدعملی پر ڈال دیتے ہیں۔ وسوسہ اندازی کا بنیادی مصدر شیاطین الجن والانس ہوا کرتے ہیں۔ امدادِ الٰہی کے بغیر ایسے شیاطین سے دوری بشر کے لیے مشکل ہے، اس لیے آیت میں اللہ سے پناہ طلب کرنے کا اور پناہ خداوندی میں آجانے کا حکم دیا گیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ وساوس شیطانی کا ورود کاملین پر بھی ہوسکتا ہے اور یہ ان کے کمال کے خلاف نہیں۔

آیت سے یہ بھی اخذ کیا گیا کہ وسوسہ اور غصہ کے وقت اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھ لیا جائے۔ (روح المعانی)

﴿لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ﴾ [سورة حم السجدة: 42]

ترجمة: اس قرآن میں باطل نہ آگے سے آسکتا ہے، نہ پیچھے سے۔ یہ نازل کردہ ہے حکمت والے تعریف والے اللہ کی طرف سے۔

تَفسِیر: آیت میں قرآن حکیم کی شان بیان کی گئی ہے کہ یہ محفوظ ترین طریقے سے نبی کریم ﷺ پر نازل کیا گیا ہے، اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں، ہر باطل سے محفوظ ہے۔ ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ۝ عَلٰی قَلْبِكَ﴾

سُلوك: بعض علماء راسخین نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جیسے قرآن ہر باطل سے محفوظ ہے، اسی طرح جو لوگ قرآن سے وابستہ رہتے ہیں، وہ بھی ہر باطل سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

سُوْرَۃُ الشُّوْرٰی

پارہ: 25

① ﴿ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴾ [سورۃ الشوریٰ: 13]

ترجمة: اللہ اپنی جانب جس کو چاہے، کھینچ لیتا ہے اور اس شخص کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہو۔

تفسیر: رسول جس دین کی دعوت دے رہے ہیں، یہ کوئی نئی اور انوکھی دعوت نہیں ہے، ان سے پہلے سینکڑوں نبیوں نے بھی یہی کام انجام دیا ہے۔ اب اگر مشرک و کافر اس کام کو اجنبی یا بھاری سمجھ رہے ہیں تو یہ ان کی جہالت و بدبختی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہدایت نصیبی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ دو ② طریقوں سے دی جاتی ہے: پہلا یہ کہ اللہ خود اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے، پسند کرلے اور اس کو صراط مستقیم پر کھڑا کردے۔ اللہ کا یہ عمل اجتباء و اصطفاء کہلاتا ہے یعنی اللہ نے اس کو چن لیا جیسے انبیاء کرام ہوا کرتے ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ کہ جو لوگ اپنی جدوجہد و عمل اخلاص سے اللہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں، اللہ ان کی اس جدوجہد کو ضائع نہیں کرتا، انہیں بھی ہدایت و صراط مستقیم عطا کردیتا ہے۔ اللہ کے اس فضل و کرم کو ہدایت نصیبی اور سلوک کہا جاتا ہے۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں ”جذب و سلوک“ کی طرف اشارہ نکلتا ہے جو تصوف کی معروف اصطلاح ہے۔ (روح المعانی)

حکیم الامت رحمہ اللہ اس کی تشریح یہ کرتے ہیں کہ ”يَجْتَبِيْ“ جس کے معنی جذب اور کھینچ لینا ہیں جیسا کہ انبیاء کرام کو منتخب کرلیا جاتا ہے۔ اس میں ان کی عبادت ریاضت کو دخل نہیں۔ یہ اپنی ذات میں ہدایت کے چراغ ہوا کرتے ہیں اور ”یھدیٰ“ ہدایت کے معنی سالک کو راہ دکھانا (راہ عمل کا چلنے والا)، اس طرح جذب و سلوک کی اصطلاح قائم ہوگئی۔

② ﴿ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ﴾

[سورۃ الشوریٰ: 15]

ترجمة: ہمارے عمل ہمارے لیے اور تمہارے عمل تمہارے لیے۔ ہماری تمہاری کوئی بحث نہیں۔ اللہ ہی ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کے پاس جانا ہے۔

تفسیر: حق اور باطل کے بحث و مناظرہ کے بعد بھی حق بات کو قبول نہ کیا تو اب بحث بے کار ہے، قیامت ہی میں اس کا فیصلہ ہوگا کیونکہ وہاں سب کو حساب کتاب دینا ہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ نصیحت ایسے موقعہ کے لیے ہے جب بحث ومناظرہ ختم ہوجائے پھر بھی حق قبول کرنے کی توقع نہ رہے۔(﴿لَنَآ اَعۡمَالُنَا وَ لَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ﴾ کہہ دیا جائے)

③ ﴿اَمۡ لَہُمۡ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَہُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا لَمۡ یَاۡذَنۡۢ بِہِ اللّٰہُ﴾ [سورة الشورىٰ: 21]

ترجمۃ: کیا ان کے تجویز کیے ہوئے کچھ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لیے ایسا دین مقرر کردیا ہے جس کی اللہ نے کوئی اجازت نہیں دی؟

تفسیر: اللہ نے نبیوں کے ذریعہ آخرت اور دین کا راستہ بتلایا ہے تو پھر کیا اس کے سوا اور کوئی ہستی ایسی ہے جسے کوئی دوسرا دین مقرر کرنے کا حق واختیار حاصل ہو کہ وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال اور حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام قرار دے؟

تو پھر ان مشرکوں نے اللہ کی وہ راہ چھوڑ کر جو انبیاء کرام نے بتلائی ہے دوسری راہیں کہاں سے نکال لیں؟

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے بدعت کا مذموم اور حرام ہونا ثابت ہوتا ہے۔
(کیونکہ بدعت بھی اپنے دل وخواہشات سے گھڑ لی جاتی ہے۔)

④ ﴿وَ لَوۡ بَسَطَ اللّٰہُ الرِّزۡقَ لِعِبَادِہٖ لَبَغَوۡا فِی الۡاَرۡضِ﴾ [سورة الشورىٰ: 27]

ترجمۃ: اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے روزی کی فراخی کردیتا تو یہ سب زمین پر سرکشی کرنے لگتے لیکن وہ جس قدر بھی مناسب سمجھتا ہے، اسی انداز سے رزق نازل کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں سے خوب باخبر، بصیرت رکھنے والا ہے۔

تفسیر: اللہ سے بڑھ کر اپنے بندوں کی مصلحتوں اور ضرورتوں کا جاننے والا اور کون ہوسکتا ہے، وہ اپنے ہر بندے کی ضرورت اور اس کے ظرف ومصلحت کے لائق روزی دیتا ہے۔ اگر وہ بے تحاشا سب کو خوشحال اور فارغ البال کردے (جیسا کہ وہ قادر اور مقتدر ہے) تو عام انسانی طبائع ایسی ہیں کہ بجائے امن وامان فتنہ وفساد برپا کردیں اور ایک دوسرے کے دشمن ہوکر کفر وبغاوت میں مبتلا ہوجائیں۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جس طرح روزی کی کشادگی سے بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے، ایسے باطنی بسط (انوارات واحوال قلب) کی اکثریت بھی بعض کے حق میں مضر ہوجاتی ہے۔
(لہٰذا اگر کسی کو قلب کی یہ کیفیت حاصل نہ ہو تو اس کو مغموم نہ ہونا چاہیے۔)

⑤ ﴿وَ اِذَا مَا غَضِبُوۡا ہُمۡ یَغۡفِرُوۡنَ ﴿ۚ۳۷﴾﴾ [سورة الشورىٰ: 37]

ترجمۃ: اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کردیتے ہیں۔

تفسیر: اللہ کے نیک بندوں کے اوصاف واخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں ایک خصلت معافی ودرگزر کی بھی

بیان کی گئی ہے کہ جب انہیں کسی جائز بات پر غصہ آتا ہے تو ضبط وتحمل کر لیتے ہیں، انتقام نہیں لیتے۔ یہ کیفیت اخلاق وشرافت کی اونچی علامت ہے۔ علاوہ ازیں یہ خصلت ''اخلاق نبوت'' میں شمار کی جاتی ہے۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ معاف کرنا یا برابر کا بدلہ لینا دونوں جائز ہیں۔ (اگرچہ معاف کر دینا افضل واحسن ہے)۔ (روح المعانی)

ملحوظہ: اللہ کے نیک وبرگزیدہ بندوں کو غصہ وطیش ضرور آتا ہے لیکن وہ اس کا اظہار بے موقع نہیں کرتے اور جب انہیں بے محل وبے جا غصہ آ جائے تو اس کے تقاضہ پر عمل نہیں کرتے بلکہ اپنی طبیعت کو قابو میں رکھتے ہیں، یہی خصلت ان کے کمال وخوبی کی علامت ہے۔

علاوہ ازیں غصہ کا سرے سے نہ آنا کوئی اچھی بات بھی نہیں بلکہ یہ دل کی کمزوری اور بے حمیتی کی علامت ہے۔ کمال نہیں، نقص ہے۔ ہنر نہیں، عیب ہے۔ کمال وخوبی یہ ہے کہ جب بے محل وبے جا غصہ آ جائے تو اس کے تقاضے پر عمل نہ کرے، ضبط کرے اور اس مقام سے گزر جائے۔

⑥ ﴿وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ﴾ [سورة الشورىٰ: 41]

ترجمة: اور جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد (برابر کا) بدلہ لے سو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں ہے۔

تفسیر: اوپر والی آیت ۴۰ میں بیان کیا گیا کہ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے لیکن جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہو گیا۔ بے شک اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتے۔

دونوں آیتوں سے یہاں دو اصول ثابت ہوتے ہیں:

ایک ① قانون عدل کہ جیسا کرے گا ویسا پائے گا۔ مثلاً دانت کا بدلہ دانت، آنکھ کا بدلہ آنکھ، لیکن یہاں یہ اہم نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس بدلہ میں یہ بھی شرط ہوگی کہ وہ بدلہ فی نفسہ جائز وحلال ہو، ممنوع یا حرام قسم کا نہ ہو۔ مثلاً لوٹ مار کا بدلہ لوٹ مار نہ ہوگا، زنا کا بدلہ زنا نہ ہوگا، غیبت کا بدلہ غیبت نہیں ہوگا، حرام کاری کا بدلہ حرام کاری نہ ہوگی، یا کسی نے دھوکہ سے شراب پلا دی تو آپ کو شراب پلانا جائز نہیں۔

دوسرا ② اصول ''قانون فضل'' ثابت ہوتا ہے۔ رحم ورعایت کا قانون کہ آدمی برائی کا بدلہ نہ لے، معاف ودرگزر کر دے۔ یہ عمل اللہ کو زیادہ پسند ہے۔

سُلوك: مفسرین لکھتے ہیں کہ مجموعۂ آیات سے انتقام لینے کا صرف جواز ثابت ہوتا ہے (یعنی برابر کا بدلہ لیا جا سکتا ہے) انتقام لینے کا حکم ثابت نہیں ہوتا۔ (جصاص)

⑦ ﴿اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ [سورة الشورىٰ: 42]

ترجمة: الزام تو صرف ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین پر ناحق سرکشی کرتے پھرتے ہیں۔ ایسوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر: آیت کا تعلق احکام فوجداری سے متعلق ہے۔ اوپر کی آیات میں قانون عدل اور قانون فضل کا تذکرہ کیا گیا تھا اور یہ کہا گیا کہ برائی کا بدلہ برائی سے لیا جا سکتا ہے۔ البتہ معاف و درگزر کرنا بہتر اور اعلیٰ خصلت ہے۔ مذکورہ آیت میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ ابتداءً ظلم کرنا یا بدلہ لینے میں زیادتی کرنا سخت بات ہے۔ البتہ ظلم ہونے پر بدلہ لینا اور بات ہے۔

سُلوك: مذکورہ آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ تشدد کرنا مطلقاً منع نہیں ہے بلکہ وہ تشدد برا ہے جو بے جا اور ظالمانہ ہو۔

ملحوظه: حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ برائی پر انتقام لینا یا معاف و درگزر کرنا مختلف حالات کے تحت ہے۔ جو شخص ظلم کرنے کے بعد شرمندہ و افسوس کرتا ہو، اس کو معاف کر دینا افضل ہے۔ اور جو اپنی ضد و عناد پر قائم رہتا ہو، اس سے انتقام لینا بہتر ہے۔ (بیان القرآن)

﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا﴾ [سورة الشوریٰ: 52]

ترجمة: آپ کو یہ خبر نہ تھی کہ الکتاب کیا چیز ہے اور نہ یہ کہ الایمان کیا چیز ہے لیکن ہم نے اس قرآن کو نور بنا دیا کہ اس کے ذریعہ ہم ہدایت کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں۔

تفسیر: آیت میں اس حقیقت کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ کامل استعداد اور صلاحیت رکھنے والا بھی بغیر تائید و توفیق الٰہی کچھ نہیں پاتا۔ اپنے ہنر و قوت بازو پر ناز کرنے والے عام طور پر ٹھوکر کھاتے ہیں۔ متکبر انسانوں کو یہ باور کیا جا رہا ہے کہ نبی و رسول کی عظیم شخصیت بھی نبوت سے پہلے ایمان و اسلام اور قرآن کی تفصیل سے واقف نہ تھی پھر اللہ نے آپ پر فیضان وحی کا القاء کیا اور کمالات و فضائل و درجات سے سرفراز کیا گیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ کمالات و فضائل سب کے سب موہوب (عطائی) ہوا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں جس ذات کو عطا کرنے کی قدرت ہے، اس کو سلب کمالات کی بھی قدرت ہے۔ لہٰذا کسی صاحب کمال کو اپنے فضل و کمال پر ناز نہ کرنا چاہیے۔

سُوْرَةُ الزُّخْرُفِ

پارہ: 25

41 ﴿بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝﴾

[سورة الزخرف: 22]

ترجمة: بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک راہ پر پایا ہے اور ہم انہیں کے نقش قدم پر راہ یافتہ ہیں۔

تفسیر: قرآن حکیم نے بار بار ان مشرکین سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ شرک کی تائید میں کوئی عقلی یا نقلی دلیل پیش کرو۔ لیکن اس کا جواب وہ ہمیشہ یہی دیتے رہے ہیں کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ایسے ہی کہتے اور کرتے دیکھا ہے۔ اگر یہ حق نہ ہوتا تو یہ قدیم زمانے کے لوگ اس پر قائم نہ رہتے۔

سُلوك: امام رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آباء پرستی کی مذمت میں اور کچھ نہ ہوتب بھی یہ آیت اس کے لیے کافی ہے۔ (تفسیر کبیر)

42 ﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝﴾ [سورة الزخرف: 31]

ترجمة: اور کہنے لگے کہ یہ قرآن دو مشہور شہر کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟

تفسیر: مشرکین عرب کا یہ ایک عام اعتراض تھا کہ نبوت کسی ایسے شخص کو ملنی چاہیے تھی جو امیر و کبیر، صاحب تخت و تاج ہوتا۔ اس کے لیے کم از کم مکہ یا طائف کے کسی سردار کا انتخاب ہونا چاہیے، محمد ﷺ تو ایک غریب و یتیم آدمی ہیں، ان کو نبوت کیونکر مل گئی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جس طرح انبیاء کرام کو ان کی قوموں نے یہ طعنہ دیا تھا کہ وہ دولت و ثروت، شان و شوکت نہیں رکھتے، ایسے ہی منکرین نے بھی یہی طعنہ اولیاء اللہ کو دیا ہے۔

43 ﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝﴾ [سورة الزخرف: 35]

ترجمة: اور جو کوئی بھی اللہ رحمن کی نصیحت سے اندھا بن جائے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

تفسیر: یعنی جو بھی شخص نصیحت اور ذکر الٰہی سے غافل ہو گیا، اس پر ایک خصوصی شیطان مقرر ہو جاتا ہے جو اس کو ہر وقت یاد الٰہی سے غافل رکھتا ہے اور اس کے دل میں طرح طرح کے شبہات ڈالتا ہے۔

یہ شیطان موت تک اس کا ساتھی رہا کرتا ہے اور قیامت کے دن جب معلوم ہوگا کہ یہ برا ساتھی تھا تو اس

وقت حسرت وافسوس سے کہے گا: کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق ومغرب کا فاصلہ ہوتا۔

شاہ عبدالقادر صاحب محدث ﷫ لکھتے ہیں کہ دنیا میں تو شیطان کے مشورہ پر چلتا تھا، آخرت میں اس کی صحبت پر پچھتائے گا۔ اس طرح کا ساتھی شیطان کسی کو انسان کی شکل میں ملتا ہے اور کسی کو جن وغیرہ کی۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ لکھتے ہیں کہ ذکر الٰہی سے منہ موڑنے پر اگرچہ فوری گرفت نہ ہو لیکن گناہوں میں ترقی ہوتی رہتی ہے، یہ عذاب سے کم نہیں۔

﴿وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ﴾ [سورة الزخرف: 52]

ترجمة: فرعون کے اعتراضات میں ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ موسیٰ ﷤ روانی سے تقریر بھی کرنا نہیں جانتے ہیں۔ (حالانکہ ایسی بات نہ تھی)

تفسير: کسی مسخرے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا: ''میرا کمال یہ ہے کہ مجھ میں کوئی کمال نہیں''۔ اعتراض کی بھی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے، بس منہ کھولا اور بک دیا۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ آیت سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ زبان آوری وطلاقت لسانی یا عرفی ورواجی کمالات کا نہ ہونا عیب یا نقص کی علامت نہیں ہیں۔

(اولیاء اللہ میں بہت سے ایسے بھی ہوئے ہیں جو بہت کم کلام کرتے تھے۔ تصوف میں ان چار خصلتوں کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے: (1) قلت طعام (2) قلت کلام (3) قلت منام (4) قلت اختلاط مع الانام۔)

سُوْرَةُ الدُّخَانِ

پَارَہ: 25

① ﴿وَ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ﴾ [سورة الدخان: 20]

ترجمۃ: اور میں پناہ لے چکا ہوں اپنے اور تمہارے پروردگار کی اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو۔

تفسیر: سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کی دھمکیوں پر یہ جواب دیا تھا کہ تم لوگوں نے میری سنگساری کا فیصلہ کرلیا ہے تو مجھے کچھ فکر نہیں ہے، میں اپنے رب کی پناہ میں آچکا ہوں، وہ میری حمایت کرے گا، مجھے یہ سہارا کافی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ کے آگے التجا کرتے رہنا اور اپنی قوت وطاقت کا دعویٰ کرنا عبدیت (بندگی) کی علامت ہے (جو اخلاقِ انسان میں بلند تر سمجھی جاتی ہے)۔

② ﴿وَ اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ﴾ [سورة الدخان: 21]

ترجمۃ: اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے الگ ہو جاؤ۔

تفسیر: یعنی اگر میری بات نہ مانتے ہو تو کم از کم مجھے ایذاء نہ دو اور اپنے جرم کو سنگین نہ بنالو۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ جس سے اصلاح کی امید نہ ہو، اس سے قطع تعلق کرلیا جائے۔

③ ﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۙ طَعَامُ الْاَثِیْمِ﴾ [سورة الدخان: 43 تا 44]

ترجمۃ: بے شک زقوم کا درخت بڑے بڑے مجرموں کی غذا ہوگا۔

تفسیر: زقوم جہنم کا ایک خاردار درخت ہے جو ہر قسم کی لذت وفائدے سے خالی، نہایت بدبودار کڑوا، سوزش و آگ والا۔ یہ اہل جہنم کی ضیافت میں پیش کیا جائے گا۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے صوفیاء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ درخت حرص وحب دنیا کا درخت ہے جو قیامت کے دن اس شکل میں ظاہر ہوگا۔ (روح المعانی)

ملحوظہ: جب قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی تو ابوجہل نے اپنے دوستوں سے کہا: لو تمہارا دوست محمد ﷺ کہتا ہے کہ جہنم میں ایک درخت ہے حالانکہ آگ تو درخت کو جلا دیتی ہے۔ (درمنثور)

اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب نازل کیا: ﴿اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْٓ اَصْلِ الْجَحِیْمِ﴾ [سورة الصافات: 46]

یعنی زقوم تو جہنم کی تہہ میں اگنے والا درخت ہے (جیسا کہ بعض حیوانات آگ میں زندہ رہتے ہیں)

سُوْرَةُ الْجَاثِيَةِ

پَارَہ: 25

⑪ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا﴾ [سورة الجاثية: 18]

ترجمة: پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا سو آپ کو اسی راہ پر قائم رہیے اور بے عملوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے۔

تفسیر: بے دین لوگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ ہر راہ چلنے لگتے ہیں، ان کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔

اے نبی! ہم نے آپ کو ایک سیدھی بے غبار راہ پر کھڑا کر دیا ہے۔ آپ خود بھی اس پر قائم رہیے اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر چلائیے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو شریعت کی اتباع کا حکم دیا جا رہا ہے تو دوسرا اور کون ہوگا کہ وہ شریعت کی مخالفت کرے اور دعویٰ کرے کہ مجھ کو کمالات اور قربِ خداوندی حاصل ہے؟ یہ کس قدر باطل دعویٰ ہے۔

② ﴿ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ [سورة الجاثية: 35]

ترجمة: یہ سزا اس لیے ہے کہ تم نے اللہ کی آیات کو ہنسی مذاق بنا رکھا تھا اور تم کو دنیا کی زندگی نے دھوکہ میں ڈال رکھا تھا۔

تفسیر: آخرت میں سارے حقائق سامنے ہوں گے۔ جن باتوں کو دنیا کی زندگی میں خواب وخیال بلکہ خوش خیالی سمجھا جاتا تھا، وہ واقعہ بن کر سامنے ہوں گے، دل یقین کر رہے ہوں گے اور آنکھیں دیکھ رہی ہوں گی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ انکارِ آخرت کی بنیاد یہی دنیا کی مشغولی اور اس کا انہماک ہے۔

سُورَةُ الأَحْقَاف

پَارَہ: 26

① ﴿ اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○﴾

[سورة الأحقاف: 4]

ترجمة: میرے پاس کوئی آسمانی کتاب لاؤ جو اس (قرآن) سے پہلے کی ہو یا کوئی علمی مضمون لاؤ اگر تم سچے ہو۔

تفسیر: مشرکوں سے خطاب ہے کہ اگر تم اپنے دعویٰ شرک میں سچے اور حق پر ہو تو کسی آسمانی کتاب کی دلیل پیش کرو یا اسے علمی اصول سے ثابت کرو کہ توحید کے سوا شرک بھی حق ہے۔

سُلوك: عارفین نے آیت سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ دین کے بارے میں کوئی بھی دعویٰ معتبر، دلیل کے بغیر قابل قبول نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ دعویٰ کشف والہام بھی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

ملحوظه: قرآن حکیم نے یہاں ایک اہم تنبیہ کی ہے جس پر بہت سے اہل علم کو بھی توجہ نہیں۔

عام طور پر توحید کے اثبات کے لیے دلائل پیش کیے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ جاری بھی ہے لیکن قرآن کریم نے ایک قدم آگے بڑھ کر مشرکوں سے الٹا مطالبہ کر دیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو شرک کے اثبات کے لیے دلیل پیش کرو۔

اور حقیقت یہ ہے کہ توحید کے ثبوت کے لیے علمی دلائل و براہین کی چنداں ضرورت نہیں، کائنات کا سارا نظام خود دلیل و ثبوت ہے۔ ضرورت تو اس کی ہے کہ شرک کی گنجائش کے لیے دلیل طلب کی جائے۔

اس طرز و عنوان سے قرآنی استدلال اور انسانی استدلال کا واضح فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔

② ﴿ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ ﴾

[سورة الأحقاف: 9]

ترجمة: آپ کہہ دیجئے کہ میں رسولوں میں کوئی انوکھا تو نہیں ہوں، میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا۔ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس وحی آتی ہے اور میں واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔

تفسیر: نبوت و رسالت ایسی اجنبی چیز نہیں کہ تم شک و شبہ میں پڑ جاؤ، ہزاروں سال سے نبوت کا سلسلہ چل رہا ہے پھر میری نبوت پر کیوں تعجب کرتے ہو۔ میں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے نہ کہ غیب دانی اور مافوق الفطرت قوتوں کا۔ جیسے اللہ کے سب بندے ہیں، میں بھی اس کا ایک بندہ ہوں۔ تم میں اور مجھ میں

فرق یہ ہے کہ میرے پاس وحی اور اس کا کلام آتا ہے جس کی میں تم کو دعوت دیتا ہوں۔

سُلوک: حکیم الامت ؒ لکھتے ہیں کہ آیت سے افراط عقیدت کا رد نکلتا ہے۔ آیت میں رسول اللہ ﷺ کا پورا تعارف بیان کر دیا گیا ہے تو پھر اولیاء اللہ کو ہر کلی و جزئی کا علم جاننے والا سمجھنا کس قدر گمراہ بات ہے۔

﴿۳﴾ ﴿اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾ [سورة الأحقاف: 20]

ترجمة: تم اپنی لذت کی چیزیں دنیا ہی میں حاصل کر چکے ہو اور ان کا خوب مزہ اٹھا چکے ہو۔ آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔

تفسیر: آیت میں مُجرموں کو خطاب ہے کہ دنیا کی حرام لذتوں میں مبتلا ہو کر تم اپنے انجام سے بے خبر ہو گئے تھے حتیٰ کہ اپنے خالق کو بھی بھلا بیٹھے، آج دنیا کی اس لذت خوری اور آخرت فراموشی کے صلہ میں جہنم کا عذاب چکھو۔

سُلوک: حکیم الامت ؒ نے لکھا ہے کہ آیت سے زہد کی ترغیب نکلتی ہے اور اس طرف اشارہ بھی ہے کہ دنیا کی لذات میں اس قدر توسع کرنا کہ معاصی میں ابتلاء ہو جائے، خطرے کی بات ہے۔

﴿۴﴾ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ﴾

[سورة الأحقاف: 35]

ترجمة: آپ صبر کریں جیسا کہ ہمت والے نبیوں نے صبر کیا ہے اور ان لوگوں کے بارے میں جلدی نہ کیجئے۔

تفسیر: مخالف اور معاند کے لیے انتقام الٰہی کا تقاضہ پیدا ہونا ایک فطری بات ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک میں کبھی کبھی خیال آیا کرتا تھا کہ ان مخالفین و معاندین کی ضد و عناد پر انہیں فوری سزا مل جائے، تو اچھا ہے یہ کسی صورت ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔

آیت میں آپ کو صبر کرنے کی تلقین کی گئی اور صبر خیر ہی پیدا کرتا ہے۔

سُلوک: عارفین نے لکھا ہے کہ کمال درجہ کا صبر کرنا نبیوں کی خصوصیات میں شامل ہے، نبیوں جیسی عالی ہمتی و کشادہ ظرفی نہ کسی کی قدرت میں ہے، نہ اس کا کسی کو حوصلہ۔

سُوْرَۃُ مُحَمَّد

پارہ: 26

① ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِىْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۖ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ﴾ [سورة محمد: 15]

ترجمة: جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا جاتا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں ایسی نہریں ہیں جن کا پانی متغیر ہونے والا نہیں۔ اور دودھ کی ایسی نہریں ہیں جن کا ذائقہ بدلنے والا نہیں۔ اور شراب کی ایسی نہریں جو نوش کرنے والوں کے لیے صرف ذائقہ ہی ذائقہ والی ہیں۔ اور شہد خالص کی نہریں ہیں۔ اور وہاں ان لوگوں کے لیے ہر قسم کے پھل ہوں گے اور اللہ کی خصوصی بخشش بھی۔

تفسیر: خلاصہ یہ کہ اہل جنت ہر قسم کی مادی و روحانی نعمتوں سے مالا مال ہوں گے۔ دنیا کی ہر مادی نعمت فنا پذیر ہوتی ہے، پانی سڑ جاتا ہے، دودھ بگڑ جاتا ہے، شراب تلخ و تیز ہوجاتی ہے، شہد گدلا اور میلا ہوجاتا ہے لیکن جنت کی یہ نعمتیں دائمی، ابدی، خوش ذائقہ و تروتازہ رہا کرتی ہیں۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اہل اشارات نے پانی کو حیات روحانی، دودھ کو علم الٰہی اور شراب کو شوق و محبت اور شہد کو وصل و قرب کی صورت مثالی تجویز کیا ہے۔

② ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا﴾ [سورة محمد: 16]

ترجمة: ان منافقین میں بعض ایسے بھی ہیں جو آپ کی طرف کان لگاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب آپ کے پاس سے باہر آجاتے ہیں تو جو لوگ علم والے (صحابہ) ہیں، ان سے پوچھتے ہیں کہ ابھی انہوں (نبی) نے کیا کہا تھا؟ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور وہ اپنی خواہشات پر چل رہے ہیں۔

تفسیر: منافقین کا ذکر ہے کہ یہ لوگ کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آیا کرتے تھے لیکن نہایت بے دلی اور رواروی میں، ان کے چہرے مہرے سے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آپ کی گفتگو کو توجہ سے سن رہے ہیں حالانکہ واقعہ ایسا نہ تھا، مجلس رسول میں بیٹھنے کے بعد بھی ایسے کورے نکلے رہتے تھے کہ جب مجلس سے باہر نکلتے تو بناوٹ و تکلف میں اہل ایمان سے پوچھا کرتے کہ جناب ابھی جو ارشاد ہوا، وہ کیا تھا؟ یہ ان کی منافقت تھی کہ وہ ایمان والوں میں اپنی نیک نامی کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صحبت و ہم نشینی بڑے سے بڑے عالم و مرشد کے پاس بھی بے اثر ہوجاتی ہے جب کہ بیٹھنے والے کے دل میں استفادہ و طلب حق کا ارادہ نہ ہو۔

③ ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾

[سورة محمد: 19]

ترجمۃ: آپ اس کا یقین رکھیے کہ سوائے اللہ کے اور کوئی قابل عبادت نہیں اور آپ اپنی خطا کی معافی طلب کرتے رہیے اور تمام ایمان والے مرد اور عورتوں کے لیے بھی۔ اور اللہ خوب باخبر ہے تم سب کے چلنے پھرنے اور رہنے سہنے پر۔

تفسیر: استغفار کے معنی معافی اور بخشش طلب کرنا۔ یہ عمل صرف گناہ یا معصیت پر ہی نہیں کیا جاتا ہے بلکہ ہر آن و ہر شان اس کو جاری رکھا جاتا ہے کیونکہ بغیر اللہ کی دستگیری کے کسی کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ خطا میں نیت شامل ہو یا نہ ہو، بہرصورت استغفار دعا ہی ہے۔

ذنب کا اردو ترجمہ خطا، لغزش کیا جاتا ہے جب کہ اس کا صدور معصوم شخصیت سے ہو۔ اس لحاظ سے نبی و رسول کا ذنب غیر نبی سے بالکل مختلف ہوگا جس کا اردو ترجمہ خطا یا لغزش ہی ہوسکتا ہے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے اشارہ ملتا ہے کہ مشائخ اپنی دعاؤں میں اپنے متعلقین کو بھی شریک رکھا کریں۔

﴿وَ لَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ﴾ [سورة محمد: 30]

ترجمۃ: اور اگر ہم چاہتے تو آپ کو ان کی پوری پوری نشاندہی کر دیتے، سو آپ ان کے حلیہ سے پہچان چکے ہیں اور آئندہ ان کے طرز کلام سے ضرور پہچان لیں گے۔

تفسیر: منافقین کی رفتار و گفتار کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سے فرماتے ہیں کہ باوجود ہمارے تفصیلی طور پر بتانے کے آپ اپنی فراست ایمانی اور بصیرت قلبی سے ان کے لب ولہجہ پر غور کر کے انہیں پہچان لیں گے کیونکہ نفاق کفر کی طرح واضح نہیں رہتا۔

سلوك: صوفیاء اور عارفین نے لکھا ہے کہ آیت سے فراست مومن کی اصل معلوم ہوتی ہے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں: فراست کی بناء پر کسی پر بدگمانی کرنا درست نہیں۔ البتہ مرشد و مصلح کو تفتیش کرنا جائز ہے جیسا کہ واقعۂ افک میں رسول اللہ ﷺ نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور بعض دیگر اصحاب سے تفتیش کی ہے۔

(واقعہ کی تفصیل ''ہدایت کے چراغ'' جلد صفحہ ۲/۶۸۹ پر دیکھئے)

﴿وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴿٣٣﴾﴾ [سورة محمد: 33]

ترجمۃ: اور اپنے اعمال برباد نہ کرو۔

تفسیر: یعنی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کر کے اپنے اعمال ضائع نہ کر لو۔

مخالفت، اصول دین اور اعمال دین دونوں میں ہوسکتی ہے۔ آیت اگرچہ مطلق حکم بیان کرتی ہے لیکن اہل

سنت علماء نے اس کو اصول دین کی مخالفت پر شمار کیا ہے کہ کفر وشرک کر کے اپنے اعمال برباد نہ کرلو، حبط اعمال کا مسئلہ صرف کفر وشرک سے متعلق ہے۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت کی تفسیر میں امام قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ گناہ کر کے اپنا عمل برباد نہ کرلو، عمل سے مراد نفس عمل نہیں بلکہ نورِ عمل مراد ہے کہ معصیت و نافرمانی سے عمل کے انوار و برکات بجھ جاتے ہیں جب تک توبہ نہ کرلی جائے۔ (روح المعانی)

﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴾ [سورة محمد: 38]

ترجمة: اور اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کرے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

تَفسِير: اللہ نے جس حکمت ومصلحت کے تحت اپنے بندوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، اگر تم اس کی پابندی نہ کرو تو اس روگردانی کے باعث کسی دوسری قوم کو یہ خدمت دے دے گا جو تمہاری طرح بخیل نہ ہوگی۔ ایسی قوم سے اللہ دین کی یہ خدمت لے لے گا البتہ تم اس سعادت سے محروم ہو جاؤ گے۔

صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ دوسری قوم کون ہے؟

آپ ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ''اس کی قوم''

پھر فرمایا: اللہ کی قسم! ایمان اگر ثریا ستارے پر جا پہنچے گا تو ملک ''فارس'' کے لوگ وہاں سے بھی اس کو اتار لائیں گے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت میں اس بات کی تعلیم ہے کہ انسان اپنی کسی دینی خدمت کو اپنی ذات پر موقوف نہ سمجھے کہ یہ کام میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ دعوت وتبلیغ، درس وتدریس، تصنیف و تالیف، وعظ ونصیحت، بحث ومباحثہ، اجتماعات، سیادت وقیادت، اتحاد واتفاق، جنگ وجہاد وغیرہ میری جد وجہد وفکر سے قائم ہے۔ ایسا خیال کرنا زعم وپندار ہے جو حرام ومذموم خصلت ہے۔

سُوْرَةُ الْفَتْح

پارہ: 26

(1) ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [سورة الفتح: 4]

ترجمة: وہ اللہ وہی تو ہے جس نے اہل ایمان کے دلوں میں سکینہ نازل کیا تا کہ اپنے پہلے ایمان کے ساتھ ان کا دوسرا ایمان اور زیادہ ہو جائے۔

تفسیر: سکینہ کے معنی تسلی اور اطمینان قلب کے ہیں۔ عربی لغت میں اس کے معنی نور، قوت اور روح کے آتے ہیں۔ یہ آیت صلح حدیبیہ سے متعلق ہے جو ماہ رجب ٦ ھ مطابق مارچ ٦٢٨ء کا واقعہ ہے۔

نبی کریم ﷺ چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرہ کرنے مکة المکرمة آرہے تھے، مشرکوں نے آپ ﷺ کو روک دیا اور جنگ کی تیاری شروع کردی۔ ایسے نازک وقت میں جب کہ صحابہ کے پاس ہتھیار تھے نہ ساز و سامان، مدینہ منورہ سے صرف عمرہ کرنے کی نیت سے چلے تھے، ایسی حالت میں مقابلہ کرنا سخت مسئلہ تھا۔ لیکن صحابہ کے اخلاص و اطاعت شعاری نے مشرکوں سے مقابلہ کرنا طے کرلیا پھر اللہ نے ان کے قلوب پر سکینہ نازل کیا جس کی وجہ سے ہمت و استقامت کے قدم جم گئے۔

سلوك: نزول سکینہ سے قلب کو طمانیت حاصل ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں اعمال آسان ہو جاتے ہیں اور ضبط و تحمل پیدا ہوتا ہے۔

(2) ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ [سورة الفتح: 10]

ترجمة: جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں، وہ اللہ ہی سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔

تفسیر: صحابہ کرام کی یہ بیعت صلح حدیبیہ ٦ ھ کے موقع پر بیعت علی الموت (شہادت فی سبیل اللہ) تھی۔ یہ بیعت اس وقت ہوئی جب یہ خبر اڑی کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو کافروں نے شہید کر دیا ہے۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے بات چیت کے لیے مکة المکرمة بحیثیت سفیر روانہ کیا تھا۔ اس افواہ پر چودہ سو صحابہ نے جو بے ہتھیار، احرام کی حالت میں تھے، رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر عہد کیا کہ یا ہم مکہ فتح کریں گے یا پھر اپنی جان دے دیں گے، اس بیعت کو "بیعت رضوان" بھی کہا جاتا ہے۔ اس بیعت پر اللہ نے خوشنودی کا اعلان فرمایا۔ [سورة الفتح: 18]

بیعت تو رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر ہو رہی تھی لیکن اللہ نے اس کو اپنے ہاتھ پر بیعت ہونا قرار دیا۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت میں اشارہ ہے رسول اللہ ﷺ کی شان فنا و بقا کا۔

⑬ ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾

[سورۃ الفتح: 18]

ترجمة: بے شک اللہ خوش ہوا ان مسلمانوں سے جو آپ سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے۔ اللہ کو خوب معلوم تھا کہ جو کچھ بھی ان کے دلوں میں تھا، سو اللہ نے ان پر سکینہ نازل کیا۔

تفسیر: وہی صلح حدیبیہ کا تذکرہ ہے۔ آیت میں صحابہ کرام کے ایمان و اخلاص کی شہادت دی گئی ہے کہ ان کے قلوب دولت ایمان و اخلاص سے معمور ہیں۔ صحابہ کرام کی صداقت کے لیے صرف ایک یہی آیت کافی ہے۔

سُلوك: فقہاء نے لکھا ہے کہ نیت اگر سچی ہو تو توفیق الٰہی ضرور دستگیری کرتی ہے۔ (جصاص)

⑭ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۗ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ﴾

[سورۃ الفتح: 29]

ترجمة: محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ زور آور ہیں کافروں پر اور نرم ہیں آپس میں (یعنی مہربان ہیں)

تفسیر: آیت میں صحابہ کرام کی شان بیان کی گئی ہے۔ بیان کرنے والا رب العالمین ہے۔ آیت میں صحابہ کرام کی پوری کی پوری جماعت کا تذکرہ ہے کہ یہ لوگ کافروں کے مقابلہ میں سخت مضبوط، قوی ہیں جس سے ان کی کفر و شرک سے بے زاری کا اظہار ہوتا ہے اور اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ان کا معاملہ نرم اور خلوص و محبت کا رہا کرتا ہے۔

سُلوك: صحابہ کرام کی اس کیفیت کو اہل علم نے حب فی اللہ و بغض فی اللہ قرار دیا ہے جو تصوف میں کثرت سے لکھا و بولا جاتا ہے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی خاص حالت میں مومن کے ساتھ سختی اور کافر کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا پڑے تو یہ عمل آیت کے عام حکم کے خلاف نہیں ہوگا۔

صوفیاء کرام نے کہا ہے کہ مومن کامل صفات جلال و صفات جمال کا جامع ہوا کرتا ہے۔

سُوْرَۃُ الحُجُرَات

پارہ: 26

(1) ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ﴾ [سورۃ الحجرات: 1]

ترجمۃ: اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول سے پہلے کسی کام میں سبقت نہ کرو۔

تفسیر: یعنی جس کسی معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کوئی حکم یا فیصلہ ملنے کی توقع ہو تو اپنی رائے پر کوئی فیصلہ نہ کرلو بلکہ حکم الٰہی کا انتظار کرو۔ نبی کے فرمانے سے پہلے کچھ بولنے کی جرأت نہ کرو پھر جو حکم آپ ﷺ سے مل جائے، اس کو قبول کرو۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں احکام الٰہی اور احترام رسول کا ادب سکھایا گیا ہے اور اپنی طبیعت کے تقاضوں کو نبی کی موجودگی میں مغلوب رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(2) ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ ﴾

[سورۃ الحجرات: 2]

ترجمۃ: اے ایمان والو! اپنی آواز کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور ان سے ایسا کھل کر نہ بولا کرو جیسے آپس میں کھل کر بولا کرتے ہیں۔ کہیں تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر تک نہ ہو۔

تفسیر: اپنی آوازوں کو پست رکھنے کا حکم اس وقت ہے جب آپ مجلس میں بیٹھے ہوں اور گفتگو فرما رہے ہوں۔ مجلس نبوی کا یہ ادب ہے کہ اگر آپ سے خطاب کرنے کی ضرورت ہو تو نہایت ادب واحترام کے ساتھ پست آواز میں عرض معروضہ کیا جائے۔ جیسا کہ ایک باادب بیٹا اپنے باپ سے، ایک لائق شاگرد اپنے استاذ سے، ایک مخلص خادم اپنے آقا سے، ایک فرمانبردار مرید اپنے شیخ سے، ایک سپاہی اپنے افسر سے جس طرح بات کرتا ہے، اس سے کہیں زیادہ ادب واحترام کا معاملہ کیا جائے۔

سلوک: مذکورہ آداب تو آپ کی حیات طیبہ سے وابستہ ہیں۔

آپ ﷺ کی وفات شریف کے بعد آپ ﷺ کی احادیث پڑھنے، سننے کے وقت بھی یہی آداب ملحوظ رکھنے چاہئیں، محدثین کرام کا حدیث پڑھتے وقت یہی ادب ہوا کرتا تھا۔

اسی طرح قبر شریف کے پاس حاضری کے وقت بھی یہی آداب ملحوظ رکھنے چاہئیں۔

اور تقریباً یہی معاملہ آپ کے خلفاء، علماء ربانیین اور اولوالامر کے ساتھ درجہ بدرجہ رکھنے کی ہدایت مفہوم ہوتی ہے۔

ملحوظہ: ہندو پاک کے شہرۂ آفاق سیرت نگار علامہ سلیمان ندوی رحمہ اللہ ان آداب کو اس طرح نظم کرتے ہیں:

اے زائر بیت نبوی یاد رہے یہ — بے قاعدہ یاں جنبش لب بے ادبی ہے
آہستہ قدم نیچی نگاہ پست ہو آواز — خوابیدہ یہاں روح رسول عربی ہے

③ ﴿ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ ﴾ [سورة الحجرات: 7]

ترجمة: بہت سی باتیں ایسی ہوا کرتی ہیں کہ اگر وہ اس میں تمہارا کہا مان لیا کریں تو تم کو بڑی مضرت پہنچے۔

تفسیر: رسول اللہ ﷺ اگر تمہاری بات یا رائے پر عمل نہ کریں تو برا نہ مانو کیونکہ حق لوگوں کی خواہشات کے تابع نہیں ہوتا، رسول جو فیصلہ کرتے ہیں وہی حق وصواب ہوا کرتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اپنے شیخ کو ہم رائے بنانے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔

④ ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ ﴾

[سورة الحجرات: 11]

ترجمة: اے ایمان والو! نہ مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہیے، کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہیے کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو۔ ایمان کے بعد گناہ کا نام لگنا برا ہے، اور جو باز نہ آئے وہی لوگ ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو۔ کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور نہ سراغ لگایا کرو (یعنی جاسوسی نہ کرو) اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے۔ کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ یقیناً تم اس کو ناگوار سمجھتے ہو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آیت میں مکارم اخلاق (بلند ترین اخلاق) کی تعلیم ملتی ہے (جو تصوف میں خصوصی ہدایت رکھتی ہے)۔

ملحوظه: فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ کسی کو عیب دار نام سے یاد کرنا اس صورت میں حرام ہے جب وہ بلاغرض صحیح ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسے ہی نام سے جانا پہچانا جاتا ہو جو عیب دار ہے اور وہ شخص اس کو اپنی توہین نہیں سمجھتا تو اس کو اس عیب دار نام سے پکارنا جائز ہے۔ مثلاً نابینا حکیم صاحب، لنگڑے حافظ صاحب، گنجے وکیل صاحب، سلیمان الاعرج (لنگڑا)، سفیان الثوری (بیل) وغیرہ۔

تجسس حرام ہے یعنی کسی کے عیب اور کمزوریوں کی تلاش میں پڑے رہنا، مسلمانوں کے عیب کی پردہ دری کرنا ممنوع ہے، پردہ پوشی واجب ہے۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: تجسس میں یہ عمل بھی شامل ہے کہ چھپ چھپ کر کسی کی باتیں سننا یا اپنے آپ کو سوتا ہوا بنا کر دوسروں کی باتیں سننا، یہ سب حرام عادتیں ہیں۔

سُوْرَۃُ قٓ

پَارَۃ: 26

(41) ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ [سورة ق: 18]

ترجمة: وہ کوئی لفظ اپنے منہ سے نکالنے نہیں پاتا مگر یہ کہ اس کے آس پاس ہی ایک تاک میں لگا رہنے والا فرشتہ تیار رہتا ہے۔

تفسیر: انسان کے منہ سے کوئی بات نکلی خواہ خیر کی ہو یا شر کی، ادھر لکھنے والا فرشتہ فوری نوٹ کر لیتا ہے۔ انسانی اعمال کے لکھنے والے فرشتوں کو "کراماً کاتبین" کہا جاتا ہے۔ یہ فرشتے ہر انسان پر خواہ وہ کافر ہوں یا مسلمان، مسلط کر دیئے گئے ہیں۔ داہنی جانب کا فرشتہ نیکیاں لکھتا ہے اور بائیں جانب کا فرشتہ برے اعمال درج کر لیتا ہے۔ یہی نوشتے حشر کے دن ہر ایک کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں گے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں زبان کی حفاظت کا حکم ہے۔

(انسان کی زبان جیسے نیکیوں کا سرچشمہ ہے، ویسے ہی برائیوں کا پٹارہ بھی ہے۔)

(42) ﴿لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾

[سورة ق: 22]

ترجمة: البتہ تو اس دن سے بے خبر تھا، سو ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ ہٹا دیا، سو آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔

تفسیر: آیت میں کافروں سے خطاب ہے۔ حشر کے دن ان پر غیبی حقیقتیں خوب واضح ہو جائیں گی، ان سے کہا جائے گا کہ دنیا کے مزوں میں پڑ کر آج کے دن سے غافل تھا، تجھ کو دنیا میں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا، آج ہم نے تیری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا ہے اور نگاہ تیز کر دی ہے۔ اب اپنی آنکھوں سے خود ہی دیکھ لے دنیا میں جو باتیں کہی جاتی تھیں، وہ صحیح تھیں یا غلط؟

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں: بلا کسی ریاضت و مجاہدہ کے کشف ہونا کافروں تک کو میسر ہے تو پھر مومن کا یہ مطلوب نہ ہونا چاہیے۔

(43) ﴿فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ﴾

[سورة ق: 39]

ترجمة: سو آپ ان کافروں کی باتوں پر صبر کیجئے اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہیے سورج کے نکلنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے۔

تفسیر: قرآن حکیم کی یہ آیت جب نازل ہوئی کہ ہم نے زمین وآسمان وساری کائنات کو چھ دن میں پیدا کیا ہے اوراس پیدائش میں اللہ کوکوئی زحمت یا مشکلات پیش نہیں آئیں۔

یہودیوں کے شریر عالموں نے مکۃ المکرمۃ کے مشرکوں کو مسلمانوں پر یہ طعنہ دینے کے لیے جملہ کسا: ہفتے کے سات دن میں چھ دن میں تو زمین آسمان پیدا کیے پھر ساتویں دن اللہ نے تھکن سے آرام کیا۔

اس قسم کی بے ہودہ بکواس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو صبر کرنے اوراپنے رب کی تسبیح وتہلیل کرنے کا مشورہ دیا۔

سُلوك: حکیم الامت ؒ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ مصائب ومشکلات کے وقت اللہ کی یاد میں مشغول ہوجانا سکون وتسلی کا قوی ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

ملحوظہ: تخلیق کائنات میں چھ یوم کا یہ شمار انسانی تفہیم کے لیے کیا گیا ہے۔ مقصود تو یہ ہے کہ اتنے عظیم کارخانے کو مختصر وقت میں بنا دیا گیا۔

اعتراض تو ہر تعبیر میں کیا جا سکتا ہے کہ چھ دن کیوں، چار دن میں بھی ہوسکتا تھا۔ اگر دو (۲) دن کہا جائے تو ایک دن میں کیوں ممکن نہ رہا؟ اسی طرح ایک دن بھی کہا جاتا تو اس پر بھی اعتراض ہوسکتا کہ ایک دن کی کیا ضرورت؟ یہ دراصل شیاطینی وساوس ہیں جو حق کو مشتبہ کرنے کے لیے ڈالے جاتے ہیں۔

سُوْرَةُ الذّٰرِيٰت

پارہ: 26

(1) ﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ﴾ [سورة الذاريات: 17]

ترجمۃ: وہ لوگ رات کو بہت کم سوتے ہیں۔

تفسیر: اللہ کے نیک بندوں کا حال بیان کیا گیا ہے کہ ان میں جہاں کئی ایک نیک خصلتیں ہیں، ایک خصلت یہ بھی ہے کہ وہ راتوں کو لہو ولعب، سیر وتفریح، کھیل تماشوں، رنگ رلیوں وفحش کاریوں میں جاگ جاگ کر وقت برباد نہیں کرتے بلکہ رات کا بڑا حصہ ذکر وفکر، تسبیح وتلاوت میں صرف کرتے ہیں۔

اس کے باوجود اپنی عبادت وریاضت کو کوئی بڑا کارنامہ نہیں سمجھتے بلکہ آخر شب استغفار میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اللہ سے معافی ومغفرت طلب کرتے ہیں۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں اہل اللہ کے بعض خصوصی اعمال کا ذکر ہے۔

جو لوگ شب میں نوافل تک کے لیے خصوصی اہتمام کرتے ہوں تو وہ فرائض وواجبات کی ادائیگی میں شب و روز کتنا اہتمام کرتے ہوں گے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ

(2) ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ [سورة الذاريات: 21]

ترجمۃ: (زمین کی پیدائش میں بہت ساری نشانیاں ہیں بلکہ) خود تمہاری ذات میں بھی ہیں۔ کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟

تفسیر: انسان خود اپنے ظاہری واندرونی اعضاء ونظام پر غور کرے تو وہ ضرور قائل ہو جائے گا کہ اس چھوٹے سے عالم کا بنانے والا ایسا حکیم ومدبر ہے تو کائنات کے اس وسیع وعریض نظام کا بنانے والا کیسا کچھ عظیم و قدرت والا ہوگا؟

سلوک: علم تصوف میں انسانی نظام کو عالم اصغر اور آفاقی نظام کو عالم اکبر کہا جاتا ہے۔

ملحوظہ: سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے چند اشعار مروی ہیں:

دَوَاءُكَ فِيْكَ وَمَا تُبْصِرُ ... وَدَاءُكَ فِيْكَ وَمَا تَشْعُرُ

وَأَنْتَ الْكِتٰبُ الْمُبِيْنُ الَّذِيْ ... بِأَحْرُفِهٖ يَظْهَرُ الْمُضْمَرُ

وَتَزْعَمُ أَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيْرٌ ... وَفِيْكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْأَكْبَرُ

(3) ﴿فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ [سورة الذاريات: 50]

ترجمة: سوتم اللہ ہی طرف دوڑو۔ میں تمہیں اللہ کی طرف سے ڈرانے والا ہوں۔

تفسیر: اوپر کی آیات میں مشرک و گمراہ قوموں کے تذکرے اور ان کے انجام کو سنانے کے بعد کہا گیا: اب تو اللہ کی طرف رجوع ہو جانا چاہیے، غفلت و دوری کی بھی ایک حد ہوتی ہے فارسی کا مقولہ ہے: تا بکئے؟

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ فرار کے لفظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ توجہ الی اللہ نہایت ذوق وشوق کے ساتھ ہونی چاہیے (کیونکہ دوڑ میں توجہ وعجلت وتیزی ہوا کرتی ہے)

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝﴾ [سورة الذاريات: 56]

ترجمة: اور میں نے جنات اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

تفسیر: امام تفسیر قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ لِيَعْبُدُوْنِ کے معنی لِيَعْرِفُوْنِ ہیں۔ یعنی انسان وجنات کو اللہ نے اپنی معرفت حاصل کرنے کے لیے پیدا کیا ہے (کہ وہ اللہ کا حق پہچانے)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عبادت بغیر معرفت کے قابل لحاظ نہیں ہوتی، اسی طرح معرفت بھی بغیر عبادت کے حاصل نہیں ہوتی۔

اہل ظاہر علماء نے صرف صورت عبادت کو اختیار کیا ہے اور جاہل صوفیاء نے معرفت کا دعویٰ کیا ہے (دونوں ہی ناقص ہیں)

ملحوظه: آیت میں انسان کی پیدائش کی غرض وغایت بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ کی بندگی واطاعت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بندگی کی کیا حکمت ہے؟ بندگی کیوں کروائی جارہی ہے؟

اس کا ایک جواب تو اہل علم نے ''ابتلاء'' (آزمائش) قرار دیا ہے کہ کون اطاعت پر قائم رہتا ہے تا کہ اس کو انعام دیا جائے (جنت) اور کون انکار کرتا ہے جس کو سزا دی جائے۔ (جہنم)

صوفیاء کرام نے اس کا جواب ''ظہور اسماء الٰہیہ'' لکھا ہے یعنی اس بندگی سے اللہ کی صفات رحم وکرم، فضل و عنایت کا ظہور ہو۔ محل خیر پر فضل وکرم کا ظہور ہو اور محل شر پر نقمت وعذاب کا ظہور ہو۔ (کتاب ''حکیم الامت'' از مولانا عبد الماجد دریا آبادی) ہر دو۲ جواب کی قرآن وحدیث تائید کرتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ﴾[سورة يونس: 14] قوله «لَوْ لَا اَنَّكُمْ تُذْنِبُوْنَ لَخَلَقَ اللهُ خَلْقًا»

(الحدیث، ترمذی جلد: ۲ رصفحہ ۱۹۸)

❀❀❀

سُوۡرَۃُ الطُّوۡرِ

پَارَہ: 27

(۱) ﴿وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَاتَّبَعَتۡهُمۡ ذُرِّيَّتُهُمۡ بِاِيۡمَانٍ اَلۡحَقۡنَا بِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ﴾ [سورة الطور: 21]

ترجمۃ: اور جولوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا ساتھ دیا، ہم ان کے ساتھ ان کی اولاد کو بھی شامل کردیں گے اور ہم ان کے عمل سے کچھ کم نہیں کریں گے، ہر شخص اپنے اعمال کا پابند ہے۔

تفسیر: اہل ایمان کی اولاد اور متعلقین اگر ایمان پر قائم رہیں اور انہی کی راہ پر چلتے رہے ہوں اور جو خدمات ان کے بزرگوں نے انجام دی تھیں، انہوں نے بھی ان کاموں کی تکمیل میں اپنی زندگی بسر کی ہو تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ایسی اولاد کو ان بزرگوں کے ساتھ جنت میں یکجا کردیں گے اگرچہ ان کے اعمال اپنے بزرگوں کے اعمال سے کم تر ہوں۔ اس عزت افزائی میں ان بزرگوں کے اجر وثواب میں کمی نہ کی جائے گی۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ نسبی شرافت آخرت میں کام آئے گی لیکن یہ شرافت دینی وایمانی ہو، دنیوی شرافت مراد نہیں ہے۔

(۲) ﴿يَتَنَازَعُوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا لَّا لَغۡوٌ فِيۡهَا وَلَا تَاۡثِيۡمٌ ۝﴾ [سورة الطور: 23]

ترجمۃ: جنت میں جنتی آپس میں جام شراب پر چھینا جھپٹی کریں گے، وہ شراب ایسی ہوگی جس میں نہ بک بک ہوگی اور نہ کوئی بے ہودہ بات۔

تفسیر: جنتی دوستوں میں دورِ شراب بھی چلے گا۔ بطور خوش طبعی وانبساط ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کریں گے، اس طرح یہ محفل شراب وکباب تفریح اور لطف وسرور کا ذریعہ رہے گی۔

آیت میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ جنت کی یہ شرابیں صرف اور صرف لذت ونشاط وعیش کے لیے ہوں گی۔ اس کے منافی پہلو، نشہ، چکر، متلی، بکواس، عقلی فتور وغیرہ کچھ نہ پیدا ہوگا، نہ کوئی گناہ کی بات ہوگی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ دوستوں میں ہنسی مزاح اور اکل وشرب برا نہیں جیسا کہ زاہدانِ خشک نے اس کو وقار کے خلاف سمجھا ہے۔

آیت سے یہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دوست کی خوش دلی کا علم ہو تو اس کے مال میں تصرف بھی کیا جاسکتا ہے۔ سورۃ النور کی آیت ۶۱ سے اس کی تائید بھی ملتی ہے۔

(۳) ﴿وَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعۡيُنِنَا وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ حِيۡنَ تَقُوۡمُ ۝﴾

[سورة الطور: 48]

ترجمة: اور آپ اپنے رب کی تجویز پر صبر سے قائم رہیئے۔ اس لیے کہ آپ تو ہماری عین حفاظت میں ہیں اور جب اٹھیں تو اللہ کی تسبیح کیا کیجئے۔

تفسیر: آیت کا لفظی ترجمہ تو یہ ہوگا کہ آپ ہماری آنکھوں میں ہیں لیکن اس کلام سے حفاظت و پناہ مراد ہوتی ہے۔(روح المعانی) یعنی آپ اپنے کام میں مشغول رہیئے، آپ کی حفاظت ونصرت ہمارے ذمّے ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سکون وطمانینت کا تعلق ''مراقبۂ حضوری'' سے متعلق ہے۔ جس شخص کو یہ کیفیت نصیب ہو جائے، یہی ایمان کی اعلیٰ صفت ہے جس کو حدیث میں احسان کہا گیا ہے۔

سُورَةُ النَّجْمِ

پارہ: 27

(1) ﴿فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ ۖ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى﴾ [سورة النجم: 32]

ترجمة: سوتم اپنے آپ کو مقدس نہ سمجھو۔ وہی خوب جانتا ہے تقویٰ والوں کو۔

تفسیر: قرآن حکیم کی اہم ترین نصائح میں ایک نصیحت یہ بیان کی گئی ہے کہ اگر اللہ نے تمہیں تقویٰ کی توفیق دی ہے تو شیخی نہ مارو اور اپنے آپ کو بزرگ نہ بناؤ، وہ سب کی بزرگی و پارسائی خوب جانتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنی اصل کو نہ بھولے، جس کی ابتداء ایک ضعیف و ناپاک قطرۂ آب سے تھی پھر بطن مادر کی تاریکیوں میں ناپاک خون سے پرورش پائی پھر دنیا میں اللہ نے اسے بلند مقام دے دیا ہو تو ایسے ضعیف البناء کو سر اونچا کرتے شرم آنی چاہیے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت سے اپنے آپ کو مقدس و بزرگ سمجھنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

(2) ﴿وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ [سورة النجم: 39]

ترجمة: اور انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

تفسیر: انسانی کے عمل کا فائدہ خود اسی کو ملتا ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی دوسرا لے اڑے۔ کرے کوئی، پائے دوسرا، ظلم کا قانون ہے۔

دراصل اس میں یہودیوں کی قدیم بدعقیدگی کی تردید کی گئی ہے۔ ان کے بےعمل عاملوں نے یہ بات عام کردی کہ نیک و بزرگوں کی اولاد سے ہونا نجات کے لیے کافی ہے۔ لہٰذا جو لوگ پیغمبروں کی نسل سے ہیں، انہیں ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت نہیں، اپنے بزرگوں کے ساتھ جنت میں چلے جائیں گے۔

عیسائیوں نے تو نجات کا سارا مدار صلیب کو قرار دیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سولی پر چڑھ کر اپنی امت کی نجات حاصل کرلی ہے۔ جاہل مشرک قوموں میں تو یہ وبا عام ہی رہی ہے۔

قرآن حکیم کی اس آیت نے اس وہم و خیال کی شدت سے تردید کی ہے کہ ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہ آئے گا۔ (معالم، روح المعانی)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عمل سے مقصود اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی خوشنودی حاصل کرنی ہونی چاہیے اور یہ خوشنودی غیر کے عمل سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ خود کو عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اور اگر اللہ کسی کو اپنی طرف سے خوشنودی دینا چاہے تو یہ اور بات ہے۔

سُوْرَةُ الْقَمَر

پارہ: 27

⑪ ﴿تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝﴾ [سورة القمر: 14]

ترجمۃ: (ہم نے نوح کو کشتی میں سوار کر دیا) جو ہماری نگرانی میں چل رہی تھی۔ یہ سب اس شخص کا انتقام تھا جس کی بے قدری کی گئی تھی۔

تفسیر: سیدنا نوح علیہ السلام کو ان کی قوم نے جھٹلا دیا اور سنگسار کر دینے کی دھمکی بھی دیدی تھی۔ انجام قوم کی غرقابی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ تباہی دراصل سیدنا نوح علیہ السلام کو ستانے اور ان کو جھٹلانے کے صلہ میں پیش آئی۔ حقیقت میں یہ اللہ کا انتقام تھا جو حضرت نوح علیہ السلام کے انتقام میں قوم سے لیا گیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کا انتقام خود لیا کرتے ہیں (لہٰذا نیکوں کو اپنے کام میں مشغول رہنا چاہیے، مخالفوں کے ستانے اور پریشان کرنے پر توجہ نہ دینی چاہیے)

⑫ ﴿سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ۝﴾ [سورة القمر: 26]

ترجمۃ: ان کافروں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹا شیخی باز کون ہے؟

تفسیر: سیدنا صالح علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔ آپ نے اپنی قوم کو اپنی رسالت اور توحید کی دعوت دی۔ قوم کے سرداروں نے کہا: ہمارے رہتے ہوئے صالح خود سردار بننا چاہتا ہے۔ کیا سرداری کے لیے ہم کافی نہیں؟ یقیناً صالح جھوٹا و شیخی باز ہے۔ العیاذ باللہ۔

آیت میں اس بکواس کا جواب دیا گیا کہ بہت جلد اس کا فیصلہ ہو جائے گا کہ جھوٹا شیخی باز کون ہے۔
پھر کیا تھا، فرشتے کی صرف ایک چیخ نے ساری قوم کے دل گردے پھاڑ دیئے اور پوری قوم خس و خاشاک میں تبدیل ہو گئی۔ [سورة القمر: 31]

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے ایک نکتہ اخذ کیا ہے کہ جب کسی کی اصلاح سے مایوسی ہو جائے اور وہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو تو جواب میں ایسا عنوان اختیار کرنا چاہیے جو آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ (عنقریب معلوم ہو جائے گا) اہل اللہ اپنے مخالفین کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے ہیں۔

سُوۡرَۃُ الرَّحۡمٰنِ

پارہ: 27

(1) ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ [سورة الرحمن: 13]

ترجمۃ: سو تم اے جن وانس! اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر: دنیا کی ساری نعمتیں انسانوں کے لیے پیدا کی گئی ہیں جن کا شمار انسانی علم سے باہر ہے۔ اتنی کثیر وعظیم نعمتوں کا شکر ادا نہ کرنا بلکہ ان کو بے قدر و قیمت سمجھنا کفرانِ نعمت نہیں تو اور کیا ہے؟

اس سورت میں یہ آیت اکتیس (31) مرتبہ آئی ہے اور ہر موقع پر نئی نعمت کے اظہار پر لائی گئی ہے جیسا کہ آسمانی کتابوں کا طرز ہوا کرتا ہے کہ اہم امور کو بار بار دوہرایا جاتا ہے۔ سیدنا داود علیہ السلام پر نازل شدہ کتاب ''زبور'' میں مناجات ۱۳۶ میں ایک فقرہ ''اس کی رحمت اب تک ہے'' چھبیس (26) مرتبہ آیا ہے۔

سلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا مطلوب ہے۔ یہ عمل زہد اور تعلق مع اللہ کے خلاف نہیں جیسا کہ بعض اہل تقشف نے سمجھ رکھا ہے۔

ملحوظہ: سورت میں اکتیس (31) مرتبہ جن وانس سے مستقلاً خطاب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم میں جنات کا بکثرت ذکر آیا ہے۔ ان صریح آیات سے معلوم ہوا کہ انسانوں کی طرح جنات بھی مستقل مخلوق ہیں لیکن بعض مغربی ذہن یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ جن بھی کوئی مستقل مخلوق ہے، انہوں نے جن کو انسانوں ہی کی شریر قسم قرار دیا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

چونکہ موجودہ فرنگی تحقیقات میں ان عقلمندوں کو جنات کا ثبوت نہیں ملا، لہٰذا جن ون کوئی چیز نہیں ہے۔

اکبر الٰہ آبادی رحمہ اللہ نے ان روشن خیالوں کو یہ جواب دیا ہے:

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز

جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

(2) ﴿یُعۡرَفُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ بِسِیۡمٰهُمۡ فَیُؤۡخَذُ بِالنَّوَاصِیۡ وَالۡاَقۡدَامِ﴾ [سورة الرحمن: 41]

ترجمۃ: مجرم لوگ تو اپنے حلیہ ہی سے پہچان لیے جائیں گے۔ پھر پیشانیوں اور پیروں کے بل پکڑ لیے جائیں گے۔

تفسیر: قیامت کے حشر میں مجرم لوگوں کا چہرہ خود ان کے جرائم کا آئینہ دار ہوگا، پکڑنے والے فرشتوں کو مزید تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہ ہوگی۔ ایسے شریروں اور کپاٹیوں کو پکڑ پکڑ کر جہنم میں اوندھے منہ پھینک دیا جائیگا۔

سُلوك: صوفیاء عارفین نے لکھا ہے کہ دنیا کی زندگی میں گناہ کے نقوش چہرے اور سارے بدن پر مرتسم ہوجاتے ہیں اور آخرت میں یہی نقوش جو آج مخفی ہیں، واضح اور نمایاں ہوں گے۔
(﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ الآیۃ۔ سورۂ کہف کی ایک تفسیر یہ بھی بیان کی گئی ہے۔)

سُورَةُ الوَاقِعَة

پارہ: 27
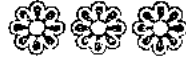
① ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝﴾ [سورة الواقعة: 10 تا 11]

ترجمۃ: اور جو اعلیٰ درجے کے ہیں وہ تو اعلیٰ درجے ہی کے ہیں۔خاص قُرب والے ہیں۔

تفسیر: ان سے حضرات انبیاء کرام اور ان کے بعد اولیاء امت اور متقین کاملین لوگ مراد ہیں۔سابقون کے معنی اپنی اطاعت وعبادت کے لحاظ سے درجہ اول والے۔(روح المعانی)

سلوك: حکیم الامت ﷫ لکھتے ہیں کہ مقربین کا رتبہ عام صلحاء مومنین سے اوپر ہوگا۔اہل تصوف کا یہی مقصود ہوا کرتا ہے کہ وہ مقربین میں شامل ہوں۔

② ﴿لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝﴾ [سورة الواقعة: 79]

ترجمۃ: اس کو وہی چھوتے ہیں جو پاک بنائے گئے ہیں۔

تفسیر: شاہ عبدالقادر صاحب محدث ﷫ لکھتے ہیں کہ وہ کتاب قرآن مجید ہے جس کو فرشتے ہاتھ لگاتے ہیں۔ یعنی لوح محفوظ جس میں قرآن مجید محفوظ کیا گیا ہے،فرشتوں کے سوا جو کہ ہر گناہ سے پاک ہیں،اور کوئی وہاں تک رسائی نہیں پاتا۔

سُلوك: حکیم الامت ﷫ لکھتے ہیں کہ صوفیاء عارفین نے کہا ہے: قرآن کے اسرار و دقائق تک وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو ہوائے نفس کی آلودگیوں سے پاک و طاہر ہیں۔

③ ﴿فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝﴾ [سورة الواقعة: 88 تا 89]

ترجمۃ: سو جو کوئی مقربین میں سے ہوگا،تو اس کے لیے راحت ہے،عمدہ غذائیں اور عیش کی جنت ہے۔

تفسیر: روح و ایمان کے معنی رحمت وخوشبو کے بھی ہیں۔اسی طرح مغفرت واستراحت کے معنی بھی بیان کیے گئے ہیں۔(معالم)

سُلوك: حکیم الامت ﷫ لکھتے ہیں کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا مقرب بندہ وہی ہوتا ہے جس کو اللہ اپنا مقرب بنالے(نہ کہ عام لوگ اس کو مقرب سمجھیں)

❀❀❀

سُوْرَۃُ الْحَدِیْد

پارہ: 27

(1) ﴿ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ﴾

[سورة الحديد: 16]

ترجمۃ: کیا ایمان والوں کے لیے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت اور جو دین حق نازل ہوا ہے، اس کے آگے جھک جائیں اور نہ وہ ان لوگوں کی طرح ہو جائیں جنہیں ان سے پہلے کتاب الٰہی ملی تھی پھر ان پر ایک طویل زمانہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں کے بہت سارے نافرمان تھے۔

تفسیر: اللہ کی کتاب کے آگے دل جھک جانے کا مطلب یہ کہ وعظ ونصیحت کو قبول کرنا اور اس کی اطاعت کرنا، اس میں سستی یا غفلت کو راہ نہ بنا دینا مراد ہے۔ (روح المعانی)

امام اعمش رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مکۃ المکرمۃ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد صحابہ کرام کو معاشی فراخی اور آرام ملا۔ بعض صحابہ میں عمل کی وہ جدوجہد کچھ کمزور پڑ گئی جس کی انہیں عادت تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کو "آیت عتاب" کہا کرتے تھے۔ (رواہ ابن ابی حاتم)

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سب سے پہلے جو چیز اٹھالی جائے گی، وہ دل کا خشوع ہے۔ (ابن کثیر) یعنی اللہ کی طرف جھکنے کے لیے آمادہ ہی نہ ہو، قرآن حکیم نے ایسی کیفیت کو دلوں کا زنگ قرار دیا ہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت سے تین (3) باتیں معلوم ہوتی ہیں:

1. خشوع کا لزوم اور دوام (یعنی دل کی نرمی اور اس کی بقاء کا اہتمام)۔
2. طول غفلت سے دل میں قساوت (تنگی) پیدا ہو جاتی ہے۔
3. دل کی قساوت ذکر اللہ کی کثرت سے دور ہو جاتی ہے۔

(2) ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ﴾ [سورة الحديد: 19]

ترجمۃ: اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں، وہی لوگ اپنے رب کے ہاں صدیق وشہید ہیں۔ ان کے لیے ان کا خاص اجر وثواب اور ان کا خاص نور ہوگا۔

تفسیر: اہل ایمان یعنی مومنین اللہ کے ہاں صدیق اور شہید شمار کیے جاتے ہیں۔ صدیق ایسے مومن کو کہا جاتا ہے

جس کے ہر عمل میں سچائی واخلاص ہو اور شہید کے معنی حق کی گواہی دینے والا (یعنی توحید کا اقرار کرنا سب سے بڑی گواہی ہے)۔ لہٰذا جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں، وہ صدیق بھی ہیں اور شہید بھی ہیں کیونکہ ان لوگوں نے ایمان قبول کر کے حق کی شہادت دی اور سچائی پر قائم رہے ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مومنین کو صدیق اور شہید قرار دینا اس بات کی علامت ہے کہ صدیقین میں بھی مراتب اور درجات ہیں اور صدیقیت کا سب سے ادنیٰ درجہ مومن کو حاصل ہے جیسا کہ تلاوت عامہ کا ادنیٰ درجہ ہر مومن کو حاصل ہے۔ [سورة البقرة: 257]

﴿لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ﴾ [سورة الحديد: 23]

ترجمة: (یہ بات معلوم ہو جائے) تاکہ جو چیز تم سے لی جا رہی ہے، اس پر تم رنج نہ کرو اور جو چیز اس نے تم کو دی ہے اس پر اتراؤ نہیں۔ اور اللہ کسی بھی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔

تفسیر: انسان کو اپنی زندگی میں جو بھی حالت پیش آتی ہو خواہ وہ خیر ہو یا شر "لوح محفوظ" میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ اطلاع اس لیے دی جا رہی ہے کہ دکھ و مصیبت یا ناموافق حالات پیش آنے پر غم نہ ہو اور راحت و چین کے وقت شیخی نہ ہو بلکہ اللہ کا شکر ادا ہو۔ کیونکہ جب انسان کا خیر و شر مقدر ہو چکا ہے تو پھر غم و صدمہ کرنے اور اس طرح اترانے و شیخی کرنے سے کیا حاصل؟

آیت میں تقدیر پر ایمان رکھنے کا فائدہ بیان کیا گیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں حزن و غم کا علاج بتایا گیا ہے کہ ایسے وقت تقدیر کو یاد کر لیا جائے، رنج و غم دور ہو جائیں گے۔

﴿الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ﴾ [سورة الحديد: 24]

ترجمة: وہ لوگ ایسے ہیں جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے ہیں۔

تفسیر: آیت میں اترانے والے اور شیخی باز انسان کی عادت بیان کی گئی ہے کہ وہ بخیل ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیا کرتا ہے۔

بخل کے معنی حق اللہ اور حق العباد کو ادا نہ کرنا۔ آیت میں خصوصیت سے اشارہ ہے کہ ضروری طاعات میں خرچ کرنے سے رک جانا اللہ کے یہاں ناپسندیدہ اور مردود ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ حب دنیا ایسی بری چیز ہے کہ اس سے اکثر بری صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً شان و تکبر، بخل و غفلت وغیرہ۔

﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ﴾ [سورة الحديد: 27]

ترجمۃ: اور رہبانیت کو ان لوگوں نے خود ایجاد کر لیا تھا، ہم نے ان پر مقرر نہیں کیا تھا۔

تفسیر: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھا لیے جانے کی ابتدائی صدیوں میں ان کے علماء اور مشائخ نے رہبانیت اختیار کر لی تھی۔

رہبانیت سے ترک لذات، ترک حیوانات، ترک نکاح، ترک طہارت، ترک اختلاط، ترک دنیا، گوشہ نشینی، صحرانوردی وغیرہ جیسے نامانوس اعمال مراد ہیں اور ان اعمال کو ان لوگوں نے مقدس اور عند اللہ بلند درجہ قرار دے لیا تھا۔

آیت سے پہلے تو یہ واضح کیا ہے کہ اللہ نے ایسے اعمال مقرر ہی نہیں کیے تھے کیونکہ ترک دنیا کا فلسفہ الٰہی تعلیم کے مطابق بھی نہ تھا بلکہ یہ تمام تر انسانی اختراع تھی جو بے علمی و کم علمی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی، اسلام میں رہبانیت کی اجازت نہیں ہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ صوفیاء نے لکھا ہے کہ سلوک و تصوف سے مقصود رضائے الٰہی ہے نہ کہ مراتب و درجات عالیہ کا حصول (جیسا کہ بعض نادان خیال کرتے ہیں)۔

سُوْرَةُ الْمُجَادِلَةِ

پارہ: 28

① ﴿وَ الَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا﴾ [سورة المجادلة: 3]

ترجمة: اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ''ظہار'' کرتے ہیں پھر اپنی کہی ہوئی بات کی تلافی کرنا چاہتے ہوں تو ان کے ذمے ایک غلام آزاد کرنا ہے میاں بیوی کے ملنے سے پہلے۔

تفسیر: اسلام سے پہلے عورتوں کو طلاق دینے کا ایک طریقہ ''ظہار'' تھا اور اس کا یہ طریقہ تھا کہ اپنی بیوی کو اپنی ماں کہہ دینے یا ماں بہن کے کسی پوشیدہ حصہ جسم سے اپنی بیوی کے جسم کو تشبیہ دینے پر حرام ہو جایا کرتی تھی۔ مثلاً کسی نے اپنی بیوی سے کہا: اَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ اُمِّيْ (تو میرے حق میں ایسی حرام ہے جیسے میری ماں کی پشت مجھ پر حرام ہے)۔ اس طرح کہنے پر ظہار کا حکم لاگو ہو جاتا تھا، پھر اگر اپنے اس قول سے رجوع کرنا چاہے تو ظہار کا کفارہ دینا پڑے گا، اس کے بعد بیوی اپنی سابقہ نکاحی حالت پر لوٹ آجائے گی۔ کفارہ کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیکھ لی جائے۔

اسلام میں بھی یہ طریقہ برقرار رکھا گیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں ظہار کے اس کفارہ کو موجب وعظ و زجر قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ نفس کی اصلاح میں مالی بار کو بھی دخل ہے۔

مشائخ طریقت نے اس تدبیر سے یہ اخذ کیا ہے کہ مریدوں پر ان کے کسی جرم یا غفلت کی وجہ سے مالی جرمانہ عائد کیا جائے تا کہ انہیں نصیحت و تنبیہ ہو۔

ملحوظه: بعض دنیادار مرشدوں نے اس بہانے اپنے مریدوں سے ہر ماہ نذرانہ وصول کیا ہے۔

② ﴿وَ اِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ﴾ [سورة المجادلة: 8]

ترجمة: اور جب یہ لوگ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو ایسے لفظ سے سلام کرتے ہیں جس سے اللہ نے آپ کو سلام نہیں کیا ہے۔

تفسیر: منافقین کی عادت کا ذکر ہے کہ پہلے تو یہ مجلس رسول میں بہت کم آتے ہیں اور جب آتے ہیں تو شرما حضوری میں آپ کو سلام کر دیتے ہیں لیکن سلام کے وہ معروف الفاظ استعمال نہیں کرتے بلکہ زبان موڑ توڑ کر السلام علیکم کے بجائے السام علیکم کہتے ہیں۔ (یعنی تم پر موت آئے)

سُلوك: تفسیر ماجدی کے مفسر نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ مسلمانوں میں آج کل سلام کرنے کے جو غیر اسلامی الفاظ رائج ہو گئے ہیں مثلاً آداب عرض ہے، کورنش، بندگی، آداب آداب اور عربوں میں صباح الخیر، صباح النور وغیرہ اور اس سے بڑھ کر ہندوستان میں جے ہند، نمستے وغیرہ، یہ سب تعبیرات غیر اسلامی ہیں، ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔

﴿وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ [سورة المجادلة: 9]

ترجمة: اور نیکی و پرہیزگاری کی باتوں کی سرگوشی کیا کرو۔

تَفسِیر: آیت میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی جارہی ہے کہ جب کسی سے سرگوشی کرنی ہو تو گناہ یا ظلم اور رسول کی نافرمانی کے بارے میں سرگوشی کرنی جائز نہیں ہے، نیکی اور تقویٰ کی باتوں میں سرگوشی کرنی چاہیے۔

ضرورت کے وقت مسلمانوں کو سرگوشی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ گناہ کی بات نہیں البتہ فساد و بگاڑ کے لیے منصوبہ بنانا حرام ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ شیخ کو تخلیہ میں تعلیم و گفتگو کرنے کی اجازت مفہوم ہوتی ہے۔ (جیسا کہ بعض مشائخ کا طریقہ رہا ہے)

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا﴾ [سورة المجادلة: 11]

ترجمة: اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تو جگہ کھول دیا کرو، اللہ تمہیں (جنت میں) کھلی جگہ دے گا اور جب کہا جائے: اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔

تَفسِیر: مجلس کے آداب بیان کیے گئے ہیں کہ صدر مجلس کو ہدایات دینے کے اختیارات ہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ شیخ طریقت اپنی مجلس اور ملاقات کے کچھ آداب و ضوابط مقرر کر دے تو آیت سے اس کی تائید نکلتی ہے۔

علاوہ ازیں شیخ کے لیے جائز ہے کہ اپنے اصحاب کے درمیان خواص اور عوام کے فرق کی رعایت رکھے۔

﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ﴾ [سورة المجادلة: 19]

ترجمة: ان پر شیطان چھا گیا ہے سو اس نے اللہ کی یاد انہیں بھلا دی۔

تَفسِیر: منافقوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مخالفت رسول اور غفلت و نسیان اور مسلمانوں کے خلاف سرگوشیاں، یہ ان کے ایسے اعمال تھے جس نے اللہ کی یاد سے انہیں غافل کر دیا تھا پھر احکام الٰہی بھول بیٹھے۔

حقیقت یہ تھی کہ شیطان ان پر مسلط ہو گیا اور اس نے انہیں حق کی راہ سے دور کر دیا۔ یہ سب شیطانی جماعت کے کارندے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ شیطانی طاقت بہت جلد مغلوب بھی ہو جاتی ہے۔

سلوک: حکیم الامت ؒ لکھتے ہیں کہ اگر کبھی اللہ کی یاد سے بھول یا غفلت محسوس ہو تو فوری ذکر اللہ کر کے اس کا تدراک کر لیا جائے کیونکہ یہ غفلت شیطان کے غلبہ کا اثر ہے۔

سُوْرَةُ الْحَشْر

پَارَہ: 28

(1) ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ﴾ [سورۃ الحشر: 2]

ترجمۃ: اللہ وہی تو ہے جس نے کفار اہل کتاب (یہودیوں کو) ان کے گھروں سے پہلے اکٹھا کر کے نکال دیا۔ تمہارا گمان بھی نہ تھا کہ وہ نکلیں گے اور خود ان کا بھی یہ خیال تھا کہ ان کے مضبوط قلعے ان کو اللہ کی گرفت سے بچالیں گے۔ سو اللہ کا عذاب ان پر ایسی جگہ سے پہنچا کہ انہیں خیال بھی نہ تھا۔

تفسیر: کفار اہل کتاب سے مراد مدینہ طیبہ کے مشہور قبیلہ بنونضیر والے یہودی ہیں۔ یہ قبیلہ مدینہ طیبہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا، دولت مند، طاقت وقوت والے تھے، ان کو اپنی دولت وحشمت پر ناز تھا۔

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو منجملہ اور قبائل اس قبیلہ سے بھی معقول شرائط پر صلح کر لی تھی لیکن یہ بد باطن لوگ دو (2) مرتبہ عہد شکنی کیے جن میں ایک سازش آپ کے قتل کی بھی تھی۔

آخر ان کی غداریوں کی وجہ سے آپ ﷺ نے انہیں دس دن کی مہلت دی کہ اپنے ضروری سامان (بجز اسلحہ) لے کر قلعہ خالی کر دیں اور شہر چھوڑ دیں ورنہ شہر بدر کر دیے جائیں گے۔

لیکن بنونضیر نے اپنے قلعوں سے نکلنے کا انکار کر دیا لیکن آپ ﷺ نے ان پر لشکر کشی کی اور ان کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا پھر وہ بے بس ہو کر باہر نکل آئے اور ملک شام اور خیبر کی طرف منتقل ہو گئے۔

(تفصیل "ہدایت کے چراغ" جلد ۲ میں دیکھئے)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تدابیر میں مستقل تاثیر وقوت نہیں کہ وہ کامیاب ہوں، عارفین کا مزاج بھی یہی ہوا کرتا ہے۔

(2) ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [سورۃ الحشر: 9]

ترجمۃ: اور وہ مقدم کرتے ہیں ان کو اپنی جانوں پر اگر چہ خود فاقہ ہی میں ہوں اور جو اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا گیا، سو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

تفسیر: انصار مدینہ کی تعریف کی جارہی ہے کہ یہ لوگ اپنے مہاجرین بھائیوں کے ساتھ جس ایثار وقربانی کا معاملہ کیا ہے، وہ ان کے ایمان واخلاص کی علامت ہے۔ مہاجرین کے تقاضوں کو پہلے پورا کیا اور خود فاقہ وتنگی اختیار کی حتیٰ کہ ان میں فکر تک پیدا نہ ہونے دی۔

سُلوك: آیت سے ایثار کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے (اپنی ضرورتوں کو دبا کر دوسروں کی ضرورتوں کو پوری کرنا) لیکن اس میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس ایثار سے کوئی شرعی واجب فوت نہ ہوتا ہو۔

حکیم الامت رحمہ اللہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جو بخل وحرص، جبلی وطبعی ہو، وہ بری نہیں۔ بری طمع وہ ہے جو غیر شرعی ہو (جیسے سود، رشوت، حرام کاروبار سے نفع در نفع حاصل کرنا)

﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا﴾ [سورة الحشر: 10]

ترجمة: اور ان لوگوں کا بھی حق ہے جو ان کے بعد آئے، وہ یہ دعا کرتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔

تفسیر: صحابہ کرام کی تعریف وتوصیف بیان کی گئی ہے کہ یہ دونوں مہاجرین وانصار ایسے لوگ ہیں کہ اپنے سے پہلے اور بعد والے لوگوں کو دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں اور ان سے محبت رکھتے ہیں۔

سُلوك: حضرات صوفیاء کے ہاں اپنے بزرگوں کے لیے دعائے خیر کرتے رہنا معمولات میں شامل ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ [سورة الحشر: 18]

ترجمة: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ لے کہ اس نے کل (آخرت) کے لیے کیا بھیجا ہے۔

تفسیر: قرآن حکیم کی یہ جامع آیت جس میں فکر آخرت کا عظیم درس ہے، اس سے بہتر اور کوئی درس نہیں۔ انسان کو اسی زندگی میں یہ طے کر لینا ہے کہ وہ آخرت کی زندگی کے لیے طاعات وعبادات کا کتنا ذخیرہ اب تک بھیج چکا ہے، آج عمل ہے لیکن کل صرف اور صرف حساب ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے "مراقبہ" کی اصل ثابت کی ہے۔ (جو تصوف میں بکثرت رائج ہے)

سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَة

پارہ: 28

﴿إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾

[سورة الممتحنة: 1]

ترجمة: اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے اور میری رضا جوئی کی طلب میں نکلے ہو تو تم ان سے چپکے چپکے محبت کرتے ہو حالانکہ وہ لوگ حق کا انکار کر چکے ہیں۔

تفسیر: آیت کا پس منظر یہ ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ (یمنی ثم مکی) ایک بدری صحابی تھے۔ خود تو مکۃ المکرمۃ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آ گئے تھے لیکن سارا خاندان جو اپنے سابقہ مذہب پر قائم تھا، مکۃ المکرمۃ ہی میں موجود رہا۔ فتح مکہ سے چند دن پہلے انہوں نے اپنے خاندان والوں کو خاص طور پر بعض سر برآوردہ لوگوں کو خط لکھا کہ مسلمان عنقریب مکۃ المکرمۃ پر حملہ کرنے والے ہیں، ہوشیار خبردار رہو۔ یہ خط ایک خاتون کے ذریعہ مکۃ المکرمۃ روانہ کر دیا۔ یہ عورت شہر سے باہر نکلی ہی تھی کہ جبرئیل امین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس راز کی اطلاع دی اور وہ مقام بھی بتا دیا جہاں وہ عورت تیزی سے جا رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کو اس کی گرفتاری کے لیے روانہ کیا۔ وہ عورت پکڑ کر لائی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا اور حقیقت جاننا چاہی۔ حاطب رضی اللہ عنہ نے اس خطا کا اعتراف کیا اور یہ بھی عرض کیا: یا رسول اللہ! میری نیت بری نہ تھی اور نہ میں نے اسلام سے بغاوت کی ہے۔ میں نے تو محض یہ خیال کر کے لکھا تھا کہ بہر صورت اللہ آپ کو فتح نصیب کرے گا اور مکۃ المکرمۃ اسلام کے تحت آ جائے گا۔ البتہ میری اس اطلاع سے اہل مکہ میرے کچھ مہربان ہو جائیں گے اور کم از کم میرے خاندان والوں کا پاس و لحاظ رکھیں گے کیونکہ غیر ملکی لوگ ہیں، اہل مکہ میں ان کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ یا رسول اللہ! بس اس سے زیادہ اور کوئی غرض نہ تھی۔

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ جو فیصلہ فرمائیں گے، حاطب (رضی اللہ عنہ) اس کو دل و جان سے قبول کرنے کو تیار ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حسن نیت کی تصدیق فرمائی اور انہیں معاف کر دیا۔ اسی واقعہ پر مذکورہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو عام ہدایت کی گئی کہ ایمان لانے کے بعد کفر اور اہل کفر سے ساز باز کرنا درست نہیں۔ جو کوئی ایسے تعلقات قائم کرے گا، وہ راہِ حق سے دور گر پڑے گا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حقیقی محبت کے بعد اس کے مخالف سے قطع تعلق کرنا

ضروری ہے۔

(ایمان واسلام اور کفر وشرک آگ پانی کی طرح متضاد ہیں۔ آگ، پانی کو اڑادیتی ہے اور پانی، آگ کو بجھادیتا ہے، کافروں سے دوستی ایمانی غیرت کے خلاف ہے۔)

② ﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ﴾ [سورة الممتحنة: 8]

ترجمۃ: اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں لڑے نہیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا نہیں۔ بے شک اللہ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تفسیر: ہجرت کے بعد مکۃ المکرمۃ میں چند ایسے بھی لوگ تھے جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن ان سے اسلام اور مسلمانوں کو کوئی نقصان یا حرج نہیں پہنچا تھا۔ یہ مرنج مرنجان قسم کے لوگ تھے، مسلمانوں کو مکۃ المکرمۃ سے باہر کرنے میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔

آیت میں ایسے ہی قسم کے کافروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

اسلام کی یہ تعلیم نہیں کہ اگر کافروں کی ایک جماعت نے مسلمانوں کو ستایا ہو تو دوسرے تمام کافروں کو ستایا جائے۔ ایسا کرنا حکمت اور انصاف کے خلاف بھی ہے۔

سلوک: حکیم الامت ﷫ نے لکھا ہے کہ بعض بزرگوں کی وہ عادت جو کافروں کے ساتھ نرمی اور مہربانی برتنے کی نقل کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے کافروں کے ہدایات، تحفہ جات بھی قبول کیے ہیں۔

③ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ﴾ [سورة الممتحنة: 10]

ترجمۃ: اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں (دار کفر سے) ہجرت کر کے آجائیں تو تم ان کے ایمان کا امتحان لیا کرو۔ اللہ تو ان کے ایمان سے خوب واقف ہے۔ بس اگر تم جان لو کہ یہ مسلمان ہیں تو پھر انہیں (ان کے کافر شوہروں) کی طرف واپس نہ کرو۔ ایسی عورتیں نہ کافروں کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ کافروں کے لیے حلال ہیں۔

تفسیر: دلوں کا حال تو اللہ خوب جانتا ہے لیکن ظاہری طور پر ان عورتوں کی جانچ کر لیا کرو، آیا وہ واقعی مسلمان ہیں اور صرف اسلام کی خاطر انہوں نے وطن چھوڑا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ سیدنا عمر ﷛ ایسی عورتوں کا امتحان لینے پر مقرر تھے اور پھر رسول اللہ ﷺ کی جانب سے انہیں بیعت بھی کر لیا کرتے اور کبھی خود آپ ﷺ بنفس نفیس بیعت فرمالیا کرتے تھے۔

بہر حال ایسی خواتین کو مدینہ منورہ میں مسلمانوں سے نکاح کرنے کی اجازت دیدی جاتی تھی کیونکہ اختلاف دین سے ان کے کافر شوہروں کے نکاح باطل ہو چکے تھے، اب یہ مسلمان خواتین اپنے پہلے شوہروں کے لیے حلال نہ تھیں۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا﴾

[سورة الممتحنة: 12]

ترجمة: اے نبی! جب مسلمان عورتیں آپ کے پاس بیعت کرنے آئیں اس بات پر اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھرائیں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو مار ڈالیں گی اور نہ کوئی بہتان کی اولاد لائیں گی جسے انہوں نے اپنے آپ گھڑ لیا ہو (یعنی ولد الزنا) اور نہ کسی نیک کام میں آپ کی نافرمانی کریں گی تو آپ ﷺ ان کو بیعت کر لیا کیجئے اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کیا کیجئے۔ بے شک اللہ بڑی مغفرت والا، بڑی رحمت والا ہے۔

تفسیر: عورتوں پر جیسے جمعہ، جماعت فرض نہیں، ایسے ہی جہاد بھی فرض نہیں۔ یہ اعمال مردوں پر ضروری ہیں۔ البتہ ہنگامی حالات میں امیر المومنین عام جہاد کا حکم جاری کر دیں تو پھر بلا استثناء سب پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ (تفصیل کتب فقہ میں دیکھ لی جائے یا کسی عالم سے دریافت کر لی جائے۔)

عورتوں کا جہاد، بیعت علی الاعمال قرار دیا گیا ہے جس کا تذکرہ آیت مذکورہ آیت میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بیعت کے اغراض و مقاصد کے بارے میں مذکورہ آیت واضح بیان کرتی ہے (اور یہ سارے احکام مرد اور عورتوں دونوں میں مشترک ہیں)۔

علاوہ ازیں آیت سے اس رسمی بیعت کا غلط ہونا بھی ثابت ہوتا ہے جس میں عمل کا اہتمام ہی نہ ہو۔

(صرف رسمی پیری مریدی ہوا کرتی ہے، ایسی بیعت فریب، دھوکہ اور نفع خوری کے سوا کچھ بھی نہیں۔)

حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ بھی اخذ کیا ہے کہ مرید کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اس کا شیخ و مربی اس کی اصلاح و فلاح کے لیے دعا کیا کرے۔

سُوْرَةُ الصَّفِّ

پارہ: 28

① ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾ [سورة الصف: 2]

ترجمۃ: اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے ہاں یہ بات سخت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

تفسیر: اسلام ہر مسلمان کو عملی انسان، سیرت کا پختہ اور کردار کا سچا مجاہد بنانا چاہتا ہے۔ نفاق (دو ۲ رخی) بلکہ شک وشبہ سے بھی دور رکھنا چاہتا ہے، اس لیے وہ قول وعمل کی ایک نیت پر شدت سے ہدایات دیتا ہے۔

مدینہ طیبہ میں بعض مسلمانوں نے آپس میں کہا تھا کہ اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں فلاں عمل اللہ کے یہاں محبوب تر ہیں تو ہم ان کو ضرور اختیار کرلیں گے حالانکہ اس سے پہلے معرکۂ احد میں بعض حضرات ثابت قدم بھی نہ رہ سکے تھے، آیت میں اسی پر گرفت کی جارہی ہے۔ (مظہری)

سُلوک: اہل علم کہتے ہیں کہ آیت سے معلوم ہوا کہ واعظ اور داعی کے لیے باعمل ہونا اور زیادہ ضروری ہے البتہ آیت سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ بے عمل یا ضعیف العمل کو وعظ ونصیحت کرنا درست نہیں، آیت عمل کی اہمیت وضرورت کو اجاگر کرتی ہے نہ کہ علم کی مذمت کرتی ہے۔ فَافْهَمْ

② ﴿ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ﴾ [سورة الصف: 5]

ترجمۃ: اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم کے لوگو! تم مجھے کیوں ایذا دیتے ہو؟ حالانکہ تم کو خوب معلوم ہے کہ میں صرف اللہ کا تمہاری طرف بھیجا ہوا رسول ہوں۔

تفسیر: قوم بنی اسرئیل کی پوری تاریخ یہ شہادت دیتی ہے کہ انہوں نے اپنے رسولوں کے ساتھ برا سے برا سلوک کیا ہے، ستانا پریشان کرنا تو درکنار، ضرب وقتل سے بھی نہیں چوکے۔ طبقۂ انبیاء میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو جتنا ستایا گیا، اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے یہی شکایت کررہے ہیں کہ لاعلمی اور ناواقفی میں کسی کو پریشان کرنا اور بات ہے لیکن تم لوگ تو میری نبوت ورسالت کو جانتے پہچانتے انکار کررہے ہو اور ایذاء دہی کے جرم میں مبتلا ہو۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اپنے شیخ ومرشد کو ایذاء دینا بھی اسی قبیل سے ہے۔ (اپنا استاذ شیخ نبی کا نائب وجانشین ہوا کرتا ہے۔)

۞ ﴿وَأُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۖ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ﴾ [سورة الصف: 13]

ترجمة: اور ایک نعمت اور بھی ہے جس کو تم پسند کرتے ہو (یعنی) اللہ کی ایک مدد اور قریبی فتح۔

تفسیر: اصل اور بڑی کامیابی تو وہی ہے جو آخرت میں ملے گی جس کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی البتہ دنیا کی زندگی میں بھی جو نعمت تم کو محبوب و پسند ہے یعنی اللہ کی کھلی مدد اور قریبی فتح، وہ بھی تمہیں حاصل ہوگی۔ اس قریبی فتح سے دولت مند یہودیوں کا شہر خیبر اور ملک عرب کی شہ رگ مکۃ المکرمۃ مراد ہیں جو اس خوشخبری کے بعد مسلمانوں کے اقتدار میں آگئے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ جس دنیا سے دین کو تقویت ملے، ایسی دنیا طلبی مذموم نہیں، اس کو طلب کیا جا سکتا ہے (البتہ وہ دنیا طلبی مذموم ہے جس سے دین کو نقصان پہنچتا ہو۔)

سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ

پَارَہ: 28

① ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ [سورة الجمعة: 2]

ترجمة: اللہ وہی ہے جس نے امی لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور (برائیوں سے) پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے جب کہ یہ پہلے سے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

تفسیر: اُمّیّین (ان پڑھ) اہل عرب کو کہا گیا ہے جن میں نہ علم وہنر تھا، نہ کوئی آسمانی کتاب۔ معمولی پڑھنا لکھنا بھی نہیں جانتے تھے۔ ان کی ناواقفی اور بے علمی ضرب المثل تھی۔ اللہ کو بالکل بھولے ہوئے، بت پرستی میں مبتلا، فسق وفجور میں ڈوبے ہوئے، اس کے باوجود اپنے آپ کو ملت ابراہیمی پر قائم سمجھے ہوئے تھے۔ ایسی بے راہ وتاریک قوم میں اللہ نے انہی میں سے ایک رسول اٹھایا جس نے عرب ہی سے نہیں بلکہ سارے عالم سے جہالت وگمراہی کے نقوش مٹا دیے اور عالم کو علم وحکمت، دیانت وصداقت کے سیراب کر دیا، حق وباطل جُدا جُدا ہو گئے اور انسانوں میں اخلاق وکردار کے رہنما پیدا کیے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ ولایت کا امّیت کے ساتھ جمع ہونا ممکن ہے (یعنی امی شخص بھی ولی ہو سکتا ہے۔) البتہ ایسے شخص کو شریعت کا ضروری علم لازم ہے خواہ وہ علم علماء کی صحبت و مجلسوں سے حاصل کیا ہو)

② ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [سورة الجمعة: 5]

ترجمة: جن لوگوں کو کتاب تورات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا تھا پھر انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا، ان کی مثالیں اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں سے لدا ہوا ہو۔

تفسیر: جس طرح کتابوں کے بوجھ سے لدا ہوا گدھا علم کے نفع سے محروم ہے، اسی طرح یہ بے عمل لوگ بھی علم کے باوجود علمی نفع سے محروم ہیں، محرومیت میں بے عمل انسان اور گدھا برابر ہو گئے۔

سُلوك: قرآنی مثال سے بے عملی کی مذمت ثابت ہوتی ہے، علم کی مذمت نہیں۔ علم بہر حال اللہ ہی کا نور ہے (یعنی آیت میں بے عمل عالموں کی مذمت کی گئی ہے، عالموں کی نہیں)۔

(سلوک ۵۴۷ پھر ایک بار دیکھ لیا جائے)

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ [سورة الجمعة: 6]

ترجمة: آپ کہہ دیجئے: اے یہودی ہونے والو! اگر تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم ہی بلاشرکت غیر اللہ کے چہیتے ہو تو پھر موت کی تمنا کر دکھاؤ اگر تم سچے ہو۔

تفسیر: یہودیوں کے بد عمل عالموں نے آہستہ آہستہ یہ عقیدہ عام کر دیا تھا کہ ہم چونکہ نبیوں کی اولاد سے ہیں، لہٰذا ہماری یہ فضیلت ضائع نہ جائے گی، ہمیں کچھ زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں، ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔ بھلا کسی دوست نے دوست کو عذاب بھی دیا ہے؟

آیت میں اس زعم کا جواب دیا گیا ہے کہ جب تم اللہ کے دوست ہو تو دوست سے ملاقات کرنے کے لیے موت کی تمنا کرو کیونکہ یہ تمنا بغیر موت کی پوری نہ ہوگی۔

بعض تفسیری روایات میں یہ بات مذکور ہے کہ اگر ان میں سے کوئی یہودی موت کی تمنا کر گزرتا تو اسی وقت اس کے گلے میں غیبی پھندا پڑ جاتا اور وہ ہلاک ہو جاتا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے موت کی تمنا کرنا چھوڑ دیا اور موت سے سخت خوف اور نفرت کرنے لگے تھے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ لقاء رب کے لیے موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت میں شمار کیا گیا ہے (جیسا کہ بعض صحابہ اور نبیوں نے بھی تمنا کی ہیں، البتہ دنیا کے رنج و غم سے موت کی تمنا کرنا ممنوع اور برا ہے)

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ [سورة الجمعة: 10]

ترجمة: پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین پر چلو پھرو اور اللہ کی روزی تلاش کرو۔

تفسیر: نماز سے جمعہ کی نماز مراد ہے۔ یہ جمعہ کی نماز کا خاص حکم ہے کہ جب اس کی اذان دی جائے تو ہر مسلمان کو چاہیے کہ جس حال میں اور جس مشغولیت میں ہو، چھوڑ کر مسجد کا رخ کرے، کاروبار کرنا یا بات چیت میں مشغول رہنا منع ہو جاتا ہے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ حکم نماز کا وقت شروع ہوتے ہی لاگو ہو جاتا ہے خواہ اذان ہو یا نہ ہو۔ چونکہ اذان وقت پر ہی دی جاتی ہے، اس لیے اذان کے ساتھ ہی کاروبار بند کر دینا ضروری ہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آیت سے مریدین کی کیفیت تربیت کی طرف اشارہ ہے جب ان سے کوئی غلطی ہو جائے۔

❀ ❀ ❀

سُوْرَةُ الْمُنَافِقُوْنَ

پارۃ: 28

⑪ ﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا﴾

[سورة المنفقون: 7]

ترجمة: یہی لوگ تو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جمع ہیں، ان پر کچھ خرچ نہ کرو یہاں تک کہ یہ اپنے آپ ہی منتشر ہو جائیں گے۔

تفسیر: یہ کمینی بات کہنے والے مدینہ کے منافقین تھے۔ یہ اپنے مسلمان پڑوسیوں سے کہا کرتے تھے کہ تم نے مکہ کے ان غریب وفقیر مسلمانوں کو اپنے یہاں پناہ دے کر اپنے سر چڑھالیا ہے، ان کا خرچہ بند کر دو جو انہیں مدد کے طور پر دیا کرتے ہو۔ یہ خود بخود دور ہو جائیں گے۔ کہاں کا اسلام اور کہاں کی خیر خواہی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اطراف ان کا جمگھٹا اور ہجوم سب کچھ ختم ہو جائے گا، یہ مال و دولت کے حرص میں جمع ہیں۔ ﴿لَعْنَتَ اللهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ﴾

سلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مال و دولت کی کمی کے باعث اہل اللہ کو حقیر اور بے قدر سمجھنا اپنی حماقت کا اظہار کرنا ہے۔ (بزرگی ایک بڑی نعمت ہے اور مال و دولت اور شی ہے۔)

سُورَۃُ التَّغَابُن

پارہ: 28

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ﴾ [سورة التغابن: 11]

ترجمة: کوئی بھی مصیبت اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی۔ اور جو شخص اللہ پر کامل یقین رکھتا ہے، اللہ اس کے قلب کو (صبر و رضا کی) راہ دکھا دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

تفسیر: ایمان باللہ میں تاثیر یہی ہے کہ وہ قلب کو تسلیم و رضا کا راستہ دکھاتا ہے، جس کا ایمان جس قدر بھی مضبوط اور بلند ہوگا، ہجوم مصائب میں اسی قدر سکون قلب اور اطمینان حاصل ہوگا۔

وہ ناموافق حالات سے ناامید نہیں ہوتا، اس کی نظر اللہ کی قدرت و رحمت پر رہتی ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ جس ذات نے ناموافق حالات پیدا کیے ہیں، موافق حالات پر بھی قادر ہے۔ وہ جہاں حاکم ہے، حکیم بھی ہے، ہمارے لیے جو مناسب تھا، وہ فیصلہ کیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ آیت کی تفسیر لکھ کر اعلان کرتے ہیں کہ تجربہ کی بات ہے جو چاہے تجربہ کر دیکھے۔

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ [سورة التغابن: 16]

ترجمة: سو جہاں تک ہو سکے، اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کے احکام کو سنو اور مانو اور خرچ بھی کرتے رہو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔

تفسیر: اللہ نے مال و دولت دے کر تمہیں جانچا ہے کہ کون ان فانی و زائل چیزوں میں پھنس کر آخرت کی باقی و دائمی نعمتوں کو بھول جاتا ہے اور کس نے ان سامانوں کو آخرت کا ذخیرہ بنایا ہے اور آخرت کی نعمتوں کو ترجیح دی ہے۔ لہٰذا جہاں تک ہو سکے، ڈرتے رہو اور ثابت قدم رہو۔

سُلوك: تقویٰ الٰہی میں "مَا اسْتَطَعْتُمْ" جہاں تک ممکن ہو کی قید لگا کر ضعیف و ناتواں بندوں کو آسانی و سہولت دے دی ورنہ تقویٰ الٰہی کا حق کون ادا کر سکتا تھا۔

صوفیاء محققین نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ سلوک و اصلاح نفس میں تدریجی اقدام کافی ہے۔ (تکمیل ہو ہی جاتی ہے۔)

سُوْرَةُ الطَّلَاقِ

پَارَۃ: 28

⑪ ﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾

[سورۃ الطلاق: 2 تا 3]

ترجمة: اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا رہتا ہے، اللہ اس کے لیے نجات کی شکل نکال دیتا ہے۔ اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہ تھا۔ اور جو اللہ پر توکل کرے گا، اللہ اس کی ضرورت کے لیے کافی ہے۔

تفسیر: اللہ کا ڈر و خوف دارین کے خزانوں کی کنجی اور تمام کامیابیوں کا ذریعہ ہے، اس سے مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔ بے گمان و قیاس روزی ملتی ہے، گناہ معاف ہوتے ہیں، جنت ہاتھ آتی ہے، اجر بڑھتا ہے اور قلب کو ہمیشہ سکون و اطمینان نصیب رہتا ہے۔ جس کے بعد کوئی سختی سختی نہیں رہتی، تمام تفکرات اندر ہی اندر کافور ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں حق و باطل کی تمیز پیدا ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تمام جہاں کے لوگ اس آیت کو اختیار کرلیں تو ان کو کافی ہو جائے گی۔ (روح المعانی)

اللہ پر توکل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ جائز اسباب اختیار کیے جائیں پھر کام ہونے نہ ہونے کا یقین اللہ پر کرلیا جائے اور جو بھی فیصلہ ہو، اس کو اللہ ہی کی جانب سے یقین کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم حقیقی توکل اختیار کرلو تو اللہ تمہیں ایسے رزق دے گا جیسا کہ پرندوں کو رزق دیتا ہے۔ صبح کے وقت وہ اپنے گھونسلوں سے خالی پیٹ اڑتے ہیں اور شام کو جب واپس آتے ہیں تو ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ (ترمذی) ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ توکل اور تقویٰ کی برکات کو اہل طریق ہر وقت مشاہدہ کرتے ہیں۔

سُورَةُ التَّحرِيم

پَارَہ: 28

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ [سورة التحريم: 1]

ترجمة: اے نبی! جس چیز کو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے، آپ اس کو کیوں حرام کر لیتے ہیں۔

تفسیر: واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ ہر روز عصر کے بعد کھڑے کھڑے اپنی ازواج مطہرات کے حجروں میں خیر خیریت دریافت کر لیا کرتے تھے۔ حسب معمول ایک دن ام المومنین سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے حجرے میں معمول سے کچھ زیادہ ٹھہر گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے شہد پیش کیا تھا، اس کو نوش کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا، پھر ہر روز تقریباً یہی معمول چلتا رہا۔

دیگر ازواج مطہرات پر یہ صورت حال گراں گزرنے لگی۔ خاص طور پر سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو کچھ زیادہ ہی محسوس کیا۔

عشق است ہزار بدگمانی

پھر دونوں نے باہم مشورہ کیا کہ اس صورت حال کو بدلنا چاہیے۔ پھر یہ طے کیا کہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے حجرے سے جب آپ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائیں تو انجان حالت میں یوں کہہ دیا جائے کہ غالباً آپ ﷺ نے مغافیر نوش فرمایا ہے۔ (یہ ایک گوند جیسا مادہ ہوتا تھا جس میں تیز بو ہوا کرتی تھی) ویسے بھی رسول اللہ ﷺ کو ہر تیز بو ناپسند تھی اور پھر اس گوند میں کچھ بو بھی ہوا کرتی تھی۔

چنانچہ جب آپ ﷺ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے حجرے سے دوسری بیوی کے حجرے میں تشریف لائے، ان بی بی نے مفروضہ جملہ کہہ دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا تو نہیں، میں نے تو زینب رضی اللہ عنہا کے گھر شہد پیا ہے۔ جب ہر بی بی صاحبہ نے ایسے ہی کہنا شروع کیا تو آپ کچھ متاثر ہو گئے۔ ایک بیوی صاحبہ نے اس کی تاویل کی کہ شاید یہ شہد کی مکھی نے مغافیر درخت کا جوس لیا ہوگا۔ اس پر آپ ﷺ نے قسم کھالی کہ آئندہ زینب رضی اللہ عنہا کے گھر کا شہد نوش نہ کروں گا۔

اس حادثہ پر مذکورہ آیت نازل ہوئی اور آپ ﷺ کو اپنی قسم توڑنے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے کے قسم توڑ کر کفارہ ادا فرمایا۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کسی کی اتنی رورعایت نہ کی جائے کہ اس سے خود کو دینی یا دنیوی ضرر پہنچنے لگے، اس طرح دوسروں کے اخلاق کی اصلاح بھی ہو جائے گی۔

② ﴿يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○﴾

[سورة التحريم: 8]

ترجمۃ: وہ کہتے جاتے ہوں گے: اے ہمارے پروردگار! ہمارے لیے اس نور کو آخر وقت تک قائم رکھیے اور ہماری مغفرت فرمادیجئے۔ بے شک آپ ہر چیز پر قادر ہیں۔

تفسیر: یہ دعا پل صراط پر اہل ایمان پڑھا کریں گے جب کہ اس پر یہ گزر رہے ہوں گے کیونکہ اس پل پر جو جہنم کے اوپر قائم ہے، نہایت ہی گہری تاریکی ہوگی۔ اس پر گزر کر ہی آگے جنت کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ اس گزرگاہ پر ہر نیک و بد، مومن و کافر سب کو گزرنا ضروری ہوگا۔ مومنین کا ایمان اس وقت نور و روشنی کا کام دے گا۔ جس کا ایمان جس قدر قوی اور کامل ہوگا، اس کا نور بھی قوی اور دراز ہوگا، ایسا شخص اس سخت تاریکی میں تیز سے تیز تر گزر جائے گا حتیٰ کہ کامل الایمان برق و بجلی کی طرح گزر جائیں گے۔

اور بے ایمان و منافق لوگ اندھیری میں گرتے پڑتے نیچے جہنم میں گر پڑیں گے کیونکہ ان کے پاس نور جیسی کوئی چیز نہ ہوگی، اہل ایمان کی روشنی میں چلنے کی کوشش کریں گے لیکن یہ روشنی ان کا ساتھ نہ دے گی اور وہ پیچھے رہ جائیں گے۔

اس طرح جہنم ایسے بے ایمانوں سے پُر ہوجائے گی۔ (تفصیل سورۂ حدید: ۱۲، ۱۳ میں پڑھ لی جائے)

سُلوک: بعض علماء محققین نے عالم آخرت کی اسی دعا سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بندے کی حاجت مندی اور عبودیت کسی حال اور کسی عالم میں بھی اس سے زائل نہ ہوگی (لہٰذا بندگی اور نیازمندی سے باہر ہونا چاہیے)

③ ﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ﴾ [سورة التحريم: 11]

ترجمۃ: اللہ ان لوگوں کے لیے جو کافر ہیں، مثال بیان کرتا ہے نوح علیہ السلام کی بیوی کی اور لوط علیہ السلام کی بیوی کی۔ یہ دونوں ہمارے خاص نیک بندوں میں سے دو بندوں کے نکاح میں تھیں لیکن ان دونوں نے اپنے شوہر کے حق ضائع کیے تو وہ دونوں نیک بندے اللہ کے مقابلہ میں ان کے ذرا بھی کام نہ آسکے۔

تفسیر: آیت میں ایمان اور کفر کے انجام کو بتایا گیا ہے۔ سیدنا نوح اور سیدنا لوط علیہما السلام جلیل القدر انبیاء میں شمار کیے جاتے ہیں بلکہ سیدنا نوح علیہ السلام کو نبی کریم نے "اَوَّلُ الرُّسُلِ فِي الارض" روئے زمین کا پہلا "عظیم رسول" ارشاد فرمایا ہے۔ دونوں کی بیویاں منافق تھیں۔ بظاہر اپنے شوہر کے ساتھ تعلق تھا لیکن دل سے کافروں کے شریک حال تھیں، پھر کیا ہوا؟ اللہ نے ان کے مرنے کے بعد انہیں دوزخ میں ڈھکیل دیا اور وہ اہل جہنم میں شامل ہوگئیں، نبیوں کا رشتۂ زوجیت ذرا بھی کام نہ آیا۔

کفر و نفاق ایسی بدترین خصلت ہے کہ نبی کے بستر پر سونے والی بھی نجات پا نہ سکی۔

پھر دوسری آیت میں اللہ نے فرعون کی بیوی سیدہ آسیہ رضی اللہ عنہا بنت مزاحم کی مثال بیان فرمائی جو ایمان دار اور

اللہ سے ڈرنے والی بندی تھی، جن کا شوہر خدا کا سب سے بڑا باغی وسرکش فرعون تھا۔ وہ نیک بیوی (آسیہ رضی اللہ عنہا) اپنے کافر شوہر کو عذاب سے بچا نہ سکی اور وہ غرقاب ہوگیا۔ بیوی کی نیکی اور ایمانداری اس کو کام نہ آئی اور نہ شوہر کی بغاوت وسرکشی کا بیوی پر کچھ اثر پڑا۔

شاہ عبدالقادر صاحب محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اپنا ایمان درست کرلو، نہ خاوند بچا سکے نہ جورو۔ (موضح القرآن)

سُلوک: آیت میں سیدنا نوح وسیدنا لوط علیہما السلام کو "عِبَادِنَا صٰلِحَيْنِ" "عبد صالح" کہا گیا ہے۔ نہ اوتار، نہ مظہر خدا، نہ سایہ خدا، نہ ظل سبحانی، نہ ظلی، نہ بروزی وغیرہ۔

دونوں بیویوں نے اپنے شوہر کی خیانت کی یعنی ان کے حق کو تسلیم نہ کیا اور سب سے بڑا حق یہی تھا کہ ان کی نبوت ورسالت کی تصدیق کرلیتیں اور ایمان لے آتیں۔

"تَحْتَ عَبْدَيْنِ" سے واضح ہوگیا کہ بیوی شوہر کے ماتحت ہی ہوتی ہے، برابری وہمسری کا خیال غیر اسلامی نظریہ ہے۔

﴿اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ﴾

[سورة التحريم: 11]

ترجمة: جب کہ انہوں نے دعا کی: اے میرے پروردگار! میرے لیے جنت میں اپنے قریب ایک مکان بنادیجئے اور مجھ کو فرعون اور اس کے عمل سے نجات دیجئے اور مجھے ظالم لوگوں سے بھی بچایئے۔

تفسیر: فرعون کی بیوی سیدہ آسیہ رضی اللہ عنہا کی دعا نقل کی گئی ہے۔ جب ان کا مسلمان ہونا اس کو معلوم ہوگیا تو طرح طرح کی تکلیفیں دیا کرتا تھا تاکہ وہ اسلام کا انکار کردے۔ یہ وہی خاتون تھیں جس نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دریا سے اٹھایا تھا اور ان کی پرورش کی تھی۔

سیدہ آسیہ رضی اللہ عنہا کو جب فرعون سخت سے سخت ایذاء دیتا تو وہ اللہ کو پکارا کرتی تھیں۔ اس پر انہیں جنت کا وہ محل جو انہیں آخرت میں ملنے والا ہے، دکھایا جاتا تھا کہ صبر کرو پھر تمہیں یہ عظیم نعمت ملنے والی ہے۔ اس مشاہدے سے سیدہ آسیہ رضی اللہ عنہا کو سب سختیاں آسان ہوجاتی تھیں۔

آخر خبیث فرعون نے انہیں قتل کردیا اور وہ جام شہادت نوش کرکے اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔

ہزار ہا ہزار رحمتیں ہوں اس پاک روح پر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ آسیہ رضی اللہ عنہا کے کامل الایمان ہونے کی شہادت دی ہے۔ (حدیث)

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں: آیت سے معلوم ہوا کہ ہر بلا ومصیبت سے نجات کی دعا اور اللہ سے مناجات کرتے رہنا صالحین کی سیرت رہی ہے۔

سُوْرَةُ الْمُلْك

پارہ: 29

① ﴿الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا﴾ [سورة الملك: 3]

ترجمة: جس ذات نے سات آسمان تہ بہ تہ پیدا کیے۔ (اے مخاطب!) تو اللہ رحمن کی صنعت میں کوئی فتور نہ دیکھے گا۔ لہٰذا پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے۔ کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے؟

تفسیر: آسمانوں کی پیدائش اللہ حکیم وقدیر کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے جو ہر عیب و ہر نقص سے پاک وصاف ہے، اس میں کہیں کوئی بوسیدگی، خستگی، پستگی نہیں ملے گی۔ نہایت مضبوط اور حسین وجمیل آسمان کا احاطہ کیے ہوئے۔ گویا اس طویل وعریض زمین کو اس نے اپنی گود لے لیا ہے۔ اللہ کی اس قدرت وصنعت کو دیکھو اور بار بار دیکھو کہ کس قدر منظم اور مرتب طور پر قائم ہے، آسمان کی خوبیوں اور فوائد کا احاطہ کرنا انسانی عقل وفہم سے باہر ہے لیکن قرآن حکیم کی مذکورہ آیت یہ درس دیتی ہے کہ تم اس میں کم از کم غور وفکر تو کرو، اللہ کی صنعت وقدرت کا تمہیں یقین ہو جائے گا۔

سُلوك: اہل تحقیق علماء نے لکھا ہے کہ آیت میں تین مرتبہ اہل نظر کو دعوت غور وفکر دی گئی ہے۔

فَارْجِعِ الْبَصَرَ ①: یہ پہلی نظر عوام کی ہے جو آسمانوں کے وجوہ اور اس کے ظاہری حسن کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی کمال صنعت کے قائل ہو جاتے ہیں۔

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ ②: یہ دوسری نظر اہل حکمت کی ہے جو ہر مخلوق کی مصلحتوں کو دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ موجودہ تکوینی نظام سے بہتر اور کوئی نظام ممکن نہیں۔

یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ ③: یہ تیسری نظر خواص اہل حق کی ہے جو اپنی نظر وفکر پر نادم ہو کر اپنے عجز وجہل کا اعتراف کرنے لگتے ہیں۔ (بیضاوی)

② ﴿وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ﴾ [سورة الملك: 10]

ترجمة: اور (وہ کافر یہ بھی) کہیں گے کہ اگر ہم (دنیا کی زندگی میں) سن لیتے یا عقل سے ہی کام لیتے تو آج ہم اہل جہنم میں نہ ہوتے۔

تفسیر: حشر ونشر کے بعد جب جنت وجہنم کے فیصلے ہو جائیں گے اور ہر فریق اپنے اپنے ٹھکانے پہنچ جائے گا تو اہل دوزخ اپنی بدبختی وشامت اعمال پر اس طرح نوحہ کرتے رہیں گے جس کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے۔ لیکن ان کا یہ نوحہ واعتراف کچھ بھی کام نہ دے گا کیونکہ آخرت صرف دار جزاء ہے، دار عمل نہیں۔

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اخروی صلاح وفلاح کے دو② طریقے ہیں: ایک تقلید، دوسرا تحقیق۔

یعنی بے علم انسان کے لیے کسی نیک وصالح انسان کی تقلید کرنی ضروری ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر خود علم وحکمت رکھتا ہو تو براہِ راست قرآن وحدیث کی پیروی کرنی چاہیے۔

کافروں نے دنیا کی زندگی میں دونوں طریقوں سے اعراض کیا تھا لہٰذا آخرت میں ناکام ونامراد ہوئے۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جس مرید میں تحقیق کی قابلیت نہیں، اس کو اپنے شیخ سے مزاحمت یا دلیل کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے۔

سُورَۃُ القَلَم

پارہ: 29

(1) ﴿وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ [سورة القلم: 4]

ترجمة: اور بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں۔

تفسیر: اللہ تعالیٰ نے جن اخلاق پر نبی کریم ﷺ کو پیدا فرمایا ہے، قرآن حکیم آپ کے اعمال و اخلاق کی خاموش تفسیر ہے۔ پیدائشی طور پر آپ کی ساخت اور فطرت ایسے ہی واقع ہوئی تھی کہ آپ کا کوئی عمل اور سکون حد تناسب و اعتدال سے ادھر ادھر ہونے والا نہ تھا۔ قول و عمل ہی کیا، آپ کی حرکات و سکنات تک میں اعتدال و استحکام پایا جاتا ہے۔

شیخ الہند رحمہ اللہ نے مذکورہ آیت کا ترجمہ اس طرح ادا کیا ہے: ''اور تو پیدا ہوا ہے بڑے خُلق پر۔''

قرآن حکیم کی یہ آیت آپ ﷺ کی ساری زندگی کے تعارف کے لیے کافی ہے۔

سُلوك: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مذکورہ آیت کی تفسیر میں یہ منقول ہے:

يَرْضٰى لِرِضَاهُ وَيَسْخَطُ بِسَخَطِه

اللہ کی رضا پر آپ راضی رہتے اور جس چیز پر اس کی ناراضی ہے، آپ بھی اس سے ناراض رہتے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں اشارہ ہے تخلق باخلاق اللہ کی طرف جس کا حاصل فنا فی اللہ ہے۔

(2) ﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝﴾ [سورة القلم: 10]

ترجمة: اور آپ کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مانیے جو بہت قسم کھانے والا ہو۔ بے وقعت ہو، طعنہ دینے والا، چغلیاں لگاتا پھرتا ہو۔ نیک کام سے روکنے والا ہو، حد سے گزرنے والا ہو، گناہوں کا کرنے والا ہو۔ سخت مزاج ہو، اس کے علاوہ حرام زادہ بھی ہو۔

تفسیر: آیت کا مفہوم اگرچہ عام ہے لیکن اس کا شان نزول ایک کافر سردار کے بارے میں ہے جس کا نام ولید بن مغیرہ المخزومی تھا۔ یہ بداخلاق انسان مذکورہ صفات کا حامل تھا اور اپنی قوم کا سردار بھی۔ نبی کریم ﷺ کو اس کی بات نہ سننے اور اس سے دور رہنے کی تعلیم کی گئی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں اصولی طور پر برے اخلاق کا ذکر ہے۔ (جوام الخبائث کی حیثیت رکھتے ہیں۔)

(3) ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝﴾ [سورة القلم: 42]

ترجمة: جس دن ساق کی تجلی فرمائی جائے گی اور لوگوں کو سجدہ کرنے کے لیے طلب کیا جائے گا تو وہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے۔

تفسیر: بخاری و مسلم میں اس آیت کی یہ تفسیر ملتی ہے کہ حشر کے دن اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کی موجودگی میں اپنی ساق (پنڈلی) ظاہر فرمائیں گے، اس تجلی کو دیکھ کر تمام اہل ایمان مرد و عورتیں سجدہ میں گر پڑیں گے۔ (کیونکہ ان لوگوں نے دنیا میں جو سجدہ کیا تھا، دراصل وہ اللہ کے آگے سجدہ میں گر پڑے تھے۔ یہی حقیقت اس تجلی کے وقت ظاہر ہوگی۔) مگر جو لوگ دنیا میں سجدہ نہیں کرتے تھے یا ریاکاری و نفاق میں مبتلا تھے، وہ بھی سجدہ میں گرنے کی کوشش کریں گے لیکن ایسے وقت ان کی پشت تختہ بن جائے گی، وہ خم بھی نہ ہوسکیں گے۔ یہ سب اس لیے ہوگا کہ حشر میں مومن، کافر، مخلص و منافق واضح طور پر کھل جائیں اور ہر ایک کی قلبی کیفیت مشاہد ہو جائے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صوفیاء کرام نے اس تجلی کو ظاہر پر محمول کر کے "تجلی صوری" کے جواز پر استدلال کیا ہے لیکن دیگر علماء نے اس کو اور اس جیسی آیات کو متشابہات میں شمار کیا ہے جن کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے۔

﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ﴾ [سورة القلم: 48]

ترجمة: تو آپ اپنے پروردگار کی تجویز پر صبر نہ کیجیے اور (تنگدلی میں) مچھلی والے پیغمبر کی طرح نہ ہوں۔ جب کہ انہوں نے (مچھلی کے پیٹ میں) اللہ کو پکارا اور وہ غم سے گھٹ رہے تھے۔

تفسیر: کفار کی تکذیب اور ایذاء رسانیوں پر آپ کو صبر کرنے اور برداشت کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کی مزید تقویت کے لیے شہر نینوئ کے پیغمبر سیدنا یونس علیہ السلام کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔

(جس کی مکمل تفصیل "ہدایت کے چراغ" حصہ دوم ۲/صفحہ ۱۰۰ پر مطالعہ کیجیے جو قرآنی قصص میں عظیم الشان قصہ ہے۔)

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے سیدنا یونس علیہ السلام کے واقعہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ صاحب حال کا عمل صاحب مقام کے لیے اسوہ نہیں بنتا، اسی طرح صاحب مقام عالی کا عمل صاحب مقام اعلیٰ کے لیے کبھی نقص و عیب شمار ہوتا ہے اور اس سے منع بھی کیا جاتا ہے۔

(آیت مذکورہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صاحب الحوت کی طرح پریشان و خوف زدہ ہونے سے منع کیا گیا۔)

﴿وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ﴾ [سورة القلم: 51]

ترجمة: اور یہ کافر لوگ جب قرآن سنتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی نگاہوں سے پھسلا کر گرا دیں

گے اور کہتے ہیں کہ یہ تو مجنوں ہے مجنوں۔

تفسیر: آیت میں تلاوت قرآن پر کافروں کا تاثر بیان کیا گیا ہے کہ وہ آیات الٰہی سنتے ہی غیظ وغضب میں بھر جاتے ہیں اور آپ ﷺ کی جانب اس قدر تیز نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں گویا آپ کو اپنی نظروں سے پٹک دیں گے اور پھر اسی پھر بس نہیں کرتے بلکہ زبان سے بھی آوازیں کستے ہیں کہ یہ شخص تو مجنون ہو گیا ہے۔

بعض روایات میں یہ تفسیر بھی منقول ہے کہ مکۃ المکرمۃ کے بعض کافر سرداروں نے آپ ﷺ کو نظر و سحر سے متاثر کرنے کے لیے چند نظر بازوں کی خدمات حاصل کی تھیں تا کہ آپ ﷺ پر نظر عمل جاری کیا جائے۔ چنانچہ ایسی ناکام سعی بھی کی گئی لیکن جب آپ ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے لَاَ حَوْلَ وَلَاَ قُوَّةَ اِلاَّ بِاللّٰهِ پڑھا، نظر باز ناکام و نامراد واپس ہو گئے۔ (موضح القرآن)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے آیت سے کے اقتضاء سے یہ اخذ کیا ہے کہ اہل باطل سے بھی تصرفات ہو سکتے ہیں اور وہ کبھی اہل حق پر طبعی اثرات مرتب کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔

(جیسا کہ ملعون لبید بن اعصم اور اس کی خبیث لڑکیوں نے آپ پر جادو کیا تھا جس کا چند ہفتے تک آپ پر اثر رہا ہے۔)

حکیم الامت رحمہ اللہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ کسی پر تاثیرات پیدا کرنا بزرگی کی علامت نہیں ہے۔ (عمل، رمل، جفر سے بھی متاثر کیا جا سکتا ہے۔)

سُورَةُ الحَاقَّة

پَارَہ: 29

(1) ﴿وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيْلِ ۙ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۙ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝﴾ [سورة الحاقة: 44 تا 46]

ترجمة: اور اگر (یہ پیغمبر) ہمارے ذمے کچھ باتیں لگا دیتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے۔ پھر ان کی رگ دل کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی ان کا بچانے والا نہ ہوتا۔ اور یہ قرآن بے شک نصیحت ہے متقیوں کے لیے۔

تفسیر: آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ قرآن حکیم اللہ کا خالص کلام ہے جس میں ایک حرف تو کجا، ایک حرکت بھی نبی کریم ﷺ نے اپنی جانب سے شامل نہیں کی، آپ اللہ کے برحق پیغمبر ہیں۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ الٰہی امانت میں خیانت کریں جب کہ معمولی درجے کا انسان بھی خیانت کو جرم سمجھتا ہے۔

اس کے بعد بطور فرض یہ کہا گیا اگر ایسا ہوتا تو ہم خود نبی کو پکڑ لیتے اور انہیں ایسی سزا دیتے کہ ان کا بچانے والا کوئی نہ ہوتا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نبوت چونکہ ایک ظاہری و کھلی حقیقت ہے لہٰذا اس کا جھوٹا مدعی بھی ظاہراً ہلاک کر دیا جاتا ہے اور عوام میں مردود ہو جاتا ہے۔

لیکن ولایت کا جھوٹا مدعی باطناً ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ ولایت ایک قلبی و باطنی چیز ہے اور اس باطنی کیفیت کا ادراک اہل اللہ ہی معلوم کر لیتے ہیں۔

پھر حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جس مدعی ولایت سے اکثر اہل اللہ بے زار ہوں، ایسے شخص سے دور رہنا چاہیے۔

سُوۡرَةُ المَعَارِج

پارہ: 29

① ﴿سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ لَيۡسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ مِّنَ اللّٰهِ ذِى الۡمَعَارِجِ ؕ﴾ [سورۃ المعارج: 1 تا 3]

ترجمۃ: مانگا ایک مانگنے والے نے اس عذاب کو جو کافروں پر واقع ہونے والا ہے۔ جس کا کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ (اور وہ) اللہ کی طرف سے ہوگا جو بلندیوں والا (آسمانوں والا) ہے۔

تفسیر: معارج کا واحد معرج ہے جس کے معنی آلۂ عروج (سیڑھی، آسمان) ہیں۔ اللہ کی یہ ایک صفت ہے کہ وہ ذوالمعارج (آسمانوں والا، بلندیوں والا) ہے۔

آیت میں جس عذاب کے طلب کرنے والے کا ذکر ہے، وہ کوئی معین شخص نہیں بلکہ عام کافر مراد ہیں۔ یہ لوگ از راہ تمسخر مطالبہ کیا کرتے تھے کہ وہ عذاب کیوں نہیں آتا جس کی دھمکی ہم کو دی جارہی ہے۔ کافروں کی یہ حماقت تھی کہ ایسی خطرناک بات کا مطالبہ کررہے ہیں جس کی آمد پر ان کو کوئی بھی بچانے والا نہ ہوگا پھر یہ عذاب اس اللہ کی طرف سے ہوگا جو بلند آسمانوں کا مالک ہے جس کی جناب میں پہنچنے کے لیے فرشتوں کو پچاس ہزار سال کا وقت درکار ہوتا ہے، بھلا ایسے زبردست اور قادر مطلق کے عذاب کا کوئی متحمل ہوسکتا ہے؟

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اہل لطائف مشائخ صوفیاء نے کہا ہے کہ آیت میں اللہ کی صفت ذی المعارج لانے میں دو ② نکتے ہیں:

ایک ① تو یہ کہ سالک کے لیے تسلی و تسکین ہے کہ وہ اپنی سعی و استعداد کے مطابق جس مقام پر بھی قدم رکھے گا، ذات کبریائی اس کی پذیرائی کرے گی۔

دوسرے ② یہ کہ اس صفت میں سالک کے لیے شوق افزائی بھی ہے کہ وہ جس منزل پر بھی پہنچ چکا ہو، اس پر قناعت نہ کرنی چاہیے بلکہ آگے ہی بڑھتے جانا چاہیے۔ (کیونکہ اللہ کی ذات عالی بلندتر ہے۔)

② ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ۙ﴾ [سورۃ المعارج: 19]

ترجمۃ: بے شک انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے۔ جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو جزع فزع کرنے لگتا ہے۔

تفسیر: آیت میں الانسان سے، کافر انسان مراد ہے۔ چونکہ اس کا کوئی بنیادی عقیدہ نہیں ہوتا، وہ ہر غم و مصیبت پر پریشان ہوجاتا ہے، اپنے انجام کو اللہ کی طرف خیال نہیں کرتا۔ ایسے ہی جب اس کو فراخی و کشادگی میسر آتی ہے تو اترا جاتا ہے اور غفلت و شہوات میں مبتلا ہو پڑتا ہے لیکن ایمان والے نمازی اس کیفیت

سے دور رہتے ہیں۔

آیت میں کافر انسان کے تین وصف بیان کیے گئے ہیں:

اوّل ① هَلُوْعاً: بے ہمت و پست۔

دوم ② جَزُوْعاً: گھبرانے والا، بزدل۔

سوئم ③ مَنُوْعاً: بخل و کنجوسی والا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کافر انسان کی اس پست اخلاقی سے مسلمان نمازیوں کا علیحدہ ہونا یعنی ان کا بدہمت، بزدل و کنجوس نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ طاعات (نماز) کو دل کی تقویت اور تحمل شدائد میں عظیم دخل ہے اور یہ علامت نمازیوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

سُوْرَۃُ نُوْح

پَارَہ: 29

① ﴿ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا﴾ [سورة نوح: 8]

ترجمۃ: پھر (بھی) میں نے اس کو بآواز بلند بلایا۔ پھر علانیہ طور پر بھی سمجھایا اور خفیہ طور پر بھی۔

تفسیر: آیت میں سیدنا نوح علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو ساڑھے نوسو سال تک سمجھایا، منایا اور ہدایت ونصیحت کے لیے وہ عنوانات اختیار کیے جو ایک ناصح وخیر خواہ باپ اپنی اولاد کی نصیحت ورہبری کے لیے کیا کرتا ہے۔ لیکن قوم نے جو متفقہ طور پر طے کرلیا تھا کہ نوح علیہ السلام کی کوئی بات قطعاً قبول نہ کی جائے گی، آخر کار قوم کا انجام عظیم غرقابی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ (''ہدایت کے چراغ'' حصہ اول، تذکرہ سیدنا نوح علیہ السلام مطالعہ کیجئے۔)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سیدنا نوح علیہ السلام کا یہ خیرخواہانہ عنوان ظاہر کرتا ہے کہ نبی اپنی امت کے لیے کیسا کچھ خیر خواہ ومشفق ہوا کرتا ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ جاہلوں کے ساتھ ایسے ہی شفقت وعنایت کا معاملہ کرنا چاہیے۔

اس کے بعد حکیم الامت رحمہ اللہ ایک اہم شبہ کو دور کرتے ہیں جو آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ قرآن حکیم کی دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی ہدایت وصلاح وفلاح کے لیے اس قدر درپے نہ ہونا چاہیے کہ بس یہ ایک کام رہ جائے اور باقی کام معطل ہوجائیں۔ سیدنا نوح علیہ السلام کی ساڑھے نوسو سالہ جدوجہد میں ایسا ہی کچھ محسوس ہوتا ہے۔ (ایسے عمل کو تصدی کہا جاتا ہے جو شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ عمل نہیں ہے۔)

اس شبہ کا یہ جواب دیا ہے کہ یہاں دو ② علیحدہ باتیں ہیں:

① ایک دعوت وتبلیغ ② دوسری بات دعوت وتبلیغ کے نتائج وثمرات۔

دعوت وتبلیغ میں تو سراپا مشغول رہنا چاہیے، البتہ نتائج وثمرات کے درپے نہ ہونا چاہیے۔

مذکورہ آیت میں سیدنا نوح علیہ السلام کی جدوجہد دعوت وتبلیغ میں منحصر ہے، نتائج وثمرات سے متعلق نہیں۔ لہٰذا یہ تصدی نہیں ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔

سیدنا نوح علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کے عنوان میں تین طریقے مفہوم ہوتے ہیں جس سے انہوں نے کام لیا:

اول ① عوام میں علی الاعلان تقریریں کیں اور خطاب عام سے کام کیا۔

دوم ② خطاب خاص سے کام لے کر افراد سے الگ الگ بھی کھلم کھلا گفتگو کی۔

سوم ③ بالکل نجی اور تخلیہ کی صحبتوں میں فرداً فرداً سمجھایا۔

دعوت وتبلیغ کے یہ تین عنوان سیدنا نوح علیہ السلام کی حکمت عملی کا ثبوت ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ

② ﴿وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ وَّ لَا یَغُوْثَ وَ یَعُوْقَ وَ نَسْرًا ۚ﴾ [سورة نوح: 23 تا 24]

ترجمة: (قوم کے سرداروں نے) کہا: تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا (خاص طور پر) وڈ کو نہ سواع کو۔ نہ یغوث ویعوق ونسر کو۔

تفسیر: یہ قومی بتوں کے نام ہیں جو سیدنا نوح علیہ السلام کے بعد قوم نے گھڑ لیے تھے اور ان کی پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ نزول قرآن کے عہد میں بھی جاری تھا۔

① وَدًّا یہ ان مشرکین کے زعم میں قوت وطاقت اور عشق ومحبت کا دیوتا تھا۔ اس کی مورتی قوی ہیکل مرد کی شکل پر تھی، اہل عرب بھی اس سے خوب مانوس تھے۔ اس کی پوجا شمالی عرب میں بھی کی جاتی تھی۔

② سُوَاعًا یہ حسن وجمال کی دیوی تھی۔ اس کی مورت بھی حسین عورت کی شکل پر تھی، اس کی پوجا قبیلہ ہذیل میں جاری تھی۔

③ یَغُوْثَ یہ بت قوت وطاقت جسمانی کا معبود سمجھا جاتا تھا۔ اس کی شکل شیر اور قدآور بیل کی شکل پر تھی، ملک یمن میں اس کی پوجا جاری تھی۔

④ یَعُوْقَ یہ بھاگ دوڑ کا دیوتا تھا۔ اس کی مورتی بھی گھوڑے کی شکل کی تھی، اس کی پوجا بھی اہل یمن کیا کرتے تھے۔

⑤ نَسْرًا دور بینی اور تیز نظری کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ اس کی مورت باز یا عقاب کی شکل پر تھی۔

عرب کے جاہل لوگوں نے بھی ان قدیم معبودوں کی پوجا کو اپنے ملک میں رائج کر لیا تھا اور اپنے مقاصد کو ان دیوتاؤں سے وابستہ کر رکھا تھا۔

ہندوستان میں بھی اسی قسم کے پانچ بت ① بشنو ② برہما ③ اندر ④ شیو ⑤ ہنومان کے نام سے رائج ہو گئے اور آج بھی انہی کی پوجا کی جاتی ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بعض روایات میں مذکور ہے کہ قوم نوح کے یہ معبود دراصل ملت نوح کے بزرگان دین تھے۔ ان کی وفات کے بعد شیطان نے ان کی یادگاری کے طور پر ان کی تصویریں عام کیں پھر رفتہ رفتہ ان کا تقدس عام ہوا اور انجام ایک زمانۂ دراز کے بعد ان کی بت پرستی کی بھیانک صورت میں ظاہر ہوا۔

پھر حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نیک و بزرگ لوگوں کی تصویریں رکھنے کا یہ برا انجام بت پرستی کی شکل میں ظاہر ہوا۔اس لیے صلحاء کے آثار و برکات کا زیادہ اہتمام کرنا جب کہ دین میں بگاڑ کا اندیشہ ہو،واجب الترک ہے۔

⑬ ﴿وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ۞﴾ [سورۃ نوح: 24]

ترجمۃ: اور اے اللہ!ان ظالموں کی گمراہی اور بڑھا دیجئے۔اور نوح نے یہ بھی عرض کیا:اے میرے پروردگار! زمین پر کافروں میں سے ایک باشندہ بھی زندہ نہ چھوڑیئے۔

تفسیر: سیدنا نوح علیہ السلام کی یہ دعا اپنی قوم کی مسلسل نافرمانی و بغاوت کی انتہاء پر آپ کی زبان سے جاری ہوئی۔ گمراہی و ہلاکت کی یہ دعا یا تو خود اپنے تجربہ کے بعد ضروری سمجھی گئی یا پھر وحی الٰہی کی اس اطلاع کے بعد کہ اے نوح!اب تمہاری قوم سے کوئی ایک بھی اطاعت قبول کرنے والا نہیں ہے تو سیدنا نوح علیہ السلام نے دعا کر دی۔

چنانچہ سیدنا نوح علیہ السلام نے ایسی دعا کی کہ طبقۂ انبیاء میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اپنے مخالفوں پر اضلال اور اہلاک کی دعا کرنا صاحب وحی کے لیے تو جائز ہے،دوسروں کو یہ حق نہیں کہ اپنے مخالفوں پر ایسی دعا کریں۔

لیکن بعض نادان ورواجی مشائخ نے یہ عنوان اپنے لیے بھی اختیار کر لیا ہے۔ فَاِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى

سُوْرَةُ الْجِنِّ

پَارَۃ: 29

﴿وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًاۙ﴾ [سورة الجن: 6]

ترجمة: اور انسانوں میں بہت سارے لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں کہ انہوں نے جنات میں سے بعض جنوں کی پناہ پکڑلی ہے سو ان لوگوں نے ان جنات کی نخوت وزعم کو اور بڑھا دیا ہے۔

تفسیر: عرب میں جہالت بہت پھیلی ہوئی تھی کہ جنات غیب کی خبریں جانتے ہیں، پھر ان کی نذر و نیاز چلنے لگی اور اثنائے سفر جب کسی وادی میں رات کو قیام کرنا پڑتا تو ندا لگاتے کہ اس وادی کے سردار جن کی ہم پناہ چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے ماتحت جنات سے ہماری حفاظت کرے۔ ان باتوں سے جنات کے دماغ اور سڑ گئے اور وہ غرور و تکبر میں انسانوں کے سر چڑھ گئے۔ آخر قرآن حکیم نازل ہوا اور ان کی حقیقت ظاہر کری اور انسانوں کو ان سے بے خوف کر دیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بعض لوگ جو زبردستی صوفیاء میں شمار کیے جاتے ہیں، وہ ایسے تعویذات و عملیات میں مشغول ہیں کہ جن میں جنات و موکلات کی ندا اور ان سے پناہ حاصل کی جاتی ہے، ایسے اعمال کا مذموم ہونا آیت سے ثابت ہوتا ہے۔

② ﴿قُلْ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا﴾ [سورة الجن: 21]

﴿قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا﴾ [سورة الجن: 25]

ترجمة: آپ کہہ دیں کہ میں تمہارے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں، نہ کسی خیر و بھلائی کا۔

آپ کہہ دیں کہ مجھ کو معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، آیا وہ قریب ہے یا میرے پروردگار نے اس کے لیے کوئی خاص مدت مقرر کی ہے۔

تفسیر: اوپر کی آیات میں توحید کا ذکر تھا اور ہر قسم کے شرک کی تردید تھی۔ مذکورہ آیت میں اس قدیم جاہلی عقیدے کی تردید کی گئی ہے کہ نبی و رسول بھی عالم الغیب ہوا کرتے ہیں۔ آیت واضح طور پر ایسے تصور کی نفی خود نبی کی زبان مبارک سے کروا رہی ہے کہ میں نہ نفع کا مالک ہوں، نہ تمہارے نقصان کا (بلکہ اگر مجھے علم ہوتا تو میں خیر کے خزائن جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی)۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ عذاب کا جو وعدہ تم سے کیا گیا ہے، وہ کب آنے والا ہے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں صراحت سے یہ نفی کردی گئی ہے کہ قدرت مستقلہ اور علم غیب کسی مخلوق کو حاصل نہیں، نفع ونقصان اور غیب کا علم صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔

(البتہ اللہ تعالیٰ اپنا غیب کسی نبی ورسول پر ظاہر کردیتا ہے۔ اس کو قرآن حکیم نے اِظْهار علی الْغَيْب یا اطلاع علی الغیب قرار دیا ہے، علم غیب نہیں۔ ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ [سورۃ الجن: 26 تا 27]

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ

پَارَہ: ㉙
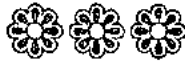
⑱ ﴿يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴾ [سورة المزمل: 1 تا 2]

ترجمة: اے کپڑوں میں لپٹنے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کر۔

تفسیر: عربی زبان میں مزمل اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو بڑے کشادہ کپڑے چادر وغیرہ کو اپنے اوپر لپیٹ لے۔
آغاز وحی میں آپ دہشت و بوجھ محسوس فرما کر کانپنے لگے اور اپنے گھر والوں سے کہا: زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ چادر اوڑھا دو، چادر اوڑھا دو۔ پھر اللہ نے آپ کو اسی نام سے مخاطب کیا اور تسلی دی۔

سُلوك: شاہ عبدالعزیز محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت سے خرقہ پوشی کے لوازم اور شروط معلوم ہوتے ہیں۔
حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ آیات میں صوفی کے مشاغل پر روشنی پڑتی ہے، یعنی رات میں نمازوں کے لیے کھڑے ہونا، قرآن کی تلاوت خوب صاف صاف کرنا، اللہ کا ذکر کرنا اور سب سے قطع ہو کر اللہ ہی کی طرف متوجہ ہونا اور اللہ ہی کو اپنا کارساز قرار دے لینا، صبر سے کام لینا، مخالفوں سے درگزر کرنا۔
[سورة المزمل: 1 تا 3]

⑲ ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۙ﴾ [سورة المزمل: 8]

ترجمة: اور اپنے پروردگار کے نام کو یاد کرتے رہیے اور سب سے ٹوٹ کر اسی کی طرف متوجہ رہیے۔

تفسیر: آیت میں اسم رب (یعنی اللہ) کا ذکر کیا گیا ہے۔ ذکر اللہ خواہ زبان سے ہو یا قلب و جوارح سے ہو یا احکام الٰہی کی پابندی کا نام ہو، سب مفہوم مراد ہیں۔

سُلوك: صوفیاء کرام نے آیت سے دوام ذکر کا مسئلہ اخذ کیا ہے (یعنی ہر وقت اللہ اللہ کہنا)۔
عارفین نے آیت سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مقام ذکر، مقام فکر سے مقدم ہے۔ (تبتل غور و فکر ہی کا نام ہے)
تفسیر مظہری کے مفسر نے لکھا ہے کہ اسم رب یعنی اللہ اللہ کی تکرار کرنا بھی مطلوب و مامور بہ ہے۔
(جن علماء نے اسم ذات (اللہ اللہ کی تکرار) کو بدعت کہا ہے، وہ کچھ درست نہیں ہے۔)

سُورَةُ الْمُدَّثِّر

پَارَہ: 29

(1) ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝﴾ [سورة المدثر: 6]

ترجمة: اور کسی کو اس غرض سے نہ دیں کہ زیادہ معاوضہ ملے گا۔

تفسیر: کسی شخص پر احسان اس نیت سے نہ کرنا چاہیے کہ جو کچھ اس کو دیا ہے، اس سے زیادہ وصول ہو جائے گا۔ جیسے کسی کو ہدیہ یا تحفہ اس نیت سے دینا کہ وہ اس کے بدلے میں اس سے زیادہ معاوضہ دے گا، مذموم اور مکروہ نیت ہوگی۔

سُلوك: صوفیاء نے کہا ہے کہ کوئی نیک عمل کر کے اس کو زیادہ نہ خیال کرنا چاہیے اور بعض دوسروں نے کہا ہے کہ اپنی نیکیوں کو زیادہ سمجھ کر احسان نہ جتایا جائے۔

(2) ﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ۝﴾ [سورة المدثر: 49]

ترجمة: تو ان کو کیا ہوا کہ اس نصیحت سے روگردانی کرتے ہیں؟

تفسیر: نصیحت و خیر خواہی سے اعراض کرنا دراصل قلب کے اس روگ کی علامت ہے جو آخرت سے غفلت و بے زارگی کے صلہ میں پیدا ہوا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جو لوگ کاملین کی اتباع سے عار محسوس کرتے ہیں اور خود اپنے احوال و واردات کی توقع و طلب میں لگے رہتے ہیں، آیت سے اس کی مذمت ثابت ہوتی ہے۔

سُورَۃُ القِیَامَۃ

پَارَہ: 29

(1) ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ [سورة القيمة: 2]

ترجمة: اور قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔

تفسیر: مرنے کے بعد دوسری حیات کے مضمون کو قیامت اور نفس لوامہ کی قسم سے بیان کیا گیا ہے کہ مرنے کے بعد سارے انسانوں کا حشر ہوگا اور وہ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور اپنی زندگی کے اعمال کے مطابق جزا وسزا کے مستحق ہوں گے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں شبہ نہیں۔

سُلوك: قرآن حکیم نے نفس انسانی کی تین قسم بیان کی ہیں:

(1) نفس امارہ: (برائی کا تقاضہ کرنے والا نفس) یہ نفس سرکشوں، باغیوں اور مجرموں کا ہوا کرتا ہے۔

(2) نفس لوامہ: (ملامت وندامت کا تقاضہ کرنے والا نفس) غفلت یا شامت سے کوئی لغزش ہوگئی تو توبہ و ندامت کا تقاضہ کرتا ہے، یہ نفس مومنین صالحین کا ہوا کرتا ہے۔

(3) نفس مطمئنہ: (محفوظ اور پر سکون نفس) یہ نہ وساوس سے متزلزل ہوتا ہے، نہ نفسانی تحریکات سے منتشر ہوتا ہے۔ ایسا نفس انبیاء کرام اور خاصان خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔

(نفس لوامہ اور مطمئنہ اللہ کی بڑی نعمتوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔)

(2) ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝﴾ [سورة القيمة: 14 تا 15]

ترجمة: اصل یہ ہے کہ انسان خود ہی اپنی حالت پر خوب مطلع ہے اگر چہ حیلہ حوالہ پیش کرے۔

تفسیر: مطلب یہ کہ ہر انسان اپنی حالت پر خود گواہ ہوگا۔ بغیر جتلائے ہوئے بھی اسے اپنا حال خوب معلوم ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ حیلے اور حجت بھی اپنے بچاؤ کے لیے تراشا رہے لیکن حشر میں سب کچھ عیاں ہوجائے گا۔ وہاں اپنی زندگی کے اعمال خود ہی نہیں، دوسرے بھی دیکھ لیں گے۔

سُلوك: عارفین نے لکھا ہے کہ حق کی معرفت ہر انسان میں ودیعت کردی گئی ہے۔ کوئی عارف بالفعل (موجودہ حالت میں) ہوتا ہے۔ کوئی عارف بالقوۃ (فطرت کی صلاحیت میں)۔ یہی استعداد قیامت کے دن ہر ایک کے لیے حجت ثابت ہوگی۔

(3) ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ [سورة القيمة: 22 تا 23]

ترجمة: اور کتنے ہی چہرے اس دن ہشاش بشاش ہوں گے۔ اپنے پرورگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

تفسیر: دیدار الٰہی کا مسئلہ موجودہ دنیا میں مختلف فیہ ہے لیکن آخرت میں دیدار الٰہی سب کو نصیب ہوگا۔ وہاں اہل ایمان اس نعمت سے سرفراز ہوں گے اور اس کی لذت وسرور سے کامران ہوں گے۔ آیت میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

سلوك: عارفین نے آیت سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ کمال قرب اور کثرت انوار کے باوجود دیدار الٰہی کرنے والوں میں احساس تشخص اور درک باقی رہے گا اور لذت وکیف پوری طرح محسوس ہوگا، انتہاء قرب کے باوجود فناء محض کی کیفیت طاری نہ ہوگی۔

سُوْرَةُ الْإِنْسَانِ

پارہ: 29

① ﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا۝﴾ [سورة الدهر: 8]

ترجمة: وہ نیک لوگ اللہ کی خوشنودی کے لیے محتاجوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

تفسیر: اللہ کی رضا وخوشنودی کے لیے اپنا کھانا باوجود خواہش وضرورت نہایت ذوق وشوق اور اخلاص سے ضرورت مندوں کو کھلا دیتے ہیں۔ ان میں مسلم وغیر مسلم کا بھی فرق روا نہیں رکھتے۔ جو بھی ضرورت مند ہوتا ہے، اس کی مدد کردیتے ہیں، نبیوں کے اخلاق دراصل ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

سُلوك: فقہاء نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ غیر مسلم قیدیوں کی امداد واعانت کرنا بھی موجب ثواب ہے اگرچہ بعض دوسرے فقہاء نے اس میں چند ایک قیدیں لگائی ہیں۔ (روح المعانی)

② ﴿اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ۝﴾

[سورة الدهر: 27]

ترجمة: یہ لوگ تو بس دنیا سے دل لگائے بیٹھے ہیں اور آگے آنے والے ایک بھاری دن کو چھوڑے ہوئے ہیں۔

تفسیر: کافر لوگ اس دن کو جو ان پر بھاری اور سخت ہوگا، بھولے ہوئے ہیں اور دنیا کی آنی وفانی نعمتوں پر مطمئن ہیں، یہ ان کی سخت غفلت ولا پرواہی ہے۔ قیامت کے دن انہیں کون نفع دے گا جب کہ وہ خود اپنے نفع کو پہچان نہ سکے۔

سُلوك: آیت میں لامذہبی ذہنیت کو واضح کیا گیا ہے کہ ان دین بے زاروں اور آخرت فراموش انسانوں کی عقلی وفکری پروازیں کتنی سطحی اور کھوکھلی ہوتی ہیں۔ یہ صرف ''حاضر پرست'' بلکہ ''آج پرست'' ہوا کرتے ہیں، دوراندیشی سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ (تفسیر ماجدی)

سُوْرَةُ الْمُرْسَلَاتْ

پَارَہ: 29

﴿ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ۝ ﴾

[سورۃ المرسلات: 30 تا 31]

ترجمة: (اے کافرو!) ایک ایسے سائبان کی طرف چلو جس کی تین شاخیں ہیں۔ جس میں نہ ٹھنڈا سایہ ہے اور نہ وہ سوزش سے بچاتا ہے۔ وہ انگارے برسائے گا جیسے بڑے بڑے محل گویا وہ زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔

تفسیر: آیت میں میدان حشر کا ذکر ہے۔ وہاں کل انسان دو 2 حصوں میں بٹ جائیں گے: یا مومن ہوں گے یا کافر۔ مومن ایک جماعت ہوگی اور کافر تمام مذاہب والے ہوں گے۔

اہل ایمان کو اس میدان میں ٹھنڈا فرحت بخش سایہ نصیب ہوگا اور وہ اس میں خوش و مطمئن حساب و کتاب کا انتظام کر رہے ہوں گے۔ یہ ٹھنڈا سایہ عرش الٰہی کا ہوگا۔

کافروں کے لیے جہنم سے ایک سیاہ اور گھنا دھواں نکلے گا اور اس شدت و کثرت سے نکلے گا کہ اوپر جا کر تین ٹکڑوں میں بٹ جائے گا اور حساب کتاب ہونے تک کافر اسی دھویں کے احاطہ میں گھرے رہیں گے، اس دھویں میں نہ سایہ ہوگا اور نہ سوز و تپش سے نجات رہے گی، اسی کرب و تپش میں ان کا حساب ہوگا اور یہ پھر جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔

حشر کے اس دھویں کو "ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ" کہا گیا، تین شاخوں والا (سہ رخی)۔

سُلوك: روح المعانی کے مفسر نے لکھا ہے کہ تین عدد کی تخصیص میں یہ نکتہ ملحوظ ہے کہ علم صحیح کی راہ میں حجابات تین ہوا کرتے ہیں:

① حس ② خیال ③ وہم

اسی طرح عمل صحیح کی راہ میں تین حجابات ہوتے ہیں:

① قوتِ وہمیہ

② قوتِ غضبیہ

③ قوتِ شہوانیہ

یہی تقاضے گمراہی و بے عملی کے اسباب بنتے ہیں۔

اس عنوان کو اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ انسان کو عذاب کی طرف لے جانے والی تین قوتوں کا غلط استعمال ہے:

① عقل وادراک کی گمراہیاں
② جذبات وشہوات کی لغزشیں
③ قوت ارادی کر کجرہیاں

② ﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ۝﴾ [سورۃ المرسلات: 48]

ترجمۃ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رکوع کرو تو وہ رکوع نہیں کرتے۔

تفسیر: دنیا میں کافروں کی حالت بیان کی جارہی ہے کہ جب انہیں نماز کا حکم دیا جاتا تو انکار کرتے ہیں اور نماز ادا نہیں کرتے۔آیت میں رکوع کا لفظ آیا ہے جو نماز کا ایک رکن ہے یعنی رکوع کرنا۔لیکن اس کے لغوی معنی خشوع خضوع وتواضع کے بھی ہیں۔اگر آیت میں یہی مراد لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ جب کبھی انہیں اطاعت وفرمانبرداری اور حق قبول کرنے کا درس دیا جاتا تو یہ تکبر واعراض کیا کرتے تھے،ایسے انکار کرنے والوں کی آخرت میں بڑی خرابی ہے۔

سُلوك: صوفیاء عارفین نے کہا ہے کہ کسی بھی حق بات کو قبول کرنے کا مقدمہ خشوع وتواضع ہے اور اس کی بڑی رکاوٹ کبر ونخوت ہے۔(جو خشوع وتواضع کی ضد ہے۔)

سُورَةُ النَّبَا

پَارَة: 30

(1) ﴿إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ۝ حَدَآئِقَ وَأَعْنَابًا ۝ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ۝ وَكَأْسًا دِهَاقًا ۝﴾

[سورة النباء: 31 تا 34]

ترجمة: اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے بے شک کامیابی ہے۔یعنی باغات اور انگور۔اور بھر پور جوانی والی یکساں عمر عورتیں۔اور لبالب جام شراب۔

تفسیر: آیت میں اہل جنت کے انعامات کا بیان ہے۔انہیں وہ ساری مادی لذتیں ونعمتیں حاصل ہوں گی جن سے وہ دنیا میں لذت یاب ہوا کرتے تھے۔سبز باغات ایک نہیں، کئی کئی عدد شیریں انگور اور حسین و جمیل نوخیز لڑکیاں، شراب سے بھر پور لذت و سرور والے پیالے وغیرہ، یہ سب نعمتیں اہل جنت کے لیے پروردگار عالم کی عطا و بخشش ہوں گی۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں جنت کی نعمتوں کو کامیابی قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ جنت سے لاپرواہی یا استغناء ظاہر کرنا باطل اور گمراہی ہے۔

البتہ جن متبع سنت بزرگوں سے ایسا ثابت ہے، یہ ان کا اپنا غلبۂ حال ہے جس میں وہ معذور ہیں اور دوسروں کے لیے قابل حجت نہیں۔

ملحوظه: جنت کی ان نعمتوں کو ذکر کر کے تین مختلف کلمات سے ان کی کیفیتوں کو ظاہر کیا گیا ہے: جَزَآءً، عَطَآءً، حِسَابًا

جَزَآءً: یعنی جنت کی یہ نعمتیں ان نیک اعمال کا بدلہ ہیں جو دنیا کی زندگی میں کیا کرتے تھے۔(اس میں عمل کی ضرورت اور اہمیت ثابت ہوتی ہے)

عَطَآءً: یعنی جنت کی یہ نعمتیں اللہ کی عطا و بخشش ہیں۔(جو عمل سے کئی گناہ زیادہ ہیں۔لہٰذا اپنے عمل کے وزن پر کامل بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔)

حِسَاباً: یعنی جنت میں جو کچھ بھی ملے گا، بے قاعدہ نہیں، حسب مراتب واخلاص ملے گا۔(ماجدی)

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ

پارہ: 30

﴿وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى ؕ﴿۴۱﴾﴾

[سورة النازعات: 40 تا 41]

ترجمة: اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو خواہشات سے روکا ہوگا۔ اس کا ٹھکانہ جنت ہوگا۔

تفسیر: رب کے سامنے کھڑا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں حرام خواہشات اور ناجائز اعمال سے بچتا رہا۔ اور یہ اس لیے کہ اس کو یقین تھا کہ آخرت میں ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہوگا اور حضور رب میں اس کا فیصلہ ہوگا تو ایسے شخص کا انجام جنت کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں ضبط نفس کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔

ملحوظه: محققین اہل سنت لکھتے ہیں کہ ہر وہ ذکر یا مجاہدہ جو لذت نفس کے لیے اختیار کیا جاتا ہے، وہ بھی ہویٰ (خواہشات نفس) کے حکم میں داخل ہے۔ اس لیے اہل بدعت کو اہل ہویٰ کہنا درست ہے۔ (کیونکہ ان کے اکثر اعمال صرف اپنی لذت اور عوامی تقاضوں کے لیے ہوا کرتے ہیں۔)

صوفیاء عارفین نے "خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ" سے خوف کے تین درجے لکھے ہیں:

① پہلا درجہ: یہ کہ اپنے قول و عمل میں آخرت کے مواخذہ کا دھڑکا لگا رہے۔ یہ مقام ① اہل تقویٰ کا ہے۔

② دوسرا درجہ: یہ کہ گناہ و لغزش میں اللہ کی نظر و کرم سے گر جانے کا اندیشہ لگا رہے۔ یہ مقام ② اہل محبت کا ہے۔

③ تیسرا درجہ: یہ کہ محض عظمت و ہیبت الٰہی سے لرزتا رہے۔ یہ مقام ③ عبدیت ہے۔

عبدیت کا مرتبہ اہل تقویٰ اور اہل محبت دونوں سے بلند تر ہوا کرتا ہے۔ انبیاء کرام کو یہی کیفیت حاصل رہتی ہے۔ (تفسیر ماجدی)

سُوْرَۃُ عَبَسَ

پَارَۃ: 30

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۙ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۙ﴾ [سورة عبس: 1 تا 2]

ترجمة: پیغمبر ترش رو ہو گئے اور متوجہ نہ ہوئے۔ جب کہ ان کے پاس نابینا آیا۔

تفسیر: نبوت کے ابتدائی دور میں ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں قریش کے چند سردار بیٹھے تھے، آپ انہیں اسلام کی دعوت و تبلیغ کر رہے تھے۔ ایسے وقت ایک نابینا صحابی عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آ گئے اور آپ سے کوئی مسئلہ دریافت کرنے لگے۔ نبی کریم ﷺ کو ان کا بے موقع سوال کرنا گراں گزرا۔ علاوہ ازیں ان قریشی سرداروں نے بھی اس کو اپنی عزت و شان کے خلاف سمجھا کہ ایک غریب وفقیر انسان ہماری صفوں میں بیٹھ گیا۔

نبی کریم ﷺ نے ضبط نفس سے کام لیا اور ان صحابی کو کچھ جواب نہ دیا اور اپنے سابقہ کام میں مشغول رہے۔ وہ نابینا صحابی اٹھ کر چلے گئے۔ کچھ دیر نہ لگی تھی کہ آپ ﷺ پر قرآن کی مذکورہ آیات نازل ہوئیں اور آپ ﷺ کو آگاہ کیا گیا کہ نفع عاجل کو نفع آجل پر مقدم کرنا چاہیے تھا یعنی نابینا صحابی تو نقد نصیحت و ہدایت لینے کے لیے آئے تھے اور قریشی سرداروں کا نفع حاصل کرنا یقینی نہ تھا۔

لہٰذا آپ ﷺ کو نابینا صحابی کی آمد پر ترش رو نہ ہونا چاہیے تھا بلکہ ان کے سوالات کا جواب دے دیا ہوتا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے واقعہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ اگر کسی ناواقف سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو اس پر مواخذہ نہ کرنا چاہیے۔

ملحوظہ: آیات کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ نابینا صحابی عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی دل جوئی فرمایا کرتے اور ان کا لحاظ رکھا کرتے تھے اور وہ جب کبھی آپ کی مجلس میں آتے تو آپ ان کا خیر مقدم کرتے اور ان کے سلام کا جواب وَعليكم السلام بِمَنْ عَاتَبَنِيْ فيه رَبِّيْ فرمایا کرتے۔ وعلیکم السلام اس شخص پر جس کے بارے میں میرے رب نے مجھ کو عتاب فرمایا۔

سُورَةُ التَّكوِير

پَارَہ: 30

⑩ ﴿وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ۝﴾ [سورة التكوير: 7]

ترجمة: اور جب ایک ایک قسم کے لوگ یکجا جمع کر دیئے جائیں گے۔

تفسیر: یوم حشر کا تذکرہ ہے۔ وہاں ہر شخص اپنے ہم مذہب و ہم ملت کے ساتھ اکٹھا ہوگا۔ مثلاً مومن مومنین کے ساتھ، یہودی یہودیوں کے ساتھ، کافر کافروں کے ساتھ، ظالم ظالموں کے ساتھ، قاتل قاتلوں کے ساتھ، اسی طرح ہر مجرم اپنے ہم پیشہ مجرموں کے ساتھ ہوگا تاکہ ہر گروہ وہاں ممتاز ہو جائے، پھر اسی کے مطابق فیصلے ہوں گے۔ دوسری آیت سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ ﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ﴾ [سورة يٰسين: 59]

سُلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جس طرح آخرت میں تناسب وارتباط، اجتماع کا سبب ہوا، اسی طرح دنیا میں بھی یہی مناسبت ارتباط وتناسب کا سبب ہوا کرتی ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ شیخ و مرید میں یہی ارتباط وتناسب نفع کا مدار ہوا کرتا ہے۔

سُورَۃُ الاَنفِطَار

پَارَہ: 30

⑪ ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝﴾ [سورة الأنفطار: 10]

ترجمۃ: تم پر نگہبان عمل لکھنے والے۔ معزز فرشتے مقرر ہیں۔

تفسیر: ہر انسان پر دو ② نگراں فرشتے مقرر ہیں جو اس کی دن رات کی نیکی و بدی لکھ لیا کرتے ہیں، ان کو قرآنی زبان میں ''کراماً کاتبین'' کہا جاتا ہے۔ یعنی معزز و باخبر فرشتے جو انسانی اعمال کو بروقت لکھتے ہیں۔ نہ ان میں کچھ خیانت کرتے ہیں، نہ بھول چوک کی وجہ سے لکھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی امانت و دیانت کی وجہ سے انہیں ''کراماً'' معزز کے لقب سے ذکر کیا گیا ہے۔ وہ ایسے باخبر ہیں کہ باریک سے باریک اور خفی عمل بھی ان پر پوشیدہ نہیں رہتا۔ اللہ نے اسی کام کے لیے انہیں پیدا کیا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اصلاح عمل کے لیے ان آیات کا مراقبہ (غور و فکر) نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔

اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ

پَارَہ: 30

① ﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾ [سورة التطفيف: 14]

ترجمة: (ایسا ہرگز نہیں کہ جزاو سزا نہ ہو) اصل یہ ہے کہ ان کے قلوب پر ان کے کرتوتوں کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔

تَفسِیر: کافروں کی بغاوت وعناد کا ذکر ہے کہ ان کا یہ انکار دراصل اس مسخ شدہ ذہنیت کا انجام ہے جو انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اختیار کر رکھی ہے۔

انہیں نہ حق کی تلاش ہے، نہ اس کو قبول کرنے کا جذبہ ہے پھر انہیں کیونکر ہدایت مل سکتی ہے۔ اسی انکار و تکذیب کی وجہ سے قلوب میں صلاحیت ہی فاسد ہوگئی ہے اور دل زنگ آلود ہو گیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ "ظلمت قلب" جس کا ذکر صوفیاء کے ہاں بکثرت آیا ہے، اس کی سند اسی آیت میں ملتی ہے۔

② ﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝﴾ [سورة التطفيف: 15]

ترجمة: (ہرگز ایسا نہیں کہ جزاو سزا نہ ہو) یہ لوگ اس دن اپنے پروردگار کی زیارت سے روک دیئے جائیں گے۔

تَفسِیر: یعنی کافر لوگ انکار وتکذیب کے انجام سے بے فکر نہ ہوں، وہ وقت ضرور آنے والا ہے کہ اس وقت اہل ایمان اپنے رب کے دیدار سے مشرف ہوں گے اور یہ بدبخت کافر محروم دیدار ہو جائیں گے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آخرت میں اہل ایمان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا جیسا کہ اہل سنت کے اکثر علماء کی بھی یہی تحقیق ہے۔

③ ﴿وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۝ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۝﴾ [سورة التطفيف: 27 تا 28]

ترجمة: اور اس شراب خالص میں آب تسنیم کی آمیزش ہوگی۔ جو جنت کا ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے مقرب بندے پیا کریں گے۔

تَفسِیر: تسنیم، جنت کے ایک عظیم الشان چشمہ کا نام ہے جس کا پانی خاصان خدا پیا کریں گے اور اللہ کے نیک بندوں (ابرار) کو بھی شراب خالص کے ساتھ آب تسنیم مرحمت ہوگا۔

اس پانی کی حلاوت وفرحت دنیا جہاں کی لذتوں سے بلند تر ہوگی، یہ اہل جنت کے اکرامات وانعامات میں سے ایک خاص انعام ہوگا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عارفین نے کہا ہے کہ آب تسنیم میں شاید ایسی کوئی خاص کیفیت ہوگی جو

لذات جسمانی اور خواہشات نفسانی سے چھڑا کر تمام تر ذوق وشوق لقاء رب کے لیے پیدا کر دیتی ہو۔

ملحوظہ: مقربون، اہل جنت کے افضل ترین مرتبہ والے ہیں جن کا ذکر سورۂ واقعۃ پارہ ۲۷ میں آچکا ہے۔

بعض محققین نے لکھا ہے کہ جنت میں مقربین تو مشاہدۂ حق کی لذتوں میں مستغرق رہیں گے اور اصحاب الیمین یعنی (ابرار) مشاہدۂ حق کے ساتھ مشاہدۂ خلق میں بھی۔ (تفسیر کبیر)

﴿فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴾ [سورة التطفيف: 34]

ترجمۃ: سوآج کے دن ایمان والے کافروں پر ہنستے ہوں گے۔ اپنی مسہریوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے۔

تفسیر: دنیا کی زندگی میں تو کافر اور بے دین لوگ غریب مسلمانوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن قیامت کے دن یہی غریب کمزور مسلمان ان پر ہنس رہے ہوں گے اور ان کو ان کی بیوقوفی اور حماقت یاد دلا رہے ہوں گے۔

سلوك: تفسیر ماجدی کے مفسر نے لکھا ہے کہ بعض بے ادب شاعروں نے اپنی حماقت سے جنت اور اہل جنت پر چوٹیں لگائیں ہیں، انہیں آیت کے مضمون سے ڈرنا چاہیے۔

سُورَةُ الانشقاق

پارہ: 30

① ﴿ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴾ [سورة الأنشقاق: 19]

ترجمة: تم کو ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچنا ہے۔

تفسیر: اوپر کی آیات میں کافروں کی دنیوی زندگی کا حال بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنی لیل ونہار میں نہایت مست وبے فکر رہا کرتے ہیں اور یہ یقین کیے ہوئے ہیں کہ مرنے کے بعد جی اٹھنا نہیں ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ دنیا کی بڑی بڑی چیزوں چاند، سورج، ستاروں، لیل ونہار کی قسم کھا کر ارشاد فرماتے ہیں کہ انسان ایسی مخلوق نہیں ہے کہ جس پر شروع سے آخر تک ایک ہی حالت قائم رہے، سارا عالم گواہ ہے کہ انسان ایک ترقی پسند مخلوق ہے۔ آج معدوم تھا پھر زندہ کیا گیا پھر مردہ ہوا، اس کے بعد زندہ کیا جائے گا۔

انسان کی تدریجی ترقی وتنزلی خود اپنے آپ دلیل ہے کہ وہ ایک حالت سے دوسری حالت پر جاتا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے مخصوص ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو آیت سے مراتب قرب میں ترقی مراد ہوگی اور یہی شان وارثین رسول کے مراتب واحوال میں ہوا کرتی ہے۔

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ

پارہ: 30

⑪ ﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ﴾ [سورة البروج: 11]

ترجمة: یہی بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر: جنت اور جنت کی نعمتوں کو حقیر اور خواب وخیال تصور کرنے والے خواہ قدیم جاہلی صوفیاء ہوں یا جدید روشن خیال (مستشرقین) ہوں، بہر حال اگر ان کا ایمان قرآن پر ہے تو غور کریں کہ قرآن حکیم نے جنت اور جنت کی نعمتوں کا ذکر کیسے کیسے شوق ورغبت دلانے والے کلمات سے کیا ہے اور کس طرح جنت ہی کو انسانی عمل کا انتہائے مقصود بتلایا ہے اور انسان کی حقیقی ودائمی کامیابی کو یہی جنت قرار دیا ہے۔ (کیا یہ ایسی حقیقت ہے جس کو حقیر یا خواب وخیال تصور کیا جائے؟)

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جنت انسانی کوششوں کی معراج ہے، اس کے سوا اور کوئی درجہ نہیں۔ ﴿وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ اور ایسی ہی چیزوں میں حرص کرنے والے کو حرص کرنی چاہیے۔

سُوْرَۃُ الطَّارِق

پَارَۃٌ: 30

﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾﴾

[سورة الطارق: 1 تا 3]

ترجمة: قسم ہے آسمان کی اور رات کونمودار ہونے والے کی۔ اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ رات کونمودار ہونے والی کیا چیز ہے؟ وہ ایک روشن ستارہ ہے۔ کوئی شخص ایسا نہیں جس پر اعمال کا یادرکھنے والا فرشتہ نہ ہو۔

تَفسِیر: یعنی قیامت کے دن اعمال پر محاسبہ ہونا ایسے ہی یقینی وقطعی ہے جیسے رات کو آسمان پر ستارے روشن ہوتے ہیں۔ ستاروں کا روشن ہونا ایک حقیقت ہے اگرچہ وہ دن میں نظر نہیں آتے، لیکن بہرحال موجود ہیں۔ اسی طرح انسانوں کے اعمال ایک صحیفہ میں درج ہو رہے ہیں جن کو کراماً کاتبین لکھ کر محفوظ کر دیتے ہیں۔ یہی اعمال قیامت کے دن روشن ہوں گے اور اسی پر فیصلے کیے جائیں گے۔

سُلوك: جیسے آسمان پر ستارے موجود تو ہر وقت ہیں مگر ان کا ظہور رات کے وقت ہوا کرتا ہے، اسی طرح انسانوں کے اعمال سب کے سب نامۂ اعمال میں محفوظ ہیں لیکن ان کا ظہور قیامت کے دن ہوگا۔ ﴿وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ﴿۱۱﴾ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۙ﴿۱۲﴾﴾ [سورة الطارق: 11 تا 13]

ترجمة: قسم ہے بارش والے آسمان کی۔ اور پھٹ جانے والی زمین کی۔ یہ قرآن قول فیصل ہے۔

تَفسِیر: عربی کلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ تاکید اور یقین کے لیے بڑی بڑی چیزوں کی قسم کھاتا ہے جو انسانوں کی نگاہ میں عظیم شمار کیے جاتے ہیں۔ آسمان اور زمین کی قسم کھا کر یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ قرآن حکیم ایک قول فیصل یعنی حق و باطل کا فیصلہ کرنے والا کلام اور ایک مضبوط پیام ہے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ پھٹ جانے والی زمین جو پودوں کے نکلتے وقت پھٹ جاتی ہے جب کہ وہ اتنی زبردست و مضبوط ہے کہ ہزاروں ٹن وزن اس کی پشت پر رکھ دیا جائے لیکن وہ ایک انچ بھی پھٹ نہیں پاتی، یہ اللہ کی کیسی عظیم صنعت ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جس طرح بارش آسمان سے آتی ہے اور عمدہ زمین کو فیضیاب کرتی ہے، اسی طرح قرآن حکیم بھی آسمان سے اترا اور جس کے سینے میں قبولیت کی صلاحیت ہوتی ہے، اسے مالا مال کر دیتا ہے۔

ملحوظہ: شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ قرآن کی اس تاثیر کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست۔ در باغ لالہ روئد و در شورہ بوم خس

بارش کی لطافت و پاکیزگی میں کوئی کلام نہیں ہے۔ جب وہ باصلاحیت زمین (باغ و کھیت) پر گرتی ہے تو پھل پھول پیدا کرتی ہے لیکن یہی بارش جب بنجر و ویران زمین پر پڑتی ہے تو خس و خاشاک پیدا کرتی ہے۔ (قصور بارش کا نہیں ہے بلکہ زمین خراب ہے۔)

سُورَةُ الأعلیٰ

پارہ: 30

① ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝﴾ [سورة الاعلى: 14 تا 15]

ترجمة: بامراد ہو گیا وہ جو پاک ہوا۔ اور اپنے پروردگار کا نام لیا اور نماز پڑھتا رہا۔

تفسیر: یعنی صحیح عقائد پر اور اعمال پر قائم رہا اور نفس کو بد اخلاقی اور خباثتوں سے پاک رکھا۔ ایسا شخص کامیاب ہوا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

سلوك: حکیم الامت ﷫ لکھتے ہیں کہ یہ دو مختصر آیتیں اہل طریق کے اعمال کی جامع تعلیمات ہیں: ① ذکر اللہ ② تزکیہ نفس۔

سُورَةُ الغَاشِيَةِ

پارہ: 30

(1) ﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝﴾ [سورة الغاشية: 2 تا 3]

ترجمة: بہت سے چہرے اس دن ذلیل وخوار، مصیبت جھیلنے والے خستہ پستہ ہوں گے۔

تفسیر: آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے دن ایک طبقے کے چہرے بارونق اور خوش وخرم ہوں گے اور دوسرے طبقے کے بے رونق، خستہ پستہ، ذلیل وخوار۔

بارونق چہرے والے اہل ایمان ہوں گے اور بے رونق اور ذلیل وخوار قوم نصاریٰ۔ کیا ان مرتاض وگمراہ عبادت گزاروں کے چہرے ہوں گے جو حق پر قائم نہ تھے اور جو مذہب کی آڑ میں دنیا حاصل کرتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کی تفسیر ایسے ہی نقل کی گئی ہے۔ (ابن کثیر)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جو شخص عبادت وریاضت کرتا ہو لیکن صراطِ مستقیم پر قائم نہ ہو جیسا کہ اہل بدعت کے پیشوا اور رہنما ہیں، وہ بھی اس طبقے میں شامل ہو جاتے ہیں۔

سُوْرَةُ الْفَجْرِ

پارہ: 30

﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ؕ﴾ [سورة الفجر: 15 تا 16]

ترجمۃ: سو آدمی کو جب اس کا پروردگار آزماتا ہے یعنی اس کو انعام واکرام دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے میری عزت بڑھادی۔ اور جب اس کو آزماتا ہے یعنی اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے میری عزت گھٹادی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

تفسیر: ناشکرے انسان کا حال بیان کیا گیا ہے کہ جب اللہ اپنے فضل وکرم سے اس کو نوازتا ہے تو اپنی حماقت سے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ملا ہے، وہ میری قابلیت ومحنت کا نتیجہ ہے اور میں تو اس کے فضل وکرم کا مستحق تھا۔

لیکن اگر اس پر مال ومتاع کی تنگی کردی جاتی ہے تو وہ ہر طرف شکوہ شکایات کے دفتر کھولے پھرتا ہے حالانکہ یہ حالت اس کے امتحان اور صبر وتسلیم کی تھی لیکن اس نے اس کو اپنی توہین اور ناانصافی سمجھا۔

آیت میں اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ دونوں خیال ہرگز درست نہیں ہیں۔ (کلّا)

حقیقت یہ ہے کہ مال ومتاع وخوشحالی نہ اترانے کی چیز ہے، نہ بدحالی بے نصیبی کی دلیل ہے۔

مقصود تو انسان کے ظرف کا امتحان ہوا کرتا ہے کہ کون اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور کون پھسل جاتا ہے۔

سُلوك: بعض جاہل مرید یہ جو کہا کرتے ہیں کہ جب سے ہم فلاں حضرت کے سلسلے میں داخل ہوئے ہیں، مال و متاع میں ترقی ہوئی ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ سلسلہ اللہ کے یہاں مقبول پسندیدہ ہے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ایسا تصور جہل خالص ہے۔ (کیونکہ خوشحالی یا فقر وفاقہ، رضائے الٰہی یا غضب الٰہی سے تعلق نہیں رکھتا۔ ﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ﴾ [سورة الرعد: 26]

(اللہ جس کو چاہے، رزق دیتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگی کر دیتا ہے اور یہ کفار لوگ دنیوی زندگی پر اتراتے ہیں اور یہ دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں ایک متاع قلیل کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔)

﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۙ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۚ﴾

[سورة الفجر: 27 تا 28]

ترجمۃ: اے اطمینان والی روح! تو اپنے پروردگار کی طرف چل۔ خوش ہوتی ہوئی اور خوش کرتی ہوئی۔

تفسیر: یہ بشارت ہر مومن کو عین اس وقت ملتی ہے جب اس کی روح قبض کرنے کے لیے فرشتے آتے ہیں۔ فرشتوں کی اس عظیم جانفزا خوشخبری کو سن کر مومن کی روح لقاء رب کے لیے بے قرار ہو جاتی ہے اور فرشتوں سے کہنے لگتی ہے کہ جلد سے جلد مجھے لے چلو۔

سُلوك: نفوس مطمئنہ وہ مقدس نفوس ہیں جو زندگی بھر رضائے الٰہی کی طلب میں اور احکام شرعیہ کی پابندی میں ایسے مطمئن ہو گئے تھے کہ مخالفت تو کیا کرتے، ناگواری کا بھی وہم باقی نہ رہا تھا، ایسے نفوس قدسیہ انبیاء کرام کے علاوہ اولیاء کاملین کے بھی ہوا کرتے ہیں۔

ملحوظه: تفسیر ماجدی کے مفسر لکھتے ہیں کہ سورۃ الفجر کی یہ آخری چار آیات گنہگار مسلمان کے لیے زندگی کا آخری سہارا اور تن مردہ کے لیے حیات بخش ہیں۔

اے اللہ! آپ اس نامہ سیاہ راقم تفسیر کو بھی آخری وقت اس صدائے دل نواز سے مشرف فرمایئے اور اس کے ہر عزیز و قریب، مخلص و متوسل کو بلکہ ہر کلمہ گو کو بھی۔ زیر مطالعہ کتاب کے مرتب کی بھی یہی دعا ہے۔

آمین یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ

سُوْرَةُ الْبَلَدِ

پارہ: 30

⑪ ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴾ [سورة البلد: 11]

ترجمۃ: مگر وہ شخص گھاٹی سے ہو کر نہیں نکلا۔

تفسیر: اَلْعَقَبَۃ کے لفظی معنی پہاڑ کی گھاٹی کے ہیں۔ آیت میں دین کی گھاٹی مراد ہے۔

دین کو گھاٹی اس لیے کہا گیا کہ اس کے احکام بھی نفس پر شاق گزرتے ہیں۔

یعنی انسان پر اللہ کے اتنے کثیر در کثیر انعامات واحسانات ہیں جس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ انسان دین کی گھاٹی عبور کرتا اور ایمان واسلام قبول کرتا لیکن اس نے بغاوت وسرکشی اختیار کی اور راہِ حق سے دور ہو گیا۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں دین کو پہاڑ کی گھاٹی کہا گیا، اس تشبیہ میں مجاہدہ کی ترغیب نکلتی ہے اگرچہ اس میں گونہ مشقت ہو۔

⑰ ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴾ [سورة البلد: 17]

ترجمۃ: اور تو اور یہ کافر ان لوگوں میں نہ ہوا جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی تاکید کی اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی نصیحت کی۔ یہی لوگ آخرت میں داہنی جانب والے ہیں (یعنی عرش الٰہی کی داہنی جانب والے کامیاب لوگ۔)

سُلوک: تواصی بالصبر تمام حقوق اللہ کی ادائیگی کا جامع عنوان ہے اسی طرح تواصی بالمرحمۃ تمام حقوق العباد کی ادائیگی کا جامع ہے۔

اہل تحقیق صوفیاء نے کہا ہے کہ تصوف کی اصل یہی دو چیزیں ہیں: ''صدق مع الحق، خلق مع الخلق۔''

(تفسیر کبیر)

سُوْرَةُ الشَّمْسِ

پارہ: 30

(1) ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ [سورة الشمس: 8]

ترجمة: پھر اس کی بدکرداری اور پرہیز گاری کا اس کو الہام کیا۔

تفسیر: انسان کی تخلیق کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چند ایک چیزوں کی قسم کھا کر یہ حقیقت بیان کی ہے کہ اس نے انسان کے اندر نیکی اور بدی کا رجحان پیدا کیا ہے۔ دونوں رجحان کا خالق اللہ ہی ہے گو نیکی کا القاء فرشتوں کے واسطہ سے ہوتا ہے اور بدی کا القاء شیطان کی جانب سے۔

وَالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى

سُلوك: حکیم الامت ؒ لکھتے ہیں کہ نفس کو جس فجور و تقویٰ کا الہام ہوتا ہے، وہ وہی نفس ہے جس میں پیدائش کے وقت استعداد رکھی تھی، یعنی انسان کی طبیعت میں یہ القاء کر دیا گیا کہ نجات و فلاح اس کے لیے ہے جس نے اپنے نفس کو راہِ فجور سے پاک رکھا اور تقویٰ و طہارت اختیار کی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نجات و ہلاکت دونوں کی کوشش انسان کے اپنے اختیار کی چیزیں ہیں۔

سُوْرَةُ اللَّيْلِ

پَارَہ: 30

﴿ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ ﴾ [سورة الليل: 7]

ترجمۃ: سوہم اس کے لیے راحت کی چیز آسان کر دیں گے۔

تَفسِیر: اوپر کی آیات میں بیان کیا گیا کہ جو کوئی اللہ سے ڈرتا رہا اور نیک بات کی تصدیق کی یعنی ایمان لے آیا تو ہم اسے جنت تک آسانی سے پہنچا دیں گے اور اسے ایسی توفیق دیں گے کہ راہ کی مشکلات آسانی سے طے کرتا چلا جائے گا۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ عمل کا دار و مدار توفیق الٰہی پر منحصر ہے۔ (اور توفیق الٰہی انسان کے اپنے ارادے واختیار سے نصیب ہوجاتی ہے۔)

﴿ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ ﴾ [سورة الليل: 19]

ترجمۃ: اور اس کے اوپر کسی کا احسان نہیں ہے کہ وہ اس کا بدلہ اتارے بلکہ وہ صرف اپنے عالیشان پروردگار کی خوشبو کے لئے عمل کرتا ہے اور وہ عنقریب خوش بھی ہوجائے گا۔

تَفسِیر: اکثر مفسرین نے ان آیات کا مصداق سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو قرار دیا ہے کہ یہ آیات ان کے بارے میں نازل ہوئیں، اگرچہ ان کا حکم عام ہے۔ (ابن کثیر، روح المعانی)

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کی تصدیق کی اور عمل کر دکھایا۔ یہ سب اللہ کی رضا وخوشنودی کے لیے تھا، احسان کا بدلہ چکانا مقصد نہ تھا، نہ احسان جتانا تھا۔ اس کے صلہ میں اللہ نے انہیں دنیا وآخرت کی اتنی بھلائی دی کہ وہ خوش ہو گئے۔

(خوشی کی تفصیل کے لیے ملحوظہ سلوک ۸۰۷ مطالعہ کیجئے)

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کسی کا احسان اتارنا اگرچہ جائز عمل ہے لیکن مزید شرف وفضیلت کی بات تو یہ ہے کہ اپنے خرچ سے سوائے رضائے الٰہی کے کوئی دوسرا مقصد نہ ہو۔

سُوْرَۃُ الضُّحٰی

پَارَۃ: 30

﴿وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝﴾

[سورة الضحیٰ: 4 تا 5]

ترجمة: اور آخرت آپ کے لیے دنیا سے بدرجہا بہتر ہے۔ اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا عطا کرے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔

تفسیر: نبوت کے ابتدائی دور میں چند یوم وحی کا سلسلہ رک گیا تھا۔ اس پر آپ ﷺ طبعی طور پر مغموم و بے چین سے تھے۔ اس پر مشرکین نے طعنہ زنی اور بدشگونی شروع کر دی تھی۔ ایک خبیث عورت نے یہ جملہ کسا تھا کہ محمد کو اس کے رب نے چھوڑ دیا ہے۔ پھر بہت جلد وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا اور آپ ﷺ کو یہ خوشخبری دی گئی کہ آپ کی ہر اگلی حالت پچھلی حالت سے بہتر و خیر ہی خیر ہے، آپ کو غم زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

سُلوك: آیت سے صوفیاء کے قبض و بسط کی اصطلاح کا ثبوت ملتا ہے۔ انقطاع وحی کی مدت قبض سے تعلق رکھتی ہے اور نزول وحی کا زمانہ بسط کی حالت ہے۔ (تفسیر ماجدی)

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ہر حالت لاحقہ، ہر حالت سابقہ سے افضل و اکمل ہے، عارف کو بھی اسی کا معتقد رہنا چاہیے تو پھر وہ حالت قبض سے غمگین نہ ہوگا۔

ملحوظہ: ﴿وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا عطا کرے گا کہ آپ خوش ہو جائیں۔ وہ عطا کیا ہے؟ کب ملے گی؟ کہاں ملے گی؟ اور آپ کی وہ خوشی کیا ہوگی؟ قرآن ان تفصیلات سے ساکت ہے۔ مفسرین کرام نے حالات و واقعات سے بہت ساری تفاصیل لکھی ہیں۔ ممکن ہیں وہ سب مراد ہوں۔

راقم الحروف کا احساس ہے کہ جب آیت اس تفصیل سے ساکت ہے تو غالباً اس سکوت کی یہ وجہ ہوگی کہ جب کسی بڑے عظیم الشان بادشاہ کی جانب سے بے حد و حساب دیا جانے والا ہوتا ہے تو ایسے موقع پر تحدید و تعیین نہیں ہوتی کہ اتنا اور اتنا دیں گے بلکہ اجمالاً کہہ دیا جاتا ہے کہ آپ کو خوش کر دیں گے۔

مذکورہ آیت کا منشاء بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا و آخرت کی ہر مرغوب و پسندیدہ چیزیں آپ کو ملیں گی جس پر آپ خوش ہو جائیں گے، یہاں آپ کو دینے والا خزائن ارضی و سماوی کا مالک بھی تو ہے، جب وہ بے تعیین دے گا تو کیا کچھ نہ دے گا؟ فَصَلَوَاتُ رَبِّيْ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ایک روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (إِذًا لَّاَ اَرْضٰی وَوَاحِدٌ مِّنْ اُمَّتِیْ فِی النَّارِ) (حدیث)

جب یہ بات ہے تو پھر میں اس وقت تک خوش نہ ہوں گا جب تک میری امت کا ایک شخص بھی جہنم میں باقی ہے۔

(22) ﴿وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ [سورة الضحىٰ: 11]

ترجمة: اور اپنے رب کی نعمتوں کا تذکرہ کرتے رہا کیجئے۔

تفسیر: اس سلسلے میں اللہ نے آپ پر بے شمار نعامات فرمائے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ مذکورہ سورت میں موجود ہے۔ لہٰذا آپ اپنے رب کی نعمتوں کا تذکرہ کرتے رہیں جس سے مزید انعامات حاصل ہوتے رہیں گے۔

قرآن حکیم نے یہ حقیقت بھی ظاہر کردی ہے کہ اگر نعمت کا شکر ادا کیا جاتا رہے تو نعمت میں اضافہ ہوا کرتا ہے۔ ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ الآیة۔ (ابراہیم)

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بعض اولیاء اللہ جب کبھی اپنے کمالات کا اظہار کرتے ہیں تو ان کا مقصود شکر کی ادائیگی ہوا کرتی ہے نہ کہ عجب و ریا۔

سُوْرَةُ الشَّرْح

پارہ: 30

(1) ﴿ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ ﴾

[سورة الأنشراح: 1 تا 3]

ترجمة: کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کیا؟ اور ہم نے آپ پر سے وہ بوجھ اتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ دی تھی۔ اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا شہرہ بلند کیا ہے۔

تفسیر: آیات مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ پر اپنے انعامات کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان میں پہلی نعمت ''شرح صدر'' (سینہ کشادہ کر دینا) ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کا حوصلہ کشادہ کر دیا گیا ہے جس میں علوم ومعارف کے سمندر اتار دیئے ہیں اور لوازم نبوت اور فرائض رسالت برداشت کرنے کا اتنا بڑا حوصلہ عطا کیا ہے کہ سینکڑوں دشمنوں اور مخالفوں وعداوتوں سے گھبرانہ پائیں اور دنیا وآخرت کے حقائق پر پورے اعتماد ویقین سے قائم رہیں۔

شاہ عبدالعزیز محدث رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آپ کی عالی ہمت اور پیدائشی استعداد جن کمالات ومقامات پر پہنچنے کا تقاضہ کرتی تھی، اس کے لیے آپ کا سینہ کشادہ کر دیا تاکہ وہ سارے فضائل وکمالات آپ کے قلب مبارک میں جمع ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بوجھ وگرانی بھی جو راہِ حق کی راہ پیمائی میں آپ محسوس فرما رہے تھے، دور کر دی گئی۔ پھر اس راہ کی مشکلات ومصائب کا برداشت کرنا آسان ہو گیا، اسی مفہوم کو آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد ﴿ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴾ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مذکورہ نعمتوں کے علاوہ آپ کا ذکر بھی بلند کر دیا گیا۔ اللہ کے مقدس فرشتے رات دن آپ پر رحمتوں کی دعا کرتے رہتے ہیں اور خود رب العالمین بھی آپ پر رحمتیں نازل کر رہا ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ﴾ [سورة الأحزاب: 56]

علاوہ ازیں اذانوں میں، اقامت میں، خطبات میں، کلمہ طیبہ میں، التحیات میں، منبروں ومحرابوں پر اور میدانوں میں آپ کا نام لیا جاتا ہے۔ اللہ نے قرآن حکیم میں بندوں کو جہاں اپنی عبادت واطاعت کا حکم دیا ہے، وہاں آپ کی اطاعت وفرمانبرداری کا بھی حکم دیا ہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اہل تحقیق صوفیاء کے ہاں جس ''شرح صدر'' کا تذکرہ رہا کرتا ہے، وہ یہی عظیم نعمت ہے (جس کی تفسیر آیت میں کی گئی ہے)۔

رفع ذکر بھی ایک بڑی نعمت ہے۔ اہل اللہ کو جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوتی ہے، وہ بھی رفع ذکر میں شامل

ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ سالک کو مقصود کے حصول سے پہلے جو ضیق وثقل اور حیرانی پیش آتی ہے اور جو اس کی کمر توڑے رکھتی ہے، وہ بھی ''وِزْر'' میں داخل ہے۔ پھر مقصود کے حصول کے بعد جو نشاط واطمینان حاصل ہوتا ہے، وہ ''شرح صدر'' ہے جو اللہ کے فضل عظیم کی علامت ہے۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مجاہدہ کرنے والوں کو عادۃً ان نعمتوں سے حصہ ملا کرتا ہے۔

﴿اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ میں اس جانب اشارہ ہے۔

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَ اِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝﴾ [سورة الأنشراح: 7 تا 8]

ترجمة: تو آپ جب فارغ ہو جایا کریں تو محنت وریاضت کیا کیجئے۔ اور اپنے رب ہی کی طرف توجہ کیجئے۔

تفسیر: یعنی نبوت ورسالت کے فرائض وواجبات سے فارغ ہولیں تو خلوت (تنہائی) میں بیٹھ کر اپنے رب کی طرف لو لگائیں اور کثرت سے عبادت ومجاہدات میں مشغول رہا کریں۔

(غالباً یہ حکم آپ ﷺ کے ابتدائی دورِ نبوت کا تھا۔ آپ راتوں میں اپنی نمازوں کے اندر اتنا طویل قیام فرماتے تھے کہ پیر مبارک متورم ہو جاتے پھر یہ حکم اٹھا لیا گیا۔)

آپ کی دعوت وتبلیغ اگرچہ آپ کی عبادات ومجاہدات میں شامل ہے لیکن اس میں ایک واسطہ مخلوق کا بھی رہتا تھا۔ آیت میں یہ حکم مل رہا ہے کہ اس نوعیت کی عبادت کے علاوہ براہ راست توجہ الی اللہ کے لیے بھی وقت نکالیں۔

سلوك: حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ شیخ جب اپنے ارشادت وافادات سے فارغ ہو جائے تو چاہیے کہ خلوت میں ذکر وفکر ومناجات میں لگ جائے اور خود کو مجاہدات سے مستغنی نہ سمجھے۔

سُوْرَةُ التِّيْنِ

پارہ: 30

(1) ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ ﴾ [سورة التين: 4]

ترجمة: ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔

تفسیر: یعنی انسان کی پیدائش یونہی بے مقصد نہیں کی گئی بلکہ وہ انتہائی حکمتوں اور صناعیوں کا مجموعہ ہے۔ بہترین ساخت، شکل وصورت کے علاوہ زمینی خلافت کا اہل بنایا ہے گویا وہ اللہ کی زمین پر اس کا نائب ومنتظم ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تصوف میں یہ جو مقولہ مشہور ہے کہ انسان صفات خداوندی کا مظہر ہے، آیت میں اس کی تائید ہوتی ہے۔

سُورَةُ العَلَق

پَارَة: 30

(1) ﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴾ [سورة العلق: 19]

ترجمة: اور آپ نماز پڑھتے رہیے اور اللہ کا قرب حاصل کرتے رہیں۔

تفسیر: اللہ سے قرب وخوشنودی حاصل کرنے کا قوی ترین ذریعہ نماز ہے۔ آیت میں اسی کی کثرت کا حکم دیا جارہا ہے، آیت میں سجدہ سے نماز مراد ہے۔ (معالم، راغب)

آیت میں سجدہ کی یہ خاصیت بیان کی گئی ہے کہ اس سے قربِ الٰہی بڑھتا ہے۔ اس لیے فقہاء کرام نے آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ سجدہ میں ثواب کی نیت کے ساتھ قربِ الٰہی کی بھی نیت کرنی چاہیے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ خشوع (اللہ کے آگے عاجزی و نیاز مندی) جو سجدہ کی روح ہے، وہی قربِ الٰہی کا مدار ہے۔

سُوْرَةُ الْقَدْرِ

پارہ: 30

⑪ ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ﴾ [سورة القدر: 3]

ترجمة: شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

تفسیر: رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی کسی طاق رات کو شب قدر کہا جاتا ہے۔

شب قدر دراصل نزول قرآن کی پہلی رات ہے۔ اسی رات غارِ حرا میں نبی کریم ﷺ پر رمضان ۱۳ قبل ہجرت (مطابق جولائی ۶۱۰ء) رمضان المبارک کی طاق رات تھی۔ قرآن حکیم کی پہلی آیت ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ پانچ آیات مَا لَمْ يَعْلَمْ تک نازل ہوئیں۔

اس مقدس رات کو سال بھر کی تمام راتوں میں افضل رات قرار دیا گیا ہے، اس رات کی عبادت کو ہزار مہینوں کی عبادت کے ثواب سے بہتر کہا گیا ہے۔

اس رات سال بھر کے انسانی فیصلے فرشتوں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ حیات، موت، صحت، بیماری، رزق، کامیابی، خیر وشر وغیرہ جملہ احوال۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں اس بات کی صراحت ہے کہ فضیلت والے دن رات میں عبادت کا خاص اہتمام کرنا چاہیے، یہی اہل طریق کی عادت ہے۔

سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ

پارہ: 30

⑪ ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝﴾ [سورة البينة: 8]

ترجمة: اللہ ان لوگوں سے خوش ہوا اور وہ اللہ سے خوش رہیں گے۔ یہ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا رہا ہے۔

تفسیر: اوپر کی آیات میں یہ بیان کیا گیا کہ جو لوگ قانون الٰہی کے باغی اور منکر ہیں، گو ان کا ماضی کیسا کچھ بھی رہا ہو، وہ حشر کے دن اللہ کی عدالت میں بدترین مخلوق ہوں گے اور جو لوگ قانون الٰہی کی تصدیق کرنے والے اور وفادار ہیں خواہ وہ دنیاوی حیثیت سے جیسے بھی ہوں، وہ اللہ کی عدالت میں بہترین مخلوق شمار ہوں گے، انہیں جنت کے اعلیٰ درجات ملیں گے اور وہ ان نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ شادکام رہیں گے اور سب سے بڑی کامیابی و نعمت یہ ہوگی کہ اللہ ان سے خوش و راضی رہے گا۔

ان کا یہ اخروی انجام دنیا میں خشیت الٰہی پر قائم رہنے کی وجہ سے ہوا۔

سُلوك: علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آخرت کا بلند ترین درجہ رضائے الٰہی ہے جو دنیا میں خشیت الٰہی سے حاصل ہوتا ہے اور خود خشیت الٰہی معرفت الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا معرفت الٰہی کی ضرورت ہے۔ (روح المعانی)

ملحوظه: سچی معرفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وحدانیت کے ذریعہ پہچانو۔ یعنی اس کی ذات کو بھی واحد و یکتا جانے اور اس کی صفات کو بھی یکتا و بے نظیر یقین کرے۔ اپنا مقصود و طلب بھی صرف اسی کو بنائے، فاعل و مؤثر حقیقی بھی صرف اسی کو سمجھے۔ (معرفت ہی رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے۔)

سُوْرَةُ الزَّلْزَلَة

پَارَہ: 30

⑪ ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾ [سورة الزلزال: 4]

ترجمة: اس دن زمین اپنی سب خبریں بیان کرنے لگے گی۔

تَفسِیر: سورت میں قیامت کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔ یہ سب واقعات نفخ اول (پہلا صور) کے وقت پیش آئیں گے۔ زمین پر پے در پے زلزلے آئیں گے، زمین کی اس مسلسل جنبش واضطرابی حالت سے سارا عالم زیر وزبر ہوجائے گا، زمین اپنے اندر کا بوجھ باہر نکال ڈالے گی۔ یہ بوجھ زمین کے دفینے و معدنیات وخزائن ہوں یا انسانی مردے ہوں۔ انسان گھبرا کر اور سراسیمہ ہوکر پکار اٹھے گا کہ آخر زمین کو کیا ہورہا ہے۔ اس وقت زمین کو اللہ گویائی کی طاقت دیں گے۔ وہ مومن و کافر ہر انسان کے اچھے و برے عمل جو اس کی پشت پر کیے گئے تھے، نام بنام شمار کروائے گی کہ فلاں نے فلاں عمل فلاں وقت میری پشت پر کیا تھا وغیرہ۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تکلم (بات چیت کرنا) عادۃً ایسے جسم کی صفت ہے جس میں حیات و ادراک وشعور ہو لیکن آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جمادات (خاک وآگ) میں بھی یہ صفت ہے اگرچہ اس کا ظہور قیامت کے دن ہو۔

ملحوظہ: روایات صحیحہ میں بکثرت یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ ایک درخت نے نبی کریم ﷺ کو سلام کیا تھا، کنکریوں نے آپ ﷺ کی نبوت کی شہادت دی، مکۃ المکرمۃ میں ایک پتھر تھا جو آپ کے گزرتے وقت آپ ﷺ کو سلام کیا کرتا تھا۔

سُورَةُ العَادِيَات

پارہ: 30

﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۞ ﴾ [سورة العٰديٰت: 6]

ترجمة: بے شک آدمی اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔

تفسیر: قرآن حکیم میں جہاں کہیں مطلق اَلْاِنْسَان کا لفظ آیا ہے تو اس سے عموماً کافر انسان مراد ہوتا ہے۔ مذکورہ آیت میں بھی اَلْاِنْسَان سے کافر انسان مراد ہے۔

کافر اپنے رب کا جو اس کی پرورش کر رہا ہے، روزی، ہوا، پانی، آگ، دن رات کی نعمتیں بے حد وحساب ہیں، اس کا شکر ادا نہیں کرتا اور نہ اس کو اللہ کی طرف سے خیال کرتا ہے بلکہ ان نعمتوں کو اپنی قابلیت وصلاحیت کا حق سمجھا کرتا ہے، آیت میں اسی ناشکری کا ذکر ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ سورت میں انسان کی ایک طبعی خامی کا ذکر ہے کہ وہ شکر گزاری نہیں کرتا، لیکن مجاہد فی سبیل اللہ اس عیب ونقص سے پاک ہوا کرتا ہے، وہ خلاف طبع سعی کرتا ہے اور اس کا شکر بھی ادا کرتا ہے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ انسان میں طبعی موانع ہونے کے باوجود عمل کرنے سے زیادہ اجر ملتا ہے۔

سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ

پَارَہ: 30

① ﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝﴾ [سورة القارعة: 6 تا 7]

ترجمة: پھر جس شخص کا پلہ بھاری ہوا۔ وہ تو خاطر خواہ عیش میں ہوگا۔

تفسیر: حشر کے دن اعمال کے وزن کیے جانے کا ذکر ہے۔ اس دن ہر ہر عمل تولا جائے گا۔ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حشر میں اعمال وزن کیے جائیں گے، شمار نہیں کیے جائیں گے۔ اعمال کا وزنی یا بے وزن ہونا اخلاص اور سنت کی مطابقت پر منحصر ہوگا۔ جس عمل میں دونوں چیزیں ہوں، اس عمل کا وزن بھاری ہوگا اور جو عمل دونوں سے خالی ہوگا، کمزور ہوگا، وہ ہلکا اور بے وزن ہوگا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں: قیامت کے دن اعمال وزن کیے جائیں گے جیسا کہ دیگر آیات میں بھی اس کی تصریح ہے۔ (جب کہ دنیا میں اعمال کا کوئی مادی جسم نہ تھا جو وزن کیے جاسکیں۔)

معلوم ہوا کہ دنیا کے یہ اعمال آخرت میں اپنا جسم اختیار کر لیں گے۔ (قرآن کی ایک اور آیت سے یہی مفہوم ہوتا ہے: ﴿وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ [سورة الكهف: 49] اور جسم کی شکل اسی روز معلوم ہوگی۔)

سُوْرَةُ التَّكَاثُر

پَارَہ: 30

﴿ اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝﴾ [سورۃ التکاثر: 1 تا 2]

ترجمۃ: فخر کرنا تمہیں (آخرت سے) غافل کیے رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ تم قبرستان میں پہنچ جاتے ہو۔

تفسیر: زمانۂ قدیم میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر اپنی کثرت آبادی اور مال و دولت کی کثرت پر فخر و شان ظاہر کرتا تھا اور اسی اُدھیڑ بن میں اپنی زندگی ختم کر دیا کرتے تھے۔

دنیا کی زندگی کا ان کے یہاں بس یہی تصور تھا۔

قرآن حکیم نے اس جاہلی تصور کا نہایت تاکید کے ساتھ رد کیا ہے اور یہ حقیقت سمجھائی ہے کہ:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں: مباحات (دنیا کی جائز چیزوں کی کثرت) پر فخر کرنا مذموم ہے۔

تفسیر ماجدی کے مفسر لکھتے ہیں کہ آج بیسویں صدی کی مہذب حکومتوں کو فخر و ناز بھی اپنی اپنی Man Power پر ہی رہا کرتا ہے، یہ قدیم جرثومہ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

سُورَۃُ العَصر

پَارَہ: 30

⑪ ﴿وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ﴾ [سورة العصر: ا تا 2]

ترجمة: قسم ہے زمانے کی۔ بےشک انسان خسارے میں ہے۔

تَفسِیر: عصر زمانے کو کہتے ہیں اور خود زمانہ ایک وقت ہے جو تیزی کے ساتھ گزرتا چلا جارہا ہے۔ گویا زمانہ وقت کا ظرف ہے جس کے اندر انسان سب ہی کچھ کرتا رہتا ہے، اسی میں وہ کھوتا ہے اور اسی میں وہ پاتا بھی ہے۔ نفع ونقصان، رنج والم، خیر وشر سب کچھ اسی میں اس پر واقع ہوتے ہیں۔

انسانی عمر کے لمحات دیکھتے دیکھتے گزر جاتے ہیں اور انسان خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ اسی زمانے کو گواہ قرار دے کر قرآن مجید کہتا ہے کہ کافر انسان کیسا بےنصیب ہے کہ وہ آخرت سے غافل ہو گیا اور خسارے میں پڑ گیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عمر کے لمحات عظیم نعمت ہیں۔ لہٰذا کوئی لمحہ ضائع نہ ہونا چاہیے، ساری زندگی تحصیل کمال یا تکمیل کمال میں بسر ہونی چاہیے۔

اس حقیقت پر اہل اللہ خوب متنبہ ہوئے ہیں۔

ملحوظه: روایات میں آیا ہے کہ مکۃ المکرمۃ کے مشہور تاجر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب دعوت اسلام کے شروع ہی میں ایمان لائے تو ان کے ایک دوست نے کہا: ابوبکر رضی اللہ عنہ! تم تو معاملات میں بڑے ہوشیار تھے لیکن ایمان قبول کر کے سخت دھوکہ کھا گئے اور فلاں وفلاں دیوتاؤں کی توجہ وعنایت سے محروم ہو گئے۔

اس پر یہ سورت نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ محروم رہ جانے والے حقیقتاً کون لوگ ہیں؟

سُوْرَةُ الْهُمَزَة

پارہ: 30

﴿الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ﴾ [سورة الهمزة: 2]

ترجمة: (بڑی خرابی ہے اس شخص کے لیے) جس نے مال سمیٹا اور اس کو گن گن کر رکھا۔

تفسیر: مال و دولت کی حرص و ہوس کبھی قناعت نہیں چاہتی جہنم کی ہوس کی طرح۔ هَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ کا تقاضہ کرتی رہتی ہے۔ مال جمع کرنے والا کبھی مطمئن نہیں ہوتا، اس پر بیس اکیس کا چکر ہر وقت سوار رہتا ہے۔ علاوہ ازیں مال کی یہ دائمی حرص و خواہش بخل پیدا کرتی ہے اور اسی بخل کی وجہ سے وہ مال کو بار بار شمار کرتا رہتا ہے کہ کہیں کوئی پیسہ خرچ نہ ہو جائے یا نکل کر بھاگ نہ جائے۔ اکثر مال داروں کو بخیل دیکھا گیا ہے کہ وہ ہر وقت حساب و کتاب کے چکر میں پڑے رہتے ہیں، اسی میں ان کو مزہ آتا ہے، بخیل مال داروں کی غذا بس یہی مزہ ہوا کرتا ہے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ایسا مال جمع کرنا مذموم ہے جو محض مال کی محبت اور خصوصی شغف کے ساتھ ہو، جس کی علامت یہ ہے کہ اس کو بار بار شمار کرتا رہے (اور خرچ نہ کرے۔ نہ حق اللہ، نہ حق العباد۔)

سُوْرَةُ الْفِيْل

پارہ: 30

(۱) ﴿وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝﴾ [سورة الفيل: 3]

ترجمة: اوران پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے۔

تفسیر: اصحاب الفیل کا یہ مشہور زمانہ واقعہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں نبی کریم ﷺ کی ولادت سے چند ہفتے پہلے پیش آیا۔(واقعہ ''ہدایت کے چراغ'' جلد ۲/صفحہ ۲۹۴ پر مطالعہ کیجیے جو مستند تاریخی حوالہ جات سے مرتب کیا گیا ہے۔) اللہ نے اپنے گھر کعبۃ اللہ کی حفاظت اپنی مخلوقات میں سے کمزور اور چھوٹی سی مخلوق پرندوں سے لی۔

حاکم یمن ابرہہ خانہ کعبہ کو ڈھانے کے لیے ہاتھیوں کا لشکر لیکر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ خانہ کعبہ کو ڈھاتے، سمندر(بحر احمر) سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کا ٹڈی دل اڑتا آیا جن کے پنجوں اور چونچوں میں کنکریاں تھیں، ابرہہ کے لشکر پر برسانے لگا۔ پرندے خود چھوٹے تھے اور کنکریاں ان سے کہیں چھوٹی لیکن ہاتھیوں کا یہ غول بیابانی بھوسہ کی طرح خاک آلود ہوگیا۔ جس پر بھی یہ کنکری پڑتی، آر پار ہوجاتی۔ ابرہہ پریشان ہوکر بھاگ کھڑا ہوا اور سارا لشکر تباہ و برباد ہوگیا۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مؤثر حقیقی صرف حق تعالیٰ ہیں، اسباب و ذرائع مؤثر نہیں۔

تفسیر ماجدی کے مفسر لکھتے ہیں: ''شعائر اسلامی کی بے حرمتی کرنے والوں کو عتاب الٰہی سے ڈرنا چاہیے۔''

ملحوظہ: ہاتھیوں کے مقابلے کے لیے کم از کم ہاتھیوں کا لشکر ہونا چاہیے تھا، چھوٹی چھوٹی چڑیوں کا کیا حوصلہ؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کائنات کی کسی بھی چیز میں ذات قدرت و طاقت نہیں ہے۔ اب جس میں بھی قدرت و طاقت نظر آرہی ہے، وہ خدائی عطا ہے جو حسب منشاء چیزوں میں ڈال دی گئی ہے پھر جب اللہ کی مرضی ہوتی ہے تو یہی قدرت و طاقت ان اشیاء سے چھین لی بھی جاتی ہے۔

ہاتھی چڑیا ہوجاتا ہے اور چڑیا ہاتھی۔

﴿فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝﴾ [سورة يٰسين]

❀ ❀ ❀

سُورَةُ قُرَيْشٍ

پَارَة: 30

(1) ﴿ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۧ ﴾

[سورة قريش: 3 تا 4]

ترجمة: انہیں چاہیے تھا کہ اس گھر (خانہ کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں۔جس نے ان کو بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے امن دیا۔

تفسیر: قبیلہ قریش جو زمانہ قدیم سے خانہ کعبہ کے پاسبان اور خدمت گزار تھے، انہیں اسلامی دعوت مل جانے کے بعد مشرک و بت پرستی سے توبہ کر کے صرف اس گھر کے مالک رب العالمین کی عبادت کرنی چاہیے تھی جب کہ اس نے عرصۂ دراز تک اس خدمت کے صلہ میں رزق کی فراوانی اور دشمنوں کے اندیشوں اور خوف سے نجات بھی دی ہے۔نعمت کا یہ حق تھا کہ وہ شکر بجالاتے نہ کہ فخر ومباحات میں مبتلا رہتے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اگر کسی کو دینی خدمات کے صلہ میں مال وجاہ نصیب ہو تو اس کو بجائے تفاخر، اللہ کا شکر اور اطاعت کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔

سُوْرَةُ الْمَاعُوْن

پَارَہ: 30

① ﴿فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝﴾ [سورة الماعون: 2]

ترجمۃ: سووہ یہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

تفسیر: آیت میں کسی خاص آدمی کا حال نہیں بیان کیا گیا ہے بلکہ دین اسلامی کو جھٹلانے والے ہر کافر کا حال بیان کیا گیا ہے۔ پھر جو حق اللہ ادا نہیں کرتا، وہ حق العباد (بندوں کا حق) کیا ادا کرے گا۔ یتیم جو بے سہارا ہوا کرتا ہے، بھلا اس کا کیا حق ادا کرے گا۔ ایسے ہی غریبوں مسکینوں کا حال ہے۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں: دل کی قسوت (تنگی) ہی ان مذموم اعمال کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

سُورَةُ الْكَوْثَرِ

پَارَہ: 30

﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝﴾ [سورة کوثر: 3]

ترجمة: یقیناً آپ کا بدخواہ ہی بے نام ونشان ہے۔

تفسیر: رسول اللہ ﷺ کے کمسن صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوگیا تو عام طور پر کافروں نے شگون لیا کہ بس چند دن اور صبر کرلو۔ جب یہ بھی انتقال کر جائیں گے تو ان کے کام کا کوئی بھی نام لینے والا باقی نہ رہے گا، یہ نیا دین اپنی موت آپ ہو جائے گا۔

ایسا شخص جس کی نرینہ اولاد نہ ہو، اس کو عربی زبان میں ابتر کہا جاتا ہے۔ یعنی (والد) جس کی وفات کے بعد اس کا کوئی نام لینے والا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا کہنے والوں کو خود ابتر قرار دیا ہے جو حرف بحرف پورا ہو چکا ہے۔ ایسا طعنہ دینے والوں کا حسب ونسب تو کیا، نام ونشان بھی گم ہو چکا ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ کے دوستوں کی مخالفت کرنے والوں کا نام ونشان مٹ جاتا ہے، ان کا ذکر خیر کہیں نہیں ہوتا۔

سُوۡرَةُ الۡكَافِرُوۡنَ

پَارَۃ: 30

(1) ﴿لَآ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ﴾ [سورۃ الکافرون: 2]

ترجمۃ: نہ میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرتا ہوں اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کرو گے۔ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔

تفسیر: دین اسلام اور شرک کی ملتوں میں کسی بھی اتحاد کی صورت ممکن نہیں، دونوں بالکل الگ الگ راہیں ہیں۔ مکۃ المکرمۃ کے چند کافر مصالحت کے شریفانہ عنوان سے ایسی کوئی صلح چاہتے تھے کہ ہمارا مذہب بھی باقی رہے اور دین اسلام بھی چلتا رہے تا کہ باہمی اختلاف ختم ہو جائے۔

غالباً اکبر کا دین الٰہی بھی اس جیسی کوشش کا ایک نمونہ تھا اور آج (۱۴۱۷ھ مطابق ۱۹۹۶ء میں) بھی بعض نام نہاد اسلامی ممالک کے سربراہوں کا ذہن وفکر اسی جانب جا رہا ہے۔ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ﴾

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں بغض فی اللہ کا ثبوت ملتا ہے کہ اہل کفر وشرک سے تبری اور متارکت (بے زارگی اور دوری) ضروری ہے۔

سُورَةُ النَّصر

پَارَہ: 30

(1) ﴿إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴾ [سورة النصر: 1]

ترجمة: جب اللہ کی مدد اور فتح آ پہنچے۔ اور آپ لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتے دیکھ لیں۔ تو اپنے رب کی تسبیح و تہلیل کیجئے اور اس سے بخشش طلب کیجئے۔ بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

تفسیر: اکثر مفسدین لکھتے ہیں کہ قرآن حکیم کی سورتوں میں سب سے پہلی مکمل سورت "سورۃ الفاتحہ" نازل ہوئی اور آخری سورت یہی سورۃ النصر ہے۔ (قرطبی، مسلم)

ان آیات میں آپ ﷺ کو عنقریب ہونے والی نصرت اور فتح عظیم کی خوشخبری دی گئی ہے۔

اور اس کی یہ علامت بتلائی گئی کہ لوگ اسلام میں جوق در جوق داخل ہوں گے اور اسلام تیزی سے پھیل جائے گا، ایسے وقت آپ اللہ کی حمد و تسبیح کثرت سے کرتے رہیں اور استغفار بھی۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے: «سُبْحٰنَكَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ» (بخاری)

چنانچہ ۸ھ میں مکۃ المکرمۃ جو گویا زمین پر اللہ کا دار السلطنت ہے، اسلام کے زیر نگین آ گیا اور اللہ کا دین پورے جزیرۃ العرب میں پھیل گیا۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اسی طرح سالکین طریق کو بھی چاہیے کہ جب تعلیم و تبلیغ، وعظ و ارشاد سے فارغ ہوں تو کثرت ذکر و فکر اور تقرب الی اللہ کے لیے کچھ وقت مقرر کر لیں۔

ملحوظہ: تفسیر ماجدی کے مفسر علامہ عبد الماجد صاحب دریا آبادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سارے مذاہب میں اسلام کا یہ منفرد عنوان ہے کہ انتہائی فتح مندی اور کامیابی و کامرانی کے وقت یہ ارشاد نہیں ہوتا کہ اس فتح و کامیابی کا جشن دھوم دھام سے منایا جائے، جلسے جلوس نکالے جائیں، نقارے بجائے جائیں، روشنی و چراغاں کا اہتمام کیا جائے، زندہ باد، پائندہ باد کے نعرے بلند کیے جائیں، دفاتر اور مدارس کو چھٹی دے دی جائے وغیرہ وغیرہ۔

بلکہ یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ اس کامیابی و فتح و عظیم کی مسرت میں اللہ کی یاد اور اس کی حمد و ثناء کثرت سے کی جائے بلکہ ایسے وقت کچھ زیادہ ہی تسبیح و تہلیل سے کام لیا جائے۔ اللہ اکبر

زمینی و آسمانی فکر میں کس قدر بعد و تفاوت ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار

سُورَۃُ المَسَدِ

پارہ: 30

﴿تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ؕ﴾ [سورۃ لھب: 1]

ترجمۃ: ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ برباد ہوگیا۔

تفسیر: قریشی سردار ابولہب کا نام عبدالعزّٰی بن عبدالمطلب تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا چچا تھا۔ اپنے کفر و شرک کی وجہ سے آپ ﷺ کے شدید ترین دشمنوں میں شامل تھا، آپ پیغام حق سناتے تو یہ آپ ﷺ پر پتھر پھینکا کرتا تھا۔ آپ بارہا اس کی اس خبیث حرکت سے زخمی بھی ہوئے ہیں۔

عام لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ محمد ﷺ کی بات نہ سنو، یہ جھوٹا اور بے دین آدمی ہے۔

ایک دفعہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہنے لگا: تَبًّا لَّكَ سَآئِرَ الْيَوْمِ اے محمد! تو ہمیشہ برباد رہے۔ اس کے خبیث عنوان کو اللہ نے خود اس کے گلے کا ہار بنا دیا، اس کی بیوی ام جمیل بنت حرب سردار قریش ابوسفیان کی بہن تھی، آپ ﷺ کی دشمنی میں حد پار کر چکی تھی۔

مذکورہ سورت میں ان دونوں خبیثوں کا انجام بتایا گیا ہے۔ ﴿لَعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ﴾

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جیسے اپنے نبیوں کا انتقام لیتا ہے، ایسے ہی اپنے اولیاء کا بھی انتقام لیا کرتا ہے۔

سُوْرَةُ الإِخْلَاص

پَارَہ: 30

① ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ [سورة اخلاص: 1]

ترجمة: آپ کہہ دیں کہ وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ نہ اس کے کوئی برابر ہے۔

تفسیر: یہ مستقل پانچ صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے تعارف کے لیے بیان کی گئی ہیں۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ جس طرح سورۃ الکوثر شانِ رسالت میں جامع ہے، اسی طرح سورۃ الاخلاص شان توحید میں جامع ہے۔

سُلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ پوری سورت اپنے اختصار کے باوجود معارف وعقائد توحید پر مشتمل ہے۔

ملحوظہ: دنیا کی قدیم قوموں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے تعارف میں بڑی بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں، انہوں نے اللہ کے تعارف کے لیے انسانی حدود کا سہارا لیا ہے۔

جس طرح انسانوں کے بہت سارے افراد ہوتے ہیں اور ان میں ضرورت واحتیاج توالد وتناسل کا سلسلہ چلتا ہے، اسی طرح رب العالمین کو بھی انہی قیود وبندھنوں میں سمجھنے کی کوشش کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں بڑے بڑے خدا پیدا ہو گئے۔

قرآن حکیم نے اللہ کے تعارف کے لیے نہایت سیدھا سادہ عنوان اختیار کیا ہے جو ایک عام انسان سے لے کر ایک بڑے فلسفی دانا فرزانہ کو بھی مطمئن کر دیتا ہے۔

اصولی طور پر کسی بھی شخصیت کے تعارف سے پہلے دو ② باتوں کا سمجھنا ضروری ہے: ایک اس کا ذاتی تعارف، دوسرا صفاتی تعارف۔

اللہ کی ذاتی تعارف اس لیے ممکن نہیں کہ انسان کی ذہنی وعقلی پرواز خود اس قدر ضعیف ومحدود قسم کی ہے کہ وہ خود اپنا ذاتی تعارف حاصل نہ کر سکا کیونکہ انسان جسم وروح کا مجموعہ ہے لیکن روح کی حقیقت سے آج تک کوئی واقف نہ ہو سکا تو پھر اپنے خالق کا ذاتی تعارف کیونکر پا سکتا ہے؟

سورت میں اللہ تعالیٰ کا صفاتی تعارف ملتا ہے جس سے اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔

اَحَد، صَمَد، لَمْ يَلِدْ لَمْ يُوْلَدْ، لَمْ يَكُنْ لَّه كُفُواً اَحَدٌ

وہ یکتا ہے، بے نیاز (غیر محتاج) ہے، اس کی کوئی اولاد نہیں، نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اس کا کوئی ثانی وہمسر

نہیں۔ اللہ کی صفات میں پہلا لفظ اَحَدٌ ہے، اَحَدٌ کے معنی واحد نہیں جو دو (2) کا مقابل ہوتا ہے، بلکہ اس کا ترجمہ ''یکتا'' کیا جاتا ہے۔ اَحَدٌ ایسے عدد کو کہا جاتا ہے جو شمار گنتی سے نہیں تعلق رکھتا۔ اردو میں ''لاثانی'' یکتا سے اس کا مفہوم ادا ہوسکتا ہے۔

لطیفہ:

دنیا کی قدیم قوموں نے خدائیت کی تقسیم اس طرح کی ہے:

ہندوؤں نے کائنات کی تخلیق و پیدائش کو ''برہما جی'' کے ذمہ کیا ہے۔

ربوبیت و پرورش کا حق ''وشنو جی'' کے قبضہ میں دیا ہے۔

اہلاک وفنا (موت وہلاکت) کو ''شو جی'' کے حوالہ کیا ہے۔

اور دنیا کی ایک تہائی آبادی عیسائیوں نے حشر کے دن آخری فیصلہ کو اللہ کے اکلوتے بیٹے مسیح علیہ السلام کے ہاتھ میں رکھا ہے۔ ﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾

سُورَةُ الفَلَقِ

پَارَہ: ۳۰

۴ ﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ﴾ [سورة الفلق: 4]

ترجمة: پناہ چاہتا ہوں گرہوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والیوں کے شر سے۔

تفسیر: زمانۂ قدیم میں سحر جادو کا عام رواج تھا اور اس کو فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا تھا، آج بھی متعدد قوموں میں یہ بیماری موجود ہے۔

عام طور پر جادو کرنے والے رسیوں، دھاگوں، بالوں پر گرہ ڈال ڈال کر عمل کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ پر بھی مدینہ طیبہ کے منافق یہودی لبید بن اعصم اور اس کی خبیث لڑکیوں نے آپ ﷺ کے موئے مبارک کسی طرح حاصل کر کے اس پر جادو کی گرہ لگائی تھی جس کا اثر چند ہفتوں تک آپ پر رہا پھر جبرئیل امین نازل ہوئے اور سورۂ فلق وسورۃ الناس آپ کو پڑھ کر سنائیں، آپ ﷺ صحت یاب ہوگئے۔ آیت میں انہی پھونک مارنے والیوں کا ذکر ہے۔

سلوك: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اسباب طبعی سے اہل باطل کا اثر اہل حق پر بھی پڑ سکتا ہے۔ (جیسا کہ منافقین کے جادو کا اثر نبی کریم ﷺ پر پڑا تھا۔)

پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس قسم کی تاثیرات، حق و باطل کا ہرگز معیار نہیں بن سکتیں جیسا کہ بعض لوگوں نے دھوکہ کھایا ہے۔

۵ ﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ﴾ [سورة الفلق: 5]

ترجمة: اور پناہ چاہتا ہوں حسد کرنے والے کے حسد سے جب کہ وہ حسد کرنے لگے۔

تفسیر: آیت میں حسد سے پناہ طلب کرنے کی ترغیب دی گئی ہے کہ اس کے شر سے حفاظت نصیب رہے۔

حسد دراصل اس مکروہ وحرام جذبہ کا نام ہے جو کسی کی خوشحالی، خوش عیشی، کامیابی وسرفرازی دیکھ کر دل میں پیدا ہو اور یہ تقاضہ ہو کہ یہ نعمت اس سے زائل ہو جائے، چاہے خود کو ملے یا نہ ملے۔

آیت میں اس حاسد کے حسد سے پناہ طلب کرنے کی ہدایت دی جا رہی ہے جب کہ وہ حسد کرنے لگے۔ یعنی زوال نعمت کے اسباب اختیار کرے۔ ایسی صورت میں حاسد کا حسد کسی بھی خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔

اس لیے یہ تعلیم دی گئی کہ حاسد کے حسد سے پناہ طلب کی جائے کہ جب کہ وہ حسد کرنے لگے۔ ورنہ فقط حاسد خود اپنے عذاب وغم میں مبتلا ہے جس کا وہ رات دن مزہ چکھ رہا ہے۔

سلوک: رذیلہ اخلاق میں حسد بدترین خصلت ہے۔

ملحوظہ: کہاجاتا ہے کہ سب سے پہلا گناہ جو آسمان پر کیا گیا، یہی حسد تھا۔ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کیا اور سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

اور زمین پر بھی سب سے پہلا گناہ یہی حسد تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بڑے بیٹے قابیل نے اپنے چھوٹے بھائی ہابیل پر حسد کیا اور پھر بھائی کو قتل کر دیا۔ (قرطبی)

سُورَۃُ النَّاس

پَارَہ: 30

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ [سورة الناس: 4]

ترجمة: پناہ چاہتا ہوں وسوسہ ڈالنے والے پیچھے ہٹ جانے والے شیطان کے شر سے۔

تفسیر: ہر شر و گناہ کی ابتداء کسی نہ کسی وسوسہ سے ہی ہوا کرتی ہے، اگرچہ وسوسہ ایک خیال ہے لیکن اس کا اقرار عمل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وسوسہ اگر دل میں آ کر فوری نکل گیا تو انسان محفوظ رہ گیا لیکن یہی وسوسہ اگر دل میں قرار پکڑ گیا تو آدمی کو کسی نہ کسی دینی یا دنیوی مضرت میں پھانس لیتا ہے۔

ایسے برے وسوسے سے شیاطین یا جنات وشریر انسانوں کی طرف سے ہوا کرتے ہیں۔ کسی خبیث انسان نے کسی کے بارے میں شبہ ڈال دیا، بس شبہ والا ناچنے لگا، اس لیے وسوسہ سے پناہ طلب کرنے کی تعلیم دی گئی۔

سُلوک: حکیم الامت رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ وسوسہ اندازی غفلت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے لہذا غفلت کا علاج ذکر اللہ سے کیا جانا چاہیے۔

(حدیث میں ہے کہ اللہ کی یاد سے شیطان دور ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے یہ حقیقت ظاہر کی ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا﴾ [سورة الأعراف: 201] یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں، جب انہیں کوئی خطرہ پیش آ جاتا ہے تو وہ اللہ کی یاد میں مشغول ہو جاتے ہیں۔)

خادم الکتاب والسُّنّہ
محمد عبد الرحمن غفرلہ
حال مقیم جدہ، سعودی عرب

المنعم پبلشرز کی دیگر مطبوعات

تسہیل البیان فی تفسیر القرآن

سو تقریریں

خزینہ

ندائے منبر و محراب

خلاصۃ القرآن

عشاق قرآن

ایمان افروز واقعات

احسن القصص

بڑوں کا بچپن

درس قرآن و حدیث